

V1355 Date 17/12/09

Title - MABADI SIYASİYATI .

Author - Haceron Khan Sheerani .

Publisher - Maktaba Jamia (Delhi) .

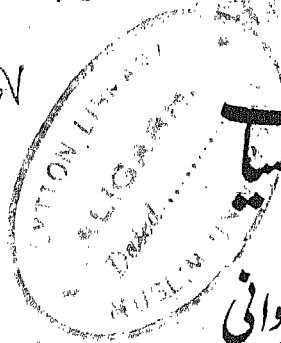
Year - 1940

Pages - 608 .

Subjects - Siyaset .

✓ و غیبس (۱۶)

۶۶



مبادی سیاست

مؤلف

ہارون خاں شروانی

پیرا ہاں

علی

ایم۔ اے (آکسن)؛ ایف، آر، ایچ، ایس؛

بیٹرٹریٹ لا

صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن

فہرست

رکن کورٹ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ

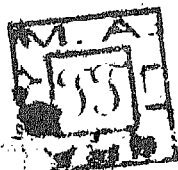
مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ

مدرسہ اسلامیہ



مکتبہ جامعہ

دہلی نئی دہلی، لاہور، محضو۔ ممبئی

بیت صلا

بیت صلا

بیت صلا

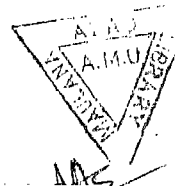
بیت صلا

5



۲۵
۸۱۷۸
۱۳۵۵

جید پرس دہلی
۱۳۵۵



۱۸۷

CHECKED

2002

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U1355

دیباچہ طبع دوم

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ کتاب ”مبادی سیاسیات“ جس کی دوسری اشاعت ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے، ملک میں مقبول ہوئی اور اہل فکر نے اسے غایت مہربانی سے اٹھوں ہاتھ لیا۔ اس اشاعت میں کتاب کے دونوں حصے یکجا کر دئے گئے ہیں تاکہ مضمون کا تسلسل پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو جائے۔ ۱۹۳۶ء سے اب تک، یعنی پہلی اشاعت سے دوسری اشاعت تک، ونسپ کی سیاسیات نے اس درجہ پلٹا کھایا ہے کہ کتاب ایک بڑی حد تک از سر نو لکھی گئی اور جیسے پہلے ستمبر ۱۹۳۶ء تک کے واقعات سے نتائج اخذ کئے گئے تھے ویسے ہی اب ۵ اپریل ۱۹۳۹ء تک کے واقعات سے نتیجے نکالے گئے ہیں بعض مضامین کو دلچسپی یا افادی پہلو کے اعتبار سے حذف کر دیا گیا ہے یا ان میں کمی کر دی گئی ہے اور بعض میں ذرا زیادہ وضاحت کی ضرورت سمجھی گئی ہے۔ اصطلاحات کی بجائے ایک کے دو فہرستیں منسلک ہیں، ایک میں اردو اصطلاحات کا انگریزی میں اور دوسری میں انگریزی اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ لکھا گیا ہے اور زمانے کے تقاضے کے اعتبار سے اردو اصطلاحات میں پہلے سے بھی زیادہ آسانی کا ملحوظ رکھی گئی ہے۔ امیہ ہے کہ یہ اشاعت نقش اول سے بھی زیادہ مفید اور مقبول ثابت ہوگی۔

ہارملن خاں شروانی حیدر آباد دکن
۱۸ اپریل ۱۹۳۹ء

نور محمد
۱۸ اپریل ۱۹۳۹ء

اقتباسات از طبع اول

پہلی جلد

اس جلد کے ابواب پر... مکمل نظر ثانی کر کے اس امید سے پیش کیا جا رہا ہے کہ اس سے موجودہ زمانے کے بچ در بچ سیاسی حالات کے سمجھنے میں آسانی ہوگی؛ نیز جامعات ہند کے ان طلبہ کے لئے بھی یہ حصہ مفید ہوگا جنہوں نے مضمون نظری سیاسیات لیا ہے.....

۳ جون ۱۹۳۶ء

دوسری جلد

جلد اول..... جس میں زیادہ تر مملکت کے مستقل نظریات تھے، اردو داں اصحاب نے اٹھوں اٹھلی..... موجودہ جلد میں زیادہ تر حکومت کے کل پرزوں اور بین الاقوامی ہیئت پر بحث کی گئی ہے اور پیرایہ ایسا رکھا گیا ہے کہ یہ حصہ نہ صرف ان طلبہ کے لئے مفید ہو جنہوں نے بی اے یا ایم اے میں سیاسیات متقابلہ لیا ہو بلکہ وہ تمام حضرات بھی جنہیں سیاسیات حاضرہ سے دلچسپی ہو اس سے کما حقہ استفادہ حاصل کر سکیں..... ساتھ ہی ابواب متعلقہ کے تحت قانون حکومت ہند کا مکمل تجزیہ کیا گیا ہے۔

۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء

سیاسیات

20-1-86

باب

تمہید

سیاسیات کو تعریف اور اس کا تعلق دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ

سیاسیات درہمیت - انسان کی اجتماعی حیثیت - ترتیب و تنظیم سیاسیات کی تعریف

اور اقسام - طرز تدلل - تاریخ سے تعلق - عمرانیات سے تعلق - معاشیات

سے تعلق - مذہب و اخلاق سے تعلق

سیاسیات کی اہمیت جنگ عظیم کے بعد سے دنیا میں جو تلاطم اور انقلابی کیفیت رونما ہے اس میں سب سے مزید عنصر سیاسیات کا نظر آتا ہے، اور یورپ ہو یا ایشیا، کسی بڑے عظیم اور کسی نیک میر کوئی شعبہ زندگی اس قدر جاذب توجہ نہیں جیسے سیاسیات۔ ایسے ممالک اور ایسے طبقے جو برصغیر سے جمود کی حالت طاری تھی، نہ صرف اپنے ملکوں کی بلکہ تمام عالم کی سیاسی کیفیات میں اپنی گہری لچپی کا اظہار کر رہے ہیں، اور جب بھی دنیا میں اضطرابات، جھگڑوں یا معاشی، معاشی اور بین الاقوامی تغیرات کا ذکر سننے میں آتا ہے تو یہی وہ علم ہے جس کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر ہماری توجہ مبذول ہوتی ہے، اور جو اصطلاحیں اور نو ساختہ الفاظ ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں۔

ان میں کوئی نہ کوئی سیاسی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ یوں تو ہر نئی اصطلاح، مادی شے یا غیر مادی تخیل کی تعریف ویسے بھی ضروری ہے۔ لیکن جب چند الفاظ ایسے پڑھنے میں آئیں جو زبان زد خاص و عام بھی ہوں تو ان کی تعریف لازمی رہ جاتی ہے، اس لئے کہ عوام کے تخیل میں جو معنی کسی خاص لفظ کے ہوتے ہیں وہ مزید مسترصل مفہوم سے ہٹے ہوئے ہوتے ہیں اور جب کسی علم یا فن کی ماہریت دریافت کر کے کسی گوشش کی جائے تو تجسس کرنے والے کا اولین فرض یہ ہے کہ پہلے صحیح مفہوم خود سمجھ لے اور پھر اسے دوسروں پر ظاہر کر کے کی گوشش کرے۔

انسان کی اجتماعی حیثیت۔ سیاسیات میں ایک مخصوص علم یا ادارے سے بحث کی جاتی ہے جسے مملکت کہتے ہیں۔ انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک انفرادی یعنی وہ حیثیت جو اسے بطور ایک فرد واحد کے مائل ہے، دوسرے اجتماعی یعنی وہ حیثیت جو اسے بطور رکن معاشرے کے مائل ہے۔ جس طرح انسان اپنی انفرادی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے جس میں دیگر افراد کو دخل نہ ہو۔ علاوہ خاندانی تعلقات کے، جو ہر انسان کو اپنے ماں باپ یا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہوتے ہیں، انسانی فطرت اس کی مقتضی ہے کہ وہ دوسروں سے بھی تعلقات پیدا کرے۔ بس یہ وہ سن کر ڈھسو کو پہلے مرتبہ اپنے بظاہر ویران و سنان جزیرے میں انسان کے باؤں کا نشان نظر آیا ہو گا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی ہو گی۔ گو اس نے اپنی زندگی کچھ ایسے قالب میں ڈھال لی تھی کہ وہ اپنے طریقے اور اپنی بکری ہی سے دل بہلانا کافی سمجھتا تھا اور گوا سے معلوم نہ تھا کہ پاؤں کا نشان کس شخص کا ہے، لیکن وہ محض انسان ہونے کی وجہ سے اس جستجو میں

لگ گیا کہ اس کا پتہ لگائے۔ الغرض بوجہ اس کے ہر شخص کو فطری طور پر بہت سے دوسرے اشخاص سے تعلق ہوتا ہے اس لئے نہ صرف اپنی ذات کے متعلق فرائض و حقوق حاصل ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے بھی وہ اپنے اقوال و افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

جہاں تک محض انفرادی ذمہ داری کا تعلق ہے، یعنی جہاں تک انسان اپنی ذات کی خدمت کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، آرام کرتا ہے وہاں تک اس کا تعلق علم یا سیاسیات سے نہیں ہوتا؛ سیاسیات کا میدان صرف اس وقت شروع ہوتا ہے جب انسان کا ذکر بطور رکن معاشرے کے کیا جائے۔ ترتیب و تنظیم معاشرے کے قیام و استحکام کے لئے کسی نہ کسی قسم کی ترتیب و تنظیم کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر اس کا فقدان ہو تو انسانی مجموعے میں تواحد کی کیفیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ تہذیب، جس سے شایستگی کا مفہوم لیا جاتا ہے، اس کے معنی ہی ترتیب کے ہیں۔ اگر نام نہاد معاشرے میں کسی قسم کی تنظیم نہ ہوگی تو وہ ایک غیر مرتب غول سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گا اور اس میں اجتماعی کیفیت کلیتہً مفقود ہوگی۔ اس کیفیت کے لئے یہ لازم ہے کہ ایک شخصیت ایسی ہو (خواہ وہ مفرد ہو یا مرکب) جس کے احکام ہر فرد عام طور سے ماننے اور اگر کوئی انھیں ماننے سے انکار کر دے تو اسے مجبور بھی کیا جاسکے۔ اس شخصیت کے حکم کا مرتبہ قانون کا ہو گا اور جماعت کی تنظیم کی بنا اس کے دئے ہوئے احکام یا اس کے تسلیم کئے ہوئے قواعد ہوں گے۔ الغرض سیاسی معاشرے کا قیام صرف اسی وقت ممکن ہے جب اس میں ایک حاکم کی شخصیت اور محکوم جماعت ہو اور یہ محکوم جماعت اس حاکم کی شخصیت کے مسئلہ

قواعد کے ذریعے سے منظم، مرتب اور مہذب رہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر جماعت کے افراد اپنی ہیکاری اور تعال کے ذریعے سے جماعت کو منظم کرنا نہ چاہیں تو حاکم شخصیت کو بڑی بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ آخر بالا فر منظم جماعت از سر لویے ربط غول کے شکل میں تبدیل ہو جائے، چنانچہ مستقل ترتیب و تنظیم کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ افراد میں مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت اور خواہش ہو اور ان کا نصب العین یہ ہو کہ اپنے افعال سے وہ حتی الامکان معاشرے کو فوشر نہ ہونے دیں گے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ادارہ جس میں ایک شخصیت پر قواعد نظم کا کلیتہً داد و مدار ہو اور کوئی شخص انھیں تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اسے سزا بھی ملے سکے۔ ایسے ادارے میں آزادی کا فقدان ہوگا۔ لیکن یہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب تک ہر فرد دوسرے فرد کی خواہشات رجحانات اور میلانات کا مکافقہ خیال نہ رکھے گا اس وقت تک خود اس کی خواہشات، رجحانات اور میلانات کی پرواہ دوسرے افراد کو بھی نہ ہوگی اور ملک میں اس افراد فری کے باعث ابتری اور کشاکش پھیل جائیگی۔ دوسروں کی آزادی کا خیال رکھنے کے معنی ہیں کہ ہر فرد ایک خاص حد تک پابند ہو اور چونکہ منظم پابندی کا نام ہی ضبط ہے اس وجہ سے تنظیم و ترتیب اس وقت تک ناممکن ہیں جب تک پابندی اور نظم نہ ہو، اور جس طرح انسانی آبادی ملکیت کے لئے لازم اور ضروری ہے اسی طرح یہ عنصر بھی اس کا جزو ولا ینفک ہے۔ یہ منظم ضبط کی کیفیت جس ادارے کے ذریعے سے قائم کی جاتی ہے اسی کو حکومت کہتے ہیں۔

سیاسیات کی تعریف اور اقسام - اس پیچیدہ ادارہ یعنی مملکت سے جس علم کا تعلق ہے اسے سیاسیات کہتے ہیں۔ علم سیاسیات میں حکم دینے والے اور محکوم کے باہمی تعلقات کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر حکومت ایک مرکب جماعت ہو تو اس کے اجزاء کے باہمی تعلقات، اور اگر حاکم فرد واحد ہو تو اس کے حقوق و فرائض شمار کئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی فی نفسہ مملکت کے حقیقی مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع پر غور کیا جاتا ہے۔

اس علم کے دو پہلوؤں میں جہ فرق ہے وہ بالکل عیاں ہے۔ ایک طرف تو سیاسیات میں مجرد مملکت کی ابتدا، اس کی خصوصیات و مقاصد، نیز اصول حکومت و اصول مداخلت پر بحث ہوتی ہے، اور دوسری جانب اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ مختلف ممالک میں کس قسم کی حکومتیں قائم ہوں، ان کے مقاصد کیا تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے کیا کیا تدبیریں اختیار کی گئیں، آیا کسی خاص مطمح نظر کو پیش رکھا گیا یا نہیں، آج کل مختلف مملکتیں کس طرف جا رہی ہیں اور ان کا راستہ سیدھا ہے یا ان میں کسی قسم کی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں تخیلات کے مابین بہت بڑا بعد ہے ایک میں نفس مملکت پر بلا کسی خاص ملک کے حوالہ کے بحث کی جاتی ہے اور دوسرے میں واقعتاً پرتاج کا اظہار کر کے مختلف مملکتوں کے طرزائے حکومت کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں اصناف میں سے ایک کو نظری سیاسیات اور دوسرے کو اطلاقی سیاسیات کہیں گے۔

طرز استدلال - اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

سیاسیات پر غور کرنے اور سیاسی نتائج اخذ کرنے کے لئے متعدد طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ جتنے علوم سے اس وقت تک انسان واقف ہوا ہے ان کی تقسیم و تقوّل میں ممکن ہے۔ وہ علوم جن سے تجربہ کے بعد نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں یعنی وہ جن کا تعلق سہولیات قدرتی و طبعی سے ہے، انھیں قطعی علوم کہتے ہیں۔ لیکن وہ علوم جن کا تعلق انسان کی دماغی کیفیات، عادات و تعلقات سے ہے ان میں کسی قسم کے ارادی تجربہ کی گنجائش نہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا معمل بنایا جائے جس میں ارادۂ انسانی فطری خصوصیات کا آزادانہ تجربہ کر کے نتیجے نکالے جاسکیں۔ جب تجربہ کا دور دورہ مسدود ہو گیا تو سیاسیات کے لئے دوسری طریقے باقی رہتے ہیں، ایک یہ کہ تجسس کرنے والا خود اپنے دماغ پر زور ڈال کر نفسِ مملکت کے آغاز، ارتقاء اور مقاصد پر غور کرے اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا کے گزرے ہوئے اور موجودہ دستوروں کا مقابلہ کر کے ایسے نتائج اخذ کرے جو اسے سیاسیات میں مدد دے سکیں۔

مفصلہ بالا بیان سے خود بخود اس اعتراض کا جواب مل جائے گا جو بعض مرتبہ سیاسیات پر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ سیاسیات کو مدونِ علم کا رتبہ حاصل نہیں۔ اگر مدونِ علم کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح ریاضی و طبیعیات و دیگر ہم جنس علوم میں ہم چند اشیاء پر ایک خاص عمل کر کے چند عالمگیر نتائج پر پہنچ جاتے ہیں تو یقیناً سیاسیات کو مدون نہیں کہا جاسکتا۔ انسانی عادات و اطوار، دماغی کیفیات یا فطری خواص، جغرافیائی اثرات اور تاریخی روایات میں اتنا عظیم الشان تنوع پایا جاتا ہے کہ ان کے متعلق کسی کلیہ کا قیام ناممکن ہے اس لئے کہ جو سیاسی ادارہ ایک قوم کے لئے مفید

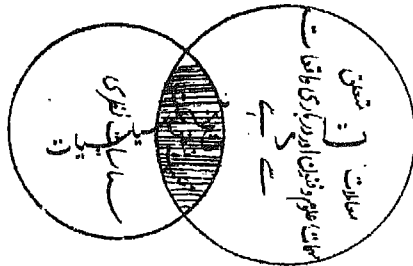
ہو گا وہ ممکن ہے کہ دوسری قوم کے لئے مضر ہو یا کم از کم اتنا مفید نہ ہو کہ اسی وجہ سے بعض نہایت ممتاز سیاست دان سیاسی استدلال کے تاریخی یا مقابلتی طریقے کو بے کار سمجھتے ہیں۔ تاریخی طرز استدلال وہ ہے جس میں ایک ہی ملک یا ایک ہی قوم کی درجہ بدرجہ سیاسی ترقی اور مختلف طرز اُسے حکومت پر جو اس ملک میں قائم ہوئے ہوں، غور کیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس قوم یا ملک کے سیاسی مقاصد کیا سے کیا ہو گئے اور ان مقاصد کی کس حد تک تکمیل کی گئی۔ یہ طرز استدلال درحقیقت تقابلی طرز کا ہی ایک شعبہ ہے جس میں ایک ہی ملک کے مختلف زمانوں کے طرز اُسے حکومت اور مختلف ممالک کے موجودہ و سابق مقاصد کے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص ملک یا کسی خاص حصہ دنیا کی سیاسی روٹل کیا ہے اور اس کو مد نظر رکھ کر آئندہ کی بابت کوئی خیال قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن علمائے اس طرز استدلال کی تنقید کی ہے ان کا قول ہے کہ یہ طریقہ نہایت مغالطہ آمیز ہے۔ مقابلہ ہم جنس اشیا یا ادارات کا کیا جاتا ہے، غیر جنس کا نہیں اور جب مکان یا زمان میں اصولی تبدیلی پیدا ہو گئی تو پھر مقابلہ کیسے ممکن ہے۔ اسی بنا پر بعض کا خیال ہے کہ جب تک کوئی مجموعہ افراد تمدن کی ایک مخصوص حد تک نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس کے افعال دائرہ سیاسیات میں نہیں آسکتے اور اُن سے کوئی سیاسی استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ غالبیت دونوں اصولوں موجود ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ زمان یا مکان کا لحاظ کئے بغیر محض مقابلے یا کسی اور طرز استدلال کے ذریعے سے ایسے کیلئے قائم کئے جاسکتے ہیں جو ہر ایک حالت پر جاری ہوں، یقیناً وہ غلطی پر ہیں۔ اسی طرح نئی نوع انسان کی ایک خاص مجموعہ کی حیثیت ہے

اور اس کے ایک حصہ کے سیاسی تجربات سے یقیناً دوسرا حصہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تاریخ سے تعلق - یہ بحث ہیں ایک دوسرے موضوع کی طرف لے جاتا ہے، یعنی علم سیاسیات کا دیگر ہم جنس علوم کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ لیکن تو مختلف مصنفوں نے اس بحث پر بہت کچھ طبع آزمائیاں کی ہیں اور سیاسیات کا تعلق قطعی علوم مثلاً علم ہندسہ، ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات تک سے بنایا ہے، لیکن اختصار کو مدنظر رکھ کر یہاں اس کا تعلق محض ہم جنس علوم سے دکھایا جائے گا۔ مفصلہ بالا بیان سے علم تاریخ کے ساتھ سیاسیات کا تعلق معلوم ہو گیا ہوگا۔ ایک بہت بڑے فرانسیسی سیاست دان کا قول ہے کہ تاریخ انسانی زندگی کا علم ہے اور اسے سیاسی استدلال میں اولین رتبہ حاصل ہے۔ یہ ادھر بیان کیا جا چکا ہے کہ قطعی علوم اور انسانی علوم اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ موخر الذکر کے لئے کوئی معمل یا تجربہ خانہ تیار نہیں کیا جاسکتا بلکہ ہم مجبور ہیں کہ نئی نوع انسان کے قدیم تجربوں سے فائدہ اٹھائیں۔ تاریخ اس تجربہ خانہ یا معمل کی کمی کو پورا کرتی ہے۔ وہ بے شمار واقعات، انسانی احساسات، دوستیوں اور دشمنیوں، جنگ و صلح، صعود و زوال، علی اور ذلی اور ارتقائی مدارج کا ایک سمندر ہے اور نہ صرف انسانی علوم کے محقق کو بلکہ جتنے بھی علوم اس دنیا میں پائے جاتے ہیں سب کے خوشہ چنیوں کو اس سے مدد ملتی رہتی ہے۔ سیاسیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اور بہت سے سیاسی اصول ایسے ہیں

لے موسیو کے لائبر M. DESLANDRES جن کے مقولے کو ریورسیرج و گارنر

W. GARNER نے اپنی کتاب "تہذیب سیاسیات" باب میں نقل کیا ہے۔

باب اول در تہذیب و تمدن
 (لئے آئینہ میں دیکھو کہ کون سی آہستہ آہستہ
 A.M. 1900
 جو مختلف ممالک کے دستوری تغیر و تبدل اور نظم و نسق کے انقلابات سے نتیجہ کئے گئے
 ہیں لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ تاریخ بالکل سیاسیات سے بھری ہوگی یا جملہ سیاسی
 اصول محض تاریخ سے ماخوذ ہوں گے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ایک طرف
 نظری سیاسیات میں ہیں تاریخ سے بہت ہی کم مدد ملتی ہے وہاں دوسری جانب سیاسی
 استدلال کے لئے اکثر تاریخی واقعات بے کار ہوتے ہیں اور سیاسی محقق کے لئے صرف
 ایسے ہی واقعات کافی ہوتے ہیں جو تنظیم مملکت اور ترتیب حکومت کے متعلق ہوں
 لہٰذا تاریخ اور سیاسیات کا باہمی تعلق مفصلہ ذیل شکل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا



ان دونوں دائروں میں سے ایک سیاسیات کا دائرہ ہے اور دوسرا تاریخ کا اور یہ دونوں دائرے بجائے اس
 کے کہ ایک دوسرے پر بالکل منطبق ہو جائیں، ایک دوسرے کو ایسے کاٹتے ہیں کہ ایک دائرے کا ایک
 حصہ دوسرے دائرے سے باہر رہ جاتا ہے۔ سایہ دار حصے میں وہ تاریخی امور ہیں جن کا تعلق مملکت کے تعلقات
 یا اس کی ترکیب سے ہے، اور یہ حصہ براہ راست سیاسیات کے دائرے میں شامل ہے۔ اس کے برعکس
 سیاسیات کا غیر سایہ دار حصہ نظری سیاسیات ہیں اور تاریخ کا غیر سایہ دار حصہ لٹریچر، ادب، دارالعلوم اور دیگر
 ایسے معاملات سے پر ہے جن کا تعلق براہ راست مملکت کی شکل سے نہیں۔

۱۔ **عمرانیات سے تعلق**۔ سیاسیات کو عمرانیات سے بھی گہرا تعلق ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ سیاسیات حکومت کا علم ہے۔ عمرانیات میں مفہم دوسرے امور کے اصول حکومت اور ان کی ترویج کے جو اثرات معاشرے پر پڑتے ہیں ان پر بحث کی جاتی ہے۔ گویا اس علم کا براہ راست تعلق دستوروں کے ارتقا اور حکومت کی شکلوں سے نہیں، تاہم جس طرح سیاسیات میں تاریخی مواد کو کام میں لایا جاتا ہے اسی طرح محقق عمرانیات سیاسی مواد کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کے معاشری ارتقا کے ساتھ سیاسی ارتقا لا بد لازمی ہے، چنانچہ جب مٹھی یا تصویر سی خیالات پیدا ہوتے ہیں تو ان کی زد سے حکومت اور سیاسی تخیلات بھی نہیں بچ سکتے۔ جیسا کہ عالم عمرانیات نے کہا ہے، انسانوں کا کوئی ایسا مجموعہ نہیں ہے جسے معاشری اکائی تصور کیا جاسکے، بدین سبب ہیں ایک سیاسی اکائی یعنی "قوم" کو عمرانی اکائی بھی بنالینا پڑتا ہے، اسی وجہ سے سیاسیات اور عمرانیات کا چولی دزن کا ساتھ ہو جاتا ہے اور کسی ملک کی سیاسی تنظیم دراصل اس کی معاشری تنظیم کا ایک جزو بن جاتی ہے۔

۲۔ **معاشیات سے تعلق**۔ سیاسیات کا تاریخ سے جس قدر گناؤں سے اس سے شاید کچھ کم سبب سیاسیات اور معاشیات کا باہمی تعلق ہے جس طرح سیاسیات میں حاکم و محکوم کے باہمی ربط پر بحث ہوتی ہے اسی طرح معاشیات کا سر و کار ان کے

۳۔ بیک مار، "مادی عمرانیات" BLACKMAR: ELEMENTS OF

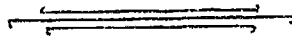
۴۔ اب SOCIOLGY.

۵۔ روس، "عمرانیات" ROSS: SOCIOLOGY. باب ۱۔

کب معاش کھانے پینے، داد و ستد، ملکی درآمد و برآمد، لگان اور اگلنداری سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں، چنانچہ کسی زمانے میں ان دونوں علوم کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی تھی اور معاشیات کو بھی علم "سیاست" میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ تاہم وقتیکہ کسی ملک کی تنظیم نے ترقی کے ایک خاص درجہ کو عبور نہ کر لیا ہو، اس وقت تک وہ معاشی اعتبار سے ترقی نہیں کر سکتا، اور اسی طرح جب تک اس ملک میں درآمد و برآمد کے لئے قوانین مرتب نہ ہوں اور لگان و اگلنداری کے حدود مقرر نہ کیے جائیں، اس وقت تک یہ اندیشہ بگاڑ رہے گا کہ کہیں سیاسی تنظیم بیکار نہ ہو جائے۔ آج کل دنیا میں جتنی عالمگیر معاشی تحریکات پھیلی ہوئی ہیں، جیسے آزاد و مامون تجارت، خانی اہلک کی گمرانی اور حق ملکیت کے اصول، کاشتکاروں اور زمینداروں کے تعلقات، ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق براہ راست مملکت سے ہے۔ سیاسیات اور معاشیات کا تعلق اب تو پہلے سے بھی قریب تر ہو جاتا ہے، چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب حدائیں جو آج کل آسمان سیاسیات کو پھاڑے ڈالتی ہیں، جیسے بولشویت، فاشیت، سرمایہ داری، اشتراکیت وغیرہ ان میں سے سب کی سب تقریباً خاص معاشی اصول پر مبنی ہیں۔ الغرض ان دونوں عمرانی علوم کا باہمی رشتہ ایسے مسائل سے ظاہر ہوتا ہے جن کا تعلق براہ راست تنظیم مملکت یا اختیارات حکومت سے ہے۔

اخلاق و مذہب سے تعلق۔ یوں تو انسانی علوم کو دو کیمپی ہوئی شقوں کے علاوہ بہت سی دوسری شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن میں سے ہر ایک

کا کچھ نہ کچھ تعلق سیاسیات سے ہونا ضروری ہے بلکہ بہ نظر اختصار اس وقت صرف
 اخلاق و مذہب سے جو واسطہ ہے اس کا بیان کافی ہو گا۔ ابتدائی معاشری حالت
 میں جب انتظام مملکت میں اتنی پیچیدگیاں نہ تھیں، اور جب انسان نسبتاً سادگی
 زندگی بسر کرتا تھا، اس وقت ان تینوں میں بہت ہی کم فرق سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی
 فعل کی سزا میں مجرم کے بھائی بند کا حقہ ہائی بند کر دیتے تھے، حکومت کی جانب سے
 کسی نہ کسی قسم کی جہائی سزا دی جاتی تھی اور اگر مجرم نے کفارہ نہ دیا ہو یا اقرار گناہ نہ
 کیا ہو یا تائب نہ ہوا ہو تو اسے طرح طرح کی روحانی سزائوں کا خوف دلایا جاتا
 تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ معاملات زندگی میں پیچیدگیاں بڑھتی گئیں اور انسان کے افعال
 کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر لیا گیا۔ بجائے اس کے کہ حکمران ہی سرگردہ معاشرہ اور مذہبی
 سردار ہو، اس کی حیثیت محض سیاسی رہ گئی اور زندگی کے دوسرے شعبوں پر اس کا
 کام صرف نمک لانی تک محدود ہو گیا۔ حال کے زمانہ میں سیاسی اثرات نے اس قدر
 ترقی کی ہے کہ نہ صرف سیاسی زندگی کی اصلاح کی غرض سے قوانین نافذ کئے جاتے
 ہیں بلکہ مذہب اور اخلاق تک میں سیاسیات نے دخل حاصل کر لیا ہے، چنانچہ شادی
 بیاہ کے قوانین جن کا تعلق کسی زمانے میں محض مذہب کے ساتھ تھا، اب رفتہ رفتہ
 حکومت کے زیر اثر آتے جاتے ہیں اور اخلاقی قواعد جن کی خلاف ورزی کی سزا صرف
 اس قدر ممکن تھی کہ معاشرہ ملزم سے کنارہ کشی اختیار کر لے، مدت دراز سے براہ راست
 سیاسی اثر سے متاثر ہو چکے ہیں۔



STATE

باب ۲

مملکت اور اُس کے ہم جنس ادارات

مملکت کے عناصر۔ آبادی۔ حاکم و محکوم۔ خود مختاری۔ تعالٰیٰ دہم کاری۔

مملکت کی تعریف۔ حکومت۔ قوم۔ ریاست اور غیر

عناصر مملکت۔ اور بیان کیا جا چکا ہے کہ سیاسیات میں ایک مخصوص معاشرہ کی ادارے یعنی مملکت کے تھیں، اس کے ارتقا، اس کی مختلف صورتوں، اس کے اُلٹا کاربئی حکومت و دیگر مسائل متعلقہ پر بحث کی جاتی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نفس مملکت کے مفہوم کو واضح کر دیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کے اور دوسرے ہم جنس ادارات جیسے معاشرہ انسانی، قوم، ملک اور حکومت کے مابین فرق ظاہر کر دیا جائے۔

آبادی۔ مملکت کی تعریف تقریباً ہر ایک سیاسی مفکر نے مختلف انداز سے کی ہے، لیکن ان تمام تعریفوں میں چند عناصر مشترک پائے جاتے ہیں اور اگر غور کیا جائے تو ان مفکرین کے تخیلات کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایک کثیر آبادی ہے۔ اس امر کا تعین ناممکن ہے کہ مملکت کی آبادی

کتنی ہونی چاہئے، اس لئے کہ تاریخ میں ایک طرف تو ایسی چھوٹی چھوٹی ملکوں کا ذکر آیا ہے جیسے یہ نان قدیم میں ایس اور دورس یا قدیم بنی اسرائیل کی مملکت کنعان، جن کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی، دوسری طرف چلیز دیمور کنشک اور اشوک اعظم کی عظیم الشان سلطنتیں پائی جاتی ہیں۔ زمانہ موجودہ میں بھی آبادی کی تعداد کا کوئی معیار نہیں، اور ہم انگلستان، وینچیم، برازیل، درکس، البانیہ اور ڈنمارک، سب کو بلا امتیاز ملکوں کا لقب دیتے ہیں۔ لیکن ہم انسانوں کے ایسے مجموعے کو مملکت کا لقب نہیں دیں گے جو کسی مخصوص رقبے میں نہ رہتے ہوں بلکہ دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر ہوں، خواہ ان میں کیسی ہی کچھ کیوں نہ پائی جاتی ہو۔ مثلاً باوجود بے حد کوشش کے اس وقت تک دنیا کا کوئی رقبہ آزاد یہودی قوم کے لئے مخصوص نہیں کیا جاسکا اور گویا یہودی خواہ کسی مملکت میں بود و باش رکھتے ہوں ان پر اکثر اپنے قوانین کا عملدرآمد ہوتا ہے لیکن انھیں مملکت نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس قسم کی سیاسی کیفیت میں مملکت کے دوسرے عناصر کا وجود ممکن ہو جائیگا۔ ایسے ملکوں کی مثال ضرور پائی جاتی ہے جس کے شہری منتشر ہوں لیکن ان سے وہ سیاسی تعلق قائم رکھنا چاہئے۔ مثلاً حال ہی (وسط ۱۹۳۳ء) میں جرمنی کے الحاق آسٹریا کے موقع پر نہ صرف جرمنی میں رہنے والے جرمنوں کی بلکہ ہر جرمن شہری کی خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں رہتا ہو لڑے لی گئی تھی۔ مگر اس میں اور یہودیوں کے مسئلے میں یہ فرق ہے کہ یہاں ایک باغابطہ رقبائی مملکت کا وجود ہے اور دل ایسا کوئی رقبہ نہیں جہاں یہودیوں نے ایک آزاد مملکت قائم کر لی ہو۔

حاکم و محکوم۔ مملکت کے قیام کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اول

تو ایک ایسی شخصیت جس کو یہ حق حاصل ہو کہ معاشرے کے افراد میں تنظیم قائم رکھنے کے لئے ایسے احکام صادر کرے جن پر کاربند ہونا ہر فرد اور ہر جماعت کا فرض ہو اور خلافت و رزی کی حالت میں ملزم کہ سزا بھی دے سکے۔ یہ شخصیت مفرد اور مرکب دونوں ہو سکتی ہے یعنی اس کا مرکز ایک شخص بھی ہو سکتا ہے اور بہت سے لوگوں کی جماعت بھی، چنانچہ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ کسی ملک کے باشندوں نے بلا خارجی توسط کے براہ راست مملکتیں قائم کر لیں اور آج کل کے زمانے میں بھی بہت سی ایسی مملکتیں ملیں گی جہاں رعایا براہ راست اپنے قائم مقاموں کے ذریعے سے حکومت کرتی ہے۔

خود مختاری۔ مملکت کے قیام کے لئے خود مختاری بھی ایک نہایت ضروری عنصر ہے۔ خود مختاری کی دو تئیں کی جاسکتی ہیں، ایک تو وہ صورت حال جس میں ملک ہر قسم کے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، یعنی نہ صرف اندرونی معاملات میں اسے پوری آزادی حاصل ہو بلکہ بین الاقوامی قوانین اور معاہدوں کے علاوہ خارجی معاملات میں وہ کسی بیرونی قوت کا پابند نہ ہو۔ عام طور پر مملکت ایسے ہی سیاسی ادارہ کو کہا جاتا ہے، لیکن آج کل کے زمانے میں بعض طاقتور ملکوں کی جبرِ ارضی کے باعث شاید یہی کوئی کمزور ملک ایسا رہے گا جس پر کوئی نہ کوئی خارجی پابندی عائد نہ کر دی گئی ہو کہ جس پر توجہ خارجی معاملات کسی بڑی سلطنت کے سپرد ہے، جیسے ہندوستانی ریاستیں، کہیں کسی مخصوص سیاسی اصول کے تحت کمزور ملک پر مختلف قسم کی بندشیں عائد کر دی گئی ہیں، جیسے مسقط، کویت اور زنجبار پر کہیں خارجی معاملات کے دائرہ کو چھوڑ کر ملک کے مالیات پر قبضہ کر لیا گیا ہے، جیسے چین، جاپان اور کہیں

اندرونی اور خارجی اختیارات دینے کے باوجود، فوج رکھ کر آزادی میں خلل ڈال گیا ہو جیسے مصر میں۔ غرض اگر ملک کا معیار یہی ہو کہ ملک کی اندرونی و خارجی آزادی نام نہ حاصل ہو تو علاوہ پانچ سات سلطنتوں کے اور کسی کو ملک نہیں کہا جاسکے گا۔ اس لئے بہ نظر سہولت علم سیاسیات کو مفید بنانے کی خاطر مناسب یہ ہے کہ لفظ ملک میں ان ممالک کو بھی شامل سمجھا جائے جن کو کم از کم اندرونی معاملات میں آزادی حاصل ہو۔

تعالیٰ و ہم کاری۔ ملک کے اہم ترین عناصر میں سے باشندگان ملک کے تعالیٰ اور ملک کی بہتری کی خواہش کو رکھنا چاہئے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کسی قسم کا اختلاف نہ ہو لیکن یہ اختلاف محض طرز کار کا ہونا چاہئے نہ کہ مقصد کا۔ تاہم آبادی کے جملہ افراد اس مسئلے پر متفق و متحد نہ ہو جائیں گے کہ ان کا سب سے بڑا دنیوی مقصد اپنی ملک کو فروغ دینا ہے اس وقت تک ملک کو استحکام نصیب نہ ہوگا بلکہ شاید اس کا قیام بھی ناممکن ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر اس احساس خدمت کے چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی ملک نہیں بن سکتا اور یہ احساس ہو تو پھر بڑے سے بڑا قہر بھی ملک بن جاتا ہے۔ افغانستان ایک چھوٹا سا ملک ہے، لیکن اس وقت اس کے باشندوں میں اپنے ملک کی خاطر ہر طرح کی قربانی کا جذبہ موجود ہے اور خواہ طرز کار کی بابت ان کی رائے کچھ بھی ہو، اصل مقصد سب کا ایک ہی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود ایسی طاقتور سلطنتوں کی ہمسائیگی کے جیسے برطانیہ اور روس، وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے ہوئے ہے۔ اور روس کا علاقہ جو دنیا کے ساتویں حصے پر حاوی ہے ایک ہی ملک بنا ہوا ہے۔

حکومت کی تعمیر و ترقی۔ مندرجہ بالا بیانات سے ملک کی اہمیت

ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک کی ایسی نظم سیاسی کیفیت کا نام ہے جو کسی مخصوص
جغرافیائی رقبے میں سکونت پذیر ہو جس میں حکم دیے والی ایک شخصیت موجود ہو
جس کے باشندوں میں ملک کی بہتری کی خاطر لغال اور ہم کاری کا احساس موجود ہو
اور جسے کم از کم اپنے اندرونی حالات کے انصرام و انتظام پر معمولاً قدرت حاصل ہو
GOVT. حکومت - اس سے معلوم ہوا کہ ملک دراصل انسانوں کی ایک منظم
جماعت کا نام ہے جو سیاسی رشتے میں منسلک ہو گئے ہوں، نیز یہ بھی ظاہر ہو گیا
کہ نہ صرف آج کل کے زمانے میں جب مملکتوں کے حدود وسیع سے وسیع تر ہو رہے
ہیں بلکہ لوہان کی شہری مملکتوں میں بھی باشندوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انتظام
مملکت ہر جگہ ایک نقطہ مختصر جماعت کے سپرد کر دینا پڑتا تھا۔ اسی لئے مملکت
کا ایک جزو لا ینفک یہ ہے کہ باشندوں کے آپس میں حاکم و محکوم کے تعلقات
پیدا ہو جائیں اور حکومت اس کل کا نام ہے جس کے ذریعے سے ملک کے کاروبار
انجام کو پہنچتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا معاملہ ہے کہ حکومت کو بعض مرتبہ تمام
ملک پر حاوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ ملک اور حکومت کا وہی رشتہ ہے جو اقا اور
ملازم کا ہے جس طرح آقا اپنے ملازم کو تبدیل کر سکتا ہے اور ملازم کی علیحدگی کی وجہ
سے اس کی ہیئت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں پیدا ہوتی اسی طرح حکومتیں اپنی ریتی
ہیں مگر ملک اس وقت تک مسلسل قائم رہتی ہے جب تک وہ نظم اور حکم و ضبط خود
مختار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ایسے ملک میں جہاں موروثی بادشاہ کی حکمرانی ہو
بادشاہ مرتبہ تو اس کے دلی عہد کے اعلان جانشینی سے پیشتر ہی فوراً اس کو
حکمران تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ بادشاہ کوئی ہو، وزیر کوئی ہو، یا رینٹ شیفٹ کری ہو

یا بر خاست ہو گئی ہو، ملک کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا اور اگر ملک کے لازمی عناصر مثلاً تنظیم، مستقل آبادی، باشندوں کا باہمی تعامل اور آزادی قائم رہی اور طرز حکومت بدل جائے، یعنی بادشاہی سے جمہوریت یا جمہوریت سے دستوری بادشاہی ہو جائے تو بھی ملک برابر قائم رہتی ہے۔

قوم۔ ملک کو ایک اور ادارہ سے میٹر کرنا ضروری ہے۔ آج کل تقریباً ہر ایک حصہ دنیا میں سب سے زیادہ جس سیاسی اصطلاح کی آواز کالوں میں گونجتی ہے وہ لفظ قوم ہے، لیکن یہ بات عجیب ہے کہ گو مشرق میں بھی ہر ایک شخص قوم، قوم بکاڑا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مغرب میں بھی معاملات ”قومی“ اثر سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن مشکل سے دو ممالک کے باشندے ایسے ہوں گے جو اس لفظ کے ایک ہی معنی سمجھتے ہوں۔ آج کل کے زمانہ میں ایک طرف ایٹکلو میکسن قوم میں نہ صرف انگلستان، ممالک متحدہ امریکہ اور آسٹریلیا کے باشندے شامل سمجھے جاتے ہیں، بلکہ جنوبی افریقہ کے ”دولندیزی“، کیناڈا کے ”فرانسیسی“، ویکٹور کے ”کلت“ اور سکاٹ لینڈ کے ”مکب النسل“ باشندے بھی ایٹکلو میکسن قومیت کے مصنوعی معیار پر پورے اترتے ہیں۔ فرانسیسی قوم میں صرف وہ افراد شامل سمجھے جاتے ہیں جو جمہوریہ فرانس کے تحت اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، لیکن مشرقی بحیم کے ”والون“ اور مغربی سوئزرستان کے ”فرانسیسی“ بولنے والے اس زمرے میں شمار نہیں کئے جاتے۔ بعض مرتبہ تو قوم اور قومیت کی وجہ سے ملک کے ملک غیر آباد ہو گئے ہیں، مثلاً صلیح نامہ لوزان کی رد سے یہ قرار پایا کہ قسطنطنیہ کے یونانی بولنے والے باشندوں کے علاوہ جمہوریہ ترکیہ کے تمام یونانیوں کو یونان کے تمام ترکوں سے تبدیل کر لیا جائے اور اس سے جو صعوبتیں

اور مشکلات اٹھانی پڑی ہوں گی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ نیز حال ہی میں ترکی نے اعلان کیا ہے کہ وہ بلغاریہ اور رومانیہ کے ترکی آنے والے مسلمانوں کو (جو فی الواقع ترکی نسل ہیں) ترک وطن کر کے ترکی میں آباد ہونے کے لئے آماسیاں بہم پہنچائیگی۔ بہر حال مغربی اعتبار سے ایک عام میلان معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہم نسل افراد کو ایک ملک میں شامل کر لیا جائے اور اس میلان کا شاید سب سے اہم اور متنازع مظاہرہ وہ ہے جس کے بموجب نازی جرمنی سے یہودی صرف اس بنا پر ملک بدر کئے جا رہے ہیں کہ وہ "نسلاً" "آریہ" جرمنوں سے مختلف ہیں۔

تین ایسی مثالیں کم یا ب نہیں کہ ایک ہی بنیادی قوم کے مختلف مجبوروں نے مختلف ممالک میں آباد ہو کر اپنی اپنی ملکیتیں قائم کر لی ہوں اور ان میں ایسا شخص پیدا ہو گیا ہو کہ ہر ملک کے باشندے اپنی قوم علیحدہ علیحدہ تصور کرنے لگے ہوں۔ برازیل اور ترکی کے باشندے کچھ نسل، ہم زبان، اور ہم مذہب ہیں اور برازیل کسی نسل کے ہیں پرتگالی ہی کی نوآبادی تھی، دونوں کی روایات یکساں ہیں، لیکن برازیل کی

نہ نازی جرمنی کے مؤسس اور رہنما "ہٹلر کی کتاب" "میری جدوجہد" *Mein Kampf* میں اس اصول کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے "نسبت" کے اس لفظ نظر کو خود ہٹلر کے الفاظ میں رسالہ "دنیا کا نسلی تخیل" *Racial Conception of the World* میں دکھایا گیا ہے جو جداگانہ "نہن" "محبان یورپ" *Friends of Europe Society* نے طبع کی ہے۔ نیز دیکھو باب ۵، پارہ ۲۔

ملکت بالکل جداگانہ ہے اور آج یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پرگنائی اور بآزائی "ہم قوم" ہیں۔ یہی کیفیت ان اقوام کی ہے جو جنوبی امریکہ کے مختلف حصوں میں آباد ہیں اور باوجود یکہ ان کے رسم و رواج، زبان اور مذہب ایک سے ہیں لیکن وہ محض اپنی جداگانہ انفرادی حیثیت کی وجہ سے متحد نہیں ہوتے۔ اسی طرح ایسے بھی ممالک ہیں جہاں متعددسانی مجموعے دوش بدوش آباد ہیں اور ہر ایک اپنی انفرادی حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہیں، جیسے بھیم میں داؤن اور فلپائنک سویٹستان میں جرمن، فرانسیسی اور اطالوی۔

اب مشرق کی طرف آئیے، جہاں مغرب میں عموماً قوم کے معنی ہم نسل افراد کے مجموعہ کے لئے جاتے ہیں، وہاں ہندوستان میں قوم سے مراد ہم مذہب افراد سے ہوتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مسلمان ہیں ان کا صرف بارہواں حصہ ابتدائی غیر ممالک سے آکر یہاں آباد ہوا ہوگا اور اس قلیل تعداد میں سے شاید نصف بھی ایسے نہ نکلیں جن کے اجداد اپنی عورتوں سمیت یہاں آئے ہوں، لیکن چونکہ بظاہر ان تمدن جداگانہ نے اس لئے مجموعی حیثیت سے مسلمان ایک "قوم" سمجھے جاتے ہیں یہی کیفیت اس ملک کے عیسائیوں، سکھوں اور دیگر اقوام کی ہے۔
چند سال پیشتر تک مشرقی دنیا کے تقریباً ہر ملک کے باشندوں کی تقسیم کشم

۱۰
۱۱
۱۲
۱۳
۱۴
۱۵
۱۶
۱۷
۱۸
۱۹
۲۰
۲۱
۲۲
۲۳
۲۴
۲۵
۲۶
۲۷
۲۸
۲۹
۳۰
۳۱
۳۲
۳۳
۳۴
۳۵
۳۶
۳۷
۳۸
۳۹
۴۰
۴۱
۴۲
۴۳
۴۴
۴۵
۴۶
۴۷
۴۸
۴۹
۵۰
۵۱
۵۲
۵۳
۵۴
۵۵
۵۶
۵۷
۵۸
۵۹
۶۰
۶۱
۶۲
۶۳
۶۴
۶۵
۶۶
۶۷
۶۸
۶۹
۷۰
۷۱
۷۲
۷۳
۷۴
۷۵
۷۶
۷۷
۷۸
۷۹
۸۰
۸۱
۸۲
۸۳
۸۴
۸۵
۸۶
۸۷
۸۸
۸۹
۹۰
۹۱
۹۲
۹۳
۹۴
۹۵
۹۶
۹۷
۹۸
۹۹
۱۰۰
۱۰۱
۱۰۲
۱۰۳
۱۰۴
۱۰۵
۱۰۶
۱۰۷
۱۰۸
۱۰۹
۱۱۰
۱۱۱
۱۱۲
۱۱۳
۱۱۴
۱۱۵
۱۱۶
۱۱۷
۱۱۸
۱۱۹
۱۲۰
۱۲۱
۱۲۲
۱۲۳
۱۲۴
۱۲۵
۱۲۶
۱۲۷
۱۲۸
۱۲۹
۱۳۰
۱۳۱
۱۳۲
۱۳۳
۱۳۴
۱۳۵
۱۳۶
۱۳۷
۱۳۸
۱۳۹
۱۴۰
۱۴۱
۱۴۲
۱۴۳
۱۴۴
۱۴۵
۱۴۶
۱۴۷
۱۴۸
۱۴۹
۱۵۰
۱۵۱
۱۵۲
۱۵۳
۱۵۴
۱۵۵
۱۵۶
۱۵۷
۱۵۸
۱۵۹
۱۶۰
۱۶۱
۱۶۲
۱۶۳
۱۶۴
۱۶۵
۱۶۶
۱۶۷
۱۶۸
۱۶۹
۱۷۰
۱۷۱
۱۷۲
۱۷۳
۱۷۴
۱۷۵
۱۷۶
۱۷۷
۱۷۸
۱۷۹
۱۸۰
۱۸۱
۱۸۲
۱۸۳
۱۸۴
۱۸۵
۱۸۶
۱۸۷
۱۸۸
۱۸۹
۱۹۰
۱۹۱
۱۹۲
۱۹۳
۱۹۴
۱۹۵
۱۹۶
۱۹۷
۱۹۸
۱۹۹
۲۰۰
۲۰۱
۲۰۲
۲۰۳
۲۰۴
۲۰۵
۲۰۶
۲۰۷
۲۰۸
۲۰۹
۲۱۰
۲۱۱
۲۱۲
۲۱۳
۲۱۴
۲۱۵
۲۱۶
۲۱۷
۲۱۸
۲۱۹
۲۲۰
۲۲۱
۲۲۲
۲۲۳
۲۲۴
۲۲۵
۲۲۶
۲۲۷
۲۲۸
۲۲۹
۲۳۰
۲۳۱
۲۳۲
۲۳۳
۲۳۴
۲۳۵
۲۳۶
۲۳۷
۲۳۸
۲۳۹
۲۴۰
۲۴۱
۲۴۲
۲۴۳
۲۴۴
۲۴۵
۲۴۶
۲۴۷
۲۴۸
۲۴۹
۲۵۰
۲۵۱
۲۵۲
۲۵۳
۲۵۴
۲۵۵
۲۵۶
۲۵۷
۲۵۸
۲۵۹
۲۶۰
۲۶۱
۲۶۲
۲۶۳
۲۶۴
۲۶۵
۲۶۶
۲۶۷
۲۶۸
۲۶۹
۲۷۰
۲۷۱
۲۷۲
۲۷۳
۲۷۴
۲۷۵
۲۷۶
۲۷۷
۲۷۸
۲۷۹
۲۸۰
۲۸۱
۲۸۲
۲۸۳
۲۸۴
۲۸۵
۲۸۶
۲۸۷
۲۸۸
۲۸۹
۲۹۰
۲۹۱
۲۹۲
۲۹۳
۲۹۴
۲۹۵
۲۹۶
۲۹۷
۲۹۸
۲۹۹
۳۰۰
۳۰۱
۳۰۲
۳۰۳
۳۰۴
۳۰۵
۳۰۶
۳۰۷
۳۰۸
۳۰۹
۳۱۰
۳۱۱
۳۱۲
۳۱۳
۳۱۴
۳۱۵
۳۱۶
۳۱۷
۳۱۸
۳۱۹
۳۲۰
۳۲۱
۳۲۲
۳۲۳
۳۲۴
۳۲۵
۳۲۶
۳۲۷
۳۲۸
۳۲۹
۳۳۰
۳۳۱
۳۳۲
۳۳۳
۳۳۴
۳۳۵
۳۳۶
۳۳۷
۳۳۸
۳۳۹
۳۴۰
۳۴۱
۳۴۲
۳۴۳
۳۴۴
۳۴۵
۳۴۶
۳۴۷
۳۴۸
۳۴۹
۳۵۰
۳۵۱
۳۵۲
۳۵۳
۳۵۴
۳۵۵
۳۵۶
۳۵۷
۳۵۸
۳۵۹
۳۶۰
۳۶۱
۳۶۲
۳۶۳
۳۶۴
۳۶۵
۳۶۶
۳۶۷
۳۶۸
۳۶۹
۳۷۰
۳۷۱
۳۷۲
۳۷۳
۳۷۴
۳۷۵
۳۷۶
۳۷۷
۳۷۸
۳۷۹
۳۸۰
۳۸۱
۳۸۲
۳۸۳
۳۸۴
۳۸۵
۳۸۶
۳۸۷
۳۸۸
۳۸۹
۳۹۰
۳۹۱
۳۹۲
۳۹۳
۳۹۴
۳۹۵
۳۹۶
۳۹۷
۳۹۸
۳۹۹
۴۰۰
۴۰۱
۴۰۲
۴۰۳
۴۰۴
۴۰۵
۴۰۶
۴۰۷
۴۰۸
۴۰۹
۴۱۰
۴۱۱
۴۱۲
۴۱۳
۴۱۴
۴۱۵
۴۱۶
۴۱۷
۴۱۸
۴۱۹
۴۲۰
۴۲۱
۴۲۲
۴۲۳
۴۲۴
۴۲۵
۴۲۶
۴۲۷
۴۲۸
۴۲۹
۴۳۰
۴۳۱
۴۳۲
۴۳۳
۴۳۴
۴۳۵
۴۳۶
۴۳۷
۴۳۸
۴۳۹
۴۴۰
۴۴۱
۴۴۲
۴۴۳
۴۴۴
۴۴۵
۴۴۶
۴۴۷
۴۴۸
۴۴۹
۴۵۰
۴۵۱
۴۵۲
۴۵۳
۴۵۴
۴۵۵
۴۵۶
۴۵۷
۴۵۸
۴۵۹
۴۶۰
۴۶۱
۴۶۲
۴۶۳
۴۶۴
۴۶۵
۴۶۶
۴۶۷
۴۶۸
۴۶۹
۴۷۰
۴۷۱
۴۷۲
۴۷۳
۴۷۴
۴۷۵
۴۷۶
۴۷۷
۴۷۸
۴۷۹
۴۸۰
۴۸۱
۴۸۲
۴۸۳
۴۸۴
۴۸۵
۴۸۶
۴۸۷
۴۸۸
۴۸۹
۴۹۰
۴۹۱
۴۹۲
۴۹۳
۴۹۴
۴۹۵
۴۹۶
۴۹۷
۴۹۸
۴۹۹
۵۰۰
۵۰۱
۵۰۲
۵۰۳
۵۰۴
۵۰۵
۵۰۶
۵۰۷
۵۰۸
۵۰۹
۵۱۰
۵۱۱
۵۱۲
۵۱۳
۵۱۴
۵۱۵
۵۱۶
۵۱۷
۵۱۸
۵۱۹
۵۲۰
۵۲۱
۵۲۲
۵۲۳
۵۲۴
۵۲۵
۵۲۶
۵۲۷
۵۲۸
۵۲۹
۵۳۰
۵۳۱
۵۳۲
۵۳۳
۵۳۴
۵۳۵
۵۳۶
۵۳۷
۵۳۸
۵۳۹
۵۴۰
۵۴۱
۵۴۲
۵۴۳
۵۴۴
۵۴۵
۵۴۶
۵۴۷
۵۴۸
۵۴۹
۵۵۰
۵۵۱
۵۵۲
۵۵۳
۵۵۴
۵۵۵
۵۵۶
۵۵۷
۵۵۸
۵۵۹
۵۶۰
۵۶۱
۵۶۲
۵۶۳
۵۶۴
۵۶۵
۵۶۶
۵۶۷
۵۶۸
۵۶۹
۵۷۰
۵۷۱
۵۷۲
۵۷۳
۵۷۴
۵۷۵
۵۷۶
۵۷۷
۵۷۸
۵۷۹
۵۸۰
۵۸۱
۵۸۲
۵۸۳
۵۸۴
۵۸۵
۵۸۶
۵۸۷
۵۸۸
۵۸۹
۵۹۰
۵۹۱
۵۹۲
۵۹۳
۵۹۴
۵۹۵
۵۹۶
۵۹۷
۵۹۸
۵۹۹
۶۰۰
۶۰۱
۶۰۲
۶۰۳
۶۰۴
۶۰۵
۶۰۶
۶۰۷
۶۰۸
۶۰۹
۶۱۰
۶۱۱
۶۱۲
۶۱۳
۶۱۴
۶۱۵
۶۱۶
۶۱۷
۶۱۸
۶۱۹
۶۲۰
۶۲۱
۶۲۲
۶۲۳
۶۲۴
۶۲۵
۶۲۶
۶۲۷
۶۲۸
۶۲۹
۶۳۰
۶۳۱
۶۳۲
۶۳۳
۶۳۴
۶۳۵
۶۳۶
۶۳۷
۶۳۸
۶۳۹
۶۴۰
۶۴۱
۶۴۲
۶۴۳
۶۴۴
۶۴۵
۶۴۶
۶۴۷
۶۴۸
۶۴۹
۶۵۰
۶۵۱
۶۵۲
۶۵۳
۶۵۴
۶۵۵
۶۵۶
۶۵۷
۶۵۸
۶۵۹
۶۶۰
۶۶۱
۶۶۲
۶۶۳
۶۶۴
۶۶۵
۶۶۶
۶۶۷
۶۶۸
۶۶۹
۶۷۰
۶۷۱
۶۷۲
۶۷۳
۶۷۴
۶۷۵
۶۷۶
۶۷۷
۶۷۸
۶۷۹
۶۸۰
۶۸۱
۶۸۲
۶۸۳
۶۸۴
۶۸۵
۶۸۶
۶۸۷
۶۸۸
۶۸۹
۶۹۰
۶۹۱
۶۹۲
۶۹۳
۶۹۴
۶۹۵
۶۹۶
۶۹۷
۶۹۸
۶۹۹
۷۰۰
۷۰۱
۷۰۲
۷۰۳
۷۰۴
۷۰۵
۷۰۶
۷۰۷
۷۰۸
۷۰۹
۷۱۰
۷۱۱
۷۱۲
۷۱۳
۷۱۴
۷۱۵
۷۱۶
۷۱۷
۷۱۸
۷۱۹
۷۲۰
۷۲۱
۷۲۲
۷۲۳
۷۲۴
۷۲۵
۷۲۶
۷۲۷
۷۲۸
۷۲۹
۷۳۰
۷۳۱
۷۳۲
۷۳۳
۷۳۴
۷۳۵
۷۳۶
۷۳۷
۷۳۸
۷۳۹
۷۴۰
۷۴۱
۷۴۲
۷۴۳
۷۴۴
۷۴۵
۷۴۶
۷۴۷
۷۴۸
۷۴۹
۷۵۰
۷۵۱
۷۵۲
۷۵۳
۷۵۴
۷۵۵
۷۵۶
۷۵۷
۷۵۸
۷۵۹
۷۶۰
۷۶۱
۷۶۲
۷۶۳
۷۶۴
۷۶۵
۷۶۶
۷۶۷
۷۶۸
۷۶۹
۷۷۰
۷۷۱
۷۷۲
۷۷۳
۷۷۴
۷۷۵
۷۷۶
۷۷۷
۷۷۸
۷۷۹
۷۸۰
۷۸۱
۷۸۲
۷۸۳
۷۸۴
۷۸۵
۷۸۶
۷۸۷
۷۸۸
۷۸۹
۷۹۰
۷۹۱
۷۹۲
۷۹۳
۷۹۴
۷۹۵
۷۹۶
۷۹۷
۷۹۸
۷۹۹
۸۰۰
۸۰۱
۸۰۲
۸۰۳
۸۰۴
۸۰۵
۸۰۶
۸۰۷
۸۰۸
۸۰۹
۸۱۰
۸۱۱
۸۱۲
۸۱۳
۸۱۴
۸۱۵
۸۱۶
۸۱۷
۸۱۸
۸۱۹
۸۲۰
۸۲۱
۸۲۲
۸۲۳
۸۲۴
۸۲۵
۸۲۶
۸۲۷
۸۲۸
۸۲۹
۸۳۰
۸۳۱
۸۳۲
۸۳۳
۸۳۴
۸۳۵
۸۳۶
۸۳۷
۸۳۸
۸۳۹
۸۴۰
۸۴۱
۸۴۲
۸۴۳
۸۴۴
۸۴۵
۸۴۶
۸۴۷
۸۴۸
۸۴۹
۸۵۰
۸۵۱
۸۵۲
۸۵۳
۸۵۴
۸۵۵
۸۵۶
۸۵۷
۸۵۸
۸۵۹
۸۶۰
۸۶۱
۸۶۲
۸۶۳
۸۶۴
۸۶۵
۸۶۶
۸۶۷
۸۶۸
۸۶۹
۸۷۰
۸۷۱
۸۷۲
۸۷۳
۸۷۴
۸۷۵
۸۷۶
۸۷۷
۸۷۸
۸۷۹
۸۸۰
۸۸۱
۸۸۲
۸۸۳
۸۸۴
۸۸۵
۸۸۶
۸۸۷
۸۸۸
۸۸۹
۸۹۰
۸۹۱
۸۹۲
۸۹۳
۸۹۴
۸۹۵
۸۹۶
۸۹۷
۸۹۸
۸۹۹
۹۰۰
۹۰۱
۹۰۲
۹۰۳
۹۰۴
۹۰۵
۹۰۶
۹۰۷
۹۰۸
۹۰۹
۹۱۰
۹۱۱
۹۱۲
۹۱۳
۹۱۴
۹۱۵
۹۱۶
۹۱۷
۹۱۸
۹۱۹
۹۲۰
۹۲۱
۹۲۲
۹۲۳
۹۲۴
۹۲۵
۹۲۶
۹۲۷
۹۲۸
۹۲۹
۹۳۰
۹۳۱
۹۳۲
۹۳۳
۹۳۴
۹۳۵
۹۳۶
۹۳۷
۹۳۸
۹۳۹
۹۴۰
۹۴۱
۹۴۲
۹۴۳
۹۴۴
۹۴۵
۹۴۶
۹۴۷
۹۴۸
۹۴۹
۹۵۰
۹۵۱
۹۵۲
۹۵۳
۹۵۴
۹۵۵
۹۵۶
۹۵۷
۹۵۸
۹۵۹
۹۶۰
۹۶۱
۹۶۲
۹۶۳
۹۶۴
۹۶۵
۹۶۶
۹۶۷
۹۶۸
۹۶۹
۹۷۰
۹۷۱
۹۷۲
۹۷۳
۹۷۴
۹۷۵
۹۷۶
۹۷۷
۹۷۸
۹۷۹
۹۸۰
۹۸۱
۹۸۲
۹۸۳
۹۸۴
۹۸۵
۹۸۶
۹۸۷
۹۸۸
۹۸۹
۹۹۰
۹۹۱
۹۹۲
۹۹۳
۹۹۴
۹۹۵
۹۹۶
۹۹۷
۹۹۸
۹۹۹
۱۰۰۰

اسی اصول پر کی جاتی تھی، چنانچہ جب ۱۹۴۷ء میں ملک چین میں جمہوریت قائم ہوئی تو وہاں کے علم پر ملک کی پانچ ممتاز اقوام کے لئے ایک ایک رنگ رکھا گیا، لیکن پچھلی جنگ عظیم کے بعد مغربی ایشیا میں جو لہلہ پیدا ہوئی یعنی ترکی میں جمہوریہ قائم کیا گیا، اور ایران میں خاندان قاجار ہمیشہ کے لئے تخت سے محروم کیا گیا تو ساتھ ساتھ ان ممالک میں بھی کم و بیش مغربی طرز کی قوم کا تخیل پیدا ہو گیا، جس کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ یہ ہے کہ ہندوستان کے پارسی یہ کہہ کر شکر ہے ہیں کہ ان کے ”ہم قوموں“ یعنی ایرانیوں اور خروان کے درمیان ربط و اتحاد بڑھ جائے۔ اسی طرح فلسطین کے باشندوں کی جو فریق بندی کی گئی ہے اس میں عربی بولنے والے فلسطینی، خواہ وہ عیسائی ہوں یا مسلمان، ایک طرف نظر آتے ہیں، اور عبرانی بولنے والے یہودی دوسری طرف۔

اسلام نے جیسے دوسرے دنیوی معاملات میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا اسی طرح سیاسیات میں بھی بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے، قرآن مجید کا مخاطب کسی خاص گروہ کی طرف نہیں بلکہ نبی نور انسان کی طرف ہے، اور اس میں صریحاً لکھا ہے کہ جہاں بھی کھم اور قبیلے ہیں ان کا مقصد صرف ایک کو دوسرے سے پہچاننا ہے، ورنہ ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان جو اصلی فرق ہے وہ محض کردار کا ہے نہ کہ حسب نسب کا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ ذَكَرٍ أَنْتُمْ وَجُحُكُمْ شَوْجَرًا وَقَبَالٍ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلٍ مُبَارَكَةٍ
عَنْدَ اللَّهِ أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلٍ مُبَارَكَةٍ (قرآن مجید سورہ ۴۹، آیت ۱۳)

ریاست اور قلمرو۔ ملکت کو ایک اور ادارہ یعنی ریاست سے ممیز کرنا چاہئے۔ جیسے تو ”ریاست“ کے لغوی معنی ایک ایسے مجموعہ افراد کے ہیں جن کا کوئی سرگروہ یا رئیس ہو، لیکن سیاسی اصطلاح میں اس لفظ کا انطباق عام طور سے آزاد ملکوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے، دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی طاقتور سلطنت کا اثر ہے، اور ان پر سلطنت براہ راست حکومت نہیں کرتی، بلکہ اپنی سہولت کی غرض سے اس نے اکثر اندرونی انتظامات کو دہیں کے مقامی حکمرانوں پر چھوڑ رکھا ہے۔ علاوہ انہی دنیا میں ایسے بھی ممالک ہیں جن پر خواہ جغرافی و وسعت کے سبب سے خواہ تاریخی تنوع کے لحاظ سے، براہ راست حکومت نہیں کی جاتی، بلکہ چند اختیارات جو ملک کو متحدہ اور طاقتور رکھنے کے لئے ضروری ہوں، مرکزی حکومت کے سپرد کر دئے جاتے ہیں، اور ایسے اختیارات جن کا تعلق انفرادی بود و ماند سے ہو، مقامی ادارت کے قبضہ میں رہنے دئے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ قاعدہ بنادیا جاتا ہے کہ مرکزی حکومت کو ان اختیارات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ان دونوں قسم کے ادارات کو، یعنی جہاں کہیں بیرونی ذی اقتدار سلطنت نے اندرونی انتظامات کسی مقامی حاکم کے قبضہ میں رہنے دئے ہوں، یا ملک کے مختلف حصوں کے اختلاف روایات کے باعث انھیں بعض شعبہ جات حکومت میں مختار کی بنا دیا گیا ہو اور دوسرے شعبے کسی مرکزی حکومت کے سپرد کر لئے گئے ہوں، سیاسی اصطلاح میں ”ریاست“ کہتے ہیں۔ اول الذکر قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ہندوستانی ریاستیں ہیں اور دوسری قسم کی ریاستوں کی بہترین مثال ممالک

متحدہ امریکہ، برازیل اور روس کی منفرد ریاستیں ہیں، جہاں اکثر اندرونی اختیارات ریاستی حکومتوں کو حاصل ہیں اور مرکزی حکومت صرف ایسے اختیارات پر قیامت کرتی ہے جو ملک کی عظمت و اقتدار کے اجزائے لاینفک ہوں۔ بہر حال اگر ہم ملکیت میں ایسے انسانی مجموعوں کا شمار کریں جن کو اندرونی اختیارات تمامہ حاصل ہوں پھر بھی ریاستوں سے ان کی تفریق کر دینا مناسب ہو گا۔ آزاد ممالک کے مختلف اجزاء کو تو کسی حالت و صورت میں ملکیت کا لقب نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ عام طور پر بہت سے داخلی معاملات پر بھی مرکزی حکومت حاوی ہوتی ہے، جیسے سکہ سازی، شاہراہیں اور قومی ریلوں کا انتظام، بعض محاصل عائد کرنے کا اختیار وغیرہ، اب رہا ماتحت علاقوں کا سوال، یہاں غور طلب یہ امر ہے کہ آیا ذی اقتدار سلطنت غیر ملکی حصے اپنی سہولت کی خاطر ان رقبوں کے قبضے میں اندرونی اختیارات چھوڑ دے، یا ملک کی رفتار آزادی کی جانب ہے اور ان اختیارات سے ان غیر سلطنت کو مجبوراً دست بردار ہونا پڑا ہے۔ ہندوستان کی اکثر و بیشتر ریاستوں کو ملکیت کا لقب نہیں دیا جاسکتا، اس لئے کہ جس طرح خارجی معاملات میں ان پر قیود عائد ہیں اسی طرح اندرونی معاملات میں بھی اگر بلا دست سلطنت چاہے تو ان پر دباؤ ڈال سکتی ہے، بلکہ بعض حالات میں شاید رئیس کو تخت سے بھی ہٹا کر سکتی ہے، گویا جہاں تک ایسی ریاستوں کا تعلق ہے، بلا دست سلطنت اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے اختیارات پر حاوی ہوتی ہے۔

قلمرو کی حیثیت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ قلمرو میں دراصل وہ علاقے ہیں جو کسی زمانے میں کسی زبردست ملک کے پوری طور سے دست نگہداشت تھے بلکہ جنہیں

امتدادِ زمانہ سے خود مختاری اور ایک حد تک خارجی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ ایسی قلمروں کی مثالیں سلطنتِ برطانیہ میں ملتی ہیں، جسے اب اسی مناسبت سے ”برطانوی دولتِ عامہ اقوام“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اب بھی برطانیہ کو جنوبی افریقہ، کینا ڈا اور آپرستان میں کسی قسم کے ”قانونی“ اختیارات بھی حاصل ہوں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کے لئے ان اختیارات کو کام میں لانا خارج از امکان اور خارج از بحث ہے اور آپرستان کی حال کی تاریخ سے یہ امر پوری طرح سے واضح ہو گیا ہے کہ قلمرو کچھ بھی کرے، برطانوی حکومت دخل نہ دے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ کا بھی جو اختیار ان قلمروں کے معاملات پر رہ گیا ہے اس کی بنیاد سلطنت کی سمولت پر نہیں بلکہ خود ان قلمروں کی خوشی پر ہے، اس لئے کہ وہ بالفعل اس کے لئے تیار ہیں کہ ایسے معاملات سے جیسے بحری مداخلت، خارجی امور وغیرہ ہیں، اپنے آپ کو بالکل انکسٹان سے آزاد کر لیں۔ ایسے ترقی یافتہ سیاسی بھروسوں کو، مملکت کا لقب دینا یقیناً غلط بیانی نہ ہوگی۔

۱۹۳۳ء کی روئے برطانیہ کو اپنی قلمرو پر قانونی دباؤ کا حق باقی نہیں رہا۔
قلمروں کی تفصیلی کیفیات کے لئے دیکھو باب ۲۰

ORIGIN OF THE STATE

باب ۳

تنظیم مملکت کا آغاز اور اس کا ارتقا

تنظیم مملکت - ہندی نظریہ - چینی نظریہ - اسلامی نظریہ - یورپی نظریہ - ہوبز - لاک - ڈیوٹو۔
ان نظریوں کا مشترک عنصر، اصول معاہدہ معاشری کی تنفیذ - نظریہ تخلیق ربانی - پدمری اور دیگر
اقتدار کا نظریہ - نظریہ جبر حقیقی ارتقاء مملکت -

تنظیم مملکت - علامہ ابن خلدون نے اپنی مشہور آفاق تاریخ کے مقدمہ
میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت تمام دنیوی خیرات و حسنات کا مجموعہ اور نفسانی و
جسمانی امیدوں اور آرزوں کی غایت الغایات ہے۔ مملکت کے حقیقی مقاصد پر آئندہ
بحث کی جائے گی؛ اس وقت یہ بتادینا کافی ہے کہ ابن خلدون نے جو اسے
اتنا گراں بہا اور بربا ہے تو اس کا اسی سبب مملکت کی تنظیم کیفیت معلوم ہوتی
ہے جو اس کا جزو لاینفک اور اس کی عظمت کی گویا جان ہے۔ نظام پر معلوم ہوتا
ہے کہ مملکت کی تنظیم کبھی یہ کبھی ضرور عمل میں آتی ہوگی اور معاشرہ انسانی پر ایک

۱۔ مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم، فصل اول۔

۲۵ دیکھو آئندہ باب ۱۱۔

زمانہ ضرور ایسا گذرا ہوگا جب اس میں سیاسی کیفیات پیدا نہیں ہوتی تھیں، یعنی جب حاکم و محکوم کے تعلقات کا وجود نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ذائد از دو ہزار سال سے مشرق اور مغرب کے سیاسی مختلف واقعات کو پیش نظر رکھ کر ان کیفیات کو از سر نو مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو مملکت کی تنظیم سے بیشتر معاشرہ انسانی کی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب شخص نظریات پر مشتمل ہے اور شاید تاریخ میں کسی ایسے انسانی معاشرہ کا ذکر نہیں ہے جس میں سیاسی تحلیل کا کلیتہً فقدان ہو۔

ہندی نظریے۔ تحلیل مملکت کے آغاز کے متعلق شاید سب سے پہلے نظریہ کا ذکر جو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا، بودھ مت کی کتابوں میں ملتا ہے۔ دیکھ چکاتے ہیں لکھا ہے کہ مہاتما گوتم بدھ نے کسی کے سوال کے جواب میں یہ کہا کہ ابتدا میں انسان کی حالت بالکل مکمل تھی اور رنج و فکر کا پتہ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ فائدان قایم ہو گئے، ذاتی ملک کا رواج ہو گیا، قوم چاروںوں میں تقسیم ہو گئی، لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا اور اس کی ضرورت پیش آئی کہ کسی نہ کسی طرح سے زیادتیوں اور ظلم و ستم کا انہدام کیا جائے۔ ان فرض تمام لوگ کبھی جمع ہوئے اور انہوں نے یہ طے کیا کہ ان زیادتیوں کا انہدام اسی وقت ممکن ہے جب ایک ایسا حکمران منتخب کیا جائے جو ملزموں کو سزا دے، دشمنوں میں لڑائی جھگڑا ہو تو ان کا فیصلہ کرے اور ملک میں امن و امان قایم رکھے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی جماعت میں سے سب سے خوب رہے، سب سے نیتیں اور سب سے طاقتور شخص کو ایسا حکمران منتخب کیا اور اس سے یہ معاہدہ کیا کہ اگر وہ فرض منصبی ادا کرے تو اسے ایک مقررہ مشاہرہ دیا

جائے گا۔

اس کے بعد جو نظریہ ہندوستان کے سیاسی میدان میں سب سے متاثر ہے وہ کولتیا کا نظریہ ہے جس کے مطابق مملکت سے بیشتر بالکل زراعت کی سی کیفیت تھی، اس دامنِ مفقود تھا، ہر شخص دوسرے کی ایذا رسانی اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے پر تیار ہوا تھا اور انسانی جموعوں کی مجسمہ دہی کیفیت تھی جو سمندر کی پھلیوں کی ہوتی ہے یعنی ہر زبردست شخص اپنی خواہشات کی تکمیل کے درپے تھا اور جس طرح بڑی پھلی چھوٹی پھلیوں کو نگل جاتی ہے اسی طرح وہ بھی اپنے منہ کے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا کولتیا اس صورت حال کو منیا نیا یعنی "منطق ماہی" کا لقب دیتا ہے اور اس طرح لغت میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کرتا ہے۔ ہر حال اس کے نزدیک جب صورت حال اس قدر ناقابل برداشت ہوئی تو لوگوں نے ایک حکمران کی ماتحتی قبول کر لی۔ کولتیا یہ نہیں کہتا کہ اس حکمران کا انتخاب باضابطہ ہوا ہوگا، بلکہ وہ محض حکمران کے احکام کو تسلیم کر لینا ہی اس انتخاب کے واقعے کے لئے کافی تصور کرتا ہے۔

سنگھوش "ہندو کے سیاسی نظریوں کی تاریخ" *Epochal: A History of Hindu Political Theories*.

بنی پرشاد "ہندو قدیم میں مملکت" *Beni Prasad: The State in ancient India.*

چینی نظریے۔ تقریباً اسی زمانے میں چینی فلسفی موہاتی نے بھی مملکت سے تہل کی حالت کا تجزیہ کیا۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت کے قیام سے پہلے ہر شخص کے نزدیک حق اور ناحق کا تخیل جدا نہ تھا، چنانچہ ایک شخص کسی بات کو حق سمجھتا تھا تو دوسرا شخص نہ صرف اسی کو ناحق تصور کرتا بلکہ شخص اول کو اپنے زعم میں گمراہ سمجھتا تھا۔ اسلامی نظریے۔ ان نظریوں اور سطحوں اور سترہویں صدی کے یورپی نظریوں کے درمیان یکاڑوں برس کا جو فاصلہ ہے وہ ابتدائی مسلمانوں کی سیاسی فکر سے پُر ہو گیا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ جن تخیلات کو آگے چل کر یورپی مفکرین نے پیش کیا وہ ایک بڑی حد تک نویں اور دسویں صدی عیسوی میں ہی منظر عام پر آچکے تھے۔ مثلاً حکیم فارابی نہ صرف ان مصادر پر نظر ڈالتا ہے جن کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے روابطہ پیدا کرتے ہیں بلکہ اس نظریے کی بھی ایک بڑی حد تک پیش بندی کرتا ہے جسے بعد میں چلکمر "معاشری معاہدہ" کا لقب دیا گیا۔ وہ خدیوہ فروخت کے معاہدے کی ماہریت کا تجزیہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس معاہدے کی گواہان یہ تھے کہ فریقین کی حیثیت اور ان کا رتبہ بالکل مساوی ہوں وں میں بعض لوگ دوسروں سے زیادہ طاقتور تھے اور اپنے کمزور بھائیوں کو فوج طرح سے زیر کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے بدامنی اور شورش ہوتی رہتی تھی اور کسی طرح کی

شہ نئے کے کام کار "ہندوؤں کے سیاسی ادارات و نظریات" : Banoy Kumar
Sarkar: The Political Institutions and
Theories of the Hindus.

داد و مستند ممکن نہ تھی۔ جب لوگ اس صورت سے بالکل غاری آگئے تو انھوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائیگا جس کے ذریعے سے وہ دوسروں کو زیر کرنے کی کوشش نہ کرے اور اس معاہدے سے لوگوں میں مکمل مساوات کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

ابن خلدون یہ کہتا ہے کہ انسان فطرتاً ایک معاشری حیوان ہے اور اس کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ منظم معاشرے میں رہے۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو کچھ اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ بغیر تعالیٰ اور ہمکاری کے زندگی ہی محال ہو جائیگی چنانچہ انسان کو نہ صرف دوسروں کی مدد مسلسل درکار ہوتی ہے بلکہ وہ بھی دوسروں کی برابر مدد کرتا رہتا ہے۔ امام غزالی نے اس سے دوسو برس پہلے ہی اسی تخیل کو تفصیل سے بیان کر دیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ چونکہ انسانوں کے مجموعوں میں طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں اس لئے انھیں چکائے کے لئے ایک مستقل نظم کی ضرورت ہے اور یہ نظم حکومت کی شکل میں ہر ممکن ملک میں موجود رہے۔

۱۰ تا ۱۲۵۹ء ابن خلدون ۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء غزالی ۵۰۵ تا ۵۰۶ء
۱۱۔ دیکھو شروانی ۱۰ اسلامی سیاسی فکر اور سیاسیات کی اکیم میں اسکا رتبہ ۱۰
Sherwani: Islamic Political Thought: its

place in the Schema of Political Science.

زیرِ زح ۱۳۵۹ء شروانی، "غزالی کے خیالات سیاسی نظریوں اور اس پر رقبہ ۱۳۵۹ء

یورپی نظریہ۔ یورپ میں مملکت کے قیام سے پہلے کی حالت کا تجزیہ سولہویں صدی عیسوی سے پیشتر کسی نے نہیں کیا۔ پہلا شخص جس کی تحریروں میں ہیں اس کا پتہ چلتا ہے 'وہ گریس ہے۔ مگر کے بعد جرمن پروفیسر ڈورف اور ولندیزی ایسی نوزائے بھی اس کے تجزیے کی کوشش کی، لیکن اس موضوع پر سب سے پہلی مرتبہ کامل بحث و مباحثہ کا سہرا انگلستان کے فلسفی ٹامس ہوبز کے سر ہے جس نے ۱۶۵۱ء میں اپنی کتاب لیو ایٹھن کو خالق کر کے مصلحتی سیاست دانوں کے لئے ایک نیا بحث پیدا کر دیا۔

ہوبز۔ کوئی کیا کی طرح ہوبز کے نزدیک بھی مملکت سے پیشتر مینائی کی کیفیت ہوگی۔ چونکہ اس فطری حالت میں قانون کا بالکل فقدان تھا اس لئے حق و باطل، انصاف و بے انصافی کا وجود ہی نہ تھا۔ ہر شخص کو اپنی جلیغ خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کی کامل آزادی حاصل تھی، اور چونکہ انسان فطرتاً خود بین اور

(فقیر ۱۲۲۱ء) Sherwani: El-Ghazzali on the Theory and practice of Politics.

حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء؛ شردانی: الغزالی کے سیاسی نظریے؟ Sherwani: Al-Farabi's political Theories, علی گڑھ ۱۹۳۶ء۔

ان مفکروں کے بعض سیاسی خیالات حسب ذیل کتابوں میں ہیں گئے: فارابی،

"أولاء أهل المدينة الفاضلة"؛ غزالی، "اختیار العلوہ" جلد سوم باب ۶ فصل ۵؛ ابن خلدون، ۱۔ مقدمہ

Hobbes: Leviathan.

خود غرض ہے اس لئے ہمیشہ مختلف لوگوں کی خواہشات میں باہم تصادم ہوتا رہتا تھا۔ یہ صورت حال اس قدر ناقابل برداشت ہو گئی کہ لوگ اپنی زندگی تک سے ہماری سو گئے اور انہوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ہر شخص اپنی قوت عمل سے بالکل دست بردار ہو جائے، بشرطیکہ باقی اشخاص بھی دست برداری لئے دیں ساتھ ہی جمہ افراد نے با اتفاق رائے اپنے ادیر حکومت کرنے کا اختیار ایک ہی شخصیت کے سپرد کر دیا جسے ”ہو بڑ“ ”مقتدر اعلیٰ“ کا لقب دیتا ہے۔ چونکہ یہ کارروائی محض اس لئے ہوئی تھی کہ بغیر اس کے ملک میں امن و امان رہنا ناممکن تھا، اس لئے مقتدر اعلیٰ کا پہلا فرض یہ ہوا کہ ملک میں امن و امان قائم رکھے اور لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرے، چنانچہ جب تک وہ اس اساسی شرط کو پورا کرتا رہے گا یعنی جب تک وہ امن رکھے گا اس وقت تک اس کا حکم ماننا ہر شخص پر فرض ہو گا، خواہ وہ حکم بادی النظر میں کیسا ہی بے انصاف نہ کیوں نہ ہو۔

لوگ۔ ہو بڑ کے بعد جس فلسفی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ بھی اس کی طرح ایک انگریزی سی جان کوک تھا، جس نے اپنے زمانہ ۱۶۹۰ء میں شائع کئے۔ گو ہو بڑ کے نزدیک مقتدر اعلیٰ کا مطلق العنان ہونا قیام مملکت کے لئے لازمی تھا، لیکن ہو بڑ کے وقت سے لے کر کوک کے زمانہ تک یہی امر شاہ انگلستان اور رعایا نے انگلستان کے درمیان مابہ النزاع رہا تھا کہ بادشاہ کو حقوق مطلق العنانی حاصل ہیں یا نہیں۔ انگریز چارلس اول کا سر قلم کر چکے تھے، انہوں نے جبرِ دوم کو کوک

سے نکال دیا تھا، اور اکثر شاہی اختیارات سلب کر کے ایک برہمنی وکرم سوم کو تخت انگلستان پر بٹھا دیا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام انقلابات اور باوجود ہوبز کے نظریہ کے انگلستان کی مملکت برابر قائم تھی۔ لوگ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے بیشتر کے نظریہ میں کچھ نہ کچھ خامی ہے اور اس کی ضرورت سمجھی کہ ایک نیا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔ لوگ کے نزدیک یہ غلط ہے کہ مملکت کے آغاز سے بیشتر کسی قانون کا

نفاذ نہ تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی قانون قدرت رائج تھا، ہر انسان میں عقل و شعور کے جذبات موجود تھے اور وہ حق اور باطل، انصاف اور بے انصافی میں تمیز کر سکتا تھا۔ ہر شخص کو ہر چیز پر قبضہ کرنے کا قدرتی اختیار تھا، بشرطیکہ وہ دوسروں کا سدراہ نہ بنے، لیکن اس قانون کی تادیل کرنے کا استحقاق بجائے کسی ثالث کے ہر ایک فرد کو حاصل تھا۔ اس صورت حال میں ایک ستم یہ تھا کہ چونکہ ہر شخص اپنے افعال کا خود ہی جج تھا، اس لئے اکثر و بیشتر کسی خاص امر کے متعلق مختلف افراد کے فیصلوں میں تصادم ہوتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ نہایت آرام دہ کیفیت ناقابل برداشت نہ ہو جاتی، اگر بعض طاع اوفس پرست افراد دوسروں کی مقبوضہ اشیاء پر جبراً قبضہ کرنا نہ چاہتے، جس کی وجہ سے نہ صرف لوگوں کے مقبوضات بلکہ اُن کی آبرو اور زندگی بھی معرض خطر میں پڑ گئی۔

لوگ کے نزدیک معاشرہ سیاسی کا اولین مقصد انسان کی زندگی، آزادی، آبرو اور املاک کی حفاظت ہے۔ اسی مقصد کی تکمیل کے واسطے ابتدائی انسانوں نے آپس میں پھرتے کر کے یہ معاہدہ کر لیا کہ وہ قانون فطرت کی خود ہی تادیب اور نفاذ کرنے کے بجائے اس اہم فرض کو کل قوم یا قوم کی اکثریت کے سپرد کر دیں گے۔

اور جب اس طرح معاشرہ سیاسی قائم ہو گیا تو سب نے ایک شخص واحد کو اپنا حکمران قرار دے کر اپنی جانب سے اس کو نفاذ قوانین اور تادیب قوانین کا اختیار دیا، بشرطیکہ وہ ابتدائی معاہدے کے مقصد اولین کو پورا کرتا رہے، یعنی افراد کی آزادی، زندگی، آزاد اور الماک کی حفاظت کرتا رہے۔ ساتھ ہی آپس میں یہ بھی طے ہوا کہ کثرت رائے ہمیشہ اقلیت پر حاوی رہا کرے گی۔ لوگ کی رائے کے لیے کہ اس معاشرتی حالت کی ابتدا کا ثبوت محض منطقی دلیلوں ہی سے نہیں دیا جاسکتا، تاہم بالکل ممکن ہے کہ اس کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہو، اور محض اس لیے کہ ہمارے پاس اس کا ثبوت کم ہے، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ مطلقاً پیش نہ آیا ہو گا۔

روسو - تیسرا امتیاز سیاست دان جس نے معاہدہ معاشرتی پر قلم اٹھایا، جینیوا کا باشندہ ژان ژاک روٹسو تھا، جس نے اپنی مشہور کتاب ”معاشرتی معاہدہ“ کو ۱۷۶۲ء میں شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اپنی فطری حالت میں انسان کی زندگی نہایت آرام و آسائش سے بسر ہوتی تھی، انصاف یا اخلاق کا تخیل تو بالکل مفقود تھا، لیکن ہر شخص بالکلیہ آزاد ہونے کی وجہ سے فطرتاً دوسروں کے احساسات و جذبات کا پاس کرتا تھا۔ اس حالت میں کوئی چیز کسی کی ملک نہ تھی، بلکہ غیر مقررہ چیز پر ہر شخص کو قبضہ کرنے کا حق تھا۔ یہ عہد زریں ایک ایسا عہد تھا جس کا خاتمہ مستقل الماک کے رواج اور قوی دھڑ دوار افراد کی حرص کی وجہ سے ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ جب مختلف اشیاء مختلف افراد میں تقسیم ہو گئیں اور زبردست، زیر دست پر مظالم ڈھالے لگا

تو اس قیام کرنے کی صرف ایک صورت نظر آئی، وہ یہ کہ تمام افراد متحد اور مجتمع ہو کر ظالموں اور غاصبوں کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ ہر ایک شخص نے اپنی ذات اور اپنے جدا اختیارات سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو تمام قوم کے اقتدار کے ماتحت کر دیا۔ رکوس کا خیال ہے کہ اس ترکیب سے غاصب اور ظالم مغلوب ہو گئے اور ساتھ ہی چونکہ ہر شخص اس نئی جماعت کا ایک رکن تھا اس لئے آزادی میں بھی کمی پیدا نہیں ہوئی۔

مگر ہوتے ہوئے اور رکوس کے نظریوں کے اختلافات کے باعث ان کے قیام کئے ہوئے حکمرانوں کے اختیارات میں بھی بظاہر فرق ہے۔ ہوتے کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنی فطری عادات سے تنگ آکر اپنے جملہ اختیارات ایک "مقتدر اعلیٰ" کے سپرد کر دیئے۔ اس کے نزدیک خداویہ "موتہ اعلیٰ" شخص واحد ہوا ایک مرکب جماعت سے سوا دوسرے کسی اختیار حاصل ہے اور ہر شخص کو اس کے احکام کے سامنے تسلیم و احترام کرنا ضروری ہے۔

لوکہ مقتدر اعلیٰ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا اس کے نزدیک خود مافیکہ وہ جان والی اور آبرو کی حفاظت کرنا ہے گا اس کا اقتدار قائم ہے گا وہ لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس کی اقتدار اعلیٰ اس سے چھین کر کسی اور کو دیدیا۔

رکوس کے خیال کے مطابق مملکت میں اقتدار اعلیٰ باشندگان مملکت ہی کو حاصل ہے اور وقتی حکمران کی حیثیت خادم سے زیادہ نہیں ہے۔

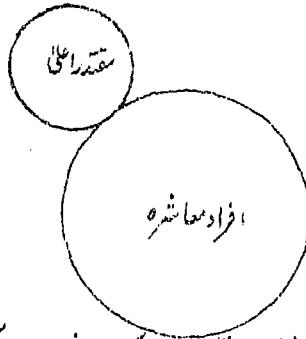
ان تینوں سیاست دانوں کے نزدیک باشندگان مملکت اور مقتدر اعلیٰ میں جو تعلق ہے وہ مفصل ذیل مشکوک سے واضح ہو سکتا ہے۔

(۱) ہوتے کے نزدیک مقتدر اعلیٰ معاہدہ کرنے والوں میں شامل نہیں تھا، لہذا اس پر معاہدے کا اثر نہیں پڑا، چنانچہ مقتدر اعلیٰ مطلق العنان ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر)

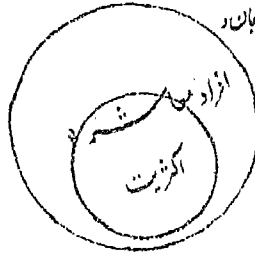
ان نظریوں کا مشترک عنصر۔ ان تمام نظریوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ ہر نوع انسان کی تاریخ دو بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(تہیہ صفحہ ۷۲)



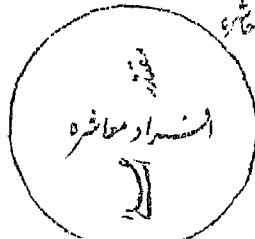
(۲) لوگ کے نزدیک پہلے معاشرہ سیاسی نظم ہوا، اس کے بعد معاشرے یا اس کی اکثریت کے

سہرہ اس شرط پر اختیارات کر دئے گئے کہ جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے گی۔



(۳) دوسرے نزدیک افراد معاشرہ

ہی کو اتھار اعلیٰ حاصل ہے۔



یعنی تنظیمِ حکمت سے پیشتر کا زمانہ اور اس کے بعد کی حالت۔ حکمت کے قیام سے پہلے کی کیفیت کی بابت سیاست دانوں کے درمیان اختلاف ہے اور اس اختلاف کی اصل بنا انسان کی فطری حالت کی حقیقت ہے۔ بعض کے نزدیک انسان فطرتاً ہی سے حریص، خود غرض، لڑاکو اور اسے کبھی کبھی کہتے ہیں کہ خواہ اس کی حالت منظم ہو یا نہ ہو، وہ چند قوانین قدرت کا اتباع کرتا ہے اور اس میں اور انسانی جانداروں میں جو امتیاز ہے وہ عقل، فہم و ادراک کے وجود پر مبنی ہے۔ آخر الذکر فلسفی کہتے ہیں کہ انسانیت کے معنی ہی یہ ہیں کہ مختلف انسانوں میں فہم و ادراک کی صفات موجود ہوں، اور یہ کہنا کہ ازل سے ہی انسان محض خود غرض یا محض حریص ہے، صریح غلط بیانی ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ رفتہ رفتہ بعض زبردست افراد میں خود غرضی اور حرص کے جذبات پیدا ہو گئے، چنانچہ ہر ایک کے نزدیک معاہدہ معاشرتی سے پیشتر ہی نوع انسان میں فساد و غارت کا بازار گرم تھا اور اسی کے انداز کی غرض سے آخر کار معاشرہ سیاسی قائم کرنا پڑا۔

اصول معاہدہ معاشرتی کی تصدیق۔ یورپ اور امریکہ پر ان نظریوں کا اثر نہایت عظیم نشان پڑا۔ ممالک متحدہ امریکہ اور فرانس کے انقلابی دستوروں کے بہت سے فقرے روس کی تحریروں سے لئے گئے ہیں لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر میں سیاسوں میں اس کے خلاف رد عمل پیدا ہو گیا اور ایٹم مذہب کی جبری تنظیم اور دائرہ میوم نے اپنے دلائل سے گویا کہ اس کا خاتمہ کر دیا۔ نوک کا یہ قول کہ عدم شہادت سے عدم واقعہ ثابت نہیں ہوتا، بالکل لائق ہے۔ سب کے نظریے کی بنیاد بھی ایک حد تک واقعات اور منطقی استدلال پر مبنی، لیکن نوک کا

ایک طرف تو ثبوت کے فقدان کو تسلیم کر لیتا اور دوسری جانب معاہدے کو بطور ایک واقعہ کے پیش کرنا، ایک امر لا طائل سے ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے فرض بھی کر لیا جائے کہ کسی وقت میں ہی نوع انسان یکجا بیٹھے، اور انھوں نے آپس میں یا کسی شخص ثالث سے کسی قسم کا معاہدہ کیا، تاہم یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ان ابتدائی معاہدہ کرنے والوں کی اولاد پر بھی اس کے شرائط کی پابندی فرض ہے دوسرے ہم جانتے ہیں کہ موجودہ بیچ در بیچ قانونی تبدیلیات، صدیوں کے ذہنی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ جب انسان منظم ہی نہ تھا اور جب آپس کے تعلقات تقریباً مفقود تھے تو پھر معاہدہ جیسے سجدہ قانونی تنظیم کا احساس پیدا ہونا، اس احساس پر ان کا عمل کرنا، اور ہر ایک فرد کا، خواہ وہ زبردست ہو یا کمزور، چھوٹا ہو یا بڑا، سختی سے کاربند ہونا کم و بیش ناممکنات سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ آخر اس معاہدے کو استحکام کیوں حاصل ہوا۔ اس کے دو ہی اسباب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ مقتدر، اعلیٰ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے معاہدے کا قیام جانتا ہے، اور دوسرے یہ کہ افراد معاشرہ امن و امان کے خواہاں ہیں۔ لیکن اگر محض مقتدر، اعلیٰ کی خواہش ہی پر قیام معاہدہ کا دار و مدار ہے تو پھر معاشرہ سیاسی جبری پر منحصر ہوا، اور اگر اس کی بنیاد افراد معاشرہ کی خواہش پر ہے تو ایک دور میں تقاریر بھی سوال کر سکتا ہے کہ آخر افراد کوئی اکمل امن و امان کی خواہش کیوں ہوتی ہے۔ تقریباً اسی قسم کی تنقید سربز، لوک، روسو اور ڈام ان سیاستوں کے نظریوں کی کی جاسکتی ہے جنھوں نے معاہدہ معاشری کے تخلیق کو پیش کیا ہے۔ آخر میں صرف یہ کہنا باقی ہے کہ روسو کے نزدیک اجتماعی ہیئت

پیدا ہونے کے بعد ہر ایک شخص پہلے کی طرح بالکلیہ آزاد رہا اس نظریے میں جو مناسطہ ہے وہ مناسطہ ظاہر ہے۔ ہر شخص کی دو چیزیں ہوتی ہیں ایک انفرادی دوسری اجتماعی۔ اجتماعی حیثیت جمہور افراد کی انفرادی حیثیتوں کا نام نہیں بلکہ وہ ایک علیحدہ تخیل ہے جو کہ ان تمام انفرادی حیثیتوں کی کیمیائی ترکیب سے بنا ہے چنانچہ خود و سوان و دونوں تخیلات کے امین اختیار کر کے اجتماعی اداروں کو "نشر عامہ" اور انفرادی اداروں کے مجموعے کو "نشر انفرادی" کا لقب دیتا ہے۔

ہم نے نظریہ معاہدہ معاشری کو دو اسباب کی بنا پر اس قدر اہمیت دی ہے ایک تو یہ کہ کم دہش یا پانچویں صدی ق م سے انیسویں صدی عیسوی تک مشرق و مغرب دونوں کے بعض بڑے بڑے نظریہ سازی یکے بعد دیگرے اسی نظریہ کے مناسطے میں پڑے رہے یا دوسرے مختلف سیاسوں نے اس کی مختلف شکلیں قائم کی ہوں؛ لہذا اس کی ضرورت پیش آئی کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔

Divine origin theory

نظریہ مخلوق ربانی - نظریہ معاہدہ معاشری کے بعد دوسرا کم دہش عالمگیر نظریہ مخلوق ربانی کا ہے جس کے مطابق مملکت کی آفرینش اور قیام انسان کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام ہے۔ اس کے محقق یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ خدا نے اپنے چند برگزیدہ مندوں کو تخت و تاج عطا کر کے ان کے سپرد معاشرہ انسانی کی تنظیم کر دی ہے، لہذا حکمرانوں کو جو حقوق حاصل ہیں ان سے انھیں محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظریہ نے مغربی ممالک پر نہایت گہرا اثر ڈالا، تا آنکہ جرمانیہ کے شہنشاہ کو شہنشاہیت کے ایک خاص معنی میں دوسرے عیسائی بادشاہوں سے مقدس و ممتاز سمجھا گیا اور انگلستان میں شاہان اسٹورٹ نے اپنی شخصیت کو مملکت کا

دار و مدار اسی پر رکھا۔ مشرق میں بھی اس کا ایک خاص اثر پڑا، اور شاید یہی اصول ہے جس کے تحت بادشاہوں کو پٹل اللہ کہا جالے لگا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو گوارہ دہی ہے کہ مملکت کو خدائے پیدا کیا ہے اور اسی نے انسانوں کو منظم کر کے معاشرہ سیاسی کی بنیاد ڈالی ہے، لیکن اس سے کسی قسم کا استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ خدائے لوہر چربہائی ہے، ہر مادی شے اور غیر مادی شے کا مبداء وہی ہے، اس نے نہ صرف انسان ہی معاشرہ قائم کرنے کی صلاحیت پیدا کی بلکہ جانوروں میں بھی ایک قسم کی تنظیم قائم کر دی جس سے خود انسان بھی سبق لے سکتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ خدائی پیدا کی ہوئی چیزوں میں مملکت یا حکمرانوں کو کوئی خاص امتیاز حاصل ہے جو دوسری مخلوقات کو حاصل نہیں۔ خدا ہر چیز کو سبب اول ہے؛ اسی لئے جب ہم کسی خاص تخیل کے مبداء کی تحقیقات کرتے ہیں تو غور و رسانی کے اصول کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور سبب اول کی تلاش کی بجائے محض سبب ثانی کی جستجو کو کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ خیال کہ چونکہ مملکت کی تخلیق خدائے کی ہے لہذا مزید تحقیقات نہیں کرنی چاہئے، نہ صرف بیکار ہے بلکہ شاید نقصان رساں بھی۔

پدر سری اور مادری سری اقتدار۔ نظریہ معاہدہ معاشری اور نظریہ تخلیق ربانی کے بعد جس نظریہ نے زمانہ حال کے سیاسی تخیل پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے وہ پدر سری یا مادری سری نظریہ ہے۔ ارسطو طالیس کے زمانے سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک فکشل سے کوئی عہد ایسا گزرا ہوگا جس میں سیاسی مفکروں کی ایک جماعت نے پدر سری نظریہ کی تائید میں قلم نہ اٹھایا ہو۔ اس کے مطابق مملکت دراصل

خاندانوں کے ایک مجموعے کا نام ہے اور جس طرح ابتدائی زمانوں میں سر خاندان میں باب کو اختیارات مطلق حاصل تھے اسی طرح مملکت میں بھی ایک شخصیت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے والے اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل خاندانوں کے سربراہ کاروں، نبی اسرائیل کے بطریقوں اور رومن "پدری اقتدار" کے اصول کو پیش کرتے ہیں۔ ازمانہ حال میں اس نظریہ کی پیکل قائم کی گئی ہے کہ ابتدائے خاندان کا سرگروہ ایک فرد واحد ہوتا تھا جس کا حکم جملہ اہل خاندان مانتے تھے اور بعض مقامات میں اس گروہ کو اپنے دست نگر افراد پر موت و زلیست کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ خاندان کے افراد میں توسیع ہوئی اور انھوں نے گٹھ یا قبیلہ کی صورت اختیار کر لی اور یہ خیالی لوگوں کے دلوں میں اس قدر جا گریں ہو کر قبیلے کے افراد اپنے آپ کو ایک ہی مورث اعلیٰ کی اولاد ظاہر کرنے لگے۔ جب قبیلوں کی تنظیم میں امتداد و زمانہ سے استقلال و قوت پیدا ہو گئی تو انھیں اپنے ہمسایہ قبائل کو غلبہ کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے بعد خواہ مجبوراً ورنہ اراداً، مختلف قبائل ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو گئے اور مملکت و ازدواج کے قوانین مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مرد و ایام سے ہم نسل ہونے کا خیال بھی زائل ہونے لگا یہاں تک کہ آخر کار مملکت پیدا ہو گئی۔

اس نظریہ کو انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک ایک حد تک عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور اسے پہلی ذک اس وقت کی جب لوگوں نے دنیا کا سفر کر کے دور افتادہ اقوام کے حالات کی تفتیش کرنی شروع کی۔ اس کے منتقدوں کو یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ دنیا میں بعض ممالک ایسے بھی ہیں جن میں ایک ایک عورت کو متعذر

مردوں سے نہ صرف نکاح کرنے کی اجازت ہے بلکہ عادتاً اور دا جا ایسا بھی کیا جاتا ہے؛ مثلاً لمبا رکی بعض ذالوں میں ایک عورت کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے جس کے باعث خاندان کی سرگروہ دی ہوئی ہے اور اسی کے واسطے سے خاندانی جائیداد کی وراثت پساندگان کو پہنچتی ہے۔ یہی کیفیت نیپال اور تبت کی بعض اقوام کی ہے جہاں اگر کوئی عورت ایک شخص کے نکاح میں ہو تو وہ اس کے تمام بھائیوں کی منکوحہ بھی جاتی ہے۔ غرض ان اگتافات کے بعد دوسری نظر یہ کے حافی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ابتدا میں ہر جگہ باپ ہی خاندان کا سرگروہ ہو گا علاوہ ازیں حال ہی میں پروفیسر کس نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بعض ممالک میں قدیم ترین سیاسی ادارہ خاندان نہیں بلکہ قبیلہ ہے جو رفتہ رفتہ گھرانوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور انھوں نے اپنے اس خیال کا ثبوت آسٹریلیا کی اصلی اقوام اور کالٹ قوم کی تنظیم سے دیا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ آسٹریلیا میں خاندان کو مطلق کوئی اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ ”قوم“ چند مجموعوں پر مشتمل تھی جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک نشان مخصوص تھا، مثلاً ایک مجموعے کے لئے سانپ کی تصویر دوسرے کے لئے کسی پرند کی تصویر اور مناکحت و ازدواج کے قوانین اسی تفریق پر مبنی تھے؛ مثلاً کوئی شخص اپنے ہی نشان کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کم و بیش وہی

لہ آج بھی ٹراڈیکور کی ریاست میں اسی الٹی اصل کے مطابق لڑکی کا حقدار جہا راجہ کا بیٹا نہیں ہوتا بلکہ اسکا بھائی ہوتا ہے۔

مثلاً جنکس: ”The State and the Nation“ اور قوم

صورت حال ہے جو ہندوؤں کی بعض ذاتوں میں پائی جاتی ہے، یعنی بعض ذاتوں میں ایک ہی گوتہ کے دو افراد باہم شادی کر سکتے ہیں، بعض میں نہیں۔ اور اسکا چستان اور آریستان میں بھی قبیلوں کو جتنی اہمیت حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی خاندان کو حاصل نہیں ہے۔

نظریہ جبر۔ بعض یاسوں کے نزدیک ملکیت کی بنا محض جبر و قوت پر ہے۔ ابتدا میں غالباً ایسا ہی ہوا ہو گا کہ کسی دور میں عقلمند اور قوی شخص نے پہلے تو بہت سے لوگوں کو اپنے زیر اثر کیا اور پھر ان کو ماتھے کے کر قرب و جوار کے باشندوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کیا۔ جب اس کی قوت بڑھ گئی اور اس کا اثر لوگوں کے دلوں پر مستقل طور پر قائم ہو گیا تو اس نے انھیں اپنا حکم ماننے پر مجبور کیا، یہاں تک کہ وہ ان کا متحمل نہ رہا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو ان کر کسی ملک میں آزادی اور حقوق انسانی کا نام بھی باقی نہیں رہتا چاہے اور جس طرح محض معاہدہ یا ہی ملکیت کی بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا اسی طرح محض جبر پر ہی اس کا مدار نہیں ہو سکتا۔ آج کل کے زمانے میں دنیا کے ملک یا انعمیت پسند یا ان میں ایک خاص قسم کی مطلق العنان حکومت یعنی آمریت کا رواج ہے جہاں عمومیت ہے دامن تو ظاہر ہے کہ یہ اڑا کیا ہی نہیں جاسکتا کہ حکومت کی بنا جبر پر ہے؛ جہاں آمریت ہے وہاں آمر کا یہ قول ہے کہ اس کے حکومت کی

وجود حسب نسب کی اہمیت کے عروں کی تنظیم بھی خاندانوں پر نہیں بلکہ قبائلی پر مبنی ہے اور ہر قبیلہ داپلے اپنے آپ کو ایک ہی جہ کی اولاد تصور کرتے ہیں۔

بنیاد جبر پر نہیں بلکہ دراصل وہ قوم کا قائم مقام ہے اور قوم اس کے کردار کی موید اور ہوتا ہے۔

حقیقی ارتقاء مملکت۔ اس موضوع پر جتنی لیلیں اس وقت تک پیش کی گئی ہیں وہ سب کی سب انہدامی ہیں، یعنی مختلف نظریے پیش کر کے ان میں سے تقریباً ہر ایک کا بطلان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ارتقاء مملکت کیسے قائم ہوئی۔ سب سے پہلے بات جو ذہن نشین ہونی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہور سیاسی ادارات ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا تاریخی واقعہ ہم کو نہیں ملتا جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ مملکت کا شکل انسانی کے کسی تجربے کے دماغ میں بلا بیرونی اثرات کے یک بیک پیدا ہو گیا ہوگا۔ اس خیال کو مد نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ گو مفصلہً بالا نظریات میں سے کوئی بھی بالکل صحیح نہیں، بہر کیف ہر ایک میں کچھ نہ کچھ حقیقت کا پہلو ضرور ہے۔ اصطلاحاً اپنی مشہور آفاق کتاب ”سیاسیات“ میں کہتا ہے کہ مملکت ایک تدریجی ادارہ ہے اور انسان نظر تا ایک سیاسی حیوان ^{کلف} ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہونے کے خالی اکبر نے نبی نوع انسان کے ہر ایک فرد کے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر اپنی زندگی گزارے، اور ساتھ ہی اس کو یہ قابلیت و رعیت کی ہے کہ باہمی تعلقات کو مرتب و منظم کرے، ساتھ ہی شاید سب سے پہلے اثرات جنھوں نے انسان کو قانون و آئین کی پابندی پر آمادہ کیا، وہ مذہبی قواعد

ہوں گے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ مملکت کا انتظام و انصرام صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مختلف افراد کو قانون کی پابندی پرستی سے مجبور کیا جاسکے اور خلاف ورزی کرنے والوں پر مناسب تشدد روا رکھا جاسکے۔ ان سب امور کے بعد بھی مملکت کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک ہر ایک فرد مملکت نہیں تو ایک عظیم الشان تعداد افراد نہ صرف اپنے دل میں بلکہ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت نہ کرے کہ باوجود ان تمام سختیوں کے وہ مملکت کے قیام کا ہمتن خزانہ ہے۔

اس خیال کو ذرا تفصیل کے ساتھ شاید سب سے پہلے امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ”احیاء العلوم“ میں پیش کیا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احیاء کے چند پاروں کا ہو بہو ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ہم اس کا اندازہ کر سکیں کہ باوجود تقریباً ایک ہزار سال کے بعد کے امام غزالیؒ کا خیال کس درجہ جدید ہے۔ مملکت کے ارتقاء کے سلسلے میں وہ کہتے ہیں ”انسان کی آفرینش کچھ اس طرح عمل میں آئی ہے کہ وہ تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ ہمیشہ اس کا خوالہ رہتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہے۔ اس خواہش کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ ساتھ نبی نوع انسان کی بقا کے لئے ضروری ہے اس لئے کہ جنسی اختلاط کے بغیر اولاد کا ہونا ناممکن ہے، اور دوسرے اس کے کھانے پینے اور اولاد کی تعلیم و تربیت کے واسطے بھی اسے غیردوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنسی اختلاط سے اولاد ہوتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے بیوی بچوں کو لے کر اپنے آپ کو ہمیشہ گھر میں بند نہیں رکھ سکتا، چنانچہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے اسے بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ تعامل کرنا پڑتا ہے جو کسی تجارت یا حرفت میں لگے ہوئے

بعد ازاں مغربی حکومت کے عہدوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ مملکت کی صحیح
انصرام کے لئے ایک بادشاہ یا امیر کی ضرورت ہے جو ہر چیز کی نگرانی رکھے اور مختلف
عہدوں پر لائق اصحاب کو مقرر کرے۔

انفرنس مملکت کے ارتقاء کے یہ تمام عناصر مدد و معاون ہوتے ہوئے ہوں گے۔ غالباً
ابتداء میں یہ چھڑی انفرادی کے دماغ میں سیاسی حس پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ عالمگیر ہو گئی
لیکن یہ چیز محض ایک خیال کی حد تک محدود تھی اور حقیقی سیاسی اداروں اور قوانین
کی تعلیم میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال صرف ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان قوانین کے حکمت
اور سیاسی ارادات کے استحکام کے لئے عمل کی ضرورت لڑت ہوئی اور اس طرح گویا
عظیم مملکتیں جنم سے وجود پا گئیں۔

شاہد کھنیکار نے "تہذیبیات" Garner: Introduction to
Political Science.

باب ۴ ملکت کی آبادی اور اس کا رقبہ

آبادی۔ ایشیائی مملکت۔ یونان۔ روم۔ جزائری انٹرات۔ اسلامی تسلیم۔ خلافت۔ زمانہ وسطی
عالمگیر سلطنت کا خاتمہ۔ موجودہ یورپ۔ مملکت کے دور۔

آبادی۔ مملکت کی تعریف کے سلسلے میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مجاہد دیگر
اجزائے لائف کے اس کے قیام کے لئے وہ لازمی عناصر یعنی انسانوں کی کثیر تعداد
اور مستقل رقبہ لازمی بھی ہیں۔ آبادی کے لئے مختلف سیاسوں نے مختلف نظریے قائم
کئے ہیں۔ ارسطو کا پس نے چونکہ شہری مملکتوں کے ملک بینی یونان میں نشوونما پایا تھا
اس لئے اس کے دماغ میں کسی ایسی مملکت کا نہیں آئی نہیں سکتا تھا جس کی آبادی
چند ہزار نفوس سے زیادہ ہو، اور وہ یہ کہتا ہے کہ مملکت کی آبادی پر حکومت کو
پورے طور سے نگرانی کرنی چاہئے اور اس سے ایک خاص تعداد سے زیادہ بڑھنے
نہ دینا چاہئے۔ وہ قوم اور مملکت میں یہی فرق سمجھتا ہے کہ قوم میں تو انسانوں کی
تعداد کم و بیش غیر محدود ہوگی لیکن مملکت میں (جس سے اس کی مراد شہری مملکت ہے)
وہ نسبتاً کم اور غیر محدود ہوگی۔ روس کے نزدیک مملکت کے باشندوں کی تعداد جس قدر

سے ارسطو کا پسین با "سیاسات" ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵۵، ۱۶۵۶، ۱۶۵۷، ۱۶۵۸، ۱۶۵۹، ۱۶۶۰، ۱۶۶۱، ۱۶۶۲، ۱۶۶۳، ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، ۱۶۶۶، ۱۶۶۷، ۱۶۶۸، ۱۶۶۹، ۱۶۷۰، ۱۶۷۱، ۱۶۷۲، ۱۶۷۳، ۱۶۷۴، ۱۶۷۵، ۱۶۷۶، ۱۶۷۷، ۱۶۷۸، ۱۶۷۹، ۱۶۸۰، ۱۶۸۱، ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۴، ۱۶۸۵، ۱۶۸۶، ۱۶۸۷، ۱۶۸۸، ۱۶۸۹، ۱۶۹۰، ۱۶۹۱، ۱۶۹۲، ۱۶۹۳، ۱۶۹۴، ۱۶۹۵، ۱۶۹۶، ۱۶۹۷، ۱۶۹۸، ۱۶۹۹، ۱۷۰۰، ۱۷۰۱، ۱۷۰۲، ۱۷۰۳، ۱۷۰۴، ۱۷۰۵، ۱۷۰۶، ۱۷۰۷، ۱۷۰۸، ۱۷۰۹، ۱۷۱۰، ۱۷۱۱، ۱۷۱۲، ۱۷۱۳، ۱۷۱۴، ۱۷۱۵، ۱۷۱۶، ۱۷۱۷، ۱۷۱۸، ۱۷۱۹، ۱۷۲۰، ۱۷۲۱، ۱۷۲۲، ۱۷۲۳، ۱۷۲۴، ۱۷۲۵، ۱۷۲۶، ۱۷۲۷، ۱۷۲۸، ۱۷۲۹، ۱۷۳۰، ۱۷۳۱، ۱۷۳۲، ۱۷۳۳، ۱۷۳۴، ۱۷۳۵، ۱۷۳۶، ۱۷۳۷، ۱۷۳۸، ۱۷۳۹، ۱۷۴۰، ۱۷۴۱، ۱۷۴۲، ۱۷۴۳، ۱۷۴۴، ۱۷۴۵، ۱۷۴۶، ۱۷۴۷، ۱۷۴۸، ۱۷۴۹، ۱۷۵۰، ۱۷۵۱، ۱۷۵۲، ۱۷۵۳، ۱۷۵۴، ۱۷۵۵، ۱۷۵۶، ۱۷۵۷، ۱۷۵۸، ۱۷۵۹، ۱۷۶۰، ۱۷۶۱، ۱۷۶۲، ۱۷۶۳، ۱۷۶۴، ۱۷۶۵، ۱۷۶۶، ۱۷۶۷، ۱۷۶۸، ۱۷۶۹، ۱۷۷۰، ۱۷۷۱، ۱۷۷۲، ۱۷۷۳، ۱۷۷۴، ۱۷۷۵، ۱۷۷۶، ۱۷۷۷، ۱۷۷۸، ۱۷۷۹، ۱۷۸۰، ۱۷۸۱، ۱۷۸۲، ۱۷۸۳، ۱۷۸۴، ۱۷۸۵، ۱۷۸۶، ۱۷۸۷، ۱۷۸۸، ۱۷۸۹، ۱۷۹۰، ۱۷۹۱، ۱۷۹۲، ۱۷۹۳، ۱۷۹۴، ۱۷۹۵، ۱۷۹۶، ۱۷۹۷، ۱۷۹۸، ۱۷۹۹، ۱۸۰۰، ۱۸۰۱، ۱۸۰۲، ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۸۰۵، ۱۸۰۶، ۱۸۰۷، ۱۸۰۸، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰، ۱۸۱۱، ۱۸۱۲، ۱۸۱۳، ۱۸۱۴، ۱۸۱۵، ۱۸۱۶، ۱۸۱۷، ۱۸۱۸، ۱۸۱۹، ۱۸۲۰، ۱۸۲۱، ۱۸۲۲، ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۸۲۵، ۱۸۲۶، ۱۸۲۷، ۱۸۲۸، ۱۸۲۹، ۱۸۳۰، ۱۸۳۱، ۱۸۳۲، ۱۸۳۳، ۱۸۳۴، ۱۸۳۵، ۱۸۳۶، ۱۸۳۷، ۱۸۳۸، ۱۸۳۹، ۱۸۴۰، ۱۸۴۱، ۱۸۴۲، ۱۸۴۳، ۱۸۴۴، ۱۸۴۵، ۱۸۴۶، ۱۸۴۷، ۱۸۴۸، ۱۸۴۹، ۱۸۵۰، ۱۸۵۱، ۱۸۵۲، ۱۸۵۳، ۱۸۵۴، ۱۸۵۵، ۱۸۵۶، ۱۸۵۷، ۱۸۵۸، ۱۸۵۹، ۱۸۶۰، ۱۸۶۱، ۱۸۶۲، ۱۸۶۳، ۱۸۶۴، ۱۸۶۵، ۱۸۶۶، ۱۸۶۷، ۱۸۶۸، ۱۸۶۹، ۱۸۷۰، ۱۸۷۱، ۱۸۷۲، ۱۸۷۳، ۱۸۷۴، ۱۸۷۵، ۱۸۷۶، ۱۸۷۷، ۱۸۷۸، ۱۸۷۹، ۱۸۸۰، ۱۸۸۱، ۱۸۸۲، ۱۸۸۳، ۱۸۸۴، ۱۸۸۵،

زیادہ ہو اسی مناسبت سے ہر ایک کی آزادی کا حصہ کم ہوتا ہے، اس لئے کہ منافع عامہ جو اس کے نزدیک معتدرا علی ہے، دراصل تمام باشندوں کی خواہشات سے مرکب ہے چنانچہ اگر باشندوں کی تعداد کم ہوگی تو ہر ایک کا منافع عامہ میں نسبتاً زیادہ حصہ ہوگا اگر تعداد زیادہ ہوگی تو کم ہوگی۔ مونٹیگیو بھی غالباً اسی اصول کو مد نظر رکھ کر کہتا ہے کہ آزادی ان ہی ملکوں میں زیادہ ہوتی ہے جن کی آبادی نسبتاً کم ہو، بلکہ وہ اس سے بھی ایک قدم بڑھا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بڑے بڑے ملکوں کے لئے مطلق العنانی ہی بہترین حکومت ہے اور انفرادی آزادی ان ہی ملکوں میں زیادہ شاداب ہوتی ہے جن کا رقبہ اور آبادی کم ہو۔

(پانچویں صفحہ ۱۵۱) Plato: Republic (۴۲۳ ج ۲) میں کہتا ہے کہ ملکت کی آبادی کم و بیش ۵۰۰۰ ہونی چاہئے یا اس سے کم آبادی ہوگی تو ملکت اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو سکتی، اور اس سے بہت بڑی ہوگی اور انتظام شکل پر جائیگا۔ ارسطو طالس اس تعداد کو بھی (جو شاید نزدیک حقیر ہے) بڑا تصور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ علاوہ غلاموں اور تاجروں کے جو شہر پر ہیں شامل نہیں تصور کئے جاتے تھے، ہر شہر کی کو ہر دوسرے شہر سے واقف و ناظر در رہے، دیکھو چانس "جب فلسفی بادشاہ ہوں" Chance: When philosophers are kings ۱۹۵۰ sophists are kings

Rousseau: Le Contrat Social. "سودا، معاہدہ معاشری"

Montesquieu: L'Esprit des lois "مونٹیگیو، روح قوانین"

ایشیائی مملکت - یہ ظاہر ہے کہ انتظام و انصرام میں جس قدر بہت چھوٹے ملکوں میں ہوتی ہے وہ ان ممالک میں شکل ہے جن کا رقبہ یا آبادی نسبتاً کثیر ہو۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جہاں برآختم ایشیا کے قدرتی حصوں کا رقبہ نہایت وسیع ہے اور فطرت نے اس میں قسم قسم کی آب و ہوا، وسائل اور نسل انسانی کی اکثریتیں پیدا کی ہیں، وہاں یورپ میں زندگی کی کشش ایشیا سے نسبتاً زیادہ ہے، اور پہاڑوں اور دریاؤں کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے رقبوں کی بھی مستقل حد بندی ہو گئی ہے۔ ایشیا کی تاریخ کا مطالعہ کر لے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بڑی سلطنتوں کے حالات سے یہاں کے ہر حصے کے دقائع بھرے پڑے ہیں اور گوارہ اور سانی اقوام دونوں میں مقامی ادارات کو کم و بیش خود مختاری حاصل ہوتی ہے، خواہ وہ گاؤں کی شکل میں ہوں یا قبیلے کی شکل میں، لیکن ملکت کا عام رجحان وسعت کی طرف ہے آج سے ڈھائی ہزار سال پیشہ خود ہندوستانیوں نے سلسلہ ساز دہجھاؤم یا "اتحاد قومی" کی بنیاد رکھ کر گویا اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کی تھی جو ارسطاطالیس کے نزدیک ملکت اور قوم میں پایا جاتا ہے اور اس بظاہر شہنشاہیت پسند سلسلے کے پرچم میں ہندوستان کے ہر حوصلہ مند حکمران کا یہ فرض سمجھا گیا تھا کہ وہ ہمالیہ پر بہت سے راس کاری تک تمام ملک کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دے۔ ہندوستان سے پہلے متعدد حکمرانوں نے، جن میں اشوک اعظم، سمرگپت، علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق اور

لکھ اس بحث کے لئے دیکھو مادہ اکمال کرچی کی قابل قدر تصنیف "شرقی عزمین" Raddha

Kamāl Mukerjee: Democracies of the East.

اور بگ زیب عالمگیر کے نام متنازع ترین ہیں۔ علاوہ ایک نہایت مختصر حصہ ملک کے باقی جملہ اطراف داکٹراؤں کی طرف سے تسلیم کیے گئے ہیں۔ سلطنت کے فیروزہ میں منسلک کر کے اپنے آپ کو "سارو بھوم"، "چکر درتن" یا شاہ جہاں کا مصداق بنا دیا یہ کیفیت دیگر ممالک ایشیائی بھی ہے، اور یہیں یہاں اور تیسرے بہمن اور دارلوش، چنگیز اور لاگو حضرت عمرؓ اور مارون الرشید، سلیمان اعظم اور حضرت علی پاشا کی وسیع فطرتوں کے قصے دہرانے کی حاجت نہیں۔

یونان۔ جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کم از کم وسطی، مغربی اور جنوبی یورپ میں عظیم الشان سلطنتوں کی گنجائش نہیں ہے، اور فطرت نے براعظم کا چھوٹا پھٹی چھوٹی ملکوں کے آغاز اور نشوونما کے لئے گویا کہ وقف کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیار یورپ کا سیاسی تخیل ابتدا میں محض شہری سلطنت ہی تک محدود تھا، جس کا رقبہ نہایت مختصر یعنی چند مربع میل سے زیادہ نہ ہوتا تھا، اور جو کلیہ خود مختار ہوتی تھی۔ اس سیاسی تخیل کا سب سے متنازع مظاہرہ ارض یونان میں ہوا جہاں آغاز تاریخ ہی سے سینوں چھوٹے چھوٹے آزاد شہر نظر آتے ہیں، اور اگر بعض مرتبہ اتحاد یا اتحاد یا اسپارٹا، ہونٹیا یا اکاتیا، قریب و جوار کے بلدیات پرست اور پالیتے ہیں لیکن یہ قابو دیر پا نہیں ہوتا اور اپنے زوال تک یونان شہری ملکوں کا جلال نگاہ بنا رہتا ہے۔

روما۔ سلطنت روما کے قیام سے ایک جدید تخیل کی ابتدا ہوئی، وہ یہ کہ جس قدر بھی ملک حاصل کیا جائے خواہ وہ یورپ میں ہو خواہ ایشیائیں، وہ سب ایک بلدی نظام کے تحت ہو۔ تخیل ترقی کر کے ایک عالمگیر سلطنت کی شکل میں

ظاہر ہوا، جس کا اصول یہ تھا کہ عیسوی یعنی یورپی دنیا میں جتنی بھی سلطنتیں ہیں وہ سب کی سب شہنشاہ کی ماتحت ہیں۔ گو پاکستان میں یہ کی گئی کہ جس طرح ایشیائی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں اسی طرح یورپ کی بھی شیرازہ بندی ہو چکے لیکن یورپ میں مرکز گزیر اثرات اس قدر قوی تھے کہ ابتدائی سے اس سلطنت کی مخالفت ہونے لگی، اور آخر کار اس کی کیفیت ایک نہایت کمزور دیسی ڈھالی عہدیت سے زیادہ نہیں رہی۔

جنس انسانی اثرات۔ ملکوں کی ہندوی اور ان کے مستقبل پر جغرافیہ کا ایک عظیم الشان اثر پڑتا ہے۔ علامہ ابن خلدون سے لے کر مونٹسکیو اور ہیکل تک ایک بہت سے ریاسوں نے اس بحث پر قلم اٹھایا ہے کہ آب و ہوا، کیفیت ارضی اور سامان خورد و نوش کے اثرات کسی حد تک مختلف اقوام کی ترقی یا تزلزل کا باعث ہوتے ہیں، اور ان سب نے نہایت تفصیل سے اس کے متعلق جلد چھپ سیکھائی اصول بتا دیے کہ کسی کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف انسانوں کے طبائع اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ بعض مرتبہ ایک ہی واقعہ کا دو اشخاص پر بالکل جدا جدا اثر پڑتا ہے، اس لئے کسی خاص اصول کی تدوین کم و بیش ناممکنات سے ہے، لیکن جزائی اثرات کو نظر انداز کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ جیسا ایڈمنڈ ہیکل نے

۵۵ مقدمات تاریخ ابن خلدون، مقدمات ۴ و ۵

۵۶ مونٹسکیو، روح قوانین، حصہ جات ۱۶ و ۱۷

۵۷ ہیکل، تاریخ تمدن، Buckle: History of Civilization

اپنی ایک تقریر میں کہا تھا، اس ناصیلے کو جو انگلستان اور اُس کی امریکی نوآبادیوں کے مابین واقع ہے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور یہ امر ناگزیر ہے کہ اوتیونس جیسے وسیع سمندر کے حائل ہونے کے باعث موزالذکر کی حکومت میں کمزوری پیدا ہو جائے۔ تاریخ انگلستان یا تاریخ جاپان کے واقعات اُس وقت تک پوری طور پر سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک مطالعہ کرنے والا یہ بدی اثر پیش نظر نہ رکھے کہ برطانیہ عظمیٰ اور جاپان دو جزیرے ہیں اور ان کی سرحد کسی دوسرے ملک کی سرحد سے نہیں ملتی۔ اسی طرح افغانستان اور سوئیستان اپنے اپنے ملک کے پہاڑوں کا منہن ہونا چاہئے، کیونکہ یہی وہ عنصر تھا جس کے باعث عظیم الشان سلطنتوں کے قرب و جوار کے وہ اب تک آزاد ہیں۔ علاوہ ازیں ایشیا اور یورپ کے اکثر ممالک کے حدود قائم کرنے میں اونچے اونچے پہاڑوں، بڑے بڑے دریاؤں اور وسیع صحرائوں کا ضرور لحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن واضح ہو کہ یہ حکم امریکہ اور آسٹریلیا کی اندرونی حدود پر نہیں لگایا جاسکتا، اس لئے کہ ان دونوں براعظموں میں بین الاقوامی یا بین ریاستی سرحد کی شکل بعض درجہ ایک خط مستقیم جیسی ہے جو کسی عرض البلد یا طول پر ہو کر گزرتی ہے اور جس میں پہاڑوں، دریاؤں، شہروں اور قریبوں کے مواقع کو نظر بہا نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء

۵۷ ایڈمنڈ برک کی وہ تقریر جس نے امریکی نوآبادیوں سے مفاہمت کے اصول پرارج

کو برطانوی ایلان عام میں کی۔

۵۸ کناڈا اور ممالک متحدہ امریکہ کے درمیانی سرحد اقتضائے مغرب سے (بقیہ صفحہ ۵۸ پر)

اسلامی تعلیم۔ یہاں ایک خاص امر کی طرف توجہ مبذول کرنی ضروری ہے۔ تعلیم اسلام کے بعد دنیا میں ایک بالکل جدید خیال کی ابتدا ہوئی، یعنی اسلام کا نام لیوا خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، کسی نسل سے ہو، رنگ روپ کوئی ہو وہ مرکز اسلام سے وابستہ ہے۔ ویسے تو تقریباً ہر مذہب عالمگیر بھائی چالنے کے اصول پر مبنی ہوتا ہے لیکن پیغمبر اسلام صلعلم نے اس اصول کو اپنے علم سے پورا کر دکھایا۔ وہ ایسے فرد فرید تھے۔

جنہیں دور و نزدیک سب گرامی برابر تھے ملی و ذنگی دشمنی نہ صرف آنحضرت صلعلم بلکہ ان کے

خلیفہ تھے امت کے ایسے نگہبان ہو گئے کہ جیسے نگہبان چوپاں

سمجھتے تھے ذاتی و مسلم کو یکساں نہ تھا عباد و عریں تفاوت نہایاں

کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی

زیلے میں مال جانی نہیں ہوں حبیبی

(بقیہ صفحہ ۵۸) ایک آف دی وڈو تک بارہ سو سال خط تقیم کے طرح عرض البلد اہر پرتع سے اور پہاڑوں، دریاؤں، شہروں، گاؤں اور بعض مرتبہ مکانات تک کو کاٹتی ہوئی علی جاتی ہے یہیں الانڈیا امن و امان کے اسکان کا ایک زبردست مظاہرہ ہے کہ باوجود اس خط کے غیر محفوظ ہونے کے ان دو ملک کے درمیان سلامۃ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔

شلہ مدین مدو جزا سلام مصنف مولانا سالی مرحوم حصہ موسومہ "دعا"

الفصا حصہ موسومہ "خلافت راشدہ" شلہ

گدیا اسلام نے مسلمانوں کو ایک طرف تو حُبِّ الْوَطَنِ مِنَ الْإِيمَانِ کا سبق پڑھایا اور دوسری جانب انھیں یہ سکھایا کہ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ یعنی تمہارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ خود بہتر اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے اپنے جاں نثاروں سے اس کا عملی ثبوت یہ دلایا کہ جب مکہ کے مہاجر آپ کی بیادت میں مدینہ پہنچے تو مدینہ والوں کو یہ اصول بتایا گیا کہ اُن میں اور مہاجروں میں کوئی نسلی رشتہ نہیں، لیکن اسلامی بھائی چارے کی بنا پر دونوں ایک برادری کے افراد ہیں۔

خلافت: خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں نے نہ صرف عرب کے قرب و جوار کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا، بلکہ مصر، شام، ایران اور عراق تک ملکات اسلامیہ میں شامل ہو گئے تھے، اور غلامی امیہ کے ابتدائی عہد میں دیکھا سنہ سے کہہ برائے تک دنیا کے ہر ملک اسلامی قازن کے پیرو اور بیت المال کے باجگذاہ بن گئے تھے۔ جب تک انتظام میں مرکز بیت قائم رہی اس وقت تک عربستان اور اسلامی بھائی چارے کے دونوں اصولوں کی یہ یک وقت انطباق کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، اس لئے کہ اسلام نے لوگوں کی عادت و خصلاات، طرز معاشرت اور عام ذہنیت میں اس قدر فرق پیدا کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی وطنیت کو بھول

تھے حضرت محمدؐ جب ہجرت کر کے یثرب (یعنی مدینہ منورہ) تشریف لے گئے تو وہاں مہاجرین کی مسلمانوں کے مسائل کا یہ انتظام کیا کہ ایک ایک مہاجر کو انصار (یعنی مدنی مسلمانوں) میں سے ایک ایک کا بھائی بنا دیا تاکہ کثرت بھی ہو اور غیر ضروری تکلیف بھی نہ ہو۔ اسے اصطلاح میں ”معاذات“ یعنی بھائی چارہ کہتے ہیں۔

گئے تھے، بلکہ بعض اقوام کی تو زبان تک بدل گئی تھی۔ یہ واقعہ بنیائیت عجیب و غریب ہے کہ قرن اول کے بعد جس تمدن کا نشوونما ہوا اس میں عربی اور عربی دونوں عناصر موجود تھے، چنانچہ اس عہد زریں میں جتنے بڑے بڑے امام، فقیہ، مدبر اور وزراء گئے ہیں ان میں سے اکثر نسلاً عجمی تھے، مگر اخوت اسلامی کی لطیفی میں اس قدر مضبوطی کے ساتھ منسلک تھے کہ ان کے واسطے اس سے علیحدگی قطعاً ناممکن تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عالمگیر ملکیت کی بنا متزلزل ہونے اور جگہ جگہ مسلمان حکمرانوں کے اپنی اپنی سلطنتیں قائم کر لینے کے بعد بھی عرصہ دراز تک ہر ایک مسلمان فرمانروا خلیفہ وقت کا ادب و احترام کرتا تھا، اور کم از کم مذہبی معاملات میں مرکز خلافت ہی کی طرف منجھتا رہتا تھا۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ۱۹۲۲ء کے خاتمہ خلافت تک ہر مسلمان خواہ وہ ہندو ہو یا مصری، ایرانی ہو یا عجمی، خلفائے آل عثمان کے مسابقت اپنا ایک خاص رشتہ تصور کرتا، گویا سیاسی حیثیت سے اسے ترکوں کے ساتھ کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلاشبہ امام نہاد خلفاء صدیوں سے عیش و عشرت میں مشغول، اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ظلم و ستم کے لئے تیار، طرز عمل میں متبدل اور اصول اسلامی سے بہت دور جا پڑے تھے، تاہم اس لحاظ ”خلیفہ“ کے ساتھ قرن اول کی اتنی روایات وابستہ تھیں کہ ہر مسلمان پر اس کا ایک خاص اثر تھا۔ یہی وہ محفل ہے جسے یورپی قوتیں ”ہم اسلامیت“ کا لقب دیتی ہیں۔ اس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان و دیگر ممالک اسلام میں تحریک ”خلافت“ کی ابتدا ہوئی جس کا مقصد حقیقی یہ تھا کہ مرکز خلافت کو انگریزوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے۔

زمانہ وسطی۔ جبکہ اسی قسم کی کیفیت یورپ میں زمانہ وسطی میں بھی پائی جاتی

ہے۔ یوں تو اپنے عروج کے زمانے میں سلطنت روما حدود ایران سے لے کر بحر ادقیاؤس تک اور رھائن اور ڈینیوب سے نیل تک پھیلی ہوئی تھی لیکن اول تو اس ابتدائی عہد میں کوئی ایسی ملکت نہ تھی جو اس کا مقابلہ کر سکتے، دوسرے ہلدیہ روما سے بالآخر اس عظیم الشان سلطنت کا انتظام نہ ہو سکا! چنانچہ پہلی صدی عیسوی ہی میں اس کے درجے کر دے گئے، ایک وہ جو روما کی نجس سینات کے زیر انتظام رہا اور دوسرا وہ جو قیصر کی ماتحتی میں آگیا۔ آٹھ سو برس تک عیسوی دنیا برابر اپنے جوئے بدلتی رہی، یہاں تک کہ ۲۵۵ء میں شہر کو روما میں چارلس اعظم کی تاج پوشی عمل میں آئی اور اس طرح اس عالمگیر "مقدس سلطنت روما" کی ابتدا کی گئی جو مختلف صورتوں اور پیمانوں میں صدیوں تک قائم رہی۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس جدید سلطنت کے ساتھ قدیم روما کی بعض روایات ضرور وابستہ ہوں گی، لیکن یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جب شہر میں ایک جدید عیسوی سلطنت کی تنظیم کی گئی تو اسی زمانے میں خلفائے نبی عباس کے زیر سیادت اسلامی عالمگیر سلطنت دن دوئی رات چوگنی تر تھی کر رہی تھی۔ اگر کوئی اندکہ کی تنظیم کا عیسوی دنیا پر اثر نہیں پڑا تو یقیناً یہ ایک ایسا عجیب و غریب تاریخی توار ہے جس کی نظیر ملنی ناممکن ہے۔ تیرھویں صدی میں جب عیسوی سلطنت کا زوال ہو چکا تھا اور جب یورپ میں اس کے علاوہ مسلمانوں کی اندکسی حکومتیں

۱۲ دیکھو برائن: "مقدس سلطنت روما" Bryce: The Holy

Roman Empire. باب ۴۔

اور یوں، 'فرانس'، 'انگلستان'، 'ہنگری' اور 'پستان' کی عیسوی سلطنتیں قائم ہو چکی تھیں۔ اُس وقت بھی دانستے الی کی ایری اسی عالمگیر سلطنت کا راگ تھا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کا مقصد اعلیٰ یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی ان دامن سے گزاردے اور جی الی کے جتنے جھگڑے پیدا ہوں وہ سب نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا جائیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ایک عالمگیر حکمران برسرِ اقتدار ہو اور اطراف و اکناف عالم کے فرمانرواؤں کے درمیان جو تنازعات ہوں ان کا وہ فیصلہ کر سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مختلف اقوام کے مخصوص قوانین میں باہمی اختلاف ہو گا، لیکن عالمگیر ملکت کا بادشاہ ان تمام قوانین کو باہم منسلک کر سکے گا اور جی الوسع ان کے باہمی تضاد کو دور کر سکے گا۔ الغرض دانستے کے نزدیک بہترین طرزِ حکومت وہی ہے جو تمام دنیا پر حاوی ہو۔

عالمگیر سلطنت کا خاتمہ۔ خواہ خلافتِ نبی امیہ و خلافتِ نبی عباس

کا اثر یورپ پر پڑا ہو یا نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ دونوں کا نشوونما، دونوں کا عروج اور دونوں کا زوال تقریباً ایک ہی طرح ہوا اور جیسے نبی امیہ کی مسند نشینی سترہویں برس کے اندر اندر جگہ جگہ نئی سلطنتیں قائم ہو گئیں اور دسویں صدی عیسوی میں طولویوں

نکالے دانستے الی کی ایری: "ملوکیت" : Dante Alighieri :

De Monarchia : باب یہ اقتباسات ڈیونگ کی کتاب "نظریات سیاسی اہمہ قدیم

دعہ بر علی : Dunning: Political Theories, Ancient and Medieval

باب و فصل ۴۴ و ۴۵ در ترجمہ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ سے لے گئے ہیں

فاطمیوں، سہانہوں، غزنویوں اور سلجوقیوں نے جگہ جگہ خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ بالکل ویسے ہی بارہویں اور تیرہویں صدی میں بلکہ اس سے بھی پہلے یورپ میں عالمگیر سلطنت کا تخیل ہی تخیل باقی رہ گیا اور فرانس، برائٹن برگ، سوئیڈن، برعوبہ، روسیہ اور ایسی بہت سی کم و بیش آزاد سلطنتیں قائم ہو گئیں، یہاں تک کہ جس طرح ہلاکو نے خلافت کا دس کی اس وقت محض خیال سے زیادہ وقعت نہ رہی تھی) ۱۲۵۸ء میں صلیب نامہ دیست فالیا پر دستخط کرنے والی سلطنتوں نے، جن میں خود نام نہاد "مقدس سلطنت روما" بھی شامل تھی، یہ اعلان کر دیا گیا کہ عالمگیر عیسوی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اس کے حکمرانوں پر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھ دی گئی ہے جس میں ہر ملک بجائے خود ایک سلطنت یا ملکت کا رتبہ رکھے گا۔

موجودہ یورپ۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ کوشش کی گئی کہ مختلف ممالک یورپ کے حدود ہی ہوں جو یہاں کی مختلف نسلیں اور مختلف زبانیں بولنے والی قوموں کے ہیں۔ لیکن سٹی یورپ میں اس اصول کے انطباق میں بہت سی قبیلہ پیش آئیں۔ ایک طرف تو ترکی سرحد سے لے کر بیوریانک اور سیستی سے دس تھک تمام علاقہ شہنشاہ آسٹریا کے ماتحت تھا جس میں روسانی، مجار،

صلیب نامہ دیست فالیا کا وہ فقرہ جس کا یہاں مطلب بیان کیا گیا ہے، اٹام وکمال ڈاکٹر لیکاک کی کتاب "مبادی سیاسیات" deacock: Elements of Political Science.

جرمن، اطالوی، ہنگری، سلوفاک، پولستانی، سرب، کروٹی، کاسو، اور بہت سی مختلف نسل اقسام آباد تھیں، اور جنوب میں ایک بڑا علاقہ ترکوں کے ماتحت تھا جس میں اسلامی عنصر غالب تھا۔ ۱۸۷۸ء، ۱۸۷۹ء اور ۱۹۱۱ء کے جنگوں کے بعد یورپ کے اسلامی نہ صرف بالکل آزاد ہو گئے بلکہ بعض جگہ مثلاً چیخوسلوواکیا میں تو غیر اسلامی آبادی پر بھی تسلط ہو گئے، اور آج بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جو پرانی سلطنتیں باقی ہیں یا نئی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان میں ہمیشہ ہم زبان، ہم مذہب یا ہم نسل قوموں کو ایک ہی ملکت کے ماتحت رکھا گیا ہے۔ مگر دراقوام پر تسلط یا غیر ملکیوں پر قبضہ آج بھی اتنا ہی قابل ستائش سمجھا جاتا ہے جتنا ۱۸۷۸ء سے پیشتر جنوبی یورپ کا اٹلی میں الحاق، آسٹریا اور شہر وائسٹک کی جرمنی سے جبراً علیحدگی، ہیمنسواہ پر رومانیوی تسلط، زنجیرہ کارپے تھیں کے جرمانیوں کا چیخوسلوواکیا میں شمول، ایک بہت بڑی ترکی آبادی کا حسب سابق روس، رومین اور بلغاریہ کے ماتحت رہنا، یہ اور بہت سی دوسری مثالیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپی ذہنیت میں زیادہ فرق پیدا نہیں ہوا۔

اگر زندہ اجسام سیاسی کی قطع و بید کی بابت معلومات حاصل کرنے ہوں تو کتاب "خفیہ عہد نامے" مؤلفہ سیمور کوکس *Seymour Coxe: The Secret Treaties* کا مطالعہ خالی از لطفی نہ ہوگا۔ نیز حال ہی میں منچوریا پر جاپان کے اور جسنہ پراٹھی کے قبضے سے نیز بحیرہ روم کے مشرقی و مغربی حصہ پراٹھی کی ریشہ دوانیوں سے ظاہر ہو گیا ہے کہ اچھی دنیا آزادی کے اصول سے کس قدر دور ہے۔ ۱۹۱۸ء میں منچور "رہنمائے جرمنی" کے (لقبہ منچور) کے

مملکت کے حدود - مفصلہ بالا حالات سے یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ مملکت

کاخیل (ننداد) مانہ سے برابر تبدیل ہوتا رہا ہے، اور قبائلی تعلقات، مذہبی رواج یا
جغرافیائی کیفیات اور جنگی فتوحات کے ذریعے سے مملکتوں کی شیرازہ بندی ہوتی آئی ہے۔
بلاشبہ کسی انسانی اروے کے متعلق کوئی قطعی حکم لگانا ناممکن ہے اس لئے یہ نہیں
کہا جاسکتا کہ مملکت کے حدود آخر کیا ہونے چاہئیں؟ تاہم خواہ رشتہ آفریں کوئی بھی
کیفیت ہو، اس میں شبہ نہیں کہ زور دار اور دیر پا مملکت کے لئے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ
جس قدر ممکن ہو اس میں ہم جس کیفیات زیادہ ہوں، اور اگر مملکت میں مختلف اجنس
قومیں ہوں تو پھر ان کے لئے باہمی تعاون و تعامل کی خواہش بالکل لازم و ملزوم ہے
ورنہ اس کے بغیر مملکت ایک دن کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان
حصہ جات دنیا کا میلان، جہاں آزادی و خود مختاری کا احساس غالب ہے، ہم زبان
ہم نسل مملکتوں کی طرف زیادہ ہے، اس لئے کہ ان ہی دو کیفیات سے ہماری امید
بندھ سکتی ہے۔ اگر ان کا بھی فقدان ہو اور ساتھ ہی لوگوں میں باہمی اتفاق کی کیفیت بھی
حد سے بڑھ گئی ہو یعنی تعامل کی خواہش جاتی رہی ہو یا پیدا ہی نہ ہوئی ہو تو مملکت کا
خیال محال سے زیادہ وقت نہیں رکھتا۔

واقیہ مذکور (آسٹریا اور چھ سو ناکہ کے جرمن حصے کو ملحق کر لینے سے وٹنی پرپ کے ایک
بڑے حصے کا کم از کم نسلی مسئلہ تو طے ہو گیا۔

باب ۵ خواہشِ تعالٰی

خواہشِ تعالٰی کی ہمیت - نسل - زبان - مذہب - جذبہ تعالٰی
خواہشِ تعالٰی کی اہمیت - اس سے قبل مملکت کے لازمی اجزاء کے
سلسلے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اہم ترین محرکین مملکت میں سے باشندوں کی خواہشِ تعالٰی
بھی ہے۔ یہ عنصر اس درجہ اہم ہے کہ اگر باقی تمام لوازمات مملکت موجود بھی ہوں اور
افراد آبادی میں باہمی تعالٰی کا جذبہ نہ ہو تو مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ خواہشِ تعالٰی کے
یعنی نہیں کہ باشندوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف رائے نہ ہو، اس لئے کہ یہ ممکن
ہے کہ لاکھوں، کروڑوں باشندے ہر معاملے پر مکمل اتفاق رائے رکھتے ہوں، بلکہ
اس سے صرف یہ مراد ہے کہ مملکت کے قیام و استحکام کا سوال پیدا ہوتا ہے ہر فرد
خواہ اس کی کوئی بھی رائے کیوں نہ ہو، ایک دوسرے کا ہمزبان ہو جائے گا اور اس
کی بقا اور آزادی پر اپنے آپ کو قربان کر لئے سکے لئے تیار ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے
ہیں کہ دنیا میں ایسے ممالک موجود ہیں جہاں خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے، لیکن چونکہ
ان کے باشندوں کا مطمحہ فقر ایک نہیں اس لئے سترن بساطِ عالم میں ان کے لئے کوئی
جگہ نہیں! اس کے برعکس ایسے ملک ہیں فقر آئے ہیں جہاں بظاہر مختلف نسلیں آباد

ہیں، مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، مختلف مذاہب مانجے ہیں، لیکن چونکہ ان سب باتوں کے باوجود باشندوں میں ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی تعالٰی کا جذبہ موجود ہے اس وجہ سے وہ مملکت کی شکل میں ترقی کے راستے پر گامزن ہیں۔

نسل۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون کون سی خصوصیات ہیں جن سے یہ خواہش تعالٰی پیدا ہوتی ہے۔ ان میں سب سے پہلے تو نسل کو لیجیٹیمٹیشن مشہور ہے کہ خون کے جوش کے آگے کچھ نہیں رہتا، یعنی جب خون ایک ہوگا تو انصاف و اتحاد کا امکان قوی ہو جائے گا۔ بادی النظر میں مجذوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایک قبیلہ والے متحد ہو کر ایک جگہ رہتے ہیں اسی طرح اگر نسل ایک ہو تو گمان غالب ہے کہ لوگ متحد ہو کر سیاسی معاشرہ یعنی مملکت قائم کریں گے۔ یوں تو انقلابِ فرانس سے نسل، قوم اور مملکت تقریباً ہم معنی کیفیات شمار کی جاتی ہیں، لیکن حال کے زمانے میں جب سے جرمنی میں نازی فزق برسرِ اقتدار ہوا ہے، اس تخیل میں بہت زیادہ قوت پیدا ہو گئی ہے اور ہمارے کان جرمینی اور اس کے آمرانہ کی نسلیت اور ابا بیت کی آوازوں سے سن ہوئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ٹھنڈے دل سے

مثلاً دیکھو "رِیٹل" نسل، "ہینٹ اور روح" *L. G. Trala: Race, mind and soul* اسی اصل پر انجمن "سبائین یورپ" *Friends of Europe* نے حال ہی میں ایک چھوٹا سا کتابچہ "نسلیت" *Racialism* کے نام سے شائع کیا ہے جس میں ٹیڈ کی کتاب "میری جدوجہد" *Hitler: Mein Kampf* کے وہ اقتباسات درج ہیں جن پر نازیہ حال کی جرمن "آریہ" نسلیت کا دار و مدار ہے۔

دیکھیں تو یہ سب ایک بہت بڑا ڈھکوسلا ہے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان ملکوں میں بھی، جہاں کے باشندے غیروں کے ساتھ شادی بیاہ کرنے سے احتراز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہاں کے خون میں بھی میل نہیں ہے، کوئی ایسا ملک ہے جس پر کبھی نہ کبھی باہر والوں کا حملہ نہ ہوا ہو اور جہاں کی عورتوں کے ساتھ ان حملہ آوروں نے جنسی تعلقات پیدا نہ کئے ہوں؟ انگلستان، واسے کیلیفورنیا، برطانیوں، (فرمنیوں) آئرلینڈ اور جرمنوں کی اولاد ہیں، تو جرمن فرماؤں، اسلانیوں، تھائیوں اور جنوبیوں سے یہاں ہیں۔ ہندوستان کے باشندوں کو نسلیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ایک طرف ایرانی اور یونانی خون ہے تو دوسری جانب مغول اور دھڑاڑی آثار پائے جاتے ہیں۔ ہندی ہٹالوں میں سے شاید کسی کو اس سے زیادہ اپنی بے میل "شرافت" پر فخر نہ ہوگا جتنا یہاں کے پٹھانوں کو، لیکن کوئی ایسی قوم ہے جس نے ہندوستان پر شمال و مغرب سے حملہ کیا ہو اور حق امتنان ایسا اپنے اثرات نہ چھوڑے ہوں؟ بعض ایسے ممالک بھی نظر آتے ہیں جو ایک دوسرے کے ایک حد تک ہم نسل ہیں لیکن جن میں سے ہر ایک کو سیاسی تفرد حاصل ہے۔ ایسی مثالیں سوئیڈن اور نوروے، جرمنی اور آسٹریا، چلی اور پیرو اور بہت سے دوسرے ممالک میں ملے گی۔ الغرض ایک طرف تو کسی رشتے کے باشندوں کا کلیتہً ہم نسل ہونا ہی دشوار ہے، اور دوسری جانب محض ہم نسل ہونے سے کوئی حجب و لارزہ متقدّمین نہیں ہوتا، نہ اس کی وجہ سے بغیر دوسرے عناصر کے وجود کے مملکت ہی قائم ہوتی ہے۔

نہ بالان - دوسرا عنصر جراثیم کے اتحاد و اتفاق میں مدد دیتا ہے، زبان

ہے۔ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اور حال کے زبان میں ہندوستان میں اس مسئلے نے صحیح طور پر ایک خاص اہمیت حاصل کر لی ہے۔ زبان وہ عنصر ہے جس کی مدد سے ایک انسان دوسرے کے سامنے اپنا مطلب آسانی سے ادا کر سکتا ہے۔ اگر ہم تاریخ عالم پر نظر ڈالیں تو ایک تمدن کے ایک وسیع رقبے میں پھیلنے میں کسی ایک عنصر نے شکل سے اتنی مدد دی ہوگی جتنی زبان نے، اور اس کے زور سے بڑے بڑے ممالک کو سرنگوں ہونا پڑا ہے۔ مثلاً دو زبانوں یعنی عربی، اور فرانسیسی کو لیجئے۔ عربی ایک خانہ بدوش قوم سے نکلی، لیکن ایسی قوم سے جو اپنی زبان پر فخر کرتی تھی کہ جو اسے نہ بول سکتا تھا اسے ”عجمی“ یعنی گورنگا کہتی تھی۔ اپنے دلس سے نکلی کر اس نے اپنا سکہ جانا شہر و مع کیا، عراق اور شام، مصر، الجزائر اور مراکش تک اس قدر رخنہ ہوئی کہ عراقیوں، شامیوں، قبطیوں، بربروں اور مغربیوں کو بالکل غربادیا، یہاں تک ان قوموں اور اصل عربوں میں شکل سے کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ مشرق کی سرزمین میں ایران، مادر اللہ اور وسطی ایشیا میں جہاں ایک عظیم الشان ایرانی تمدن پہلے سے موجود تھا۔ عربی اصل زبانوں کو شکست دے گئی لیکن وہاں کی علمی زبان بن گئی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں عربی زبان کی بہت سی تصانیف عجیبوں سے ملتی ہیں۔

فرانسیسی زبان بھی کسی زمانے میں یورپ کے تمدنی اتحاد کا ایک بڑا ذریعہ بن چکی تھی۔ شاید ان خدوین میں فرانسیسی کے زبردست دشمنوں میں سے ایک۔ فرانسیسی عظیم الشان پریشا تھا، لیکن آج بھی اس کے حملے و تیشے پورے کام چلا رہے ہیں۔ حالانکہ فرانسیسی زبان کے معنی ”بلا فکلیٹہ“ کے ہیں، حال میں داخل ہوتے

ایک پوری سمت فرانسیسی فلسفی اور انقلاب فرانس کے پیشرو دانتون کے لئے وقف نظر آئیگی، آگے بڑھو اور فریڈرک کے کتب خانے کی کوئی الماری کھولو تو اکثر کتاب فرانسیسی زبان میں بھی نظر آئیں گی۔ انھیں فرانسیسی زبان فرانسیسی تہذیب کو نہ صرف یورپ میں بلکہ ایران و ترکی کے ملک میں بھی پھیلانے میں مدد ہوئی اور رفتہ رفتہ واحد بین الاقوامی زبان بن گئی۔ خود فرانس میں ایک نوزائیدگی کی عصبیت کی وجہ سے یہ ملک جواز منہ سٹلی، اسپینول، جاگیرون، بنٹیم، ٹھا، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی مرکزیت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے وہ نسبتاً آسانی سے یورپی ملک کی صف میں آگیا۔

لیکن غیر ملک میں اس قدر اثر پیدا کرنے کے باوجود فرانسیسی زبان، بلعینم اور مغربی سوسائٹیاں کو فرانس میں مدغم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی اور آج بھی باوجودیکہ وہ ان دونوں ملکوں کے ایک معتد بہ حصہ کی مادری زبان ہے تاہم یہ فرانس سے بالکل آزاد ہیں۔ اسی طرح صدی ہادی تک جرمن زبان بولنے والے سیکڑوں ریاستوں میں مقیم رہے، اور سنہ ۱۹۱۴ء تک جرمنی اور آسٹریا کے باشندے، اگر یہ سب کے سب ایک ہی زبان بولتے تھے، سیاسی اعتبار سے یہ قدر نظر نہیں ہوئے، مادھر کوہ فرانس کے اس پار جانو تو دیکھ گئے کہ اس بیسویں صدی عیسوی میں جب ہر طرف قومیت کا ڈھنگ راسخ ہے، کس طرح ہمسائی جوسب کے سب نظر بیا ایک ہی قسم کی برائیاں بولتے ہیں، ایک دوسرے کے سبکے کاٹ رہے ہیں۔

”Sans Souci“

(صفحہ ۷۰)

پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دو مختلف النوع زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی طور پر مدغم ہو جائیں۔ ویلز کی زبان انگریزی سے اتنی ہی مختلف ہوگی جتنی برہم زبان سے اردو، تاہم ویلز اور انگلستان کے درمیان سات سوہریں سے جو سیاسی یکجہ رنگت ہے وہ دوسروں کیلئے باعثِ رشک ہے۔ یہی کیفیت برٹنی اور فرانس کی ہے جہاں کی زبانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلجیم میں دو زبانیں یعنی فلیمش اور فرانسیسی بولی جاتی ہیں، کناڈا اور بنجالی افریقہ میں دردو زبانیں سرکاری طور پر تسلیم ہیں اور روس میں تو جتنی ریاستیں شامل ہیں اس سے زیادہ زبانیں مانگے ہیں۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں مختلف زبانیں بولنے والوں کا ایسا عجیب و غریب ذخیرہ نہیں ملے گا جیسا ممالک متحدہ امریکہ میں، تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ مشکل سے کسی ملک کے باشندوں کے درمیان اس قدر اتفاق و اتحاد ہوگا جتنا اس ملک میں۔

۱۵۵۔ اسپین میں اب بھی شمالی و مغربی باسک، وسطی قشتالیہ، مشرقی قشتالیہ اور جنوبی اندلس کے بولنے میں معنہ برفرق ہے۔

۱۵۶۔ ممالک متحدہ امریکہ کی مختلف النوع آبادی کا اندازہ اس سے ہو جائے گا کہ صرف ریاست نیو یارک میں غیر زبانوں کے رسالہ جات و اخبارات کی تعداد ۱۲۵۰۰۰ میں حساب کی گئی تھی۔

ہسپانوی ۱۴، اطالوی ۲۶، جرمن ۱۱، پولش ۹، فرانسیسی ۶، جیغوسلواک ۴، عربی ۴، پرتالی ۳، سویڈش ۳، پرتگیزی ۱، یوگوسلواک ۵، چینی ۳، روسی ۵، عبرانی ۱، بیش ۱۶، جاپانی ۱، ویلز ۱، روسی ۱، روٹش ۱، ڈنمارکی ۱، لٹھوانی ۳، رومانی ۴، یوکرینی ۱، دیگر ممالک

میرین - ۱۲۵۰۰۰

ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی اتحاد کے لئے سانی اتحاد لازمی نہیں ہیں اور سانی اتحاد کے باوجود ایک ہی زبان بولنے والوں کا متعدد آزاد ملکوں میں منقسم ہونا ممکن ہے۔

مذہب۔ تیسرے عنصر جسے مملکت کے قیام میں مدد و معاون سمجھا جاتا ہے مذہب ہے، یہ ایک عزیز ناک واقعہ ہے کہ گو ہر مذہب دنیا کو امن و امان کا سبق دینے اور نبی نوع انسان میں بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے لیکن اکثر چونکہ اپنے اخلاقی اصول اور بود و ماند کے طریقوں کی وجہ سے وہ ایک مخصوص تمدن کا علمبردار ہو جاتا ہے اس لئے اس کے نام لیراؤں اور دوسرے مذاہب کے پیروں کے درمیان تفریق پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک مذہب دوسرے مذہب واپس واپس پر تفریق حاصل کرنے کے لئے خون کی ندیاں بہا دیتے ہیں۔ تاریخِ عالم کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ مذہب کسی زمانے میں مملکت کی بنیاد بن چکا ہے، چنانچہ اشوک اعظم کی سلطنت، خلافت اسلام اور مقدس سلطنت روم "ایک بڑی حد تک مذہبی اصول پر قائم تھیں" اور جن افراد کا مذہب حکومت کا مذہب ہوتا تھا انھیں مملکت میں ایک خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا۔ لیکن جیسا ہم ایک ایندہ باب میں زرا تفصیل سے بیان کریں گے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مذہب کو مملکت کے احکام کے لئے بہ نسبت ایشیا کے یورپ میں زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ یورپ کے تقریباً ہر ملک کی تاریخ میں مذہبی سختیوں کی بے شمار مثالیں ملیں گی حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ پلایا

جانا، عیسوی مذہب کے ابتدائی سین میں عیسائیوں کے ساتھ غایت بے رحمی کا برتاؤ پھر چارلس اعظم کا جرمنی کو بزورِ شمشیر عیسائی کرنا، ہسپانوی مسلمانوں اور عثمانی ترکوں کے ساتھ صرف اس وجہ سے سختی کا برتاؤ کہ وہ مذہباً مسلمان تھے، انگلستان کی ملکہ میری کی اور ملکہ الیزبتھ کے عہدوں میں روٹن کی بچھ لگ اور احتجاجیوں کا ایک دوسرے کے خلاف سخت ترین تشدد، پیرس میں شہرِ بارتولومیو کے دن والا قتل عام ایسی بے شمار مثالوں سے تاریخِ یورپ بھری پڑی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغرب میں مذہب کی کس طرح سیاسی تفوق کا آلہ کار بنایا گیا۔ مشرق میں جب کبھی ایک مذہب والوں اور دوسرے مذہب والوں کے درمیان آویزش ہوئی ہے تو وہ مذہبی تفوق کے خاطر نہیں بلکہ محض سیاسی تفوق کی خاطر، اور ایسے زمانوں میں بھی (جیسے خلافتِ نبوی ائمہ دینی عباس کا زمانہ) جب حکومت کی بنیاد مذہبی اصول پر تھی، دوسرے مذہب والوں کے ساتھ انتہائی رواداری برتی گئی ہے۔ حال ہی میں جب انگریزوں نے ترکوں سے ارضِ فلسطین کو فتح کیا تو اسے "آخری صلیبی جنگ" کا لقب دیا گیا تھا، اور آج بھی لاکھوں یہودی، جرمنوں کو اپنے پشتینی جنم بوم کی بحال دیا گیا ہے اور جو رہ گئے ہیں ان کے لئے دنیا تنگ کر دی گئی ہے۔ آزادی اور رواداری کی سب سے بڑی بنیاد انگلستان کو تصور کیا جاتا ہے لیکن اس ملکیت کے انتظام و انصرام میں مذہب کو خاصہ دخل ہے۔ نہ صرف یہ کہ دارالامرا میں کلیسے انگلستان کے تیس عہدِ نشست کرتے ہیں اور کنیٹر برٹنی کے صدر اسقف کو پریوی کونسل میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے، بلکہ قانونِ بندر بست سائنس کی رو سے بادشاہ انگلستان کے لئے کلیسا کے انگلستان کا پیر دہونا

لازم قرار دیا گیا ہے، چنانچہ اگر شاہ انگلستان کلیسا سے انحراف کریں تو انہیں تخت کو خیر باد کہنا پڑے گا۔

ہاں ہم یہ نہیں کیا جاسکتا کہ آج کل مملکت کا قیام مذہبی بیگانگی کی وجہ سے عمل میں آتا ہے۔ اصلاً مذہب کا تعلق انسان کی ذاتی ضمیر اور اس کے ذاتی اخلاق سے ہے، اور اگر انفرادی اخلاق ہی سے تمدن کی ترکیب ہوئی ہے تاہم ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے ملکوں میں روز بروز مذہب، ایک اجتماعی کیفیت سے نکل کر محض انفرادی تاثرات کی طرف گامزن ہے۔ کسی زمانے میں جب عقیدے کو مذہب میں آج سے زیادہ دخل تھا یہ ممکن تھا کہ انسانوں کے بڑے بڑے عظیم انسان مجموعوں کو مذہب ایک دیر پا سیاسی رشتے میں منسلک کر دیتا ہو، لیکن آج کل جب عقیدے پرستی دلائل کا غلبہ ہو چلا ہے اور تقریباً ہر شخص کے مذہب کا تخیل جدا گانہ ہونے لگا ہے تو مذہب انسانوں کی مجموعی کیفیت کو مستحکم نہیں کر سکتا اور رجحان ایک حد تک اس طرف ہے کہ مذہب سیاسیات سے بے تعلق ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل سیاسی اصطلاح میں جسراہز سے ”مذہب“ کا لقب دیا جاتا ہے وہ برائے معنی میں مذہب نہیں بلکہ ایک خاص قسم کے تمدن کا نام ہے ہندوستان ہی کو لیجئے۔ یہاں بہت کم ایسے مسلمان رہنما ہیں جو اسلامی سیاسی اصول پرستی سے عمل کرتے ہوں لیکن جب کبھی سرکاری خدمات یا مجالس مقننہ پیش کشوں

۱۹۵۱ء و ۱۹۵۲ء میں دو صدراعظم اور ۱۹۵۳ء میں سابقہ نخست کرتے ہیں۔ دیکھو آئیں ”توازن و تنوری“
جدا باجہ قانون بدولت کے لئے دیکھو ٹیبل ”ناشرینہ“ Select Charters: S. 10

کے تنا سب کا مسئلہ آتا ہے تو ان ہی رہنماؤں کی آوازیں سب سے بلند ہوا کرتی ہیں۔ ایسے رہنماؤں کی پیروی میں جو نقص ہے وہ یہی ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اصول سے انحراف کیا جاتا ہے اور دوسری جانب اسی مذہبی اصول کے نام پر حقوق طلب کئے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے کوئی ذریعہ ان کی بات کو سنجیدگی سے سننے یا اس پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ان اصحاب کا قصور نہیں بلکہ جیسا اور بیان کیا جا چکا ہے مذہبی سیاسی اصول میں وہ جذب نہیں رکھتا کہ اس کے ذریعے سے انسانوں کے سیاسی حقوق میں استحکام کی کیفیت پیدا ہو۔ عیسائی اپنی مذہب کے سیاسی اصول کو، جس کے بموجب انھیں سیاسیات سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے، صدیوں سے چھوڑ بیٹھے، ہندو اپنے سیاسیات کو مدت ہوئی چھوڑ دیں سے چھین چکے اور یہ امر کچھ تعجب خیز نہیں کہ مسلم عوام بھی اسی راستے پر چل پند کر رہے ہیں۔

۷۵ حضرت عیسیٰ کا فرمودہ تھا کہ ”جو قیصر کا ہے وہ قیصر کے سپرد کر دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کے“
 ۷۶ ۱۶ اپریل ۱۹۷۹ء کو مسٹر محمد علی جناح نے اپنے ایک بیان میں صاف کہہ دیا کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی کسی مذہبی جماعت نہیں بلکہ وہ ایک فاضل سیاسی جماعت ہے۔ اس کے تین ہی روز بعد ان کی شہر شکر آبادیہ ڈاکٹر لکھنوی نے ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت جس چیز کی ضرورت ہے وہ خدا کا دھیان لگانا نہیں بلکہ ملک کا دھیان لگانا ہے۔ اسلامی سیاسی اصول کے لئے دیکھو مولف کا رسالہ ”اسلامی دولت و امہ کی ابتدا“ Sherwari: The Origin of Islamic polity. حیدر آباد دکن ۱۹۷۹ء

جذبہ تعالٰی - مختصر یہ ہے کہ اگر سیاسی اتحاد و اتفاق کے اصول کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز انسانی جمہوروں کو قائم و مستحکم کرتی ہے وہ کوئی موضوعی عنصر مثلاً زبانِ نس یا مذہب نہیں بلکہ ایک خالص معنوی جذبہ تعالٰی ہے۔ جیسا ایک فاضل فرانسیسی نے لکھا ہے، 'سیاسی اتحاد و اتفاق کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ باشندگان ملک کے مقاصد حق پر مبنی ہوں، دوسرے ان کے قلب میں جوش اور گرمی ہو اور تیسرے ان کا مجموعی ضمیر ایک مخصوص اخلاقی کیفیت پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت کے قیام کے لئے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ باشندگان ملک سچے دل سے مملکت کے ہی خواہ ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ ہر ایک کا طرز کار ایک سا ہو، لیکن جب تک ملک کا مقصد یہ ہو کہ وہ دل کر مجموعی طور پر ایک مملکت قائم کرے کے لئے کوشش کرے اور قیوت کسی قسم کا استحکام قطعاً ناممکن ہوگا۔ دوسرے ضرورت اس کی ہے کہ باشندوں میں قلبی جوش ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مملکت اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتی جب تک ملک والے وقت آنے پر اپنے تن، من، دھن سے اس کی آزادی اور ترقی کے لئے قربان ہو جانے کے لئے تیار نہ ہوں۔ محض زبانی جمع خرچ سے کام نہیں نکلتا، اور ہر مملکت کی تاریخ میں ایسے زمانے آتے ہیں جب مملکت کی بقا کی خاطر ہر طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑتی ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی

۵۹ ریناں: "تو کیا ہے؟" *Reman: Qu'est ce qu'une nation?*

۵۹ جیسا قرآن مجید ۲، ۱۵۵ میں آیا ہے، "اور تم تمہارا امتحان کریں گے دُر سے اور بھوک سے اور اہل جال اور بھول کے نقصان سے" (وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِمِثْلِ مَا كُنتُمْ تَرْجُونَ وَلَنَجْعَلَنَّ مِنَ الْمَوْلَىٰ اِلَآ نَفْسٍ وَنَعْمَ اَمْرًا)

یکفیت ہونی چاہئے کہ جہاں تک ملک کی بہتری اور دشمن سے بچاؤ کا تعلق ہے،
 باغیہ گان ملک اپنے اپنے ذاتی مفاد کی بجائے مشترک مفاد کو مد نظر رکھیں اور ملک
 کے اجتماعی مفاد کے ساتھ ان کا انفرادی تعلق حق اور صداقت پر مبنی ہو۔

یہ سب امور دو الفاظ میں شامل ہو سکتے ہیں، یعنی خواہشِ تعالٰی، اور یہی
 وہ چیز ہے جس کی قیامِ مملکت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر کسی ملک
 والے ایسے گروہوں میں تقسیم ہوں جن کا نقطہ نظر ایک دوسرے سے متضاد ہو اور جو اپنے
 ملک کی خاطر قربانیاں کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، تو ایسی حالت میں باوجود قدرتِ الہی
 کی دی ہوئی قسم کی نعمتوں کے وہ ملک مملکت کے رستہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ مثلاً دنیا میں
 کسی ملک کی اتنی آبادی نہیں ہے جتنی چین اور ہندوستان کی، لیکن یہاں کے باشندوں
 میں باہمی تعالٰی کی خواہش کے فقدان کے باعث یہ دونوں ملک دنیا کے خود دار اور
 مستمرانِ ممالک میں کی صفِ آخر میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے ممالک
 جیسے، 'فرض کیجئے'، سوویتان، بھیم اور بہت سے دوسرے ممالک ہیں جہاں کے
 لوگ باوجود انجیلی، لسانی اور مذہبی اختلاف کے اپنی اپنی مملکتوں کے قیام و استحکام
 کے لئے دوش بدوش کو شاں ہو کر ترقی کی شاہ راہ پر چلتے والوں کی پہلی صف میں نظر
 آتے ہیں۔ بلاشبہ اگر آبادی اپنے آپ کو ہم نسل سمجھے یا ان کی زبان یا مذہب ایک
 ہو تو یہ عناصر خواہشِ تعالٰی کے پیدا ہونے میں مدد ہوں گے۔ لیکن جیسا ہم دیکھ چکے ہیں،
 اس خواہش کے لئے درحقیقت نہ ہم نسل ہونے کی ضرورت ہے نہ ہم لسان ہونے کی
 نہ ہم مذہب ہونے کی۔

Sovereignty SOVEREIGNTY

باب ۶ اقتدارِ اعلیٰ

اجتماعی کیفیت کی اہمیت - اجتماعی قوتِ ارادی خصوصیاتِ اقتدارِ اعلیٰ - تکثیری نظریہ
 علی اقتدارِ اعلیٰ - ہیئتِ حاکمیت کی تنظیم، تفویض و تحدید - مناسط - اقتدارِ اعلیٰ کا تعین -
 اجتماعی کیفیت کی اہمیت - ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہیں کہ
 انسان کی دو حیثیتیں ہیں، ایک تو اس کی انفرادی حیثیت دوسرے اجتماعی حیثیت
 اور علومِ عمرانی میں اس کی خالص انفرادی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف اجتماعی
 حیثیت پر غور کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ امور
 علومِ عمرانی میں شامل نہیں سمجھے جاتے جن کا تعلق فرد کی ذات محض سے ہو اور
 جن میں فرد کے تعلقات دیگر افراد کے مجموعوں سے نہ دکھائے جائیں۔ سیاسیات
 بھی علومِ عمرانی میں سے ہیں، اور عیسایہ علم کی تعریف کے ضمن میں دکھایا گیا ہے
 اس میں انسان کی ایک ایسی اجتماعی کیفیت پر بحث کی جاتی ہے جس کا شاید
 اہم ترین عنصر تعامل، ترتیب و تنظیم ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ سب انسان ایک سے نہیں ہوتے، کوئی عقلمند سب سے تو
 کوئی بوقوفا، ایک امیر سب سے دوسرا غریب ہے۔ اسی طرح بعض افراد میں نظرِ تازہ ترتیب

”تنظیم کا مادہ ہوتا ہے، بعض میں اس مادہ کا کلمہ ”نقدان“ ہوتا ہے، اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو ترتیب و تنظیم کے ساتھ کسی تنظیم کیفیت میں خود اپنا بول بالا رکھنا چاہتے ہیں۔ شیخ سعدی شیرازیؒ نے خوب فرمایا ہے:-

| | |
|-----------------------------|------------------------------|
| کیکے پاسبان و کیکے پادشاہ | کیکے دادخواہ و کیکے تاج خواہ |
| کیکے نشادمان و کیکے دروہند | کیکے کامران و کیکے مستمند |
| کیکے باجدار و کیکے تاجدار | کیکے سرفراز و کیکے خاکسار |
| کیکے بر حصیر و کیکے بر سریر | کیکے در پلاس و کیکے در حریر |

| | |
|----------------------------|-------------------------------|
| کیکے در جہانِ جلالتِ میسر | کیکے در کمنہِ حوادثِ اسیر |
| کیکے در گلستانِ راحتِ مفیم | کیکے با غم و رنج و محنتِ ندیم |

کیکے مقبل و عالم و ہر شہسار
کیکے مدبر و جاہل و شر مشہار

غرض اگر ایک ہی مقام کے جملہ افراد کو باہم سیاسی طور منسلک ہو جائے گی نہایت کر کے بھڑدیا جائے اور کسی قسم کا تہدید ہی عمل روانہ رکھا جائے تو اس جماعت کے افراد میں جو لوگ اپنی سیادت کے خواہاں ہیں ان میں بلاشبہ لڑائی جھگڑے، بلکہ شاید کشت و خون تک کی نوبت آجائے گی، اور اگر بالفرض کوئی شخص اتنا خود غرض نہ بھی ہوتا یہ ہم ان اصولوں کی بابت اختلاف ہونا اور اس اختلاف کی وجہ سے جھگڑے پیدا

ہونا لازمی ہے، جن پر نئی مملکت بنی ہوگی۔ بہر حال خواہ کوئی بھی صورت حال پیدا ہو، سیاسی انسلاک باہمی، یعنی مملکت کے ساتھ کسی نہ کسی عظیم الشان تہذیبی قوت کا قیام قطعاً لازم ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان کی اجتماعی کیفیت قائم رہ سکتی ہے نہ مملکت، اور نہ ایسی جماعت پر (اگر اسے جماعت کا لقب دیا بھی جائے) علم سیاسیات کا انطباق ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وہ قوت ہے جس کو اقتدارِ اعلیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتیں دونوں اس کے وجود کے لازمی اجزاء ہیں، اور ان دونوں میں سے کسی سے بھی وہ گریز نہیں کر سکتا بلکہ اس کے خاتمہ تک یہ برابر قائم رہتی ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بہت سے امور ایسے پیش آتے ہیں جن میں انسان کا ذاتی مفاد اس کی جماعت کے مفاد سے ظاہر مختلف ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے مفادوں کے درمیان ولادت سے وفات تک ایک عظیم الشان کشمکش جاری رہتی ہے، اور کبھی ایک کا پتہ بھاری نظر آتا ہے کبھی دوسرے کا۔ انسان کا فی نفسہ کسی جماعت کا مستقل رکن بننا اس کا مقتضی ہے کہ جب کبھی ان دونوں میں باہمی مخالفت نظر آئے اور ساتھ ہی سیاسی جماعت کا مفاد اس جماعت کے قیام و استحکام کے لئے لازمی ہو، تو وہ اپنے ذاتی مفاد کو اس اجتماعی مفاد پر قربان کر دے۔ لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ہر شخص کا سیاسی احساس جداگانہ ہے بعض از خود اپنے نفس کو مارنے یعنی ایثار اور سیاسی قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں اس طرز عمل پر آمادہ کرنے کے لئے جبر کی ضرورت ہے۔

اور جب تک ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو ہر کن سلطنت پر مساوی طور پر عادی ہو اس وقت تک مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔
اجتماعی قوتِ ارادی۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو مملکت میں بائندہ ملک کی اجتماعی کیفیت ہی مملکت میں سب سے زیادہ قوی و ذی اقتدار ہوتی ہے اور یہی الحقیقت مملکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ چونکہ بعض افراد صاحبِ وسائل ہوتے ہیں، بعض قوی ہوتے ہیں، بعض ذی اثر ہوتے ہیں، بعض کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہوتا ہے، اس لئے اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ افراد کے سیاسی رشتہ کو ملک اور اجتماعی کیفیت کو قائم رکھنے کے لئے خود جملہ باشندوں کی اجتماعی قوتِ ارادی سے کام لیا جائے تاکہ ہر کس و نا کس، بڑے اور چھوٹے کی انفرادی خواہشات و عادات پر غلبہ پانے کا امکان ہو، ورنہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، مرکزِ گریز قوتیں اپنے عمل سے مملکت کو قائم نہیں رہنے دیں گی۔ یہی وہ تخیل ہے جسے مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کا لقب دیا جاتا ہے اور جسے ہونہر و لغو ذہان (بائتھ) فرد کے اعلیٰ کے مقابلے میں "مجدود فانی" کا لقب دیتا ہے۔ مملکت کے اسی اقتدارِ اعلیٰ کے

لکھ وڈروڈن نے اپنی کتاب "موسم" مملکت *Woodrow Wilson: The State* باب ۱۴ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس لفظ کا مطلب یہ کیا خوب کہا ہے کہ "انضباط سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہر ایک شخص کے لئے ہر شے کی

ملکہ" یہ آیتھن *Democracy* باب ۱۴ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس لفظ "انتہائی" کے اعلیٰ اور بہت سی چیز (وقت) ہے۔ غام طور پر اس سے مراد زیادہ تر بادشاہ (بقیہ صفحہ ۸۱)

مطلق علامہ ابن خلدون نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ مملکت میں ایک عصبیت تمام عصبیتوں سے قوی اور پر زور ہوتی ہے، اسی وجہ سے وہ سب پر غالب آتی ہے اور تمام عصبیتیں اس میں شامل و دخیل ہو جاتی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ”یہ عصبیت عام ایسی چیز کے مزاج کی مانند ہے جس کی نگوین مختلف عناصر سے ہوتی ہے، لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جملہ افراد کے انفرادی حیثیات لازماً انفرادی میلانات کے مجموعے کے مترادف ہوں گے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ مک کا مفاد بہت سے امور میں بائندگان مک کے انفرادی مفاد سے مختلف ہوتا ہے۔“

انفرض جیسا اس سے پیشتر بیان کیا جا چکا ہے، مملکت کے قیام کے لئے حاکم و محکوم دونوں کا ہونا لازمی ہے، محکوم تو باشندگان ملک بحیثیت افراد کے ہوتے ہیں اور حاکم نہ اقتدار ان ہی باشندوں کی اجتماعی سیاسی کیفیت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، اور یہی کسی مملکت میں اعلیٰ ترین اقتدار ہے۔

خصوصیات اقتدار اعلیٰ مملکتی اقتدار اعلیٰ کی اس توضیح کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خصوصیات اور لوازمات مختصر طور پر بیان کئے جائیں۔ ظاہر کر

بقیہ صفحہ ۸۰۔

بازمانہ کی ذات سے لی جاتی ہے۔ سیاسی اعلیٰ اصطلاح میں یہ وہ شخصیت ہے (مفرد یا مرکب) جو تمام ادارات مملکت پر حاوی ہوتی ہے۔

علامہ مقدمہ تاریخ ابن خلدون، حصہ ۴، فصل ۱۰۔

۵۵ مقابلہ کردہ روسو ”معاہدہ معاشری“ Rousseau: Contrat

social ۴۲، ۴۳۔ نیز دیکھو باب ۳، بالا عنوان ”اصول معاہدہ معاشری کی تنقید“

کہ یہ اقتدار ایسی ملکوں میں نہیں کم و بیش اندرونی و بیرونی آزادی حاصل ہو، ہر باشندہ اور ہر مجموعہ افراد پر حاوی ہو گا، جس کے معنی ہیں کہ جب تک کوئی شخص حدودِ مملکت میں پورے باشندے رہ سکے گا، اور جب تک وہ اس مملکت کے زیر سایہ زندگی بسر کرے گا اس وقت تک وہ برابر اس کے اقتدار کے ماتحت رہنے پر مجبور ہو گا۔ یہ ناممکن ہے کہ اگر کوئی شخص خواہ وہ اس مملکت کا شہری ہو یا نہ ہو جس میں وہ رہتا ہے، اپنی آپ کو اقتدارِ اعلیٰ سے آزاد کر لے، اس میں شبہ نہیں کہ بعض مشرقی ممالک ایسے بھی ہیں جن میں بغیر ملکوں کے اس اقتدار سے مستثنیٰ ہونے کی اجازت ہے، مثلاً جگتلیئم سے پہلے سلطنت عثمانیہ نام نہاد اصول ”مراعات“ کے تحت یورپی باشندوں کو چند ایسے حقوق حاصل تھے جو ترکی اقتدارِ اعلیٰ کے بالکل منافی تھے، اور ان بھی چین کے بعض حصوں میں اسی اصول کا اتباع کیا جاتا ہے، لیکن محض مشنریات میں جن سے ہمارے کلیہ کی حقیقت پر مستندہ اثر نہیں پڑتا۔

علاوہ ازیں ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مملکت کو مستقل طور پر اقتدارِ حاصل ہوتا ہے، حکام کی تبدیلی، حدودِ مملکت کی کمی بیشی، عہد ناموں صلح ناموں سے

لے مراعات کے لئے دیکھو:-

(۱) ٹوآن بی رکرک ڈورڈرکی حالیہ *Toynbee & Kirkwood: Modern Turkey* باب (۲)

(۲) میرٹھ ”ترکی حالیہ“ *Mears: The Modern Turkey*

(۳) ٹانگ یانگ لی: ”باغی چین“ حصہ سوم موسومہ ”چین دست و پا بستہ“ *Tangleangli: China in Rivot, Chapter "China in chains."*

مہولہ اس اقتدار میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اصول اس قدر قطعی ہے کہ بعض مصنفوں کی تو یہ رائے ہے کہ خود مملکت کو بھی یہ اقتدارِ عالی کسی دوسرے ادارے کو تفویض کرنے کا اختیار نہیں ہے، لیکن اس خیال کے برعکس ایسی مثالیں روزمرہ ملتی ہیں کہ چند روز یا عرصہ دراز کے لئے مملکت مسلم اقتدارِ عالی یا اس کے کسی جزو سے دست بردار ہوگئی ہو۔ مثلاً جب ایک ملک دوسرے ملک کو فتح کر کے اپنا ماتحت بنا لیتا ہے تو عملاً مفتوحہ مملکت اپنا اقتدارِ عالی فتح کے سپرد کر دیتی ہے اور چونکہ واقفانہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتی ہے اس لئے اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ جب وہ اس حالتِ مجبوری سے نکلنے کے قابل ہو جائے تو اپنے کھوئے ہوئے اقتدارِ عالی کو دل میں لے لے۔ اسی طرح جب متعدد مملکتیں اپنی مجموعی قوت میں اضافہ کرنے کی غرض سے دفاقیہ کی شکل میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہیں تو عملاً وہ اپنے اقتدارِ عالی کا ایک جزو مرکزی ادارے کے سپرد کر دیتی ہیں۔

بظاہر یہ علوم ہوتا ہے کہ جب مملکت کو فرد پر اس قدر عظیم الشان اقتدار حاصل ہو گیا تو بیچارے فرد کی حالت نہایت ہی زبوں ہو جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آدل تو مملکت خود افراد کی سیاسی اجتماعی حیثیت کا نام ہے، دوسرے انسان یا ادارات انسانی اپنے جملہ اختیارات کو بیک وقت کبھی کا نہیں

لکھنؤ کے لئے گارڈین ریاضیات *Garnier: Introduction to Political Science.*

باب ۸، جزو ۲ کا مطالعہ کیا جائے۔

نہیں لاتے۔ ہم کو یقیناً یہ اختیار حاصل ہے کہ جس جائز چیز کو جی چاہے کھائیں یا جہاں جی چاہے، جائیں، لیکن ہم یقیناً نہ ہر چیز کھاتے ہیں نہ ہر جگہ جاتے ہیں معاشرہ سیاسی کے قیام اور مرکز گزیر اثرات کی مدافعت کے واسطے اقتدار علی لازم و ملزوم ہے لیکن عام طور سے مملکت اس اقتدار کو محض ضرورت کے وقت کام میں لاتی ہے اور اکثر بیشتر اختیارات سے از خود دست بردار ہو جاتی ہے علاوہ ازیں بہت سی ایسی قوتیں ہیں جو اس اقتدار کے خلاف رد عمل کرتی رہی ہیں اور پوری طور سے اس کے مفاد کو جائز نہیں رکھتیں۔ اسی کو عرف عام میں مصلحت کہتے ہیں، یعنی وہ کیفیت جس کے تحت کسی کو اپنے اقتدار کے ماتحت اختیار پورا ہوں، لیکن مخالف حالات کے منظر وہ اپنے اختیار کو کام میں نہیں لے لے۔ اس کا بہترین مظاہر کسی خاص طبقے کی ناراضی کا درس ہے بشرطیکہ اس ناراضی میں غلوار بنیاد کا خطرہ لگا ہوا ہو۔

مکتشری نظریہ۔ حال میں دو اعتبار سے نظریہ اقتدار علی میں ترمیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک طرف بعض متنازع سیاست دانوں نے، جن میں فرانسیسی دیوگی اور انگریز لاکے ممتاز ہیں اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔ لاکے بہ خیال پیش کرتا ہے کہ مملکت کو دوسرے ادارات پر کوئی اخلاقی نفوذ نہیں اس لئے کہ جن افعال کو مملکت کا افعال کہا جاتا ہے وہ دراصل صرف ان لوگوں کے افعال ہوتے ہیں جو کسی دسے ہوئے زمانہ میں برسر اقتدار ہوتے ہیں۔ مملکت انسانوں کی ایسی ہی آئین ہے جیسے ان کے دوسرے ادارات، اور اسے ان ادارات کو زیر کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ دیوگی اس سے بھی آگے بڑھا

ہوا نظر آتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقی شخصیت صرف انسان کی ہے اور مملکت کو محض فرضی طور پر شخص کا مرتبہ دید یا گیا ہے تاکہ چند افراد دوسروں پر اس بہانے سے ظلم کر سکیں۔ وہ کہتا ہے کہ قانون پر عمل محض اس لئے لازمی ہے کہ اس سے معاشری ضروریات پوری ہوتی ہیں نہ کہ اس لئے کہ وہ مقتدر اعلیٰ کا حکم ہے۔

اس خیال میں جسے "تکثیری نظریہ" کہتے ہیں، دراصل انسانی آزادی اور عمویت پر زور دیا گیا ہے، اور اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں ایک طرف تو حکومت اور مملکت کے مابین غلط بحث سا نظر آتا ہے اور دوسرے اس میں قانونی اور اخلاقی نقطہ نظر کو ایک دوسرے سے کافی متنازعہ نہیں کیا ہے۔ اصل میں یہ اس نظریہ کو سب سے زیادہ تھیس سطحی یورپ میں گی ہے جہاں مسیحی اور شکر نے حکومت اور مملکت کو ایک دوسرے کا مترادف گردان کر یہ صرف تفریباً تمام اختیارات ایک مرکز کے سپرد کر دیئے ہیں بلکہ غور سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ افراد کے اختیارات کلیتہً سلب کر دیئے گئے ہیں، اور کچھ ایسا افسوس پڑھ کر بھونکا ہے کہ افراد اس حکمت عملی سے بالکل خوش اور مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ اگر اعلیٰ اور حتمی کے داخلی طرز عمل کو اصولاً غلط بھی تصور کیا جائے تو بھی ہم دیوگی اور لاٹکی سے کہہ سکتے ہیں کہ جب دوسرے "انسانی ادارات" کے درمیان تقیض ہو تو کیا کسی بالاتر شخصیت کی دخل اندازی یا ثالثی کی ضرورت نہ ہوگی، اور اگر اس شخصیت کے احکام سے ایک فرق کنارہ کشی اختیار کرے تو کیا کسی طرح کے بغیر امن و امان قائم رہ سکے گا۔ اسی شخصیت کو تو مقتدر اعلیٰ کا لقب دیا جاتا ہے۔

شہ تکثیری نظریہ کا بیان گیتل کی کتاب "تاریخ تخیلات سیاسیہ" (Gottel: History) (صفحہ ۸۶ پر)

علی اقتدارِ علی - یہاں تک تو اقتدارِ علی کا صرف نظریہ بیان کیا گیا۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ نظری میدان سے نکل کر اُسے عملی جامہ پہنا یا جائے۔ مملکت خود ایک مجر فلسفیانہ تخیل ہے، لہذا اُس کے اقتدارِ علی کی کم و بیش یہی نوعیت ہوگی۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ جملہ باشندوں کی سیاسی ہمیت اجتماعی ہر فرد یا محبوبہ افراد پر غالب ہوگی اور اُس کے احکام اُس ہوں گے لیکن علی سیاست باز کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہے کہ مملکت اپنے احکام کیسے صادر کرتی ہے، وہ کونسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے باشندگان ملک کو اس کی خواہشات کا علم ہو جاتا ہے اور وہ کس قسم کی کل سے جو لوگوں کو اُس کے سامنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جسے ”علی اقتدارِ علی“ کا مسئلہ کہنا چاہئے۔

(نوٹ بقیہ صفحہ کا) *of Political thought* میں ملے گا۔
نیز اس کے لئے لاسکی کا رسالہ ”مسئلہ اقتدارِ علی“ *Problem of Sovereignty*
اور اس کی کتاب ”صرف و نحو سیاسیات“ *Grammar of Politics*
دیکھی جائے۔

۱۵۔ اس کے بعد جو کچھ اندلال اس ضمن میں کیا گیا ہے۔ وہ ناظرین کو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملے گا تعجب ہے کہ ”ہمیت حاکم“ کے تخیل پر جو حقیقت و انفعات پر مبنی ہے، کسی نے اب تک بحث نہیں کی اور اقتدارِ علی جیسی علی چیز کو محض نظریے کے حد تک چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن میرا معنون ”اقتدارِ علی کا ایک جدید نظریہ“ *A new Theory of Sovereignty* غائبہ بیگزین جدا، ۱۰۵۵

ہمیتِ حاکمیت۔ مملکت کے حقیقی نفسِ ناطقہ یعنی ایسے ادارات کا
 تعین جس کے ذریعے سے اُس کی خواہشوں کا تا حد امکان علم ہو، ان قواعد کے ذریعے
 سے ہوتا ہے جنہیں مجموعی طور پر دستوری قوانین کا لقب دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے
 کہ یہی وہ قاعدے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس ملک میں حکومتی کل کے
 پرزے کس طرح منظم ہیں، اور ان عظیم الشان اختیارات کو، جنہیں مجموعی طوراً اقتدارِ
 اعلیٰ کہتے ہیں، کس طرح ملکی جامعہ پہنایا گیا ہے۔ گویا کہ وہ ادارات جن کے سپرد دستوری
 قانون کے ذریعے سے خاص خاص اختیارات کر دئے جاتے ہیں، اصل میں مملکت
 کے ہڈام ہیں جنہیں اپنے دستوری فرائض منصبی سے ہٹنے کا اختیار نہیں۔ واقعہ یہ
 ہے کہ جو کچھ اُن سے سرزد ہوتا ہے اپنی مرضی سے سرزد نہیں ہوتا بلکہ اُن کے
 ہر ایک جائز دستوری فعل کے ساتھ مملکت کی مرضی وابستہ ہوتی ہے، اور اُن سے
 کوئی ایسا فعل سرزد ہو جو دستوری حدود سے تجاوز کر جائے تو وہ کام مملکت کی خواہش
 اور مرضی سے مغایر ہوتا ہے۔ اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جملہ حکومتی ادارات
 جن میں نہ صرف تختہ دار ملازم بلکہ وہ سب باشندگان ملک شامل ہیں جو اس کے
 باسی کاروبار میں حصہ لیتے ہیں، دراصل مملکت کے مختار سے زیادہ حیثیت نہیں
 رکھتے۔ ساتھ ہی دستوری قانون کے ذریعہ سے اُن کے واسطے طریق کار بھی مقرر کر دیا
 گیا ہے جس سے گریز کر کے پران کا فعل محض ایک ذاتی حیثیت اختیار کر لیتا ہے
 اور ان کے اختیارات میں سدراہ ہوتا ہے۔ ایسے ادارات مملکت کو ہمیتِ
 حاکمیت کا لقب دینا مناسب ہو گا۔

۱۱۵ اس ہمیتِ حاکمیت میں جملہ اداراتِ حکومت شامل ہیں، یعنی حکومت اگر عمومی (بقیہ شب پر)

یہ ضروری نہیں کہ ہر ملک کے دستور قانون کا میلان اعلیٰ نیست یا عمومیست ہی کی طرف ہو، بلکہ جس طرح آج کل کی اعلیٰ و جبرستی اور دوسرے ممالک کی آمرتوں اور ازمنہ وسطی کی ملوکیتوں کا حال تھا، یہ ممکن ہے کہ مملکت کا اعلیٰ اقتدار عائلی ایک نقص واحد کے ساتھ وابستہ ہو اور حالات و واقعات اس کے متقاضی ہوں کہ دستور پر آئینہ نظر ثانی تک ملک کے جملہ انتظامات اسی کی سپردگی میں رہیں۔ یہ نظام بہت کہ جملہ انسانی ادارات میں دم بدم تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے کہ یہ ادارات مختلف اثرات اور بحول کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب تک حالات و واقعات اس کے متقاضی رہیں گے کہ ملک میں مطلق العنانی کا دور دورہ ہو اسی وقت حکمران کے لئے اپنے شخصی اختیارات کو کام میں لانا جائز ہوگا، لیکن جب حالات میں تبدیلی ہونے لگی وجہ سے مملکت کی حیثیت بدل جائیگی تو نئے دستور کے رواج کے باعث یہی شخصی اختیارات اس حکمران کے لئے قطعاً ناجائز ہو جائیں گے۔ اسی طرح

بقیہ صفحہ ۸۹) لئے ہوئے ہوں تو اس میں رائے دہندے اور اگر اس کی نیا مطلق العنانی بادشاہ یا امپریٹر اس کے ہا اختیار ندا و وزیر بھی شامل ہوں گے۔ یہی وہ نسبت حاکمیت ہے جس کے ذریعے سے یہاں مملکت کی اصلی خواہشات کا علم ہوتا ہے۔

شجرہ حکومت ۱۔

مملکت
نسبت حاکمیت
حکومت

اعضائے حکومت (یعنی مقننہ، عدلیہ
محکمہ ہات حکومت

اگر قانون سازی یا نفاذ قانون یا کسی دوسرے شعبہ میں اس منضبطہ دستور العمل سے گریز کیا جائے جو اس کے لئے معین کر دیا گیا ہے تو ایسے افعال محض غیر سرکاری و فائقی حیثیت اختیار کریں گے اور قابل لحاظ نہ ہوں گے۔

اس کی تقسیم، تفویض و تحدید یہ مفصلہ بالا امور کو مد نظر رکھ کر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ علی اقتدار اعلیٰ تفویض ہو سکتا ہے، تقسیم بھی کیا جاسکتا ہے اور اس کی تحدید بھی ممکن ہے۔ علی سیاسی مسائل اس درجہ پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کے حل کرنے اور انتظامِ مملکت کو کامیاب بنانے کے لئے جملہ افعیا راست و فرائض ایک ہی ادارے کے سپرد نہیں کیے جاسکتے، بلکہ اولاً تو ایک حکومت قائم کی جانی پڑے جو گویا سیمتِ حاکمیت کے سامنے ذمہ دار جوتی ہے۔ بعد ازاں جس طرح کسی زندہ عضوہ کے اعضاء سرکار ہوتے ہیں ویسے ہی ملک کا انتظام مختلف اعضاءِ حکومت کو تفویض کر دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی جیسا اور بیان کیا گیا ہے، بالکل ناممکن ہے کہ کوئی مملکت اپنا پورا اقتدار اعلیٰ یا اس کا ایک جز و صوبوں کو تفویض کر دے۔

مفصلے۔ اس ضمن میں اب صرف نام نہاد "قانونی" اور "سیاسی"

اللہ پرورد "اصل قانون" *Holland: Jurisprudence* باب ہفتم
"مقتدر" "نیم مقتدر" اور "مقتدر ماتحت" کی مثالیں دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اقتدار کی تقسیم کی بہترین
مثال ملک متحدہ امریکہ سے دی جاتی ہے، جہاں یہ اقتدار مرکزی دستور ساز طاقت مرکزی حکومت
ریاستی دستور ساز طاقتوں اور ریاستی حکومتوں میں تقسیم ہے۔

مقتدرِ اعلیٰ کا فرق اور باہمی لغت دکھانا باقی ہے۔ ”قانونی“ اقتدارِ اعلیٰ کا جو مفہوم عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس کا سیاسی اقتدارِ اعلیٰ سے جو امتیاز کیا جاتا ہے وہ نہایت مغالطہ آمیز ہے، اور یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کوئی ریاست داں اس بارے میں متفق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اس ضمن میں کیا گیا ہے اس میں اکثر بیشتر حکومت اور مملکت کے درمیان غلط بحث کر دیا گیا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو اسطرح ایل اور گروتیوس سے لے کر آسٹن اور زمانہ حال کے علماء سیاسیات تک اس مسئلہ کو صاف نہیں کر سکے کہ آخر کار اقتدارِ اعلیٰ کس شخصیت کے وابستہ ہے۔ کہیں تو بودیک کی طرح وہ اس اقتدار کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کہیں آسٹن کی طرح وہ ایسے مقتدر کو دیکھتے ہیں جس سے بالاتر کوئی شخصیت نہ ہو، اور کہیں وہ مملکت کو محض ایک مجرد ہیئت اجتماعی تصور کر کے یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اس کی حقیقت اور صفات کا تعین محض سیاسی یا قانونی نظریوں کے ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک طرف تو مملکت کی وقعت محض ایک مجرد خیال سے زیادہ نہیں رہتی، دوسری جانب اس کی قانون جیسے ادارے کا واحد منبع و ماخذ

لکھ دو میں نے مملکت اعلیٰ کے اختیارات کی جو تحدید کی ہے اس کے لئے دیکھو ڈننگ: ”نظریاتِ سیاسی از لکھ دو“

Dunning: Political Theories from

Luther & Montesquieu. باب ۱۲، ۱۳۔

Austin: Jurisprudence.

لکھ آسٹن، ”اعمالِ قانون“

Willoughby: Public Law

لکھ ولوگی، ”قانونِ عام“

قرار دیا جاتا ہے۔ اگر ہم مملکت کی "ہیئت حاکمہ" کو (جو دراصل ایسے شہریوں کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جو سیاسی امور میں حصہ لیتے ہوں) اس کا نقشِ ناطقہ قرار دیں تو یہ تمام ذمہاں رافع ہو جائیں گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت یعنی جملہ باشندگانِ مملکت کی سیاسی ہیئت اجتماعی ایک منجرِ تحلیل ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ نہ تحلیل ہی نہیں بلکہ واقعتاً قابلِ لمس ہیئتوں کا مجموعہ ہے ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ملک کے سیاسی انتظام میں مطلق حصہ نہیں لیتے، اور بہت سے حصہ لیتے ہیں۔ موزر (Moser) جن میں سیاسی تنظیم کا دار و مدار ہے، ہیئت حاکمہ میں شامل ہیں اور دائمی اقتدارِ اعلیٰ ان ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن مملکت یعنی باشندوں کی اجتماعی حیثیت اس "ہیئت حاکمہ" کی ترکیب کو جب چاہے بدل سکتی ہے، یعنی اسے اپنی مرضی سے وسیع یا تنگ کر سکتی ہے۔ برادیسٹر (Bridgman) اور ان کے پیروں کے نزدیک برطانوی پارلیمنٹ کو قانونی اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ لیکن یہ امر بحثِ طلب ہے کہ آیا یہ اصول آج بھی اتنا ہی حقیقت پر مبنی ہے جتنا پر قدیم صاحبِ موصوفہ کی کتاب کی اشاعت کے وقت تھا۔ بالفرض اگر یہ واقعہ بھی سچے تو بھی کیا یہ ناممکن نہیں کہ کسی انقلاب

فلوڈ (Flood) "تہذیبِ قانون دستور" *Dicey: Introduction to the Law of the Constitution*

of the Constitution of the Constitution تہذیبِ حصہ اول: باب اول۔

نقلہ غرض طلب کہ یہ ہے کہ اگر انگلستان میں عام انتخاب کے بعد دارالعلوم میں کسی خاص سیاسی گروہ کی اکثریت ہو تو پارلیمنٹ کو زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں یا سیاسی مرکزِ نقل مجلس کا بنیہ کی طرف ہٹ جاتا ہے۔

کے بعد ایک ایسا برطانوی دستور مرتب ہو جس کے بموجب یہ نام نہاد اقتدار
اعلیٰ پارلیمنٹ سے سلب کر کے براہ راست رائے دہندوں کے سپرد کر دیا
جائے۔

برحال ان اصولوں کو جن کی توضیح اوپر کی گئی ہے، مد نظر رکھ کر ”وفاقی“
اور ”استحقاقی“ ”قانونی“ مقتدر کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے۔ عام طور پر استحقاقی
مقتدر اصطلاح اس شخصیت کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس کے اقتدار کی
بنیاد کے دستور پر ہو۔ اکثر و بیشتر یہی وفاقی مقتدر بھی ہوتا ہے۔ لیکن بعض مرتبہ ایسا
بھی ہوتا ہے کہ ”وفاقی مقتدر“ کوئی ”قانونی استحقاق“ نہ ہو۔ اس کی بہت سی
مثالیں لارڈ براکس نے پیش کی ہیں، اور کہا ہے کہ طویل پارلیمنٹ کی ریفاست
کے بعد ایسور کرائونل، فرانس کی مجلس نظام کے ریفاست کے بعد چو لیس اعظم
اور (مسلطہ تکبر) مصری انگریز وفاقی مقتدر تھے، گو ان میں سے کسی کو قانونی
استحقاق حاصل نہ تھا۔ لیکن اگر اقتدار عالی درحقیقت مملکت کے ساتھ وابستہ ہے
اور مملکت کی خواہشات دستوری قانون کے چند مخصوص شعبوں کے ذریعے
سے معلوم ہوتی رہتی ہیں، تو پھر یہ بحث کم و بیش بے کار ہے۔ اگر کرائونل، نیپولین
اور انگریزوں کے اقتدار کو انگلستان، فرانس اور مصر کی مملکتوں نے تسلیم کر لیا تھا
تو انہیں وفاقی اور استحقاقی اقتدار ہو گیا ورنہ سیاسی اعتبار سے تو اس اقتدار کی

فہم براکس: مطالعات تاریخ اصول قانون Bryce: Studies in

History of Jurisprudence. جلد ۲ خطبہ ۱۰ اجز ۱۰

حیثیت خلافِ قانون اور بد اخلاقت ہے جسے زیادہ نہیں ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ کا تعین۔ مملکت میں عملی مقتدرِ اعلیٰ کے تعین کا مسئلہ دنیا کے اہم ترین ممالک کے دستوروں پر غور کرنے سے واضح ہو جائے گا۔ کسی مملکت کے دستوری سے یہ امر واضح ہو سکتا ہے کہ عملی اقتدارِ اعلیٰ منقسم ہے یا غیر منقسم اور وہ جس ادارے کے ساتھ وابستہ ہے اس کی بنا قانون پر ہے یا محض رواج پر اور اس کا منہج و مآخذ دراصل وہی مملکت ہے جس میں اس کا وجود ہے یا اسے کسی اور مملکت نے تفویض کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس امر کا تعین ہو جائے کہ اقتدارِ اعلیٰ کس کس ادارے کے ساتھ وابستہ ہے تو ساتھ ہی یہ بھی عائد ظاہر ہو جائے گا کہ مملکت کی بہت ترکیبی کیا ہے، اور جیسے جیسے مقتدرِ اعلیٰ کے مسئلہ کا تجزیہ کرتے جائیں گے ویسے ہی ہمارے سامنے گویا مملکت کا صحیح نقشہ آتا جائے گا۔

اگر ہم دنیا کے مختلف دستوروں پر غور کریں تو ہم سب سے کم پیچیدگی اس مملکت کے دستور میں پائیں گے جو اندرونی اور بیرونی معاملات میں بالکل آزاد ہو اور جس میں جملہ اختیاراتِ حکومت ایک ہی مرکز کے ساتھ وابستہ ہوں۔ عام طور پر ایسی مملکت کو ”فردیہ“ کہتے ہیں اور اس کی ممتاز ترین مثالیں انگلستان اور فرانس کی مملکتیں ہیں۔ انگلستان میں کوئی ایسا شاہی نہیں جس کو ”دستور کا لقب دیا جاسکے، بلکہ دستور سازی اور معمولی قانون سازی دونوں پردوں کی پارلیمنٹ حاوی ہے۔ اس پارلیمنٹ کے تین طبقے یا اجزاء قرار دئے جاتے ہیں، یعنی بادشاہ دارالامرا اور دارالعوام، لیکن یہ امر قابلِ انکار ہے کہ علاوہ رائے دینے کے بادشاہ

کاب کوئی سیاسی اقتدار باقی نہیں رہا، اور اب تو شاہ انگلستان کسی سیاسی حکمت عملی میں شاید رائے دینا بھی پسند نہیں کرتے۔ رہا دارالامرا، تو اگر دارالعوام کسی خاص امر پر اڑ جائے اور انتخاب جدید یا امتداد زمانہ سے یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ملک کی عام رائے اس رائے کے موافق ہے، تو دارالامرا کو قانون منظور کرنے کے سوا چارہ باقی نہیں رہتا۔ گویا کہ اعلیٰ اقتدار اعلیٰ یہاں عام طور پر رائے وسندوں اور ان کے اُن نمائندوں کے ساتھ وابستہ ہے جنہیں دارالعوام میں نشست کرنے کا حق حاصل ہے۔

فرانس کی صورت، آلات ذرا مختلف ہے۔ ۱۸۷۵ء کے دستور کے مطابق جس میں ۱۸۷۵ء میں اہم ترمیم کی گئیں چند خاص خاص امور میں اس وقت تک ترمیم نہیں ہو سکتی جب تک اس ترمیم کے لئے ایک مخصوص طریق کار پر عمل نہ کیا جائے، گویا کہ یہاں اعلیٰ اقتدار اعلیٰ دستور ساز جماعت اور معمولی پارلیمنٹ کے درمیان منقسم ہوتا ہے۔ مثلاً دستور فرانس کا ایک جزیہ بھی ہے کہ پارلیمنٹ ہمیشہ دواؤانی ہوگی

۱۸۷۵ء دیکھو، کاؤنٹ گری، "۲۵ سالہ گزشتہ" Viscount Grey:

Twenty-five years. جلد باب ۱۲

۱۸۷۵ء اس کے لئے مطالعہ کیا جائے قانون پارلیمنٹ ۱۹۱۲ء جس پر فیئر ہارسی نے اپنی کتاب

"تقریب قانون دستور" Dickey: Introduction to the Law

of the constitution (۱۹۱۲ء) کی تہذیب میں بحث کی ہے۔

۱۸۷۵ء ڈروون، "ملکت Woodrow Wilson: The State" باب،

اس اصول میں اس وقت تک ترمیم نہیں ہو سکتی جب تک یہ مسئلہ ایک خاص ضابطے کی رو سے "جمیعت قومی" کے سامنے نہ لایا جائے۔ اس کے عکس رلئے دیہی کا مسئلہ تحریری دستور فرانس کا جزو نہیں یعنی اس میں ترمیم معمولی قوانین کی طرح ممکن ہے۔

فردیہ سے کہیں زیادہ پیچیدگی ان ملکوں میں پائی جاتی ہے جہاں اختیار شدہ حکومت میں سے بعض تو مرکزی ادارات کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور بعض ملک کے مختلف اجزاء کے درجہ میں اصطلاح میں "ریاست" کہتے ہیں (سپر د کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن اس سپردگی کا اختیار مرکزی ادارات کے بجائے ایک یا ایک سے زیادہ دستور ساز جماعتوں کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی ملک کو "وفاقیہ" کا لقب دیا جاتا ہے، اور اس کی ممتاز ترین مثالیں ملک متحدہ امریکہ، برازیل، کیناڈا، آسٹریلیا، سوئیڈن اور روس ہیں۔ ایسی ملکوں کے اقتدار اعلیٰ کے متعلق ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان میں یہ اقتدار مرکزی اور ریاستی ادارات کے درمیان تقسیم ہوتا ہے لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں ان دونوں قسم کے ادارات سے بالاتر ایک اور ادارہ ہے جس کے ذرائع سے دستوری یعنی مرکزی اور ریاستی ادارات کے درمیان تقسیم کاری ترمیم ہو سکتی ہے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ دستور ساز ادارہ ہی مقتدر اعلیٰ ہے۔ حقیقت میں یہی نظریہ ہے جو عام طور پر قبول کیا جاتا ہے لیکن دستور ساز ادارہ نہایت کم کار فرما رہتا ہے، اس لئے کہ سالہا سال میں ایک آدھ ہی مرتبہ دستور میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ کہاں تک مناسب ہے کہ ایک ایسے ادارے کو جو اکثر و بیشتر خفہ سے مقتدر اعلیٰ کا لقب دیا جائے۔ اس لئے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وفاقیوں میں

اقتدارِ عالی چار مختلف ادارات میں منقسم ہوتا ہے۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جو موجودہ دستور کی بنا پر بلا دستور سراجِ جماعت یا جماعتوں کی منظوری کے طے نہیں ہو سکتے، ایسے امور میں یہ جماعت یا جماعتیں مقتدرِ عالی ہوتی ہیں؛ ان کے علاوہ جہاں تک امور کے انتظامات کا تعلق ہے، اقتدارِ عالی کا ایک جزو جو مرکزی ادارات اور دوسرا ریاستی ادارات کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں ایک طرف ممالک متحدہ امریکہ کی کوئی ریاست خارجی معاملات اور سگد سازی میں مداخلت نہیں کر سکتی، وہاں مرکزی حکومت کو تعزیری قوانین و مناکحت و ازدواج کے قوانین میں دست اندازی کرنے کی قطعاً ممانعت ہے۔ ظاہر ہے کہ مختلف ممالک کے وساتیران کے حسبِ حال ہوتے ہیں، لہذا اس قسم کے اصول میں بھی ممانعت ہر نا لازمی ہے۔

زمانہِ حالیہ کی مملکتوں میں دو قسم کی مملکتیں ایسی ہیں جن کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے ایک تو برطانوی سواراجی قلمروں اور دوسرے وہ ممالک جن کے اختیارات میں نامساعد متنبہ زمانہ سے تحدید ہو گئی ہے۔

ان میں سے برطانوی سواراجی نوآبادیوں کی سیاسی حیثیت میں بعضیں اب ”قلمروں“ کا لقب دیا گیا ہے، ایک عظیم الشان تبدیلی ہو گئی ہے۔ گویا بیسویں صدی عیسوی کے وسط سے برطانیہ کا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جب کسی نوآبادی کو خود مختار اور اختیارات دے دے جائیں تو ان میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے، اور اسی وجہ سے عام طور پر کنڈا، آسٹریلیا، جزیرہ آفریقہ جیسی قلمروں کے معاملات میں مداخلت نہ

۱۱۱۱ یہ آخری خیال میراثی خیال ہے۔

سے انگریزی حکومت نے اپنے حق امتناع کو استعمال نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ صورت حال کسی صریح قانون پر مبنی نہیں تھی، بلکہ بقول پروفیسر ڈاکسی کے شہنشاہی پارلیمنٹ برابر سلطنت برطانیہ کے ہر حصے پر اپنے اقتدار اعلیٰ کی دعویٰ کرتی تھی۔ لیکن قانون ویسٹ منسٹر ۱۹۰۸ء کے بموجب اب یہ طے ہو گیا ہے کہ قلمروں کی کسی حالت اور صورت سے انگریزی حکومت کے ماتحت نہیں ہیں اور اب سلطنت برطانیہ کی حیثیت تقریباً وہی ہو گئی ہے جو ۱۹۰۸ء سے پیشتر سوئڈن اور ناروے کی تھی، یعنی مختلف قلمروں کا واحد نقطہ اتصال بادشاہ کی ذات باقی رہ گیا ہے۔ اس کے معنی ہوئے کہ جہاں ۱۹۰۸ء سے پیشتر سلطنت برطانیہ میں اقتدار اعلیٰ برطانوی ادارات کو حاصل تھا، وہاں اب وہ ہر ایک قلمرو کے ادارات کو عطا ہو گیا ہے۔ راجا بادشاہ کا واقعی حق امتناع، تو نہ وہ ۱۹۰۸ء سے پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ یہ مسئلہ اور بھی زیادہ صاف ہو جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نومبر ۱۹۲۶ء کے اعلان امپریل کانفرنس میں یہ صریحاً بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ قلمروں "برطانوی دولت عامہ (قوام) میں محض انہی خوشی و خاطر سے شامل ہیں جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ اگر کوئی قلمرو چاہے تو وہ اس مجموعے سے

۱۹۰۸ء "قانون دستوری" *Law of the Constitution* اشاعت ۱۹۰۸ء قلمبر
 ۱۹۲۶ء کے دستور کے مطابق ایک قلمرو، یعنی ایرٹانان نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ وہ "مستند
 اعلیٰ خود مختار اور عمومی حکمت ہے" اس دستور بادشاہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ دیکھو سالنامہ
 "دین" *Stateman's year Book* ۱۹۳۰ء ص ۲۵۷۔

بغیر کسی قسم کے جبر واکراہ یا جنگ و جدال کے علیحدہ ہو سکتی ہے۔
اب صرف ان مالک پتھر ڈالنا باقی رہ گیا ہے جن کے کسی نہ کسی ادارے کو
کسی زمینے میں اقتدار اعلیٰ حاصل تھا لیکن اب وہ کہیں اندیش ہو گیا ہے۔ ایسے مالک
کی ہمارے لئے ایک بدیہی مثال خود ہندوستان ہے، جہاں کی مملکت یا مملکتوں
کا اقتدار اعلیٰ علاوہ چند مشنری زمانوں کے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک
سلسل نہیں مملکتوں کے اندرونی ادارات کو حاصل تھا۔ اس صورت حالی میں ایک
بہت بڑی تبدیلی ۱۷۵۷ء میں ہوئی جب شہنشاہ ہند نے بنگالہ، بہار، اڑیسہ
اور کرناٹک کے دیوانی اختیارات انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیے لیکن
اقتدار اعلیٰ قانوناً بادشاہ ہی کو حاصل رہا، اور کرناٹک و بنگالہ میں انگریز، جنوب میں
فرانسیسی اور وسط ہند میں مرہٹے یہ سب بادشاہ ہندوستان کی طرف سے حکومت
کرتے رہے۔ لیکن ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب دراصل اس بادشاہ کے حکومتی اختیارات
سلب کر لئے گئے اور اقتدار اعلیٰ پہلے انگریزی تجارتی کمپنی کو اور پھر تاج برطانیہ کو حاصل

۱۷۵۷ء اس اصول کا ایک نہایت دلچسپ مظاہرہ مارچ ۱۷۵۷ء میں ہوا جب جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم
جنرل ہرتزوغ کے شہنشاہی کانفرنس کی قراردادوں کی توثیق کی تحریک کرتے ہوئے دہلی کے ایوان
جمعیت میں ایک تقریر کے دوران میں میراے ظاہر کی کہ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی جنگ میں جس
میں برطانیہ ایک فریق ہو، اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دے۔ نیز دسمبر ۱۷۵۳ء میں ڈی ویلیز
صدر مجلس عالمہ ایرسٹان نے اعلان کیا کہ شاہ انگلستان کو ایرسٹان کے صرف خارجی مسائل پر
وہ بھی ایک حد تک تفرق باقی رہ گیا ہے۔

ہو گیا، ہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ اختیار محض مفوضہ ہے، کوئی مملکت کلینٹہ اپنے اقتدار عالی سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پسند نہیں کرے گی، اور آج کل ہندوستانی اختیارات کی جو حدائیں ہمارے گشت لگاری ہیں ان کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ ہم درجہ مملکت ہند اپنے ان اختیارات کو جو اسے کسی زمانہ میں انگریزوں کے سپرد کر اپنے پڑے تھے، ہندو تاج یا وقت واہدی واپس لینا چاہتی ہے اور اس طرح دوبارہ خوددار مملکتوں کی صف میں بیٹھنے کی آرزو کا اظہار کر رہی ہے۔

LAW

باب ، قانون

قوانین کے امتیازات - قانون ساز - قانون اور عادل حقیقی انسانی قوانین میں پردہ ہوتے ہیں۔

قانون کا مفاد - انسانی قانون کے اقسام

پچھلے باب میں دکھایا جا چکا ہے کہ ملکیت کا قیام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کوئی ایسی شخصیت موجود نہ ہو جو نہ صرف افراد کے باہمی مناقشات کو طے کرنے اور اپنے احکام کا نفاذ بشرط ضرورت بالجبر کرانے کی اہل ہو، بلکہ جو اس تعداد کو بھی دور کر سکتی ہے جو باشندگان ملک کے انفرادی احساسات و فداات اور ملک کی اجتماعی ضروریات کے مابین پیدا ہو جائے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ وہ شخصیت سیاسی اصطلاح میں مقتدر اعلیٰ کہلاتی ہے، اور جس آلہ کار کے ذریعے سے وہ اپنے فرائض منصبی انجام دیتی ہے اُسے ”ہیئتِ حاکمیت“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس ہیئتِ حاکمیت سے کوئی ایک شخص مراد نہیں، بلکہ وہ جملہ ایسے افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو از روئے دستور اس ملکیت کے سیاسی امور میں اپنے اختیارات کی حد تک مصروف ہوتے ہیں۔

قوانین کے امتیازات - ظاہر ہے کہ ایسے مرکب معاشرے ہیں

کوئی نہ کوئی ایسا مرکز ضرور ہو گا جس کے احکام اٹل اور جس کی تجاویز ناقابل تردید ہوں گی، اس لئے کہ اگر اس معاشرہ کے مرکز مختلف ہوں تو یقیناً ہے کہ بہت جلد اس کا شیرازہ بکھر جائے گا اور ملکیت منتشر ہو جائے گی۔ اسی مرکز کے احکام کو قانون کہتے ہیں، اور اگر غور کیا جائے تو اسی پر جماعت مملکت کا کلیتہ دار و مدار ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ جس پر غور کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آخر قانون کا ٹھیک مفہوم کیا ہے۔ آج کل دو تین اصول ایسے زبان زد خاص و عام ہیں جن سے قانون کا التباس نہ صرف ممکن ہے بلکہ اگر نظر غائر نہ ڈالی جائے تو اغلب ہے۔ ہم روزمرہ ایسے الفاظ جیسے ”قانون فطرت“ ”ہدائی قانون“ ”بین الاقوامی قانون“ ”قانون“ ”قانون معاہدہ“ ”قانون جرایم“ سنتے ہیں، اور جب ہم ان پر ذرا بھی غور نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سب ”قوانین“ کے مابین اصولی فرق نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے اصلی اور واقعی انشائی قانون جس مملکت کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور دوسرے ”قوانین“ کے مابین امتیاز کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر اس انشائی قانون کو پیش نظر رکھا جائے تو روزمرہ کی اصطلاح میں اس میں اور انصاف میں بہت ہی کم فرق معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس ٹھیک مملکت کو بھی، جس میں اس ”قانون“ کا نفاذ ہوتا ہے ”عدالت“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ بدین سبب اس کی ضرورت ہے کہ قانون کا ٹھیک مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

سب سے پہلے تو انشائی قوانین کا اس قسم کے قوانین سے جیسے قوانین فطرت، خدائی قوانین، بین الاقوامی قوانین، وغیرہ سے امتیاز کرنا چاہئے۔ انشائی

قوانین دراصل ان ملکی یا قومی قوانین کا نام ہے جن کا مقتدر اعلیٰ نے بہ نسبت حاکمہ کے کسی جزو مجاز کے ذریعہ سے نفاذ کیا ہو، اور جس سے روگردانی کے بعد روگردان کو یا تو سزا کا سخت سمجھا جائے ورنہ اسے کسی قسم کی تکلیف یا دقت کا سامنا کرنا پڑے۔ یہ کیفیت ”قوانین فطرت“ کی نہیں ہے۔ قوانین فطرت ان مفروضہ قوانین کا نام ہے جنہیں تمام نبی نوع انسان پر حاوی سمجھا جاتا ہے، اور جن سے نبی آدم کے باہمی تعلقات کا تعین ہوتا ہے۔ ”قوانین الہیہ“ ان قوانین کو کہتے ہیں جن کا منبع ذات باری تعالیٰ کو سمجھا جاتا ہے؛ یہ قوانین فطرت سے زیادہ مشین ہوتے ہیں، چنانچہ بہت سے ممالک میں یہ انباتی قوانین کے منافع و مافذ بھی بن جاتے ہیں۔ ”بین القوامی قوانین“ ان اصول کا مجموعہ ہیں جن پر مختلف ممالک کے باہمی تعلقات و عہد نامہ جات مبنی سمجھے جاتے ہیں؛ جب تک قوانین کسی ملک کے انباتی قوانین کی شکل اختیار نہ کر لیں اس وقت تک انہیں صحیح معنی میں قوانین کہنا مناسب نہیں، اور ان کی خلاف ورزی پر ملزم کو عام طور پر کوئی ایسی قانونی سزا نہیں دی جاتی جس سے اسے کسی خاص قسم کی تکلیف پہنچے۔ اسی طرح انباتی قوانین کو ماتحت قاعدہ ساز ادارات مثلاً مجلس بلدیہ یا مجلس بریلوے کے قواعد سے بھی ممیز کرنا چاہئے اس لئے کہ یہ مؤثر الذکر قواعد محض کسی نہ کسی انباتی قانون کے تحت عدم سے وجود میں آئے ہیں اور ایک دوسرا انباتی قانون انہیں یک نام نہ دینا کر سکتا ہے۔ انباتی قانون مملکت پر اس درجہ حاوی ہو سکتا ہے کہ ایک جرم

یاست وال کہتا ہے کہ مملکت کی حکومت کا دائرہ عمل کلیتہً قانون کے حدا اختیار سے محدود ہے اس لئے کہ مملکت کے احکام سے خلاف ورزی کرنے والے کو صرف اسی کے ذریعے سے مجبور کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح عام طور پر قانون اور انصاف کو ہم معنی قرار دیا جاتا ہے اور دونوں کو اخلاق پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ جو قانون مردود ہو وہ بالکلینہ نام نہا انصاف پر مبنی ہو۔ مثال کے طور پر اگر زید نے کچھ رقم غمرو سے قرض لی اور اس کے دعوے میں تھادی عارض ہو گئی تو ایسی صورت میں انصاف کا تقاضا یہ ہوگا کہ زید و غمرو کو وہ رقم واپس دے دے، لیکن غمرو کسی قانونی چارہ جوئی کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ دراصل انصاف کی بنا اخلاق پر ہے، اور عیسائیت کا ایک نامور عادل لارڈ کوکریج اپنی ایک تجویز میں کہتا ہے: ”گو قانون اور اخلاق ایک دوسرے کے مترادف نہ ہوں اور بہت سے ایسے افعال بد سمجھے جائیں جو خلاف قانون نہ ہوں، تاہم اگر اخلاق کو قانون سے کلیتہً علیحدہ سمجھا جائے گا تو اس کے نتائج بہت ہی بُرے نکلیں گے“ ممکن ہے کہ کوئی شخص شخصیت ایک شوہر یا باپ یا بھائی یا استاد کے کمال اخلاقی معیار پر پورا نہ اترے لیکن ساتھ ہی اس سے کسی قسم کا خلاف قانون عمل سرزد نہ ہوا ہو اور وہ قانون کی زد میں نہ آتا ہو۔ بعض اخلاقی اہل کی ترویج میں یہ کمزوری رہ جاتی ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے کوئی لازمی نقصان مرتکب کو نہیں پہنچتا، بلکہ بعض مرتبہ تو اسے بظاہر مادی فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے۔

در آنجا یکہ خلاف ورزی قانون کی صورت میں جلد وسائل مملکت اس کے خلاف استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اگر اخلاق مردوجہ اور قانون جاریہ کے اصول ایک دوسرے سے متضیق ہوئیں تو یہ مملکت کے لئے بہترین صورت حال ہوگی۔

Legislature

”قانون ساز“۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قانون مملکت کے ان احکام کو کہتے ہیں جن کا ماننا ہر فرد مملکت کا فرض ہے، اور اس سے روگردانی کی حالت میں مملکت اپنی قوت و جبروت روگردال کی سزا اور بدامنی کے دفعیہ میں صرف کر دیتی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر مملکت میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ضرور ہوگا جس کے سپرد قانون سازی کا فرض ہوگا، یعنی جسے یہ اختیار ہوگا کہ ملک کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر ایسے قواعد بنائے جن کے ذریعے سے بدامنی نہ ہونے پائے اور افراد مملکت کے مابین تعلقات وادوستد بے کشمکشے قائم رہ سکیں۔ ساتھ ہی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مملکت میں، خواہ اس کی حکومت شخصی ہو یا جمہوری، پارلیمنٹری ہو یا صدارتی، کوئی نہ کوئی قانون ساز شخصیت ضرور ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ یہ منصب شخص واحد مثلاً بادشاہ کے متعلق ہوتا ہے، جسے خاص طور پر قانون سازی

سہ حیدرآباد کے ایک نہایت لغت آؤس مقدمے میں یہ اکیس ناک انکشاف ہوا کہ برطانوی ہند (اور اس کے انتہا میں حیدرآباد) میں یہ قانونی جرم نہیں کہ کوئی شخص اپنی محرمات میں سے کسی کے ساتھ شخصی باغلائی کا مرتکب ہو۔ اس مقدمے کو اب (۱۹۲۳ء میں) چار سال ہونے کوئے اور اس وقت تک حیدرآباد یا برطانوی ہند کی مجلس مقننہ کے کسی رکن نے یہ رسم قانون کی کوئی تحریک پیش نہیں کی!

کا اہم اختیار پھر اس کے علم یا ادارک یا موردی اثر کے باعث دیا جاتا ہے بعض مرتبہ اسے اہم ترین اختیار تصور کر کے ایک ایسی جماعت مقننہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس میں تقریباً ہر شعبہ زندگی کے نمائندے ہوتے ہیں، تاکہ وہ موجودہ قوانین کی خامیوں کو سمجھ کر اور ملک کی، یا کسی خاص طبقے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر قانون بنائے یا اس میں ترمیم کرے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت خواہ کتنی ہی سمجھ دار کیوں نہ ہو یہ ناممکن ہے کہ وہ تمام ایسے واقعات کے لئے قواعد بنائے گی جو اس وقت تک پیش نہ آئے ہوں۔ مثلاً جس شخص یا جماعت کے سپرد قانون سازی ہو وہ چوری کی سزا مقرر کر سکتا ہے، لیکن یہ ناممکن ہے کہ آئندہ جتنے طریقوں سے چوری کی جائے گی وہ سب اس کے پیش نظر ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قانون ساز شخص یا جماعت کسی جرم کی قطعی سزا مقرر نہیں کرتی بلکہ حاکم عدالت کو بہت بڑا اختیار تمیزی دے دیتی ہے کہ ایک حد کے اندر جتنی چاہے سزا دے۔

ہیں ایک اور امر ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ حقیقی قانون ساز یعنی ایسے احکام دینے والا جنہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو، کو کوئی قانون الفطرت ہی سمجھ جائے اور دنیوی حکام کے سپرد ان احکام کا نفاذ اور ان کی تادیل کرنے سے زیادہ اختیار تادیل یا ان اصولوں کو موجودہ صورت حال میں مطبق کرنے کا اختیار ہو۔ یہ اختیار اس قدر عظیم الشان ہے کہ اس پر ایک بہت بڑے نظام قانونی کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً جن ممالک میں اصول اسلامی کا رواج ہو ان کے قوانین کا دائرہ دار قرآن مجید اور احادیث نبوی پر تھا، لیکن ساتھ ہی ضروریات زمانہ کے امتداد سے بڑے بڑے علماء و ائمہ نے جو اس کی تاویلیں کیں اور صورت حال کو مد نظر رکھ کر جو

قائم و شائع کئے جن سے وہ عظیم نشان نظام قانونی نکلا جسینی ابجدہ شرع اسلامی کا لقب دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں جہاں کسی قسم کا الہی قانون رائج ہوا اور جہاں کا حاکم اس کا پابند ہو، وہاں دوطرح کے حکام ملیں گے، ایک وہ جو ضروریات زمانہ کے اعتبار سے خود اس کی توسیع کرے یا علحدہ اور کم وقت سے کرے، دوسرے حکام عدالت جو ان کو وسیع شدہ قوانین کو واقعات حالیہ پر مطبق کریں اور حسب حال وقتی احکام شائع کریں۔

قانون اور عدالت۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون کی کون سی شکل کا تعلق حقیقتاً افراد ملک سے ہے اور وہ کون سے احکام میں جو دراصل ملک کے اجزاء کو انتشار و افتراق سے روکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ اصول جو احکام الہیہ میں منضبط ہوں یا وہ قواعد جو قانون ساز نے منظور کئے ہوں، بہت اہم ہوتے ہیں، اور انہیں پرملکی قوانین کا دار و مدار ہوتا ہے لیکن جیسا اوپر کہا جا چکا ہے، تاوقتیکہ مقدمہ کی وقتی نوعیت نہ معلوم ہو، فریق ثانی پر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ جب جان اسٹین یہ کہتا ہے کہ قانون مقدر الہی کے حکم کا نام ہے، تو وہ فوراً اپنی کمزوری محسوس کر لیتا ہے اور معافیہ بھی کہتا ہے کہ جس امر کی مقدر الہی اجازت دے وہی بنیاد اس کے حکم کے لئے ہے، اور ظاہر ہے کہ اجازت ظاہری بھی ہو سکتی ہے اور معنوی بھی۔ اس سے یہ صاف پایا جاتا ہے کہ خود اسٹین کو اپنی تعریف کی کمزوری کا علم تھا، وہ جانتا تھا کہ جماعت متفلسفہ یا شخص

قانون ساز کے بنائے ہوئے قواعد دراصل ملکی قوانین کا محض عشر عشر ہیں، اور بہت سے ایسے معاملات زیر بحث آسکتے ہیں (اور درحقیقت روزمرہ آتے ہیں) جن کا حل ان قواعد قوانین سے ہونا نہایت دشوار ہے، چنانچہ اس کے لئے آزادانہ تامل کے ذریعہ سے موجودہ قوانین میں ایک بڑی حد تک توسیع و اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کی تاملات کو محض "اجازت" کا لقب دینا اس لفظ کو خود ساختہ اور غلط معنی پہناتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جب مقدمہ عدالت کے سامنے جاتا ہے تو عادل پہلے یہ دیکھ لیتا ہے کہ آیا معاملہ زیر بحث پر موجودہ قوانین کا انطباق ممکن ہے یا نہیں۔ اگر یہ ممکن ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کے مطابق اپنی تجویز دے دیتا ہے، اور (جیسا کہ بیشتر معاملات میں جزاء اور بعض میں کلام پیش آتا ہے) موجودہ قوانین میں سے کسی کا کلیتہً انطباق ممکن نہیں، تو وہ فی الفور اس معاملے کے طے کرنے کی غرض سے اپنے فہم و ادراک اور اپنی قوت تحلیل کو کام میں لاکر اور جدید قواعد وضع کر کے اس کے مطابق تصفیہ کر دیتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جو جدید قواعد یہ عادل بنائے گا وہ اصولاً موجودہ قوانین کے منافی نہیں ہوں گے، لیکن اس کی دماغی کیفیات بحسبہ اسی قسم کی ہوں گی جیسی کسی نام نہاد "قانون ساز" شخص یا جماعت کی جب وہ چند خاص ضروریات کو پیش نظر رکھ کر قواعد بنائے۔ دونوں صورتوں میں جملہ عناصر کم و بیش یکساں ہی ہیں؛ دونوں کے سامنے ایک یا چند مسائل ہوتے ہیں جن پر موجودہ قانون کا انطباق نہیں ہوتا، دونوں ان کا حل چاہتے ہیں، دونوں ضرورتاً ملک اور معائنہ زیر بحث کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور دونوں ایسے قواعد وضع کرتے ہیں جنہیں وہ اس کے حل کے لئے مناسب سمجھتے ہیں؛ فرق صرف یہ ہوتا ہے (اور یہ

فرق نہایت اہم ہے کہ عادل کو اپنی تجویز بیرونی اثرات سے آزاد ہو کر دینی چاہیے۔
در آخالیکہ قانون ساز شخصیت پر بیرونی اثرات پڑتے ہیں اور وہ عام رائے،
اخبارات وغیرہ کی تنقیدوں کو پیش نظر رکھتی ہے۔

اس اصول کی مزید تفہیم کے لئے ایک مثال دینا ضروری ہے۔ فرض
کیجئے کہ زمین نے اپنی اراضی میں ایک ٹرائیلا ب بنا کر اس میں پانی بھر ارجحی الامکان
اس کی مضبوطی و حفاظت میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ لیکن ملکیت اپنی
میں کسی کو چارہ نہیں چنانچہ آفت ارضی و سماوی کی وجہ سے اس تالاب کا پستہ
پھٹ گیا اور پانی کے زور سے عمر و کی اراضی کو جو اس کے دامن میں واقع تھی،
سخت نقصان پہنچا۔ اب ایسے معاملے کے تصفیہ کے لئے عادل کیا کرے گا؟
زید نے حتی الامکان اپنے پیشے کی حفاظت کی اور کسی قسم کی غفلت نہیں برتی،
ساتھ ہی یہ بھی مسئلہ ہے کہ زید کا پستہ ٹوٹنے سے عمر و کا بہت کچھ نقصان ہوا۔
ظاہر ہے کہ اس قسم کے معاملہ کے تصفیہ کے واسطے کسی قانون ساز کا بنایا ہوا
قانون و ضوابط نا بالکل بے سود ہو گا، اور اس کے لئے عادل کو اپنا اختیار
تمیزی کام میں لانا پڑے گا، گویا کہ ایک جدید قانون وضع کرنا پڑے گا جو معاملہ
زیر بحث پر مطبق ہو سکے، اور خود ہی اس کے مطابق تصفیہ کرنا پڑے گا۔ بحسنہ
اس قسم کا مقدمہ مالک متحدہ امریکہ کی دو ریاستوں کی عدالتوں میں پیش ہوا، اور
جو امر لٹا ہر بحر منتقل ہے وہ یہ ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کے مخالف
تصفیہ ہوا، یعنی ایک ریاست کی عدالت عالیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ عمر و زید سے
ہر جہ وصول کر سکتا ہے، لیکن دوسری ریاست میں اس کے برعکس یہ طے ہوا کہ

چونکہ زید کسی قسم کی غفلت کا مرکب نہیں ہوا اس لئے اس سے ہر جہ وصول نہیں کیا جاسکتا ہے۔

یہ تو ایسے معاملات تھے جن کا تصفیہ کسی مردجہ قانون کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا۔ اب ایسے معاملات کو لیجے جن کے متعلق قوانین موجودہ میں اصول تو عدوں کئے گئے ہیں لیکن چونکہ قانون سازی کے وقت ہر امر مستقبل کی بابت پیش بینی کرنا ناممکن ہے اس وجہ سے قطعی فیصلے کے لئے حاکم عدالت کو اپنا اختیار تمیزی کام میں لانا پڑتا ہے۔ جہاں تک جرائم کا تعلق ہے عام طور پر قانون ساز محض زائد از زائد سزا کا تعین کرتا ہے، اور عدم سزا یا واقعی سزا کے تعین کو بالکل اختیار عدالت پر چھوڑ دیتا ہے۔ فرض کیجئے کسی شخص نے چوری کے ارادے سے زید کے گھر کا قفل توڑا، اور پھر اسو اپتول لے کر زید کے یلنگ کمرے تک گیا اور اس کو مارنے کی دھمکی دی یہاں تک کہ زید نے انہی صندوق کی کتبیاں اس کے حوالہ کر دیں، اور وہ مال مسروقہ لے کر جا رہا تھا کہ راستے میں گرفتار ہو گیا۔ اسے عدالت شاید اس شخص سے زیادہ سزا کا مستحق سمجھے گی جس

۳۳۰ مفردہ جات رالی لیڈر بنام لیچر Rylands v. Fletcher دارالامین صفحہ ۳۳۰
ساجوہ آرٹس بنام ویل ووڈ Marshall v. Wellwood.

۳۳۱ نیو جرجی صفحہ ۳۳۱

ان تمام مقدمات کا بیان کرے، "قانون کی ماہیت اور اس کے اخذ" Gray: The Nature
and Sources of the Law. میں دیا ہوا ہے۔

کے گھر سے مال مسروقہ تو برآمد ہوا ہے لیکن جس کے خلاف چوری کر کے لے کا تو کوئی ثبوت نہیں لیکن اس کا ثبوت ہے کہ اسے اس مال کے چوری کا علم تھا یا خود اس نے چوری کر لی تھی۔ دونوں صورتوں میں مال مسروقہ بھی موجود ہے، چور بھی موجود ہے، لیکن واقعات کے اختلاف کی وجہ سے شاید عادل سزا میں فرق کرے گا۔

حقیقی اثباتی قوانین پس پردہ ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں عدالت کے اختیار امتیازی کی نوعیت کیا ہوگی؟ یہ بالکل درست ہے کہ کچھ بھلی مثال میں قانونی اصول پہلے سے موجود تھا، لیکن یہ امر ناقابل انکار ہے کہ اس سے کم از کم ان لوگوں کو مطلق کوئی مدد نہیں ملتی جس کے واسطے وہ وضع کیا گیا تھا۔ اس میں ذرا بھی کلام کی گنجائش نہیں کہ جس وقت چور چوری کرتا ہے یا کوئی فریق معاہدہ معاہدے کو فسخ کرتا ہے اس وقت اسے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ جب اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے گا تو حاکم عدالت کیا حکم دے گا۔ کسی خاص معاملے کے متعلق یہ پیش بندی کسی حالت میں نہیں کی جاسکتی کہ دراصل کون سی قانونی تجویز اس کی بابت صادر کی جائے گی۔ گویا کہ اس معاملے کی نسبت حقیقی قانون پردہ خفا میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعث تعجب ہے کہ باوجودیکہ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے نہایت بدیہی ہے، تاہم کوئی عدالت یا کوئی نام نہاد جماعت مقننہ اسے ماننے کے لئے بظاہر تیار نہیں ہے کہ واقعی قانون سازی دراصل محکمہ عالیہ کرتا ہے نہ کہ جماعت مقننہ اور مؤخر الذکر جماعت محض اصول طے کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک قدیم قانونی اصول کے بموجب، 'نادانیت قانون کوئی معقول عذر نہیں' چنانچہ جب قانون وال

(۷ ص ۱۱۱)

دیکھتے ہیں کہ فی الواقع جماعت عالیہ ہی حقیقی قانون کا انکشاف کرتی ہے اور ہم تجویز عدالت کے اعلان کے کسی خاص مسئلے کے متعلق درہمی قانون سے باطل نہیں رہتے ہیں، تو وہ عدالت کے اس زبردست منصب کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک فاضل معنف اسی اصول کے متعلق کہتا ہے کہ قانون اُن قواعد کا نام ہے جنہیں عدالتیں تسلیم کر کے اُن پر عمل درآمد کریں۔ اسی اصول پر اس قاعدے سے کا دار مدار ہے کہ جب عدالتِ عالمیہ کسی خاص مسئلے پر کوئی تجویز صادر کر دے تو پھر تجویز کو قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے گا۔ اور آئندہ عدالت اسے ماتحت اس پر عمل کرے گی۔ یہ اصول اس درجہ مسلمہ ہے کہ سلطنتِ برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں تو ان تجویز کو آئندہ کے لئے نظیر کا رتبہ دیا جاتا ہے اور کسی عدالت ماتحت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کے خلاف عمل کرے لیکن اکثر دیگر ممالک متہذہ میں ان تجویز کے الفاظ کی اتنی پابندی نہیں کی جاتی بلکہ اُن کے اساسی اصول کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ۳۰۱ء میں تانسی جرمنی میں ایک قانون منظور ہوا جس سے عالمی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۱)

Ignorantia legis neminem excusat.

۳۰ سالہ: "اصول قانون" Salmon: Jurisprudence.

۳۱ سالہ: "اصول قانون" Holland: Jurisprudence. باب اس کے

معلق ایک اپنی کتاب "حکومتیں یورپ" Ogg: Governments of Europe.

میں لکھا ہے کہ کم از کم سترھویں صدی میں انگریزوں کے نزدیک "قانون" کے معنی ایسے قواعد کے ہو گئے تھے جنہیں عدالتیں تسلیم کریں اور نافذ کریں۔ حال ہی میں جرمنی میں وائے کے آخر پہنچنے

کی اہمیت اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ عادل کو اختیار ہے کہ کسی ایسے شخص کو سزا دے جسے مردہ تعزیری قانون کے مطابق سزا نہیں دی جا سکتی بشرطیکہ اس کے نزدیک وہ عام تعزیری اصول کے تحت یا ”مندرجہ ذیل احکام عامہ“ کے بموجب سزا کا مستحق ہو!

قانون کے ماخذ۔ اب یہ امر واضح ہو گیا ہو گا کہ تا وقتیکہ کسی قاعدے پر عدالت کی گویا مہر نہ لگ جائے اس وقت تک اسے پورے طور پر جہاں تک امر متنازعہ فیہ کا تعلق ہے، قانون کا رتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس قسم کے قواعد ہوتے ہیں جو قانون کا اعلان کرنے کے وقت عدالت مجاز کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں تو ان کی تعداد محدود ہے۔ ان تجاویز کے سب سے پہلے تو وہ ماخذ ہیں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، یعنی عدالت نے عالیہ مجاز کی تجاویز مقرر کی۔ دوسرے وہ قواعد ہیں جن کے قانون ہونے کا اعلان ملکی دستور سیاسی کے مطابق جماعت مقننہ یا دوسری قانون ساز شخصیت نے کر دیا ہے لیکن چونکہ قانون ساز کی نظر دوسری نہیں ہوتی کہ وہ تمام واقعات آئندہ پر حاوی

(نہیہ نوٹ ملے گا) ایک نیا قانون نافذ کیا ہے جس کے بموجب اگر کسی مقدمے میں قانونی تجویز مملکت کے افسران کے مشافی ہو تو عادل کو اختیار ہے کہ قانون کے صریح معنی کے خلاف احکام صادر کرے۔

۱۹ سالانہ مددیں، ۱۹۴۳ء - ۱۹۵۳ء - نیز دیکھو باب ۲۱ حاشیہ ۴

مثلاً اس بحث کے لئے دیکھو ”کوئی“: ”قانون عامہ“: *Willoughby v. Pauline*

law باب ۱۰۔

ہوسکے اس لئے) اسے مجبوراً بہت بڑا اختیار تمیزی حکمہ عدلیہ کو دینا پڑتا ہے اور جیسا بیان کیا جا چکا ہے حقیقی قانون متعلقہ کا اس وقت تک انکشاف نہیں ہوتا جب تک عدالت انہی تجویز نہ دے دے۔ یہ دواخذ کوگو یا وہ میں جنہیں زیر نظر رکھنا دستور مملکت کے مطابق ہر عادل کا فرض عین ہوتا ہے ، ان کے علاوہ بعض ایسے تو اعد بھی ہیں جن کا عام طور پر دستور مملکت میں کہیں ذکر نہیں ہوتا ، لیکن عادل بعض مرتبہ انہیں بھی ملحوظ رکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے جتنا موضوعی قوانین یا نظام کو اور یہ مذہبی احکام ، رسم و رواج ، مستند ائمہ قانون کی کتابیں اور نصیحت ہیں۔

تقریباً ہر ملک پر ایک دور ایسا گذرتا ہے جب وہاں کے قانون کا دار و مدار کلیۃً خدائی قانون پر ہوتا ہے۔ خود یورپ میں بھی جو آج کل دنیوی معاملات میں مذہبی قواعد کی دست اندازی سے اس قدر دیگر دال نظر آتا ہے ، اس قسم کا عہد گزر چکا ہے۔ رومن عہد میں سیاسیات میں مذہب کا بہت بڑا دخل تھا ، اور تارچ روم کے ہر مطالعہ کرنے والے کو اس عظیم نشان اثر کا علم ہے جو وہاں کے ”آگر دل“ یعنی پجاریوں کو سیاسیات پر چلا تھا۔ جب کبھی کسی ”آگر“ کو آسمان پر با زمین پر یا کسی جاؤر کے جسم میں یا کسی اہل جگہ کوئی بدشگونی معلوم ہوتی تو وہ اپنے حکم سے تمام موجودہ سیاسی کارروائیوں کو یکے بعد دیگرے یا ملتوی کر سکتا تھا اور اس کا حکم ناطق سمجھا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس اہم منصب نے بالکل سیاسی پہلو اختیار کر لیا ، اور یہ روزمرہ کی بات ہو گئی

کہ جب کوئی اگر کسی خاص سیاسی ذہنی کا ہمنوا ہوتا اور غریب مخالف کسی جمعیت یا مجلس پر حاوی ہوتا تو وہ کسی فرضی بدھنگونی کا اکتشاف کر کے کارروائی کوئی الٹو روک دینے میں دریغ نہ کرتا بلکہ قانون پر مذہب عیسوی کا اثر بھی کچھ کم نہیں پڑا۔ چنانچہ پہلی چارم شاہ انگلستان کے زمانے کی ایک نظیر میں صریحاً یہ حکم لگا دیا ہے کہ ”انجیل مقدس ایک ایسا قانون عامہ ہے جس پر جملہ ایتباقی قوانین کا دارومدار ہے۔ یہی کیفیت مندرجہ ذیل جیسی کتب بنود اور بعض صحائف سماوی کی ہے۔ قرآن مجید میں بھی بعض اصولی اور بعض تفصیلی قوانین مندرج ہیں اور انہی پر تمام فقہ اسلامی بنی و منحصر سمجھا جاتا ہے۔“

لیکن یہاں بھی یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ کسی ملک میں صرف انھیں خدائی احکام کو قانون کا رتبہ حاصل ہوتا ہے جنھیں عدالت ہائے مجاز تسلیم کر لیں۔ سب سے پہلی مثال شریع اسلامی کی ہے۔ شریع اسلامی کے عروج کے زمانے میں یہ شریع جملہ معاملات مملکت پر حاوی تھی، لیکن امتداد زمانہ سے (خصوصاً جب غیر اسلامی قوانین کا عروج ہوا اور ان کا دنیا پر رواج ہو گیا تو) رفتہ رفتہ اس کے بعض حصوں کو نظر انداز کر دیا گیا اور آج شاید ہی کوئی ایسا ملک ہوگا جہاں اس کا تمام و کمال رواج ہو۔ ہندوستان میں

۱۔ ”ہندو“ رومانی دستور اور سیاسی تاریخ T.M. Targbor: Constitutional and Political History of Rome.

۲۔ سالنامہ ۳۳، پہلی صفحہ جس کا اقتباس آئینہ باب ۵ میں کیا گیا ہے۔

۱۸۷۷ء کے ایک قانون کے مطابق شرع شریف اور دہرم شاستر کا نفاذ صرف معاملات وراثت اور مناکحت و ازدواج تک محدود رہ گیا ہے اور تعزیرات و ضربے جاکے معاملات پر اس کا مطلق کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ بعض اسلامی مالک اس سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے ضروریات زمانہ کو ملحوظ رکھ کر اپنے خانگی قوانین بالکل نئے سانچے میں ڈھال دئے ہیں۔ یہ ان دراصل مذہبی قوانین سے جس عظیم الشان گریز کا ہے جو اس وقت یورپ و امریکہ میں جاری و ساری ہے۔ بہر حال خواہ ہندوستان کی طرح مذہبی قوانین کی جزوی پابندی کی جائے یا ترک و مصلحت کی طرح اکثر معاملات میں مطلق پابندی نہ کی جائے، اس میں شبہ نہیں کہ مذہبی قوانین کی ترویج کا دار و مدار محض اس امر پر ہے کہ آیا عدالتیں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں یا نہیں، اگر قانون ساز نے اس کی کوئی جرم کو صراحتاً رد کر دیتے تو لامحالہ عدالتیں اسے مسترد سمجھیں گی، اگر رد نہیں کیا ہے تو پھر اس کا تسلیم کرنا نظر اور خود اس کے اختیار تفسیری پر

۱۸۷۷ء قانون پارلیمنٹ ۱۱ جارج نہ، باب ۷ دفعہ ۱۱ اس قانون کے مطابق ہندوؤں کے خانگی معاملات پر دہرم شاستر اور مسلمانوں کے خانگی معاملات پر شرع اسلامی کو حادی تسلیم کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے خانگی قوانین اور ملکی قوانین کے درمیان جنھیں متبہ عجیب و غریب اختلاف نظر آتا ہے۔ اس کی مثال ۱۸۷۷ء کے مشہور "ساروا ایکٹ" سے یہی چاہتی ہے جس کے بموجب اگر ۱۸ سال سے کم کی لڑکی ۱۸ سال سے کم کا لڑکا شادی کریں تو وہ ملکی قانون کے بموجب ایک قابل تعزیرات کا مجرم ہوگا گو شاید شاستر یا شرعاً اس کے وارث جائز تصور کیے جائیں۔

مختصر ہو گا۔

مزہبی قوانین سے گزر کر رسم و رواج تک پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسم و رواج کو اتنا ہی، بلکہ بعضوں کی نگاہ میں تو اس سے زیادہ، تقدس حاصل ہے جتنا مذہبی قوانین کو۔ قدیم یونانیوں کا خیال تھا کہ جب کوئی حاکم کسی معاملے کا تصفیہ کرنے پر تیار ہے تو قہر جس نامی معبود (جسے انصاف کا دیوتا سمجھا جاتا تھا) اس پر اپنی راء الفا کرتا ہے اور وہی اس حاکم کی تجویز ہوتی ہے، چنانچہ ان تجاویز کو

مثلاً شرع محمدی، محکمہ عدلیہ اور جماعت مفسنہ کے حدود و مکملہ دفعہ اسلامی کے حوالہ سے ظاہر ہو جائیگا۔ جملہ اہل سنت و اشاعتی اس اصول پر متفق ہیں کہ کوئی شخص اپنی جائداد وقف علی الاولاد کر سکتا ہے یعنی اس طرح پر وقف کر سکتا ہے کہ جائداد کا منافع اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو ملے گا، مگر اس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے؛ اگر کوئی زائد آئے کہ اس کی نسل بالکل منقطع ہو جائے تو وہ پیر کی کار خیر میں لگا دیا جائے۔ یاد جو مکمل اتفاق رائے ائمہ کے پر پوری کو نسل نے سنا ہے اسے پہلے بار بار یہ ملے کہ اگر وقف کا مقصد فوراً کسی خیرات میں منافع کا صرف نہ ہو گا تو وقف کا لغو سمجھا جائے گا (محمد احسان اللہ چودھری بنام امر چند، ۱۷ کلکتہ صفحہ ۴۹) پر پوری کو نسل؛ البتہ محمد اسحاق بنام میا دھر چودھری ۲۲ کلکتہ صفحہ ۱۷ پر پوری کو نسل اور قانون کی یہ شکل سب سے پہلے اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ قانون عدلیہ ۱۹۰۸ء کا قانون دفعہ اسلامی (ہندوستان کی مجلس مفسنہ نے منظور نہ کیا جس کی رو سے اہل شرعی اصول از سر نو راج ہو گیا۔ دیکھو عبدالجیم۔

Abdul Rahim: Mohommadani اسلامی

Jurisprudence. باب ۷ حصہ ۲ رتبہ

تھے جس میں کالقب دیا جاتا تھا اور لوگوں کا یہ خیال تھا کہ بادشاہوں کے پاس ان تجاویز کا گویا انبار لگا ہوتا ہے جس میں سے وہ چن چن کر ان کے مطابق مختلف معاملات کا تصفیہ کرتے ہیں۔ اگر ہم غور کریں اور ان کے معانی کے میں اسطورہ میں لڑیم پائی گئے کہ دراصل تھے مس نہیں کا اخذ وہی رسم و رواج کا ذخیرہ تھا جس کے مطابق بادشاہ یا حکمران تجویزیں صادر کرتا تھا اور خود ہر مرتبہ اشعار میں بھی تھے رسم و رواج کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہندوستان میں رسم و رواج ایک مسئلہ اخذ قانون ہے اور پنجاب تو اس قسم کے رواجی قوانین سے بھرا پڑا ہے ساتھ ہی مختلف دیہات کے واجب الغرضوں کو تسلیم کر کے مملکت نے اس اصول پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے بعض مرتبہ بعض رواج کو ایسے قوانین جیسے قوانین دستور پر امتداد ملنے سے نفوذ حاصل ہو جاتا ہے مثلاً انگلستان میں بادشاہ کو پارلیمنٹ کے منظور کردہ سودا پر یقیناً حق امتناع حاصل ہے، لیکن اسے دوسروں سے کام میں نہیں لایا گیا اور اب یہ اختیار گویا مملوب تصور کرنا چاہئے۔

سند انگریزوں اور فقہاء کی کتابیں بھی تجاویز عدالت کا اخذ ہوتی ہیں۔ بلا شبہ اس قسم کی زبردست اور اہم کتابوں سے جیسے پوسٹی نیان اور گایوسٹ نڈا کے عالمگیری اور ہدایہ، مشکوٰۃ اور دایہاگ، بیسکٹن اور گلکس، عادل اپنی تجاویز کے اصول اخذ کر سکتا ہے اور ان کی سند پر اپنے خیالات کو منہی کر سکتا ہے، لیکن تاوقتیکہ کوئی اعلیٰ عدالت مجاز ان کتابوں کے کسی اصول کے مطابق

کسی معاملے کا تصفیہ نہ کرے انھیں یا ان کے کسی جز کو اثباتی قوانین کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانون کا آخری ماخذ نصفیت ہے۔ پروفیسر الینڈ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں ”نصفیت ان قواعد کا نام ہے جو موجودہ اثباتی قوانین کے دوش بدشا کسی اعلیٰ حاکم عدالت کے حکم سے جاری کئے جائیں۔ اثباتی قوانین اور قواعد نصفیت میں باہمی اختلاف نظر آئے تو مؤخر الذکر کا ہی بول بالا سمجھا جائے گا۔ اگر وہ سرے اعضائے حکومت پر حکام عدالت کی فوقیت اس وقت تک مشتبہ تھی تو اصول نصفیت اور اس کی ترمیم و توسیع کے بعد تو اس میں کسی کا شبہ باقی نہیں رہتا۔ اثباتی قوانین موجود ہیں، ان قوانین پر حکم عمل ہو رہا ہے، لیکن عدالت ان پر لفظاً یا معنایاً عمل کرنے کی بجائے خود جدید قواعد وضع کرتی ہے اور ان کے مطابق معاملہ کا تصفیہ کرتی ہے۔ اس اصول کی ابتدا اور ترمیم بچائے خود ایک نہایت ہی اہم شاخ مطالعہ قانونی کی ہے، اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن ملک میں ان قواعد کی ابتدا ہوئی ان میں حکام بالادست نے کس طرح سے موضوع اثباتی قوانین کو نظر انداز کر کے جدید قواعد کی بنیاد ڈالی اور ان قواعد کے مطابق مقدمات کا تصفیہ کیا۔ قواعد نصفیت کی بہری مثال قاعدہ حکم امتناعی ہے جس کی رو سے قبل تصفیہ مقدمہ محض ایک فریق کی درخواست پر عدالت فریق ثانی کو نرا دعویٰ امر سے دست کشی کا حکم دیتی ہے اور عدول حکمی کی صورت میں اسے سزا کا

رنگ گذرتی ہے۔

اثباتی قانون کے اقسام قبل اس کے کہ ہم حقوق کی اہم بحث کی طرف متوجہ ہوں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر آثباتی قانون کے اقسام بیان کر دے جائیں۔ یوں تو قانون کی تقسیم بہت سے اصول پر کی جاتی ہے، لیکن سیاست کے اعتبار سے اسے دو اصول کی بنیاد پر تقسیم کیا جاسکتا ہے، ایک تو اس کے مقصد کی بنا پر اور دوسرے طرز تحقیقات و تصفیہ کی نوعیت کی بنا پر۔ اگر غور کیا جائے تو قانون کے دو بدیہی مقاصد نکلیں گے، ایک تو افراد ملکیت کے حقوق و فرائض کا تعین اور دوسرے اگر شخصوں میں تنازعہ ہو تو جسے رفع کر کے یا اس کے طے

فہم یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام قوانین کے مآخذوں کو شمار کرنے کے ساتھ ہی فقہ اسلامی کے مآخذ بھی شمار کر دے جائیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین (جسے شرع محمدی کا لقب بھی دیا جاتا ہے) تقریباً تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کے مآخذ مفصلہ ذیل ہیں۔ قرآن مجید، حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی علماء و ائمہ قانون کا اتفاق رائے۔ قیاس یعنی اصول، قبل کو پیش نظر رکھ کر کسی ایک عالم فقہ کی ذاتی رائے، استحسان یعنی بغیر اصول، قبل کے پیش نظر رکھے ہوئے بعض عالم فقہ کی رائے کا واقعات متنازعہ پر انطباق۔ اس کے علاوہ عرف یعنی رسم و رواج کو بھی مآخذ شرع اسلامی قرار دیا گیا ہے، بشرطیکہ اس کے خلاف کوئی نص صریح یا حدیث نہ ہو۔ اس پر سر عبدالرحیم نے اپنی کتاب "اصول قانون اسلامی" باب میں مفصل بحث کی ہے، علاوہ ازیں انحضرت کی تاریخ "فقہ اسلامی" (مترجم عبدالسلام ندوی) میں اصول اجتہاد کی تاریخ، جسٹس مس کی تکلیف کے مدارج واضح کئے گئے ہیں۔ (دقیقہ صفحہ ۱۲ پر)

کرنے کے طریقہ کا تعین پہلی قسم کے قوانین کو "قوانین موجہ" اور دوسری قسم کے قوانین کو "قوانین اضافی" کہتے ہیں۔ قوانین موجہ میں اس قسم کے قوانین جیسے قانون معاہدہ، قانون ازالہ حیثیت عربی، قانون مملوکات، قانون مالگداری اور ایسے ہی دوسرے قوانین ہیں جن میں ہر ایک شخص متعلق کے حقوق و فرائض کی نوعیت دکھائی گئی ہو، اس کے برعکس قوانین اضافی میں ایسے قوانین جن کا تعلق اقسام عدالت، مدارج مقدمہ، نفاذ تجویز عدالت، حد اختیار اور وہ قواعد ہوتے ہیں جن کی پابندی ضروری اور لازمی ہے۔ دوسرا اصول جس کی بنا پر قانون کو تقسیم کیا جاتا ہے افراد متعلقہ کی شخصیت پر مبنی ہے۔ اگر وہ لوں فریق کی نوعیت محض خانگی ہو تو اس کا تعلق "خانگی قانون" سے ہو گا۔ اگر ان میں

(بقیہ نوٹ ص ۱۱۹ کا) آج کل کے سلسلہ ماخذ قوانین کو پیش نظر رکھ کر زمانہ حال کے اصول قانون کے ماخذ اور شرع محمدی کے ماخذ کا مقابلہ مفصلہ ذیل طرز پر کیا جاسکتا ہے

| ماخذ قانون اسلامی | ماخذ قانون حالیہ |
|-------------------------------------|--|
| (۱) قرآن مجید و حدیث رسول اکرم صلیم | (۱) خدائی قوانین و قوانین منظور کردہ قانون ساز |
| (۲) اجماع مجتہدین | (۲) بیسے بیسے مفسرین قانون کی کتابیں |
| (۳) قیاس | (۳) نظائر |
| (۴) استحسان | (۴) تصفیت |
| (۵) عرف | (۵) رسم و رواج |

سے ایک خود مملکت اور دوسرا محض ایک فرد ہے تو اس کی نوعیت "قانون عامہ" کی ہوگی اور اگر دونوں فریق دو یا دو سے زائد مملکتیں یا ان کے شہری ہوں تو ان کا تعلق "بین الاقوامی قانون" سے ہوگا۔ خاگی قانون ایسے قانون کو کہتے ہیں جیسے قانون معاہدہ، قانون املاک، جب ان میں دونوں فریق محض خاگی افراد ہوں؛ قانون عامہ میں قانون جرائم یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت ملک میں بد امنی کا افساد کرتی ہے، دستوری قانون یعنی وہ قانون جس سے گویا مملکت کا سیاسی مرکز نقل معلوم ہوتا ہے اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مملکت کی "ہیئت حاکمہ" میں کون کون سے عناصر شامل ہیں اور انتظامی قانون یعنی وہ قانون جس کے ذریعے سے مملکت اور افراد کے باہمی تفاعلات طے ہوں شامل ہیں۔ بین الاقوامی قانون ان قواعد کا مجموعہ ہے جن پر ان اور جنگ کے وقت مختلف ممالک کو حتی الامکان کاربند رہنا چاہئے، لیکن معاہدہ پر بیان کیا جا چکا ہے، قانون کے لئے مقتدر اعلیٰ کا ہونا لازمی ہے، اور چونکہ کوئی ایسی قوت یا ادارہ موجود نہیں ہے جسے "بین الاقوامی مقتدر اعلیٰ" کہا جاسکے اس وجہ سے اکثر بعض علما ان قواعد کو قانون کا لقب دینا پسند نہیں کرتے تھے

پروفیسر اموس اپنی کتاب "علم قانون" Amos: The Science of Law میں لکھتے ہیں ان قوانین کا جو ان کی دانست میں کسی تمدن مملکت کے لئے ضروری ہیں، شمار کرتے ہیں۔ ہم اس فہرست میں تھوڑی بہت ضروری ترین حسب حال کر دی ہے۔ بقیہ ملاحظہ

اقراون جن کے اصول مضبوط ہو سکتے ہیں

قوانین جن کے اصول مضبوط نہیں ہو سکتے

قانون کوکری قانون املک قانون عاقلہ قانون شخصی قانون شرعی قانون مہرہ قانون مدنی قانون تجارتی قانون مالیاتی قانون جزائی ضابطوں کے

قانون کی حیثیت

قانون کی سی ہے

قوانین متعلقہ دایرہ مقصورہ

قوانین متعلقہ کائے عدالت

باب ۷

حقوق و آزادی

توازن اور حق۔ قانونی حقوق کی تقسیم۔ اہم حقوق کا شمار زندگی اور شخصی آزادی۔ ملکیت۔
 مناکحت و ازدواج۔ مذہبی آزادی اور رواداری۔ سیاسی حقوق۔ سیاسی آزادی۔ وٹو کی آزادی
 Rights and Duties کی آزادی

قانون اور حق۔ سب سے پہلے تو ہمیں حقوق کا مطلب اچھی طرح ذہن
 نشین کر لینا چاہئے۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مملکت میں جو قوانین
 رائج ہوتے ہیں وہ یا تو مقدر اعلیٰ کے ایسے احکام ہوتے ہیں جو نہ ایسے قواعد ہوتے
 ہیں جنہیں مقدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے جن کے ذریعے سے اس کی شیرازہ بندی ہوتی
 ہے اور جن کا ماننا ہر فرد مملکت کا فرض سلف ہے۔ مملکت کے اس اختیار کے
 باعث وہ اپنے ذی اختیار ادارات کے ذریعے سے موجودہ قوانین کی ترمیم کر سکتی
 ہے اور انہیں ایسے راستے پر لاسکتی ہے جس سے باشندگان ملک کے مجموعی
 مفاد میں ترقی ہو حقیقت یہ ہے کہ قوانین ہی کے ذریعے سے مملکت میں آزادی کا

لے باب ۷۔

وجود ممکن ہے، ورنہ انسانوں کی کسی جماعت میں اتنی مرکز گریز قوتیں ہوتی ہیں کہ وہ اسے شاید ایک دن بھی چہن نہ لینے دیں۔ اگر مملکت کا دباؤ بالکل ہٹا دیا جائے تو انسانوں کا مجموعہ گونا گونا گونے کی قوتوں کا مجموعہ ہو جائے گا، جو ایک دوسرے سے سیادت اور تقویٰ کی غرض سے برسرِ پیکار ہوں گی، جس کی وجہ سے ایسے مجموعہ افراد میں حقوق و فرائض کا نشان بھی نہیں ہو گا۔ مملکت کے غیاب میں ہر انسان کے ”حق“ کا واحد معیار اس کی ذاتی قوت ہی تک محدود ہو گا، یعنی صرف اُس کے قیام ہی کی صورت میں مختلف اشخاص اس دامن کے ساتھ اپنے اپنے حقوق کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا کہ قوانین کی ساخت اور ان کی ترمیم و تفسیح کا واحد آرکار مقتدر اعلیٰ ہے، اور قوانین ہی حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں، تو اس سے یہ اندازہ بالکل قدرتی ہے کہ حقوق کا تعین بھی اسی ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روزمرہ اس قسم کے الفاظ سنتے ہیں جیسے ”ہمارا بنیادی حق“ ”انسان کے فطری حقوق“ ”اخلاقی حقوق“ وغیرہ، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہمارا کوئی ”پیشی حق“ ایسا ہے جسے مقتدر اعلیٰ نے تسلیم نہیں کیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہو گی؟ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرا بنیادی حق یہ ہے کہ میرے مقدمات جیوری کے ذریعہ سے تصفیہ پائیں، اور اس ملک میں جس میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے، جیوری کا قانون نہ ہو، یعنی اس اصول کو مقتدر اعلیٰ نے تسلیم نہ کر لیا ہو تو اسی لحاظ میں اس کا یہ دعویٰ بالکل باطل اور بے بنیاد ہو گا۔ دوسرے آخر ”فطری حقوق“ کے تعین کا معیار کیا ہے؟ جب تک کوئی ایسی ذاتی قوت موجود نہ ہو جو ان حقوق کا



تین کر سکے اس وقت تک ہم ”فطری حقوق“ کو کیسے پہچانیں؟ ظاہر ہے کہ یہ قوت الہی ہو سکتی ہے یا دنیوی، لیکن علی انتظام کا مقصد یہی ہے کہ ہر نفع جب تک نظام مملکت اسے تسلیم نہ کرے اس وقت تک ان حقوق کی بنا پر تنازعات کا جبری تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ ہم جن حقوق کو عام طور پر ”فطری“ یا ”پیدائشی“ کہتے ہیں وہ ایسے حقوق ہیں جو فی الواقع قانون کا رتبہ نہیں رکھتے، بلکہ ملک کے بعض مصالح چاہتے ہیں کہ انہیں قانون کا رتبہ حاصل ہو جائے مثلاً جب کوئی ہندوستانی سیاسی مصطلح کہتا ہے کہ ”سیاسی آزادی ہمارا“ ”فطری“ یا ”پیدائشی“ حق ہے جس کی وجہ سے مملکت کو یہ حق فوراً تسلیم کر لینا چاہئے تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اس وقت میں سیاسی آزادی حاصل نہیں، چنانچہ اس سیاسی مصطلح کا مطلع نظریہ ہو گا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے ملک والوں کو سیاسی آزادی حاصل ہو جائے بعض حقوق ایسے ہیں جو ہمیں بدی نظر آتے ہیں، لیکن دوسرے ممالک میں انہیں زیادہ سے زیادہ ”فطری حقوق“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، چنانچہ بہت سے علاقے سیاست کو حق املاک جیسے بدیہی حق میں شبہ ہے کہ آیا یہ انسان کا فطری حق ہے یا نہیں، مثلاً روس میں افراد کو مکمل حقوق ملکیت حاصل نہیں۔ یہی کیفیت اخلاقی حقوق کی بھی ہے۔ اخلاقی حقوق ان حقوق کا نام ہے جنہیں رائے عامہ نے تسلیم کر لیا ہو، لیکن جنہیں اس وقت تک مقتدر علی کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی ہو۔ چونکہ رائے عامہ اور مملکت میں جو فرق ہے وہ تنظیم کا ہے، یعنی رائے عامہ باشندوں کی غیر منظم کیفیت کا نام ہے اور مملکت ان کی منظم اجتماعی حیثیت کا اس لئے ان دونوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ ان ”اخلاقی حقوق“ کو

بالجبر نہیں منوایا جاسکتا، یعنی جو فریق ان سے روگردانی کرے اس پر قانونی سختی نہیں کی جاسکتی، اور اسے جو خوف ہوگا وہ محض لوگوں کے مضحکے یا ان کے غصے یا ان کی ناراضی کا ہوگا؛ چنانچہ اگر وہ چاہے تو ان کی پرواہ نہ کرے اور اپنی ہسٹ پوسٹ پر قائم رہے۔ مثال کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زوجہ کا اخلاقی حق ہے کہ شوہر اس کے ساتھ نیک سلوک کرے؛ اگر کوئی شوہر ایسا بے درد ہو کہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا لیکن ساتھ ہی تعزیری قانون کے حدود کے اندر رہتا ہو اس کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ رائے عامہ اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے، اور اگر اس کی وہ پرواہ نہ کرے تو رائے عامہ اس کا کچھ نہیں کر سکتی۔

ان سب اقسام کے حقوق سے ممتاز وہ حقوق ہیں جنہیں ہم "اثباتی" یا "قانونی" کا لقب دیتے ہیں اور جنہیں مختار ادارات مملکت نے تسلیم کر لیا ہو، یعنی جن کا نفاذ مملکت کے محکمہ عدلیہ کے ذریعے سے ہوتا ہو کوئی "پیشگی" یا "فطری" حق اس وقت تک "اثباتی" حق نہیں بن سکتا جب تک مملکت ادارہ مجاز اسے پورے طور پر تسلیم نہ کرے۔ جب ادارات مملکت (بالخصوص محکمہ عدلیہ) اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حقدار شخص کو ایک دوسرے شخص کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ کرنے کا اختیار ہو گیا، اور اس شخص کا یہ فرض ہو گیا کہ وہ اس طرز کا برتاؤ تسلیم کرے، در نہ بشرط ضرورت مملکت اسے جبراً قہراً مجبور کرے گی۔ مثلاً اگر ذیل سے حاکم سے روپیہ قرض لیا ہے تو میعاد مقررہ

کے بعد خالد کو یہ حق ہے کہ وہ زید سے روپیہ واپس وصول کر لے، اگر زید نے روپیہ دینے سے انکار کیا تو خالد عدالت مجازی میں مقدمہ دائر کر کے ڈگری کر لے گا اور سرکاری فرقی اور نیلام کے ذریعے سے روپیہ وصول کر لے گا۔ انسانی معاشرے کا مدعا ہی یہ ہے کہ مختلف افراد جن امور کو بطور خود انجام نہ لے سکیں یا ان کا انجام دینا خلاف مصلحت ہو، وہ اس کی تائید اور پشت و پناہی سے ان کے اخبام دینے کے اہل ہو جائیں، اور اس مقصد کی انجام دہی کے لئے سیاسی معاشرہ اور اداروں کو اہی کے ذریعے سے لوگوں کو مختلف کام کرنے یا نہ کرنے پر مجبور کرے گا۔ انہیں اور اداروں کو اہی سے افراد کے فرائض کا تین ہو سکتے ہیں اور ہر ایسے فرائض کے جواب میں جو حق محسوس ہو ایسے قانونی حق سمجھنا چاہئے۔

قانونی حقوق کی تقسیم: قانونی حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو حقوق عامہ اور دوسرے خاکی حقوق۔ تقسیم کچھ نئی تقسیم نہیں ہے بلکہ اس میں جنہ دی فرق پر نظر ہے جو فقہائے اسلام نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے مابین رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ”حق اللہ“ سے (علاقہ عبادات کے) ایسے حقوق مراد نہیں ہو سکتے جن سے انسان مستفید نہ ہوتا ہو اور اس لئے کہ خداوند کو کسی دنیوی حق یا کسی دنیوی امر کے استفادہ سے (بالا تر ہے) اور ان سے یہ بھی مراد نہیں ہو سکتی کہ یہ حقوق خاص طور پر میرا کئے ہوئے ہیں (اس لئے کہ خدا نے تو ہر ایک حق پیدا کیا ہے) بلکہ ان دونوں باتوں کے برعکس انہیں حقوق اللہ غالباً ان کی انتہائی اہمیت کی وجہ سے کہتے ہیں اور ان میں سے اکثر کے ذریعے سے مملکت کی شیرازہ بندی عمل میں آتی ہے۔ سب سے پہلے تو خاکی حقوق و فرائض کر لیجئے۔

(سہ مشاہیر)

خانگی حقوق و فرائض وہ ہیں جو مختلف افراد کے باہمی تعلقات کو معین و منضبط کرتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ کاروبار کے ضمنی حقوق اسی کے تحت آتے ہیں، مثلاً میاں بیوی، بالغ و مشتری، مکان دار و کرایہ دار، زمیندار و کاشتکار، آقا و مائزہ کے حقوق و فرائض کا تعلق اکثر و بیشتر اسی حق میں آتا ہے، اور ملکیت کا کام یہ ہے کہ ایک طرف انہیں جبراً متوائے، دوسری جانب حد سے تجاوز نہ ہونے دے۔ ان کے برعکس حقوق عامہ میں جن کے ذریعے سے حکومت اور افراد کے باہمی تعلق کا تعین ہوتا ہے یہ بالکل ممکن ہے کہ بعض معاملات میں حکومت مثل کسی فرد کے ایک فریق پر مثلاً حکومت کسی سرکاری عمارت بنانے کا کسی کو ٹھیکہ دے یا جب دیوانی یا انتظامی عدالت میں اسے بطور ایک فریق کے گردانا جائے، لیکن ایسی حالت میں اس کی حیثیت محض خانگی ہوگی۔ حقوق عامہ وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے سے حکومت افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات کا تعین اور ان کی تجدید کرتی ہے۔ یہ ادب بتایا جا چکا ہے کہ ملکیت اور حکومت میں ایک تین فرق ہے۔ ملکیت افراد کی مجموعی سیاسی کیفیت کا نام ہے، اور یہی فی الواقع مقتدر اعلیٰ ہے؛ حکومت وہ آلہ کار ہے جس کے ذریعے سے ملکیت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔ لیکن ملکیت ایک مجرد فلسفیانہ تخیل ہے؛ اس کے برعکس حکومت چند انسانوں کے مجموعے

دقیقہ میں (۱)
 ۱۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لئے دیکھو عبد الرحیم، "اصول قانون اسلامی" Abdul
 Rahim : Mohummadan Jurisprudence. باب ۸

کا نام ہے جو مرکز گریز قوتوں کو دباتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت کا مقصد ہی افراد کے نقصان رساں احساسات کو زیر کرنا ٹھہرا تو اس کے اور افراد کے مابین ایک کشمکش اور پھینچ تان کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مملکت اپنی ہیئتِ حاکمیت کے ذریعے سے وساتیر تیار کرتی ہے، اور ان کے مطابق بنے ہوئے قوانین کے ذریعے سے افراد اور حکومت دونوں کی حدود معین کرتی ہے۔ حال کے زمانے تک یعنی اس وقت تک جب تک مملکت اور حکومت کا فرق پورے طور پر واضح نہیں ہوا تھا، مملکت اور حکومت کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھ لیا گیا تھا، چنانچہ سیاست دانوں اور معاشیوں کے ایک مخصوص گروہ، یعنی انفرادیوں کا مقصد ہی یہ ہو گیا تھا کہ فرد کو ”مملکت“ کی دست برد سے بچا یا جائے۔ مگر انسان کی انفرادی حیثیت مملکت کے احساس کے خلاف پرستگتی ہے لیکن اس تضاد میں مبالغہ آمیزی کی بھی گنجائش ہے۔ اس لئے کہ آخر مملکت افراد ہی کی اجتماعی جس کی ایک اخلاقی شکل کا نام ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ حکومت (یعنی دستوری مملکت کے ذریعے سے جو آلہ کار مقرر ہوتا ہے) وہ مرکز گریز اثرات کا استیصال کرنے میں بعض مرتبہ افراد کے انفرادی احساسات و جذبات کی پروا نہ کرے کئی جس سے اس میں اور ملک کی اجتماعی کیفیت میں تنفیص پیدا ہو جاتی ہے۔

شہ یہ مبالغہ ہر برٹش پندر کی مشہور ”فرد و مملکت“ *Herbert Spencer*:
Man Versus the State کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مملکت ایک طرف حکومت کے اختیارات کی حد بندی کرتی ہے اور دوسری جانب افراد کے جسطرح عمل کا تعین کرتی ہے۔ حکومت کے اختیار کی حد بندی کی مثالیں تقریباً ہر ملک کے دستور و آئین میں نظر آئیں گی، اور دراصل انگلستان کے دستاویز حقوق ۱۶۸۹ء فرانس کے اعلان حقوق ۱۷۹۱ء جرمنی کے اعلان حقوق ۱۹۱۹ء اور نہرو رپورٹ کے اعلان حقوق ۱۹۴۸ء میں فرد کے مقابلے میں حکومت کے اختیارات کی تحدید ہی کی گئی ہے۔ ان کے برعکس وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے سے افراد کے اختیارات کی حدود مقرر کی جاتی ہیں، مثلاً قوانین غداری و قوانین تعزیری، اور جن کے ذریعے سے

۱۔ ”نہرو رپورٹ“ کے اعلان کا شخص خالی از لطفی نہ ہوگا۔

(۱) حکومت کے جملہ اختیارات کا منبع قوم ہے۔

(۲) بلا قانونی چارہ جوئی کے کسی شخص کی آزادی سلب نہ کی جائیگی، نہ اس کی ملکیت پر قبضہ کیا جائیگا

(۳) افراد کو غیر مذہب کی آزادی حاصل ہوگی اور کسی مذہب کو ترجیح نہ دی جائے گی نہ کسی پر قانونی

مجبوریاں عائد کی جائیں گی۔

(۴) ہر فرد کو، خواہ اس کی ذات اور مذہب کچھ بھی ہوں، ”دولت عامہ“ کے مدارج میں داخل ہونے کی

اجازت ہوگی۔

(۵) کل قانونی مساوات۔

(۶) ہر شخص کو کوئی پیشہ اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہوگی اور مختلف عہدے کسی خاص مذہب

(۷) دلائل کے لئے مخصوص نہیں کئے جائیں گے۔
(نقیضہ چلے گا)

حکومت کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر کوئی فرد ان حدود سے تجاوز کرے تو حکومت فی الفور مداخلت کر کے اسے ایسی جسمانی سزا دے کہ خود اس فرد کے لئے باعث نصیحت اور دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو بلکہ اکثر ممالک میں حکومت کے عہدہ داران مجاز کو اس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

اہم حقوق کا شمار یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر افراد کے بعض حقوق کا شمار کر دیا جائے تاکہ ایک طرف تو امور متذکرہ بالا اچھی طرح سے واضح ہو جائیں اور دوسرے افراد کی مجموعی آزادی کا مفہوم بخوبی سمجھیں اسکے۔ ظاہر ہے کہ ہر ملک میں افراد کے حقوق یکساں نہیں ہوتے، اختلاف ایک طرف تو ہمارے سامنے ایسی ملکیتیں جیسے جرمنی، میں جہاں حکومت اور سیاست حاکم میں کوئی فرق نہیں اور جہاں حکومت نے ایک حد تک واقفیت مندگی کی جگہ لے لی ہے۔ ایسی ملکیتوں میں افراد کو بحیثیت افراد بہت ہی کم حقوق حاصل ہوتے ہیں، یعنی ملکیت ہرگز نہ محافظ افراد ان کے اکثر امور پر حاوی ہوتی ہے۔ دوسری وہ ملکیتیں ہیں جہاں حقوق کی ترادو کا پڑا وہ سری طرف جھکتا ہے یعنی جہاں حکومت اکثر بیشتر محض افراد کی حفاظت، ملکیت کی شیرازہ بندی اور افراد کے لئے آسانیاں بہم پہنچانے کے لئے مداخلت کرتی ہے، جیسے دنیا کے ان ممالک کا حال ہے جہاں پارلیمنٹی طرز حکومت رائج ہے۔ ہرچیز اگر پیشتر ممالک کے قوانین پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ افراد کو عام طور پر مفصلہ ذیل

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۳۱) (۱) معاشی ترقی کے لئے اتحاد کرنا اور انجمن بنانا جائز ہے۔

حقوق حاصل ہو رہے ہیں۔

۹ زندگی اور شخصی آزادی۔ سب سے اہم حقوق تو زندگی اور شخصی آزادی کے حقوق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زندگی و آزادی نہ ہوگی یا اس کا اطمینان نہ ہوگا تو پھر مملکت کا نظام بالکل بے کار ہے۔ حقوق کے اعتبار سے مردہ اور غیر آزاد یعنی غلام کی نوعیت ایک ہی ہوتی ہے، چنانچہ آج کل متمدن ممالک میں مملکت نہ صرف زندگی کی ضمانت ہوتی ہے بلکہ ذاتی آزادی کی بھی حفاظت کرتی ہے، اور نہ صرف قاتل کو سخت سے سخت سزا دی جاتی ہے بلکہ بعض ممالک میں سزائے موت اور بعض میں جس دوام ہے، بلکہ اس شخص کو بھی قابلِ اقامت گردانتی ہے جو اپنے انھوں اپنی جان لینے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس میں بعض تشنہیات بھی ہیں، مثلاً اگر ذیہ خالہ پر اس کی جان لینے کی غرض سے حملہ آور ہو تو خالہ کو حق حاصل ہے کہ اپنے بچاؤ کی خاطر ذیہ کو مار ڈالے مثلاً

۱۰ انفرادیت اور اشتراکیت کے لئے دیکھئے آئینہ باب ۱۱۔ تاہم جرمنی اور فرانسیسی اس میں انفرادی حقوق ملتی حقوق ہیں بالکل پورست ہو گئے ہیں، جرمنی میں فرد کی حیثیت مملکت کے ایک پندہ سے زیادہ نہیں۔ ایسی حکومت مملکت کے مقابلے میں فرد کے کیا حقوق ہو سکتے ہیں؟
۱۱ ۱۹۳۵ء میں جرمنی میں جو قانون عدالتوں کی تنظیم کے لئے نافذ ہوا اس میں ایک پرہیزگارہ یہ ہے کہ ”حق صرف وہ ہے جو قوم کے لئے مفید ہو“۔ دیکھو ”النامہ مدبرین“ ص ۱۱۷۔
۱۲ مثلاً مجموعہ تہذیب و تمدن، صفحہ ۳۰۲۔

(ابتداء نوٹ ملاحظہ ہوا)

۱۳ ایضاً دفعہ ۳۰۹

ای طرح کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو جبراً کہیں جانے سے روکے رہے، اسے قانونی اصطلاح میں جس پر جبر کہتے ہیں اور اکثر قانونی نظاموں میں اس کے لئے بھی سزا مقرر ہے۔ آج کل کے متقدم ممالک میں غلامی قانوناً ناجائز ہے، اور ہم اس صورت حال سے اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ ہمارے ذہن میں مشکل سے ایسی متدن مملکت آ سکتی ہے جس میں غلامی کا ادارہ حیات عامہ کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہو۔ بڑے بڑے نظامہائے قانونی (جیسے رومن قانون) میں کسی دہانے میں غلامی ایک ادارہ حیات تھی اور قدیم یورپ میں اسے اتنا ہی ”غلام پیدائش“ سمجھا جاتا تھا جتنا آج کل کے معاشین محنت، سرمایہ اور زمین کو سمجھتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ سیاسی تنظیم کی بنیاد صرف غلامی تھی، اس لئے کہ روماء و ایران کے مفکر ایسی سیاسی صورت حال کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے جس میں کسی شخص کو فکر معاش بھی ہو اور ساتھ ہی وہ مملکت کے انصرام میں حصہ بھی لے سکے۔ یہی وجہ تھی کہ پیدائشی دولت کا کام غلاموں سے لیا جاتا تھا، اور مملکت کے ”شہری“ اطمینان سے سیاسی کاروبار میں حصہ لیتے تھے۔ روماء میں غلاموں کی حالت ناقصہ بہ تھی، لہذا اس کے عہد میں پیچھے غلاموں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، چنانچہ ان کے مالک انھیں بھوکا مار سکتے اور ہر طرح کی ازیتیں پہنچا سکتے تھے۔ مشرق میں عام طور پر غلاموں کی حالت بہتر تھی، چنانچہ گوئندوں میں

للہ دیکھئے تعزیرات ہند، دفعات ۹۶، ۹۷ (بقیہ حاشیہ ص ۱۳۴)

للہ تعزیرات، دفعہ ۳۴۰

للہ مملکت روماء میں غلاموں کی حالت کے لئے دیکھئے ”تفسیر قوانین گایوس“ مؤلفہ
۱۳۴۲ھ

غلاموں پر طرح طرح کی مذہبی عائد تھیں، اور انھیں حقوق مالکانہ حاصل نہیں تھے، تاہم ان کی ذات اور زندگی محفوظ تھی۔ اسلام نے غلاموں کی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر کر دی تھی۔ اول تو اس نے آزاد مسلمان کو غلامی کے خطرے سے بالکل آزاد کر دیا، پھر غلام کی جسم و جان بالکل محفوظ و مامون ہو گئے اور اسے ایذا دینے والے یا اس کی جان لینے والے کو دہی سترادی جانے لگی جو آزاد شخص کی اذیت یا قتل کے لئے مقرر تھی۔ ساتھ ہی غلام آزاد کرنے کو ایک ثواب عظیم قرار دیا گیا، چنانچہ مالک اسلامی میں عام میلان غلاموں کی آزادی کی طرف ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ہم اکثر مالک میں آزاد شدہ غلاموں کو بڑے بڑے عہدوں پر مہتمن دیکھتے ہیں، اور بعض ملکوں میں تو ایسے لوگ سرپرست پر نظر آتے ہیں جنہوں نے کسی زمانے میں اپنی زندگی غلامی کی حالت میں بسر کی تھی۔ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد شدہ غلام اور یتیموں کی آزادی کی مساوات کو عملی جامہ اس طرح پہنایا کہ حضرت زید بن حارثہ کو (جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک آزاد شدہ غلام تھے) مہاجرین، انصار اور دوسرے شہر فکے عرب کے لشکر پر کماندار بنا کر موتہ کی جنگ کے موقع پر روانہ کیا، اور اس لڑائی میں

بقیہ نوٹ ۱۳۱ کا۔ پوسٹ Post: Commentary on Gai

Institutions. باب اول، زیر رقم ۵۳۔

P.N. Sen: Hindu Juris- اصول دہم شاستر

(بقیہ ۱۳۵ پر)

prudence درج ۱۰۔

و غلامان سپہ سالار نے اپنی جانبازی کا ثبوت شہید ہو کر دیا۔ اسی طرح جگہ جگہ سابق غلاموں کے کارناموں کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے، چنانچہ سلطان محمود غزنوی ایک غلام زادہ تھا، مہر جس "ملوکوں" نے چار سو برس تک اور ہندوستان میں نام نہاد "غلامان" کے کم و بیش ایک صدی تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ مغربی ممالک میں غلاموں کی آزادی کا خیال زمانہ حال ہی کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے، اور بعض ممالک، مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تو غلاموں کو اس وقت تک آزادی پیش نہیں ہوئی جب تک کہ موافقین و مخالفین آزادی کے مابین ایک عظیم الشان خونخوار جنگ لڑنے سے ۱۸۶۵ء تک برابر جاری نہ رہی۔ امریکہ میں اب بھی پچاس سے زنگیوں کی جان خطر سے خالی نہیں رہتی اور اب بھی اخبارات میں پڑھنے میں آتا ہے کہ کسی معمری بات پر وہاں کے سفید باشندوں نے کسی بے یار و مددگار زنگی کو زندہ جلادیا یا مار ڈالا۔

حق حیات اور حق آزادی کے اصول پر ذرا قیمتی بحث کرنے کی اس لئے ضرورت ہوئی کہ اول تو یہ حق جملہ دوسرے حقوق سے زیادہ اہم ہے، اور دوسرے باوجود اس قدر بدیہی ہونے کے اس میں مختلف زماںوں اور مختلف ممالک میں ہمیشہ تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ وہ یہ

(ایضاً حاشیہ ملاحظہ فرمائیے)
 لکھ اسلام کے جبرئیم کی شرائط غلامی پر لکھائیں ان کے لئے دیکھو عبد الرحیم "اصول فقہ اسلامی"
 باب Abdul Rahim: Mohammadan Jurisprudence.

کہ حق آزادی اور حق حیات دونوں دوران جنگ میں معطل ہو جاتے ہیں اور ساتھ اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی سزا میں حکومت کو عام طور پر مجرم کی آزادی محدود کرنے اور مواقع پر اس کی جان تک لینے کا اختیار ہوتا ہے۔

ملکیت۔ دوسرا حق جو عام طور پر اکثر ممالک میں پایا جاتا ہے وہ حق مالکانہ ہے حق مالکانہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی چیز کسی کی ملکیت میں ہو تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ اس چیز کو اپنے قبضے میں رکھے، اس سے مستفید ہو اور دوسروں کی دست برد سے بچائے یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ حق "فطری حقوق" میں سے ایک ہے، بلکہ اس حق کا انطباق جملہ افراد آبادی پر صرف زمانہ حال میں ہوا ہے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، دھرم شاستری انھیں حق مالکانہ تقریباً بالکل حاصل نہیں، اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندو متقنون اور ہندوؤں کی کتب و کلام میں صنف لطیف کو مردوزع القلم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کی معاشرتی سطح بلند کر کے انھیں حقوق ملکیت اور بعض دوسرے حقوق بحسنہ اسی طرح نئے جیسے مردوں کو، اور جہاں تک انچی ملکوتہ اشیاء پر قبضے اور ان سے استفادے کا تعلق ہے، ان میں اور مردوں میں مطلق کوئی فرق باقی نہیں رکھا۔ مغرب میں یہ اصول کہ عورت مردوں کو ملکوتہ اشیاء پر مساویانہ حقوق حاصل ہیں، حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ "قانون سٹین جاندار زمانہ منکوچہ" سے پیشتر درج ۱۸۸۲ء میں منظور ہوا، انگلستان میں عورتوں کو حق مالکانہ حاصل نہ تھا۔ ایک اور بات کی

۱۵ دھرم شاستری عورتوں کے بعض حقوق کے لئے دیکھو پریاتنامین، "اصول دھرم شاستر" رتبہ ۵۰۔

طرف توجہ مبذول کرنی ضروری ہے۔ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے کہ افراد کے حق، ماسکائنہ اور ان کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیداوار پیدائش دولت میں بہت کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائیگاں جاتے ہیں لہذا عالمین پیدائش پر حکومت کا پورا اختیار ہونا چاہئے، اور سرمایہ و زمین دونوں ملکیت ہی کی حکومت نہ کی جائیں۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ آیا اس اصول کے دعوے دار حق بجانب ہیں یا نہیں^۱ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان میں سے اکثر ضروریات زندگی کو ذاتی انفرادی ملکیت پر لے لیں چنداں حرج نہیں سمجھتے۔ نیز ہر ملکیت میں جنگ یا کسی اور شدید ضرورت کے وقت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ افراد کی ملکوتات میں سے ایک حصے پر جبراً قبضہ کر لے، اور اسی طرح اپنی روزمرہ ضروریات کے لئے حکومت کو محاصل عائد کرنے کا اختیار بھی ایک طرح سے انفرادی الماک پر جبراً قبضہ کرنے ہی کی ایک شکل ہے۔

منما تحت و از دو واج۔ تیسرے حق جو تقریباً ہر جگہ عام ہے، حق خاندانی و حق ازدواج ہے۔ خاندان کی بنیاد نکاح ہے اور یہی وہ ادارہ ہے جس کے ذریعے سے نئی آدم کی نسل جاری رہتی ہے اور ارث کا پتہ لگتا ہے اور معاشرہ انسانی کی

^۱ Married Women's Property Act, 1882, 45+46
Vict. C. 75.

اس کے اثرات کے لئے دیکھو "انٹرنیشنل قوانین انگلستان" Halsbury's Laws of

England جلد ۱۶ صفحہ ۳۷۲ دفعہ ۶۲۸ و صفحہ ۳۵۲ دفعات ۷۰، ۷۱ وغیرہ

^۲ اس بحث کے لئے دیکھو باب ۹

بنیاد مضبوط ملتی ہے۔ نکاح کے قواعد و قوانین اور عورت مرد کے حقوق و فرائض مختلف ممالک میں مختلف ہیں بعض ممالک میں صرف ایک ہی لڑک و مرد کی باہمی نہایت کی اجازت ہے، بعض میں ایک مرد متعدد عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے (جیسے ہندوستان میں ہندو اور مسلمان) اور بعض میں ایک عورت متعدد مردوں سے نکاح کر سکتی ہے (جیسے بریت اور یلبار میں) چونکہ موجد المذکر ممالک کی معاشرتی و قانونی صورت حال ہمارے معاشرہ سے مختلف ہے اس لئے اسے تو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے؛ رہے وہ قانونی نظام جو ایک مرد کو متعدد بیویوں سے نکاح کرنے کو جائز رکھتے ہیں، ان کی بابت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں جس اصول پر عمل لازمی ہے وہ یہی ہے کہ مرد مختلف بیویوں کے مابین مکمل مساوات قائم رکھ سکے گا اور عام طور پر بلا ضرورت نکاح نہیں کرے گا، اور ان مجید میں تو جہاں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ مکمل مساوات کو تقریباً ناممکن اصل قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح جن اقوام میں طلاق کا طریقہ ناجائز ہے وہاں کم از کم آج کل عورت مرد دونوں کو ایک دوسرے کو اس وقت چھوڑ دینے کا اختیار دیا گیا ہے جب دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے باہمی شدید اختلافات یا بدسلوکی کی وجہ سے تلخ ہو جائے۔

ضمیمہ کی آزادی اور رواداری۔ اس سلسلے میں آخری حق خانگی جس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، حق آزادی ضمیمہ یا غفلت کا حق ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے

کہ مذہبی عقائد کا تعلق انسان کی کیفیات قلبی سے ہے اور اسے کسی قسم کے مذہبی عقیدے کا جبر یا پابند نہیں ہونا چاہیئے، لیکن تاریخ دنیا کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عقائد مذہب مختلف افراد یا مختلف جموعوں کے مابین ایسا رابطہ پیدا کر سکتا ہے جس سے زیادہ مضبوط اور پائیدار رابطہ شکل سے ممکن ہے، چنانچہ حکومت نے ہمیشہ ایسے مذاہب اور فرقوں کو معاندانہ نظر سے دیکھا ہے جن کے علی اور ذہبی مقاصد سے وہ خلاف ہوں، اور بعض ممالک میں تو مذہب کے نام سے خون کی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اس ضمن میں مشرقی اور مغربی تاریخ میں بین فرق نظر آتا ہے۔ مذہب سے پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی بڑے مشرقی مذہب میں تشدد روا نہیں رکھا گیا۔ ہندوؤں اور بودھوں میں تو ”اہسا“ یا عدم تشدد کا ایسا اصول مسلم ہے کہ جس سے گریز ممکن نہیں؛ اسلام نے ابتدائی سے ”لکم دینکم دینی دین“ کا سبق دنیا کو سکھایا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ تلقین کی کہ تمہارے ایک بھائی کوئی تھپڑ مارے تو دوسرا رخسار بھی اس کی طرف کر دو۔ ایسے بزرگمیں جو ان عظیم الشان مذاہب کی ختم بھوم تھی کسی قسم کی عدم رواداری کا کم امکان ہو گا۔ ساتھ ہی چونکہ مشرق میں مذہب کو انسان کے تقریباً ہر ایک شعبہ زندگی میں دخل حاصل ہے اور حکومت اس امر سے اچھی طرح واقف ہوتی ہے کہ اس کی سختی سے لوگ اپنا عزیز مذہب نہ چھوڑیں گے، شاید اس وجہ سے بھی یہاں اکثر و بیشتر زمانوں اور ممالک میں رواداری برپا کی گئی ہے اور محض مذہب کی خاطر بہت ہی کم تشدد روا رکھا گیا ہے۔ اس کے عکس یورپ میں بالکل حال کے زائے تک مختلف حکومتوں کا شیورہ ہے یہ رہا ہے کہ وہ اپنے مخالف مذہب کی جڑ بنیاد اکھاڑ کر پھینک دیں۔ دو تین واقعات کو لیجئے اور ان کا

مقابلہ کیجئے۔ ۱۹۱۲ء میں فرناندو اور انزابیلا نے غرناطہ سے وہاں کے بادشاہ
 ابو عبد اللہ کو نکال دیا اور یہ وہ تاریخ ہے جب سے لے کر ۱۹۱۲ء تک ہسپانوی
 مسلمانوں پر انتہائی سختیاں کی گئی، ان کی عورتوں کی بے حرشی کی گئی۔ مردوں کو
 بدوشیزہ بنیسمہ دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا۔ چنانچہ سرزمین اندلس میں ایک بھی اسلام کا
 نام لیا جاتا نہیں رہا۔ اس کے برعکس ۱۹۱۲ء سے صرف جالیسیل بیشتر سلطان
 محمد خاں ثانی نے قسطنطنیہ فتح کر کے وہاں کی غیر مسلم ملتوں کو منظم کر کے ان میں
 سے ہر ایک کو مذہبی معاملات میں بلکہ بعض دنیوی امور میں بھی آزادی دی، اور یہ
 آزادی ۱۹۲۲ء کے صلحنامہ لودان تک مسلسل جاری رہی۔ اسی طرح جب ۱۹۲۲ء
 میں شاہ چارلس نہم شنت برٹولومیو کے دن فرانس کے احتجاجیوں کا مشہور قتل عام
 کرادیا تھا، یہاں ہندوستان میں اکبر اعظم تخت نشین تھا، جو فتح پور سیکری کے
 مشہور عبادت خانے میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے ہر مذہب کے پیشواؤں کے مناظرے

۱۹۱۵ء زوال غرناطہ کے بعد ہسپانوی مسلمانوں پر سختیاں کی گئیں ان کا ٹھوڑا بہت حال س۔ پ۔
 سکاٹ کی کتاب میں درج ہے جس کا ترجمہ مولوی فضل الرحمن صاحب نے ”اخبار الاندلس“ کے
 نام سے شائع کیا ہے۔ اس کی جلد ۳، باب ۶ کا مطالعہ کیا جائے۔

۱۹۱۵ء مردود دولت عثمانیہ میں مختلف مذہب اور ان کی آزادی تنظیم کے لئے دیکھو میرز ”تذکرہ حالیہ“
 Mears: Modern Turkey. باب ۴، ”لوائن بی وکرک دود“ ”تذکرہ“
 Toynebee + Kirkwood: Turkey باب ۹، ”ایلیس فیلس“ ”جنگ
 آزادی یونان“ - Alison Phillips: War of Greek Independence.

منا اور اپنی راجپوت رعایا پر اس درجہ مظاکر تاکہ ان میں سے ایک یعنی راجہ مان گجھ کو کابل کا صوبہ دار مقرر کرنے میں مضائقہ نہ سمجھتا۔ یہ کیفیت شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر تک بار بار جاری رہتی ہے، جس نے اپنے ہر مقابل شیواجی کے خلاف ایک غیر مسلم مرزا راجہ جے گجھ کو سپہ سالار بنانا کر بھیجا، اور آج بھی ہندوستان میں بہت سے ہندو معاہدے کے جن کی جاگیریں اسی مغل پادشاہ (یعنی اورنگ زیب) کے زمانے سے وقف ہیں۔ یہی اسباب ہیں جن کی بدولت آج ہندی مسلمانوں کے مرکزوں، یعنی دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں غیر مسلم آبادی گھٹانے سے کہیں زیادہ ہے اور سابق آستانہ خلافت، یعنی استنبول میں یونانی، آرمینی اور دیگر عیسائی فرقے تعداد میں مسلمانوں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مغرب مشرق سے زیادہ روادار ہے، لیکن آج کے دن بھی اگر شاہ انگلستان کلیسائے انگلستان سے خوف ہو جائیں تو انھیں "قانون ہندوستان" کے تحت اس کے رو سے تخت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ مشرق میں محض مذہب کی خاطر

ان عالمگیر کی عطا کردہ جاگیروں کا شمار یہاں نہ ضروری ہے اور نہ ممکن۔ خود راقم الحروف نے بیدر دکن کے قریب خانہ پورتا میں بے چراغ قبضے میں ایک بہت بڑا مندر دیکھا جس کے چاروں طرف ایک دولت آصفیہ کے زیر سایہ شہنشاہ عالمگیر کے اوقاف کی آمدنی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اسی طرح دیرہ دکن میں سکھوں کے گورام راسے کے گوردوارہ کے لئے بھی اورنگ زیب نے جاگیریں وقف کی تھیں۔ اس گوردوارہ پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔

بہت کم لڑائیاں لڑی گئی ہیں اور بہت کم ممالک میں لوگوں کا مذہب بڑے شہر بدلوایا گیا ہے، لیکن مذہب میں چارلس اعظم کے زمانے میں جرمنی کا جبرائیلیائی مذہب اختیار کرنا، صلیبی جنگیں، تیس سالہ جنگ، اور سپانوی "عدالت احتساب" کی یاد آج تک تازہ ہے۔ غیر مذہب والوں کے ساتھ یورپ کے بعض ممالک میں جو سلوک ردوار کیا جاتا ہے اس کا نمونہ دیکھنے کی خواہش ہو تو جرمنی جاسیے جہاں یہودی مذہب والوں کو خطرناک جانوروں کی طرح ملک سے نکالا جا رہا ہے اور جہاں کے لوگ ٹیبلک بھی کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہیں، یاروس جاسیے جہاں پندرہ برس سال تک مذہب اور اہل مذہب دونوں کا مضحکہ ہی نہیں اڑایا جاتا تھا بلکہ جہاں تک ممکن ہو تاان کی نفی کنی کی جاتی تھی، اور اب بھی گو مختلف مذاہب کے پیروؤں کو اپنی طرز پر چاکرے کی اجازت ہے لیکن مذہب کے مخالفین دل کھول کر ان کا مذاق اڑا سکتے ہیں اور گلی گلی مذہب کے خلاف تبلیغ کر سکتے ہیں جو مذہب والوں کے لئے لفظ ہر جائز نہیں بہر حال دنیا کا عام رجحان ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب والے کو جہاں تک اس کا مذہب ملک کی سیاسی زندگی میں دخل نہ ہو، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہو۔

سیاسی حقوق۔ آخر میں ان نہایت اہم حقوق کا ذکر کرنا باقی ہے جنہیں بعض مرتبہ جمہوری طور پر سیاسی حقوق" کہتے ہیں، یعنی حقوق، جلسہ عام کی آزادی، پریس کی آزادی، مطالبہ اور سنگت آزادی۔ عام طور پر یہ اصول رتے جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر انہ ان کا کوئی فعل کسی تعزیری قانون کے تحت نہ آئے تو وہ اس کے لئے مباح ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی زبان سے کوئی نقطہ نکالے یا اسے

تقریباً اسے یا چھنوائے اور اس کا یہ فعل کسی تعزیری قانون کے خلاف نہ ہو، تو اس کی پکڑ نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ان افعال کا دائرہ محدود ہے۔ اول تو اس کا کوئی فعل ایسا نہیں ہونا چاہئے جس سے مملکت کا شیرازہ بکھر جائے یا احتمال ہو یا حکومت کو اپنے وجود کی طرف سے خطرہ پیدا ہو جائے۔ آج کل کی حکومت پند مالک میں کسی شخص کو حکومت کی نکتہ چینی سے مشکل سے روکا جاسکتا ہے، لیکن جب حکومت یہ دیکھے گی کہ مصنف یا مقرر نے لوگوں کو علانیہ بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ اسے جبراً روک دیگی۔ حکومت کے خلاف اس معاندانہ روش کو ”غداری“ کا لقب دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر حکومت یہ دیکھے گی کہ کسی کے قول یا فعل سے نقصان کا اندیشہ ہے تو بھی اسے روک دے گی، اس لئے کہ امن و امان کا قیام بھی مملکت کے فوری مفاد میں سے ایک ہے۔ تحریر و تقریر کی آزادی کے معنی نہیں کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے عیوب کو بے جا ظاہر کرے یا اس کی ناموس کو گزند پہنچائے، اور چونکہ اس ”ازالہ حیثیت عرفی“ سے نہ صرف ایک خانگی حق یعنی ناموس کو ٹھیس لگتی ہے بلکہ اس سے نقصان اس کا بھی اندیشہ ہوتا ہے اس وجہ سے ایسی حرکات کے انکسار

مثلاً تعزیرات ہند دفعہ ۲۴۴ (الف) آج کل کے زمانے میں اس نوع کی سیاسی آزادی بعض آزاد ممالک میں سبب کی جا رہی ہے، مثلاً اٹلی اور جرمنی میں کسی شخص کی بے جا لکھائی کہ حکومتی طرز عمل کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالے یا قلم سے لکھے۔

کا اختیار افراد اور حکومت دونوں کو ہو سکتا ہے، یعنی جس فرد کے ناموں کو نقصان پہنچا ہے وہ ہر جہ وصول کر سکتا ہے اور حکومت اس کو سزا بھی دے سکتی ہے۔ بعض مرتبہ اگر حکومت کو ملک میں کسی خاص خطرے سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ان ”سیاسی“ حقوق میں قطع و برید کر لے گئی ہے، مثلاً غنیم کے حملے کے دوران میں یا ملک میں اگر غلط فہمی پیدا ہو جائے اور اس میں خود شیرازہ مملکت معرض خطر میں آجائے تو بعض مواقع پر حکومت اکثر حقوق و قوانین کو معطل کر کے ملک میں صرف ”جنگی قانون“ کا نفاذ کر دیتی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ احکام حکومت کی خلاف ورزی کی شکل میں چند افسر بیٹھ کر سرسری طور پر سزا تجویز کر لے ہیں جس کا مراحضہ نہیں ہو سکتا، اور وہ سزائی الفور دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ”فوجی قانون“ کے نفاذ کے حکومت بعض مخصوص حقوق کو معطل کر دے، یعنی مدارج مقدمات کو قائم رکھے لیکن افراد کے سیاسی حقوق کم کر دے، جیسے حکومت ہند بعض مرتبہ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا نفاذ کر کے اپنے آپ کو مامون و معصوم سمجھ لیتی ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حکومت کو

۱۴۴ تعزیری اذالہ حیثیت یعنی کی تعزیرات ہند“ دفعہ ۵۰۰ میں دی ہوئی ہے۔

۱۴۵ ناظرین کی دلچسپی و معلومات کے لئے دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کا شخص دینا مناسب ہو گا۔

اُن مقدمات میں جن میں مجسٹریٹ..... کی دانست میں فوری انداز یا جلد تدبیر

کرنی مناسب ہو تو یہ مجسٹریٹ بذریعہ حکم تحریری جس میں مقدمات کے حالات قلمبند ہوں گے.....

مجاز ہو گا کہ کسی شخص کو کسی فعل سے باز رکھنے کی ہدایت کرے..... جائز ہے کہ ظلم

(بقیہ صفحہ ۱۴۵ پر)

اس قسم کے اختیارات نہایت سوچ سمجھ کر استعمال کرنے چاہئیں، ورنہ ممکن ہے کہ ایسی کارروائیاں سے بجائے غلط فہمی کم ہونے کے برعکس اور زیادہ بڑھ جائے۔

سیاسی آزادی۔ جب حکومت لوگوں کے سیاسی حقوق میں کم سے کم مداخلت کرتی ہے تو اس صورت حال کو سیاسی آزادی کہتے ہیں۔ آزادی کے لائق یعنی تو فقدانِ مداخلت بیرونی کے ہیں، لیکن جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، یہ مکمل آزادی خواہ کسی قسم کی بھی ہو، ناممکن ہے، ورنہ مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اگر حکومت عادی سیاسی حقوق کا دائرہ تنگ کر لے گی طرف مائل ہے، یا ان کے حقوق کو کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ کر گھٹاتی ہے تو ایسے ملک میں سیاسی آزادی کی بنیادیں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ ایسے ممالک اکثر وہ ہوتے ہیں جہاں یا تو کوئی پرروپی حکومت ذی اقتدار ہو، یا جہاں کی رعایا پر حکومت کتنا اعتبار و اعتماد نہ ہو، یعنی جہاں بھی تو قانون مطالع رائج ہوتا ہو، کہیں فوجی قانون، کہیں دفعہ ۱۲۹ ضابطہ فوجداری، سیاسی آزادی کا بہت کم جزو حاصل ہے۔ اس کے برعکس عمومیت پسند ممالک مثلاً ممالک متحدہ امریکہ اور انگلستان میں، جہاں کے باشندے دل

دلیقہ سے اس کا متعلق دفعہ ہذا اشد ضرورت کی حالت میں ایک طرفہ صادر کیا جائے
 نیز جائز ہے کہ حکم مطابق دفعہ ہذا کسی شخص خاص کے نام یا عموماً خلقِ اللہ کے نام مضبوط
 کیا جائے کوئی حکم حسب دفعہ ہذا اس کے صدور کی تاریخ سے زائد از دواہ نافذ رہے گا
 ہذا اس کے کوئی گورنمنٹ بذریعہ اشتہار مندرجہ گزٹ ہدایت کر دے۔

۵۴ حسب بالا، باب ۶

کھول کر حکومت کی تنقید کر سکتے ہیں، اور خود بھی ملٹی ترین عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی کم بیش مکمل سمجھنی چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی زمانہ حال میں چند ممالک میں ایسی حکومتیں قائم ہو گئی ہیں جو خور ملک کے باشندوں پر تسلط ہیں لیکن جنہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا ہے کہ اپنے اپنے ملکوں کو ایک خاص قالب میں ڈھال لیں۔ ایسی ممالک کی مثالیں روس، ترکی، آسٹری اور جرمنی ہیں۔ اگر ان ملکوں پر بغیر اقوام کی حکومت ہوتی، اور حکومت کی طرف سے روزمرہ زندگی کی کیفیات میں جبر کیا جاتا تو یہ صراحتہ کہا جاسکتا تھا کہ ان میں سیاسی آزادی معقود ہے؛ لیکن اول تو ان ممالک کے باشندوں کا اپنی حکومتوں پر بظاہر کلیئہ اعتماد ہے، دوسرے حکومتیں جو کچھ کر رہی ہیں وہ اپنی دانت میں ملک والوں کی بہتری کے لئے ہی کر رہی ہیں، چنانچہ زیادہ سے زیادہ یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ ان ملکوں میں بالفعل انفرادی آزادی کو محدود کر دیا گیا ہے تاکہ ملک کی حالت پہلے سے بہتر ہو جائے، اور جب یہ ایک خاص

۲۲۳۵ء ہجری (۱۸۲۰ء) کے موسم حج میں کہ مکہ مکرمہ جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں علی گڑھ شاہ حجاز دتجد برسر حکومت تھے اور احکام شریعت کے علاوہ باقی ہر امر پر شخصی مطلق انصافی کا دور دورہ تھا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حجاز میں جہاں صرف دو سال پیشتر آل سعود کی حکومت قائم ہوئی تھی، لوگوں کو مکمل آزادی تقریر حاصل تھی، اور نہ صرف وہ اپنے اپنے گھر میں اور درجہ شریف میں حکومت پر دل کھول کر کلمہ جینی کرتے تھے، بلکہ جلالتہ الملک نے آزادی دے رکھی تھی کہ جو چاہے ان کے سامنے آئے اور راہ راست کی تلقین کرے، اس سے معاً اسلام کا وہ عہد مذہب سامنے آ گیا جب ایک معمولی ٹیپوٹیا حضرت عمرؓ کے ذاتی افعال پر علاوہ بد بکتہ جینی کرنے کی جاب بھی جاتی تھی۔

سچ پہنچ جائے گی تو پھر ممکن ہے کہ حکومت اپنے مخصوص طرز عمل پر نظر ثانی کرے
 دستور کی آزادی - اب دستوری آزادی کے معنی سمجھیں آجائیں گے۔
 عمومیت والے ملکوں میں بہترین حکومت وہی سمجھی جاتی ہے جو ملک کے باشندوں
 کی حقیقی نائب اور خاتم مقام ہو۔ جو لوگ اس اصول کے حامی ہیں ان کا طبع نظریہ ہے
 کہ ملک والے خود اپنے اوپر اپنے ہی مفاد کے لئے حکومت کریں۔ اور اسی سے
 قوم کی دیرینہ قاطعیتیں صحیح ارتقا ممکن ہو گا۔ چونکہ آج کل کی عظیم نشان ملکوں میں
 ملک کے باشندے براہ راست حکومت نہیں کر سکتے اس لئے منتخب شدہ نیابت کا
 طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس کے ذریعے سے اُن کے نمایندے حکومت کو ترتیب دیتے
 ہیں۔ یہ خیال بعض ممالک میں اس قدر جاگزیں ہو گیا ہے کہ اگر یہ عمومی حکومت
 غلطیاں بھی کرے اور ملک کو نقصان بھی پہنچائے تاہم اسے اتنا مضر نہیں سمجھا جاتا
 جتنا ایک ایسی صورت کو جو نیابتی نہ ہو لیکن ملک کی بہتری کے لئے کوٹاں ہو۔ اس
 میں کوئی شبہ نہیں کہ مسوینی کی مطلق العنان وزارت کی دوران میں اٹلی کو دن رونی دلا
 چوگنی ترقی ہو رہی ہے اور ہٹلر کے مختصر دور حکومت میں جرمنی کا بین الاقوامی اثر و سبوت
 بڑھ گیا ہے لیکن عمومیت پسندوں کے نزدیک دستوری آزادی کے فقدان کی وجہ سے

۱۸۶۲ء میں ابراہیم لنکن Abraham Lincoln صدر ریاستہائے
 متحدہ امریکہ نے گیش برگ Gettysburg والی تقریر میں اپنا طبع نظریہ فرما دیا۔ اس کے مشہور
 الفاظ Government of the People by The People for the People
 the People اب گویا انگریزی زبان کی ایک شل بن گئے ہیں۔

اٹلی اور جرمنی کی حالت نہایت درجہ ناقابل برداشت ہے۔ اس اصول کو مطابق دستوری آزادی صرف ان ہی ملک کے باشندوں کو حاصل ہے جن کا حکومت کی ترتیب و تنظیم میں حصہ ہے اور جہاں خود براہ راست اپنے غامبندوں کے ذریعے سے ان کی نگرانی رکھتے اور ان کے افعال کو اپنی خواہشات کے مطابق ڈھالتے رہتے ہیں۔

ملکی آزادی۔ آزادی کا مفہوم ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ وہی ملک آزاد تصور کیا جائے گا جو کسی دوسرے کے زیر اقتدار نہ ہو۔ آج کل کے زمانے میں مختلف ملک ایک دوسرے سے اس قدر وابستہ ہیں کہ نام نہاد آزاد ملک بھی مکمل طور پر آزاد نہیں کہے جاسکتے۔ مختلف ملک کے مابین معاشرتی تعلقات، عہد ناموں اور حکومت کے کڑی بندوں کے باعث فاصلے اور وقت کے معیار میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اور مسائل آمد و رفت اور دید و شنید کے انقلابات کی وجہ سے مختلف ملک کے مابین معاشرتی روابط بڑھ گئے ہیں، چنانچہ ان سب امور کے باعث کوئی خواہ کتنا ہی باقی ماندہ دنیا سے الگ تھلگ ہو، محض من مانی حکمت عملی پر کار بند نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ مکمل ذہنی اور مادی ارتقاء کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہو اور بیرونی معاملات میں کلینک کسی دوسرے کا محکوم نہ ہو، ورنہ ممکن ہے کہ اس بیرونی سلطنت یا حاکم کی خاطر اسے روزمرہ ایسی قربانیاں کرنی پڑیں جن سے نہ صرف اس کی خودمختاری مٹ جائے بلکہ اسے بہت سے داخلی نقصانات بھی پہنچیں، اور اگر حاکم ملک نے اپنی مطلب براری کے لئے اپنے اقتدار کا کچھ زیادہ کس دیا تو ممکن ہے کہ اسے اپنی دستکاری، تجارت، جہاز رانی اور صنعت و حرفت

سے بالکلید ہاتھ دھونا پڑ جائے۔^{۵۲۸}

۵۲۸ مشہور عالم، فی مور *Philimonore* آزادی کے لئے حسب ذیل لازم شمار کرتا ہے:-

- (۱) ملک میں کسی دوسرے کا غلبہ نہ ہو۔
- (۲) اپنی حفاظت خود کرنے کا اختیار۔
- (۳) اپنی حکومت کے تعین فائیدہ اختیار۔
- (۴) قومی وسائل کو کام میں لانے کا اختیار۔
- (۵) بیرون ملک کے مفید صناعات و حقوق حاصل کرنے کا اختیار۔
- (۶) ملک کے جملہ افراد و اشیاء پر قدرت۔

فلی مور کا انیسواں برکن ہیڈ "قانون بین الاقوام" *Birkenhead: Inter-*

national law صوفی ۶ میں دیا ہوا ہے۔

باب ۹

حکومت کا دائرہ عمل

ملکت اور حکومت کی مداخلت - انفرادیت اور اشتراکیت - انفرادیت - انفرادیت جدیدہ
 نزاع - پیشہ منبری - اشتراکیت - جماعتیت - اشتراکیت - اصول اشتراکیت کی مفید - اعتدال پسندی
 پچھلے باب میں بتایا گیا تھا کہ آج کل اشتراکیوں کا ایک خاص گروہ یہ کہتا ہے
 کہ افراد کے حق مالکانہ اور ان کے معاشی مقابلے کی وجہ سے پیدائش دولت میں بہت
 کچھ وقت، محنت اور سرمایہ رائیگاں جاتے ہیں، لہذا عالمین پیدائش پر حکومت کا پورا
 قابو ہونا چاہئے، اور سرمایہ وزمین دونوں ملکیت ہی کی ملک کہ ہونی چاہئیں۔ یہ اصول محض

۱۵ اس باب میں بہت سی معاشی اصطلاحات کو استعمال کرنا پڑے۔ سیاسیات اور معاشیات
 دونوں علوم عمرانی ہیں، اور ان میں جو باہمی رشتہ ہے اسے باب میں واضح کر دیا گیا ہے۔ زمانہ حال
 میں ان دونوں علوم کا تعلق پہلے سے بھی قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ باب میں اس کی خوش
 کی گئی ہے کہ جہاں تلم ہو سکے اس کے معاشی اصطلاحات سے گریز کیا جائے، لیکن بعض مرتبہ اس سے
 مفر نہیں ہو سکا۔ ”دولت“، ”مال“، ”زمین“، ”عالمین پیدائش“، ”اجارہ“، اور دوسری معاشی اصطلاحات
 کے مفہوم کے لئے دیکھو الیکس برنی کی کتاب ”اصول معاشیات“ (مطبع جامعہ عثمانیہ)

ضمنی طور پر بیان کیا گیا تھا اور اس وقت بحث و محصل کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ موجودہ باب میں اس اہم بحث پر غور کیا جائے گا اور کشش کی جانے لگی کہ آج کل دنیا کی نفاذ جن طبقہ داری نزاعات کی وجہ سے مکدر ہو رہی ہے اُن پر ٹھنڈے دل سے تبصرہ کیا جائے۔

مملکت اور حکومت کی مداخلت۔ اشتراکیت اور اس کے جوابی اصول انفرادیت کا مسدود اصل مملکت کے باہمی تعلقات، اور افراد کے کاموں میں مداخلت کا مسئلہ ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ مملکت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، اور چونکہ ملک کی تمام منظم قوت اس کی پشت پناہی کے لئے حاضر ہو سکتی ہے اس لئے بظاہر وہ ایسی مطلق العنان فرمانروا ہے جس کا حکم گویا قانون ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ افراد کی کن کن مصروفیات اور امور میں عمال حکومت کو معمولی طور پر مداخلت کرنے کا اختیار ہونا چاہئے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی ریاست یوٹاہ میں ہر شخص ضمنی عورتوں سے چاہے نکاح کر سکتا ہے لیکن شرع اسلامی کی رو سے کسی مرد کو چار سے زیادہ نکاح کرنے کا اختیار نہیں ہے اور وہ بھی جب وہ اپنی ہر ایک بیوی کے ساتھ مکمل مساوات کا ساپک کر سکے، پھر اکثر ممالک یورپ میں کسی فرد کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص ایک زوجہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت سے نکاح کر لے تو وہ گرفتاری تصور کیا جاتا ہے۔ ادھر آئی میں مجر دو لوگوں پر محصول عائد کیا جاتا ہے اور ترکی میں بچوں کا گذارہ مقرر کیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عمال حکومت اکثر ممالک یورپ میں افراد کے حق و محنت میں نسبتہ زیادہ مداخلت کر سکتے ہیں، اسلامی شرع کی رو سے اس سے ذرا کم،

اور پوتا جیسی ریاست میں انہیں اس نوع کی مداخلت کیسے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک دوسری مثال لیجئے۔ انگلستان میں جہاں جبری تعلیم کا قانون رائج ہے اگر کوئی شخص اپنے بچے کو جس کی عمر ایک خاص حد سے تجاوز کر چکی ہو، مدرسہ نہ بھیجے تو اس پر مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، لیکن ہندوستان میں حکومت کسی شخص کو جبراً اپنے بچے کو مدرسہ بھیجنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

انفرادیت اور اشتراکیت۔ اگر انفرادیت اور اشتراکیت کو اجمالی طور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انفرادی مسلک کے پیرو حکومت کو فرد کے حق میں برا تصور کرتے ہیں اور ان کا یہ خیال ہے کہ اس غیر ضروری دست اندازی کا انسان کی آزادی میں رخنہ پڑتا ہے، تاہم ان کے نزدیک چونکہ انسانی معاشرہ ہنوز اس پایہ کمال کو نہیں پہنچا کہ بغیر بیرونی رباؤ کے انسان کی زندگی، حقوق اور املاک، مال و مغلوظا روکیں اس لئے حکومت کے بغیر چارہ کا بھی نہیں۔ یہی سبب اس کی ضرورت ہے کہ جس وقت ان عناصر حیات میں سے کوئی بھی خطرے میں آئے تو حکومت مداخلت کر کے نقصان رساں کو کیفر کردار کو پہنچائے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حکومت ایسے معاملات میں بھی دست اندازی کرے جو صرفاً خود فرد کے حیلہ اقتدار میں ہوں، جیسے تعلیم، حفظانِ صحت وغیرہ، اس لئے کہ انفرادیوں کی دانست میں ہر شخص کو ان کو طے کرنے کا کلیتہً حق حاصل ہے، چنانچہ ایسی حالت میں بیرونی مداخلت بے کار ملکہ ثنائی نقصان رساں ثابت ہوگی۔

اس کے برعکس اشتراکی یہ کہتے ہیں کہ انسان ہرگز اپنے مفاد کو کما حقہً واقف نہیں ہوتا اور اس کے اور ملکیت کے اغراض میں بعض مرتبہ جو تضاد پایا جاتا،

اُس کے برے نتائج کے انداد کے لئے مملکت کی مداخلت لازمی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انفرادی معاشرے میں اصول مقابلہ کی ترویج کے باعث انسان کی محنت اور سرمایہ کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ہے، اور چونکہ ایک ہی قسم کے کام کو بہت سے لوگ یک وقت انجام دیتے ہیں اس لئے کوئی بات بھی خاطر خواہ انجام کو نہیں پہنچتی۔ اُن کی دانست میں بہترین مملکت وہی ہے جس میں اپنے پرانے کا سوال باقی نہ رہے بلکہ سرمایہ و زمین دونوں مملکت ہی کی سمجھی جائیں اور "محنت" پرانے کی کلیتہً دسترس ہو۔ کل اشتراکی مملکت میں نہ خانگی زمینداریاں ہوں گی نہ خانگی گرنیاں اور نہ ہی خانگی مدارس و کارخانہ جات، بلکہ جس قدر بھی عاملین پیدائش ہیں سب کے سب حکومت ہی کے دست نگہ ہوں گے، ہر فرد کو مملکت ہی کی طرف سے کام کیسے گا اور حکومت ہی کے مقرر کردہ معاوضہ پر اس کی قوت بسر ہی ہوگی۔

انفرادیت - اب ان اصول پر ذرا غور نظر ڈالئے۔ انفرادیت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب قدیم تجارتیت کے ساتھ ساتھ حکومت کی مداخلت و نگرانی کے خیالات داخل ہو رہے تھے، آدم سمٹھ، فون سمبولٹ اور ہربٹ سمنسٹر

شہ اشتراکیت کی مختصر تاریخ اور بیان کے لئے دیکھو ایس احمد، "اشتراکی تخیل اور تحریک" کے رجحانات "Styas Ahmad: Trends in Socialistic

Thought & Movement" خصوصاً ابواب ۸ و ۹۔

آدم سمٹھ، "دولت اقوام" Adam Smith: Wealth of the Nations

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵۴ پر

نے اس اصول کو پیش کر کے اس سے مختلف النوع استدلال کئے۔ انفرادیت کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حرکات و سکنات کی اس وقت تک پوری آزادی ہونی چاہئے جب تک یہ عیاں نہ ہو جائے کہ اس کی آزادی سے کسی دوسرے کو گزند پہنچتا ہے۔ انسانی معاشرے کی بنیاد خود غرضی پر ہے، اور ہر ایک شخص اپنی غرض کو دوسروں کی یہ نسبت بہتر پہچان سکتا ہے، چنانچہ جس قدر بیرونی اور مصنوعی رکاوٹیں کم ہوں گی اتنا ہی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگا۔ یہی نہیں، بلکہ ہر فرد کے حصول مقاصد ہی سے افراد کی اجتماعی بہبود مد نظر ہوتی ہے اس لئے کہ آخر افراد ہی سے تو معاشرہ ترکیب پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد اپنی بہبود کے لئے کوشش کرے گا تو مختلف افراد کے مابین مقابلے کی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس سے انسان کی اعلیٰ ترین قابلیتیں نمایاں ہو جائیں گی اور اس میں اپنی مدد آپ کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز اس مقابلے کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ جواز و فطرتاً ناقابل ہوں یا ماحول کے باعث ان کی فطری اہلیت زائل ہو چکی ہے وہ یا تو پس پشت چلے جائیں گے ورنہ فنا ہو جائیں گے، جس کی وجہ سے معاشرہ کو بقائے اصلح سے فائدہ پہنچے گا۔ انٹرنل

لڈ ہون ہولٹ "خیالات متعلق تحدید دائرہ حکومت" Humboldt :

Grenzen der Wirksamkeit des Staats

ہربرٹ سپنر، "ذریعہ بقائے مملکت" Herbert Spencer: *Man Versus State.*

انفرادیوں کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ افراد کے کاموں میں حکومت بے ضرورت مداخلت کرنے سے باز رہے اور صرف انھیں کاموں کی نگرانی نہ کئے جو افراد کی جان، مال اور آزادی کے لئے ضروری ہیں۔

اگر نظریہ انفرادیت پر تنقیدی نظر ڈرائی جائے تو ہمیں بہت جلد اس کے بے بنیاد ہونے کا ثبوت مل جائے گا۔ سب سے پہلا اصول جو اس نظریہ کی گویا جان ہے یہ ہے کہ نہ صرف ہر ایک فرد کو اپنی بہبود مد نظر ہوتی ہے اور نہ اس کے لئے کما حقہ کوشش کرتا ہے بلکہ وہی اس کوشش کا اہل بھی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہم جانتے ہیں کہ عقل انسانی مکمل نہیں ہے اور روزمرہ اس قسم کے سیکڑول واقعات پیش آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لئے اپنے پاؤں میں جان بوجھ کر کلہاڑی مار لینا بالکل معمولی بات ہے۔ اگر وہ اپنے جائز مقاصد حاصل کرنے کے درپے ہوتا اور اس کے حصول کے ذرائع سے بھی واقف ہوتا تو پھر ہم کسی کو ناکامی یا غربت کی زندگی بسر کرتے ہوئے نہ دیکھتے۔ پھر یہ بات غلط ہے کہ افراد اور مملکت کے اغراض ایک ہی ہیں ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ بعض مرتبہ جس چیز میں نظام افراد کا مفاد نظر آتا ہے اس میں ان کی اجتماعی کیفیت یا مملکت کا مفاد ضمیر نہیں ہوتا۔ اگر یہ اجتماعی کیفیت قائم رکھنی ہے (اور اس منہج میں)

لے عسیٰ ان لکھو اشیاء وھو خیر لکم و عسیٰ ان یحیو اشیاء وھو شر لکم (قرآن مجید)

سورہ بقرہ رکوع ۱۰۔

۷ باب ۱ بالا

۸ باب ۲ بالا

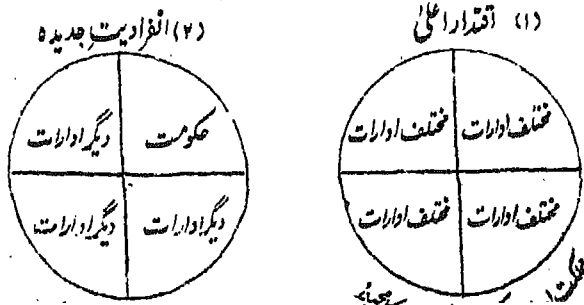
تجربہ و دلوں خیالات کو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھنا چاہیے گا، اور حکومت کے ارتقا اور اس کے اغراض کے حصول کے لئے اسی طرح سے آسانیاں اور سہولتیں ہم پہنچانی پڑیں گی جیسے خود افراد کے۔ نظریہ انفرادیت پر تیسری تنقید یہ کی جاسکتی ہے کہ انفرادی جس "آزادی" کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا تعین حکومت کی انتہائی مداخلت کے بدون ناممکن ہے اور فطری آزادی حقیقی کیسے ہی دل خوش کن خیالات کیوں نہ ہوں، بغیر اس انتہائی مداخلت کے ان کی بنیاد محض ہوا ہے۔ آخری دلیل جو انفرادیت کے موافق پیش کی جاتی ہے وہ فلسفے اصل کی ہے اور اس کا سب سے بڑا مؤید ہر برٹسینر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی معاشرے کی حقیقی فلاح و بہبود اسی میں مشتمل ہے کہ بہترین افراد باہمی مقابلے کے ذریعے سے آگے بڑھیں اور بدترین فنا ہو جائیں۔ بظاہر یہ خیال بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بے کار فرد باقی نہ رہے جو اٹھ پاؤں ہلاکے بغیر دوسروں کا گواہیٹ کاٹ کر رکھتا ہو، لیکن ذرا غور کرنے سے یہ نظریہ بالکل بے اصل معلوم ہونے لگتا ہے۔ اول تو سینئر کا یہ خیال ایسے جانوروں سے اخذ کیا گیا ہے جن میں انہی اہم صلاح کی اہمیت نہیں، درنحالیکہ انسان ان جانوروں سے ممتاز ہے، اور وہ ہر ان انہی اہمیت کو بہتر بنانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بعض ترقی یافتہ ممالک میں اب وہی ہرے، اندھے، گونگے، لے اور اپاہج، جنہیں شاید سینئر دیکر ادیتا، معاشرے کے

مفید عناصر بن گئے ہیں، اور جنہیں فطرت کی طرف سے جملہ قواسمِ جسمانی عطا ہوئے ہیں ہر لحاظ اپنی اور اپنے ماحول کی حالت کو سدھارنے میں مشغول ہیں۔ جب وہی صورت حال یہ ہے تو پھر جانوروں کی عادات و خصائص سے استدلال کرنا اور نئی نوع انسان کو گردن زدنی قرار دینا کہاں تک مناسب ہے۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مقابلے کی زد و جد سے بدخشا ہو جاتے ہیں اور نیک باقی رہتے ہیں، در آخر لیکہ حقیقت اس سے بہت سے لوگ ایک ہی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے معاشرہ کو صریح معاشی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر جو شخص مقابلے کی وجہ سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے وہ اگرچہ اضافی اعتبار سے قابل ترین ہو، لازماً بہترین نہیں ہوتا؛ اس کے وسائل اور اس کا دائرہ فطرتاً تنگ ہوتے ہیں؛ اس کے برعکس اجتماعی انتظامات کی شکل میں یہ دائرہ وسائل کی فراوانی، مقاصد کی توسیع اور سرمایہ کی زیادتی کے باعث وسیع تر ہو جائے گا۔

انفرادیت جدید - حال کے زمانے میں دوسرے سیاسی نظریوں کی طرح انفرادی نظریہ نے بھی چولا بدلا ہے اور بالخصوص پچھلی جنگ عظیم کے بعد اس کی ہیئت میں بہت کچھ تبدیلی ظہور میں آئی ہے۔ دورانِ جنگ میں اور اس کے بعد تقریباً ہر ملک میں دو قسم کی کیفیات ظاہر ہوئیں، ایک تو حکومت کی مداخلت اور دوسرے حکومت کے علاوہ دیگر اداروں کے اثر میں توسیع۔ جنگ کے زمانے میں اس کی ضرورت

۱۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ لندن کا مشہور مزارحہ رسالہ ”پیچ“ برلن تحریر میں اندھول کے خاندان کے لئے شائع ہوا کرے گا۔

پیش آئی کہ مرکز گیر قوتوں کا یا نو خاتمہ کر دیا جائے ورنہ حکومت کسی نہ کسی طرح سر
ان پر حاوی ہو جائے، چنانچہ نئے نئے محسن جاری ہوئے، "قوانین تحفظ قومی"
نافذ کئے گئے، اکثر جنگجو ممالک میں ہر ایسے شخص کو جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھا،
بھرتی کرنے پر مجبور کیا گیا، خانگی کارخانوں اور گریوئوں میں جن میں پہلے روزانہ ہستیاں
کی اشیاء بنائی جاتی تھیں، سامان جنگ اور گولہ بارود بننے لگا، انٹرنیشنل حکومت
کی نگرانی ہونے لگی اور حکومت کے عمال ہر موقع پر نظر آنے لگے۔ اس صورت حال
کے خلاف رد عمل ہو ملازمی تھا، چنانچہ جنگ کے بعد لوگوں کو حکومت کی دست برد
اور دباہلیت سے ایک قسم کی نفرت سی پیدا ہو گئی اور بڑی بڑی قومی انجمنوں اور ادارت
نے خود اپنے عمال بطول اور قاعدوں کا نفاذ کر کے یہ دکھا دیا کہ ترتیب و تنظیم محض
حکومت کے جبری سے برقرار نہیں رہتی بلکہ اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ انہیں کھاشی
کیفیات سے انفرادیت جدیدہ جنم لیتی ہے۔ اول تو اکثر ملکوں کے باشندوں میں
نئے جدید نظریوں کے متعلق جوڑ کی کتاب "زمانہ حالیہ کے سیاسی نظریات" *Garold Mordern*
Political Theory نہایت بسیط اور پر معلومات ہے۔ نظریہ اقتدار اعلیٰ اور قومی انفرادیت
کے درمیان جو تعلق ہے وہ حسب ذیل شکلوں سے معلوم ہو گا۔



عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ عقیدہ پرستی اور عملی سیاسیات دو مختلف چیزیں ہیں، اور یہ یقین ہو گیا کہ انفرادی اور اشتراکی عقیدہ پرست کچھ ہی کہتے ہوں، ہر ملک کا سیاسی ارتقا اس ملک کی سیاسی کیفیات کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ایک مسلک یہ بھی قائم ہو گیا کہ مملکت کو محض افراد کی بجائے ان کے مجموعوں کا مقابلہ کرنا ہے، اور جس طرح ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ وقت آنے پر ہم اپنے ملک یعنی اپنے مخصوص جغرافیائی رقبے پر اپنی جان بک قربان کر دیں، اسی طرح دوسرے ایسے ادارات بھی ہیں جن کے واسطے ممکن ہے کہ ہم قربانی کرنی پڑے، وہ ادارات ہمارا مذہب، ہمارا مدرسہ، ہمارا کلیسہ، ہمارا اتحاد تجارتی وغیرہ ہیں۔ نئے افراد لوں کا قتل ہے کہ اگر مملکت اور اُن قومی یا مذہبی عالمگیر ادارات کے مابین تصادم ہو جائے تو استقرائی اعتبار سے کوئی وجہ نہیں کہ مملکت ہی کو فوقیت حاصل ہو، اور موجودہ صورت حال میں ان ادارات کو نظر انداز کر دینا کسی طرح سے مناسب نہیں۔ ان کے نزدیک مملکت کی بابت زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جملہ مجموعہ جات انسانی کی ایک عہدیت یا وفاقت ہے، جس کے ذریعہ سے ان ادارات کے مابین ایک قسم کی ترتیب و تنظیم پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مملکت کو فی نفسہ کسی قسم کا ایسا تفوق حاصل ہے

اس خیال اور نظریہ اقتدار اعلیٰ سے جو تعلق جو اس کے لئے دیکھو لاکس کی تصانیف خصوصاً "مسئلہ اقتدار اعلیٰ" *Laski: The Problem of Sovereignty* "صرف بنجویا بیات" *The Grammar of Politics* نیز دیکھو باب ۱۱ عنوان "سکھیری نظریہ"۔

جس کے باعث اسے ان ادارات کو فنا کرنے کا بھی اختیار حاصل ہو۔

نراج۔ اب انفرادیت کی انتہائی شکل یعنی نراج کے اصول پر نظر ڈالئے۔

عام طور پر ”نراج“ کے معنی ”ناہودیت“ یا جملہ معاشری ادارات کے بربادی کے لئے جاتے ہیں، اور ان دونوں لفظوں سے شہنشاہیت پسندوں نے اپنا جو کام نکالا ہے اس کے باعث ہم انھیں بالالتزام انقلابی سمجھنے لگے ہیں جہاں کسی بدخبت نے کوئی بم پھینکا، جہاں کسی سیاسی جرم کا ارتکاب کیا گیا، بس ”نراج“ کی صدائیں مہاں چکر لگائے گئیں، اور چونکہ عام طور پر اس قسم کے حالات سے کام نہ لانا مقصود ہوتا ہے اس لئے کسی کو یہ سوچنے کی مہمت نہیں ملتی کہ آخر نراج کے معنی کیا ہیں اور یہ کم واتی کسی نراجی نے پھینکا ہے یا اس کا مقصد کچھ اور ہے ”نراج“ کے معنی عام حکومت کے ہیں، اور اس کے موید چاہتے ہیں کہ انسانی تولدے ذہنیہ جسمانیہ میں کچھ اس قسم کا ارتقا ہو جائے کہ جبر و اکراہ بالکل غیر ضروری ہو جائے اور افراد اور ان کے مجموعے بغیر کسی بیرونی دباؤ کے جملہ کار و بار زندگی انجام دے سکیں ان کے نزدیک حکومت ایک بڑے بھاری مضامین پر مبنی ہے، وہ یہ کہ سیاسیات میں نیابت کے اصول کا انطباق ممکن ہے، یا کوئی شخص کسی مصنوعی رقبے کی آبادی کا نائب بن سکتا ہے، بلکہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی دانا و دنیا کیوں نہ ہو، ہر اکابر میں رائے دینے کا اہل نہیں ہو سکتا، نہ یہ ممکن ہے کہ ”فخثار“ اپنے ”ہل“ سے ہر ایک معاملہ میں استفسار کیا کرے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ حکومت بے کار بھی ہے، اس لئے کہ تعلیم اور حفظان صحت ہی نہیں بلکہ ملک کی حفاظت بھی اختیاری انجمنوں اور مجموعوں کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے، مثلاً ان کا یہ قول ہے کہ تاریخ دنیا پر

نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملہ آور بہت مرتبہ کسی ملک کی منظم فوجوں کے مقابلے میں تو سبقت لے جاتے ہیں لیکن انہیں آخر کار شہر لوں کے ایسے اختیاری مسلح گروہوں کے سامنے نچا دیکھنا پڑتا ہے جو جگہ جگہ سے چھپ چھپ کر ان پر گولے برساتے ہیں۔ بہر حال راجہوں کے نزدیک اگر مملکت اور حکومت کا اٹھ اٹھا لیا جائے تو کاروبار اور مختلف امور کی کارفرمائی بالکل موجودہ زمانے کی طرح سے ہوتی رہے گی، صرف فرق یہ ہوگا کہ ملک میں بجائے مقابلہ، عناد اور دشمنی کے محبت اور اتحاد و اتفاق کا راج ہو جائے گا۔ ان کے خیال میں حکومت کے فقدان کے باوجود ترتیب و تنظیم باقی رہے گی لیکن جبر کا عنصر بالکل اٹھ جائیگا ان کا سب سے بڑا گروہ روڈین کہتا ہے کہ تم اگر جبریت سے منسوب جاؤ تو تمہیں بیسوں ملکوں اور شہرکتوں کی ریلوں میں سفر کرنا پڑے گا جنہیں لاکھوں گروہوں کی ضرورتوں نے بنایا ہو گا، لیکن جن کی ہم آہنگی کے لئے کسی برسرِ انداز مرکزی قوت یا ادارہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے نزدیک فرد صرف اسی وقت آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے جب سیاسی بساط سے مملکت اور حکومت دونوں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں۔ ایسی حالت میں فرد کو مملکت اور سرمایہ داروں کے جوئے سے آزادی حاصل ہو جائے گی اور ان کی اس مردان کی بجائے اختیاری انجمنوں کے ذریعہ سے انجام پایا کریں گے۔

مثلاً کرڈین: "راز کا فلسفہ اور اس کا مسلح نظریہ" *Kropotkin: Anarchism*
 اس کا ذکر جو فی کتاب "سب بالا میں دیا ہوا ہے۔ *its Philosophy & Ideal*

پیشہ سہری - اشتراکیت کی طرف رجوع ہونے سے پیشتر ہمیں ایک اور تحریک کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے اور وہ پیشہ سہری ہے۔ پیشہ سہری کی ابتدا فرانس میں ہوئی، اس کا بانی مہاتی پروڈوہون تھا جس نے یہ خیال غامبر کیا کہ دنیا کی جملہ حکومتوں میں دراصل طبقہ اوسط یا طبقہ اعلیٰ برسر اقتدار ہے، اور یہی دو طبقے ملک کی افزائش دولت میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں۔ اس کے نزدیک واقعہ یہ ہے کہ وہی طبقہ جو پیدائش دولت کے لئے اپنا عزیز وقت اور اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے (یعنی مزدور) سیاسی حقوق سے ایک بڑی حد تک محروم ہے۔ اتحادی کہتے ہیں کہ حکومت کے خیال کو بالکل غائب کر دیا جائے اور اس کی جگہ تمام سیاسی قوت مزدور سبھاؤں کے ساتھ وابستہ ہو تاکہ مزدور ہی سیاسی معاشرہ کے رہبر اور روح رواں ہو جائیں۔ معاشی اعتبار سے پیشہ نشاہی اشتراکیت کا عکس ہے، اس لئے کہ جہاں اشتراکیت میں "صاف" کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے وہاں پیشہ سہری مزدور کو معاشرہ کا اہم ترین عنصر قرار دیتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق مرکزی روایت کے باعث ضرورت سے زیادہ یکسانی، روزمرہ کا بے جان چکر، جدت کا فقدان اور بے اعتباری کے احساسات نمایاں ہو جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو صریح نقصان پہنچتا ہے۔ جہاں پارلیمنٹیں قائم ہیں وہاں مزدور فریق کے ارکان دراصل اپنے ہم خیالوں کے قائم مقام نہیں بلکہ اپنے حلقہ جات انتخابات کے تلامذہ قائم ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ بالکل دست و پا بستہ ہوتے ہیں اور مزدوروں

شہر دیکھو لیون: "فرانس میں اتحادیت" *Devine Syndicalism in France.*

اور آجروں کی بہبود کے لئے چاہیں بھی تو کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے موذی جلنے میں کہ کسی ملک میں نسبتاً کم ایسے لوگ ہوں گے جو ان کے ہم خیال ہوں، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہد ارتقا میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کو راہ راست پر لایا جائے جس کے لئے کسی کثرت رائے کی ضرورت نہیں، بلکہ حکومت اور اصل داروں کو بالجبر ”کھلے عمل“ یعنی ”ٹر ٹال“، ”مقاطعہ“، خفیہ نشرات انگیزی وغیرہ کو ذریعے سے دباؤ ڈال کر اپنا کہا منوایا جائے۔

تسلیم۔ مزاج کے نظریہ کو کسی نے تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا، اور اس سے بڑا سقم یہ معلوم ہوتا ہے کہ (جسا اور بیان کیا جا چکا ہے) بلاشبہ انسان خود غرض ہے، افراد اور مجموعوں کے باہمی اغراض میں یقیناً تضاد مہوتا رہتا ہے، اور اس تضاد کو روکنے کے لئے محض اختیاری انجمنیں اور اختیاری ادارات ہرگز موثر نہیں ہو سکتے۔ اگر چوری کے انداد کے لئے ایک انجمن، قاتل کو سزا دینے کے لئے دوسری انجمن، اور قرضہ کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے تیسری انجمن قائم کی گئی تو پھر جس انجمن کی قوت دوسری انجمنوں سے بڑھی ہوئی ہوگی وہی موجودہ حکومت کی جگہ لے لے گی اور دوسری ”اختیاری انجمنوں“ اور ادارات کو اپنا طبع کر لے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں حاکمیت و محکومیت کے اصول بھرے ہوئے ہیں اور کسی نظریہ ساز کی تحریر یا محض عقیدہ پرستی کی وجہ سے اس کی فطرت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت اتحادیت کی بھی ہے۔

پیشہ واپس۔ چاہتے ہیں کہ تمام مزدور سبھائی باہم متفق ہو جائیں اور یہ جدید ”وفاقیت“ حکومت کی جگہ حاصل کر لے۔ ظاہر ہے کہ جب اس وفاقیت کو حکومت

کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے اور وہ شہریوں سے اپنے احکام جبراً منوانے لگے گی تو پھر موجودہ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش ضروری سمجھی گئی ہے۔

اشتراکیت - انفرادیت کا مفہوم سمجھنے کے بعد اشتراکیت کی طرف آئیے اور سب سے پہلے اشتراکیت کے ابتدائی نظریہ کو لیجئے۔ اشتراکیوں کا سب سے بڑا گرو اور اشتراکی نظریہ کا ایک موجودہ کارل مارکس ہے جس نے اپنی کتاب ”موسمہ“ اصل داری، ”کوشش“ میں جرمنی میں شائع کرا یا۔ صنعتی دیکھائی انقلاب کی وجہ سے ایک طرف تو دولت روز بروز نسبتاً کم تعداد لوگوں کے قبضے میں چلی جا رہی تھی اور بڑی بڑی شرکتوں اور عظیم الشان کارخانوں کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا، اور دوسری جانب اسی دولت کی وجہ سے اصل داروں کی بٹھجاری اور بیچارے مزدوروں کی کم مانگی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارل مارکس نے انھیں اثرات کے تحت اپنی کتاب لکھی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دنیا کے جملہ آلام و نقائص کا انداز صرف اسی طرح ہو سکتا ہے کہ موجودہ معاشرہ کی بنیاد یعنی خانگی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی بجائے مشترکہ ملکیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ بلاشبہ ہر قسم کے کاروبار کے لئے اصل کی ضرورت ہے لیکن اصل کی ملکیت افراد کی بجائے ملکیت کے ساتھ وابستہ ہونی چاہئے، جو افراد کی اجتماعی کیفیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ ملکیت کا مقصد عظیم ہونا چاہئے

Karl Marx: Capital.

کارل مارکس ”اصل داری“

(انگریزی ترجمہ)

کر اصل کو محض چھوٹی سی جماعت کیلئے فائدے کیلئے نہیں بلکہ تمام معاشرے کی فلاح کی غرض سے استعمال کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ ملکیت کے قبضے میں آجائے گا تو ملکیت ہی اُسے کام میں لائے گی، جس کی وجہ سے مقابلہ جیسے نقصان رسا عنصر کا سدباب ہو جائے گا، اور بجائے چند چٹنے ہوئے لوگوں کے تمام معاشرہ ملکی کو طرح طرح کے فوائد مل سکے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ اشتراکیت کے رواج سے خود افراد کی عام اخلاقی حالت بھی سدھ جائے گی اس لئے کہ وہ محض اپنے اغراض کو ملحوظ رکھنے کی بجائے ملک کے معاشرتی مفاد کے حصول میں کوشاں ہوں گے۔ ان تمام انتظامات کے واسطے ملکیت کی درست اندازنی لازمی ہے، اس لئے کہ وہ افراد کی فلاح و بہبود سے خود ان سے کہیں زیادہ واقف ہوتی ہے۔ ان مفاد کے حصول کے لئے حکومت کو جملہ عاملین پیدائش پر خاص نگرانی رکھنی پڑے گی، کارخانوں کا انتظام کرنا پڑے گا اور ہر شخص کے واسطے اس کے کام کے مطابق آرام و آسائش کا انتظام کرنا پڑے گا۔

اجتماعیت - یہ تو ابتدائی اشتراکی نظریہ ہوا، لیکن پچھلے اسی برس میں (باخصوص جنگ عظیم کے بعد) اس میں بہت کچھ تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں گویا ابھی ان سب کا وارد مدار کارل مارکس کے خیالات ہی پر ہے جس خیال کا سب سے زیادہ تعلق ابتدائی اصول کے ساتھ ہے وہ اجتماعیت ہے، اور اس کے موید صرف یہ چاہتے ہیں کہ اشتراکی اصول کا اثر ہر ملک میں بتدریج پیدا کیا جائے تاکہ حکومت کی کل اشتراکیوں کے قبضے میں آجائے۔ اس کے لئے مغربی یورپ کے ہر ملک میں باضابطہ اجتماعی سیاسی گروہوں کو منظم کیا گیا جن میں

سے شاید سب سے پہلا گروہ جرمنی کی "انجمن مزدوران" کی شکل میں نمودار ہوا جسے فروری ۱۹۰۴ء سال کے پچھلی صدی کے وسط میں قائم کیا تھا، اور ۱۹۰۴ء میں آخر کار جرمانی "دستوری اشتراکی" گروہ کی بنیاد پڑی جس نے سولہ سال بعد یعنی ۱۹۲۰ء میں اپنے پیش نامہ کا اعلان کیا۔ اس پیش نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فریق انقلاب پسند نہیں بلکہ حکومت میں اس وقت تک ارتقاء کا حوالہ ہے، جب تک ملک میں اشتراکی خیالات پورے طور سے سرایت نہ کر جائیں۔ اسی طرح انگلستان میں اشتراکی خیالات کی رہبری جارج برنارڈشا اور شے مین سوسائٹی نے کی جس کے روح رواں مسٹر سڈنی ویب ہیں۔ ان کا سطح نظریہ یہ ہے کہ ایک طرف تو حتی الامکان لامرکزیت کے اصول ترویج کریں اور دوسری جانب جبری ہمہ "وظائف سمہ" کارخانہ داروں اور مزدوروں کی جبری پنچائیت اور نگرانی کارخانہ جات کے اصول کے ذریعے سے مداخلت حکومت کے دائرے کو وسیع کریں۔ یہی وہ طریقے ہیں جن کے ذریعے سے اجتماعوں کو مختلف ممالک میں لاشائی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور ایک طرف تو ۱۹۱۹ء میں جمہوری جرمنی کا سب سے پہلا صدر وہاں کے اشتراکی گروہ کا جبر فڈرشل ایبرٹ مقرر ہوا ہے، دوسری جانب ۱۹۲۰ء میں انگلستان کے مزدور فریق کا

۱۹۲۹ء دیکھو کہ "تاریخ اشتراکیت" Kinsup: A History of Socialism

۱۹۲۹ء کے وسط میں مزدور جماعت کی جو وزارت ترتیب دی گئی اس میں سڈنی ویب کو وزیر نوآبادیات بنایا گیا اور ملک معلم لے انھیں برنی کارتبہ اور لارڈ پاس فیلڈ کا خطاب مرحمت کیا

صدر ریپبلیک میڈاٹلڈ خورشاد شاہ جارج پنجم کے ہاتھ سے قلمدان وزارت حاصل کرتا ہے۔

اشتمالیت - اشتمالیت کا آخری اور سب سے اہم پیرایہ وہ ہے جسے اشتمالیت کا لقب دیا جاتا ہے، اور جس نے روس میں بالشوویت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ بالشوویت پر اس وقت بحث نہیں کی جائے گی بلکہ اس مخصوص طرز حکومت پر سیاسی فرقہ بندی کے سلسلے میں آئندہ غور کیا جائے گا؛ اس وقت صرف اس کے بنیادی اصول یعنی اشتمالیت کو بہ نظر غائر دیکھنا ہے اجتماعیت کی طرح اشتمالیت کے پر د بھی ایک مخصوص طرز کار کے ذریعہ سے اپنے مقصد کے حصول کے خراہاں ہیں۔ جس طرح اجتماعیت پسند محض ارتقاء کے ذریعے سے اشتراک کی کیفیت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں اسی طرح اشتمالیوں کے

۱۹۱۹ء انگلستان کی مزدور جماعت نے ۱۹۲۹ء تک حیرت انگیز ترقی کی۔ ۱۹۱۹ء میں ایوانِ عظمیٰ میں اس کے قائم مقاموں کی تعداد صرف دو تھی، یہ تعداد ڈیڑھ گھنٹے میں ۱۹۱۹ء میں ۱۹۱۹ء میں اس گروہ کے رہنما ریپبلیک میڈاٹلڈ انگلستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مزدوروں کی وزارت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۲۹ء کے عام انتخاب میں یہ تعداد ۲۸۸ ہو گئی اور میڈاٹلڈ کی دوسری "مزدوروں کی کاغذیہ" کا تقریر ہوا۔ اس کے بعد اس فرقے میں فوٹے چل گئے، اور خود میڈاٹلڈ اپنے پرانے رفقاء کے کار کو چھوڑ کر قدامت پسندوں اور برہمنوں کے ایک جڑ سے جاملے اور نام "تومی" کا بنیہ ترتیب دیدی۔ اس وقت سے اب تک مزدور جماعت کو براہِ زوال ہو رہا ہے اور اب اس کے صرف ۱۵۴ نمائندے ایران میں ہیں۔

نزدیک اکثر کی مقاصد کا حصول انقلاب اور طبقہ واری جنگ کے بغیر ممکن نہیں اس لئے کہ کراچی دنیا کے اہل داروں اور سرمایہ داروں نے اپنی بنیاد کو اس درجہ مضبوط کر لیا ہے کہ وہ کسی حالت میں ملامت سے راہ راست پر نہیں آسکتے۔ ابتدائی اشتہادیں جو مانی سیاسی فلسفی اینگلس کا نام نہایت متنازعہ ہے، لیکن جسے بھی شمالی گزرے ہیں ان سب میں متنازع ترین شخص جس نے اصول اشتہادیت کی علی ترویج کر کے اس کی تاریخ میں گویا چار چاند لگا دئے ہیں، لیکن تھا، جو سلسلہ سے لے کر سلسلہ تک مسلسل برسوں کا عرصہ اور جزائے حال کے عظیم ترین انسانی رہبروں میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ یہ خیال محض قمار ہے کہ جس طبقہ کے قبضے میں صدیوں سے قوت و اقتدار رہا ہو وہ بغیر فیصلہ کن جنگ کے اپنے اقتدار سے دست بردار ہو جائے گا، چنانچہ اس کی ضرورت ہے کہ جس طرح سے ہو سکے مزدور اور ملک کا محنتی طبقہ، جو اس وقت تک نہایت کس مہر سی کے عالم میں رہا ہے، جبراً و قہراً موجودہ سیاسی اختیارات اپنے قبضہ میں کر لے اور انہیں خود اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے کام میں لائے۔

سٹیم وکھو ایکس و اینگلس: "اعلان اشتہادین" : Marx & Engels :

The Communist Manifesto (Eng)

Trans., Ch. Kew, N. Y.)

لنین: "الانقلاب طبقہ اسفل" Lenin: The Proletarian Revolution.

اشتراکی کہتے ہیں کہ یہ حکومت بلاشبہ محض ایک طبقہ داری جماعت پر مشتمل ہوگی اور صحیح معنی میں ملک کی قائم مقام نہیں ہوگی، لیکن یہ طریقہ صرف اس لئے استعمال کیا جانا ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے اصل داروں کا سیاسی و معاشی اجارہ منسوخ کر دیا جائے۔ زمانہ موجودہ میں جتنی بھی بے اعتباری انقضائے امن نظر آتا ہے وہ سب عدم مساوات کی وجہ سے ہے؛ جب مکمل مساوات ہو جائے گی اور حق بحق دار رسید کے اصول کے تحت مختلفیں اور مزدوروں کو جو اپنے پیسے کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں، جملہ گم شدہ حقوق مل جائیں گے، تو پھر ایسی سیاسی فضا پیدا ہو جائے گی جس میں جبر و اکراہ کی حاجت نہ ہوگی اور اس طرح گو یا جی نوع انسان کو سیاسی نجات حاصل ہو جائے گی۔ جبر و اکراہ کے فقدان کے ساتھ ہی محاشیہ سیاسی یعنی مملکت کی بھی ضرورت باقی نہیں رہے گی، اس لئے کہ اس کا اصل اصول اقتدار اعلیٰ ہے اور اس کی ضرورت صرف اس لئے داعی ہوتی ہے کہ مختلف طبقہ آبادی کے مابین توازن پیدا کیا جاسکے جب طبقہ جماعت آبادی ہی کا خاتمہ ہو گیا تو پھر مملکت یا محاشیہ سیاسی کی کیا ضرورت باقی رہی، انقضائے گوانٹر اکیٹ اور انفرادیت کے مابین بعد المشرقین معلوم ہوتا ہے، لیکن ان دونوں کا انتہائی نصب العین یہی ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جس میں فرد کو کامل آزادی حاصل ہو اور کسی قسم کی بیرونی قوت یا اقتدار کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اصول اشتہائیت کا الحین اور ضروریات زمانہ کے اعتبار سے اس میں تغیر و تبدل ایک بین الاقوامی اشتہائی کانگریس کے ذریعے ہوتا رہا ہے جسے اصطلاح میں "اشتہالیم" کہتے ہیں۔ اس "اشتہالیم" نے اس وقت تک تین چارے بدلے ہیں۔

اس کا سب سے پہلا جلسہ سوئسٹان کے شہر بازل میں ۱۸۶۹ء میں ہوا جس میں اشتہلیوں نے باکون اور اس کے لاجی پیروں کو اپنی جماعت سے نکال دیا اور اس طرح گویا یہ اعلان کر دیا کہ مداخلت حکومت کے متعلق ان دونوں جماعتوں کے مابین ایک اصولی فرق ہے، وہ یہ کہ جہاں نراجی گروہ حکومت کے وجود کی مخالفت ہے، وہاں دوسرا یعنی اشتہلیوں کا فریق حکومت کی کل کو اپنے قبضے میں لا کر اس کے ذریعے سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسری بین الاقوامیہ کا انعقاد کیم کے شہر اینٹ ورپ میں ۱۸۸۹ء میں ہوا اور اس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کبھی کارل مارکس کے اصول کی لفظی و معنوی پابندی پیٹے ہی کی طرح ضروری ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس اشتہلیہ کا مسلک تقریباً بالکلیہ ارتقائی تھا، اور اس میں انقلاب کو بہت ہی کم دخل تھا، لیکن اس کے انعقاد کی وجہ سے اشتہلی گروہ میں ایک قسم کا ہرجاں پیدا ہو گیا اور مزدوروں کی انجمنوں میں تنظیم کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ برابر جنگ عظیم تک جاری رہی۔ اس تنظیم کی وجہ سے آہل داروں اور سرمایہ داروں کی طرح کی مراعات حاصل کی گئیں اور جنگ عظیم کی انداز پر محسوس ہونے لگا کہ شاید کارل مارکس کی پیش گوئی درست ثابت ہوگی اور اشتہلیوں کے مقاصد محض ارتقائی اور آئینی طریقوں سے حاصل ہو جائیں گے، لیکن جنگ نے اشتہلیوں میں ایک خاص نتیجہ پیدا کر دیا اور اس کے بعد ہی ارتقائی اور انقلابی اشتہلیوں کے مابین گویا دیوار آہنی حائل ہو گئی، ارتقائی گروہ تو قومی حکومتوں کے ساتھ مل گیا اور انقلابی گروہ کے افراد مختلف ممالک کے مزدوروں اور خفیوں کو اپنا بھائی بند سمجھ کر فی نفسہ

جنگ اور اصول جنگ سے منفرد ہو گئے۔ ان کے اس میدان کے باعث ایک طرف تو ہر ملک میں ان پر تشدد ہونے لگا اور دوسری جانب انھوں نے قومی حکومتوں کا ساتھ دینے سے منہ موڑ لیا۔ ان اثرات کے ماتحت ۱۹۱۹ء میں (یعنی روس کے بولشوی انقلاب کے بعد) روس کے مرکز کو سکوپین تیسرے اشتعالیہ کا انعقاد ہوا، اور اس نے وہ اعلان شائع کیا جو تمام اشتعالیوں کا نصب العین ہو گیا ہے، یعنی مارکس اور اینگلس کے اصول کے ساتھ ہی ساتھ اس نے آخر کار قطعی طور اپنے انقلاب پسند ہونے کی ذرا دامن نظر کر لی جس کا لب لباب یہ تھا کہ اشتعالیوں کا نصب العین یہ ہونا چاہئے کہ اصل واری کا خاتمہ کیا جائے اور ”ارڈلیہ“ کی آمریت قائم کی جائے۔

اصول اشتعالیت کی تنقید۔ اگر اشتعالیت پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ تمام دوسری غالی تحریکات کی طرح یہ بھی مغالطوں سے بھری ہوئی ہے۔ سب سے پہلی تو یہ ہے کہ اس میں تین عاملین پیدائش (یعنی ”زمین“ ”محنت“ اور ”اصل“) میں سے ایک یعنی ”محنت“ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انفرادی حالات میں تو قیمت، نوعیت و مقدار پیداوار، تقسیم دولت اور دوسرے معاشی امور کا تعین خود بخود طلب و رسد کے قانون کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن جب مقابلہ ہی غائب ہو جائے گا تو پھر ان کا تعین بہت

۱۹۱۹ء اشتعالی روس میں ارڈل طبع اپنے زول ہونے پر اتنا فخر کرتے ہیں جتنا سرایہ دار ملک میں شریف اپنی شہرانت پر۔

دشوار ہو جائے گا۔ تیسرے جہاں مقابلہ نہ ہونے سے رفعت ستانی اور سازشوں کا بازار گرم رہے گا وہاں جب ذاتی بہبود اور ذاتی منفعت کا خیال نہ رہے گا تو افراد بے پرواہ ہو جائیں گے۔ ارسطاطالیس اپنے استاد حکیم افلاطون کی نظریہ اشتراکیت پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب انسان کسی کام کو خود اپنا تصور کرتا ہے تو اس میں وہ شرکت اور سا جھے کے کام سے کہیں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زمانہ حال کے اشتراکی اصول کے پیرو طبقہ داری حکومت کو محض ایک منزل ارتقا تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اچھی طرح یا بری طرح کسی طرز پر بھی ناہمواری اور عدم مساوات کو مٹا کر ایسا مکمل آزاد معاشرہ قائم کیا جائے جس میں مملکت یا حکومت کی ضرورت ہی نہ ہو؛ اس میں اور نواج میں ملکی کوئی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ نراجی آج ہی سے مملکت اور حکومت کے خاتمے کے درپے ہیں اور اشتہالی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ تیسرے بین الاقوامیہ کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا مقصد اعلیٰ مساوات نہیں بلکہ آزت ہے۔ اگر ہم پچھلے بیس سال کی تاریخ روس پر نظر ڈالیں تو ہم محسوس کریں گے کہ جب تک خالص اشتہالیت کی ترویج رہی اس وقت تک فرد براہ حکومت کے شکنجے میں جکڑا رہا، اور یہ شکنجہ اسی وقت ذرا ڈھیلہ ہوا جب حکومت قطعی

۱۔ ارسطاطالیس، "سیاسیات"، ص ۲۰۴، ترجمہ انگریزی جونٹ

Aristotle's Politics Translation by Jonwell.

طریقہ اس عمومی اصول کی طرف آنے لگی جسے وہ کسی زمانے میں اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

اعتدال پسندی - یہ قاعدہ ہے کہ جب تک کوئی اصول محض مجرد شکل اختیار کئے رہتا ہے اس وقت تک اس میں غالییت کا عنصر نمایاں رہتا ہے، لیکن جب وہ عمل میں لایا جاتا ہے تو ایک قسم کے اعتدال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے محض عقیدہ پرستی سے عملی سیاسیات میں کام نہیں چل سکتا اس لئے کہ مختلف ملکوں میں افراد ہی کے تو مجموعے ہیں اور ہر ملک کی معاشی، جغرافی اور سیاسی کیفیات جدا گانہ ہونے کی وجہ سے اس کا طرز عمل جدا گانہ ہی ہونا مناسب ہے۔

کاغذی دلیل و استدلال اور بحث و تحقیق کے لئے ایک طرف ہر برٹس پستیر اور کونگن اور دوسری جانب کارل مارکس اور اینگلس کے نظریے نہایت دل خوش کن ہیں لیکن واقعات و حالات پر انطباق کرتے ہی ان کے پیروؤں کی غالییت کا کامیاب نکال کر پھینک دینا پڑتا ہے۔ جن ممالک میں انفرادی حکومت رائج ہے وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ بہرہ و عامہ و ضروریات زمانہ کی خاطر مختلف شعبہ جات حکومت میں اشتراکی اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے اور در بدر حکومت کا دائرہ عمل وسیع تر ہوتا جاتا ہے، دوسری جانب روٹن ہیں جہاں **سوشلسٹ** سے اشتراکییت کا دور دورہ ہے، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مکمل اشتراکییت کے ذریعے سے ارتقاء کی ”موجودہ منزل“ بھی اس وقت تک طے نہیں کی جاسکتی جب تک افراد کو تھوڑی بہت آزادی نہ دے دی جائے اور انفرادیت کے اصول پر ایک حد تک عمل نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انفرادی ہو یا اشتراکی، دونوں کے

ماہن جو فزق ہے وہ محض طرز کار کا ہے ، اور اگر وہ اپنے وطن کی بہبود چاہتے ہیں تو موقع دحل کے اعتبار سے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی غرض سے انھیں اپنے اصول میں کمی بیشی کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آزاد متمدن ممالک کی حکومتوں نے اپنے سر یہ فرض لے لیا ہے کہ نہ صرف اس قسم کے کاموں کو اپنے ذمہ رکھیں جیسے ڈاک اور تار اور ایک بڑی حد تک تعلیم اور حفظان صحت کے مسائل ، بلکہ ان میں سے اکثر میں ریلوں کو یا تو حکومت براہ راست چلاتی ہے ، ورنہ اگر وہ خانگی کمپنیوں کے ماتحت ہیں تو ان پر نگرانی رکھتی ہے۔ پھر ملک کی معاشی بہبود بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی جس کے لئے بیرونی مال پر طرح طرح سے محصول لگا کر ملکی صنعت و تجارت کو محفوظ کیا جاتا ہے ، حکومت کی طرف سے کارخانوں کی سرپرستی کی جاتی ہے اور دوتا فوقتا صنعتی نمانشوں کے ذریعے سے دنیا کی توجہ ملکی پیداوار اور مصنوعات کی طرف مبذول کی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی ”انفرادی“ حکومت کی لچپی پیس نہیں رکھتی ، بلکہ خانگی امور اور خاندان تک کے معاملات میں وہ مداخلت کرتی ہے ، مثلاً بعض ممالک میں لوگوں کو جبراً اپنی زندگی کا بھوکھانے پر مجبور کرتی ہے ، غائب کو ایک خاص عمر سے تجاوز کرنے پر فلاس سے بچانے کی غرض سے وظیفہ دیتی ہے ، اور مختلف کارخانوں میں ایک خاص مقدار سے زیادہ کسی کام کو نہیں کرنے دیتی۔ محنت اور مزدوری کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کا اصول اس قدر مسلمہ ہے کہ جب ۱۹۱۷ء میں انجمن اقوام کی ابتدا ہوئی تو اس کے عہد نامے میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ ”جہاں کہیں روزانہ آٹھ

گھنٹے یا سقنٹہ وارہم گھنٹے کی محنت کا قاعدہ مقرر نہیں ہے۔ وہاں کی حکومت کو اس قسم کے طریقہ کار کو رواج دینا چاہئے، اور اسی طرح بعض جدید دساتیر مثلاً جرمانہ کے دستور ۱۹۱۹ء اور اسپن کے دستور ۱۹۱۹ء میں مزدوروں کی بہبود کا خیال بہت کچھ پیش پیش نظر آتا ہے۔

آدھر بروں کے بولشویوں کو بھی محض سطحی اشتہائیت کی سطح سے اترنا پڑا ہے، اور "نئی معاشی پالیسی" کی ترویج کے بہت سے انفرادی اصول کو روکس میں رائج کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خورین کی حیات ہی میں یہ نہایت ہو گیا تھا کہ مجرد اشتہائیت میں جو نقص ہیں ان کے باعث روز بروز ابتری پیدا ہونا لازمی اور لا بدی ہے، چنانچہ اوائل ۱۹۱۹ء ہی میں کاشتکاروں سے غلہ کی بجائے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اور ۱۹۱۹ء میں لینن نے یہ اعلان کر دیا کہ ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے، اسے ملکتی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔ دواہ بعد کار خانے اور گرنیاں کرایہ پر دی جانے لگیں اور رفتہ رفتہ دکانیں بھی کھلنے لگیں۔ انفرادی اصول نے بالآخر اس قدر ترقی کی کچھ ہی عرصہ کے بعد ارضی باضابطہ

لئے عہد نامہ جن اقوام میں محنت کے متعلق دفعہ ۲۳ ملاحظہ کی جائے۔

۱۹۱۹ء دستور جرمنی ۱۹۱۹ء باب ۱۵۷۔

۱۹۲۱ء دیگر سالانہ رجسٹر ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۰ء: *Annual Register*

۱۹۲۰ & ۱۹۲۱ ان دونوں دساتیر کا اب خاتمہ ہو چکا ہے، جرمانی دستور کا ہیکل کے برسر اقتدار ہولے سے اور سپانوی دستور کا وہاں کی خانہ جنگی سے۔

بارہ سال کے لئے پتے پر دی جانے لگی اور بعض سونے کی کانیں بھی قدیم کمپنیوں کو پتے پر دی گئیں۔ اس ارتقا کا آخری اور سب سے بڑا مظاہرہ ۱۸۷۱ء میں ہوا جب روس کے آمر اور ولوں کے اشتعالی فریق کے متہم اور موجودہ روس کے راج روپ شائین نے نئے دستور کو ملک کے سامنے پیش کیا۔ اس دستور کی روس سے نہ صرف ملکیت ہی الماک کی ملک قرار دی گئی بلکہ امداد باہمی کی انجمنوں کو بھی ”اجتماعی کھیتوں“ کا نامک گردانا گیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے روس عمومی اصول کے بہت قریب آگیا اور اگر اب بھی اس کی بنیاد اشتمالیت پر ہے، لیکن اس میں فرد کو وہ اہمیت دی گئی ہے جو اسے پچھلے میں سال میں کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ چنانچہ اعلان حقوق انسانی کے ساتھ یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہر شہری معاشری، معاشی، تمدنی اعتبار سے بالکل مساوی ہے، اور جہاں پہلے صرف ”انہی قوت بازو سے کمانے والوں“ کو حقوق شہریت حاصل تھے، اب یہ حقوق ہر اٹھارہ سال کے شہری کو حاصل ہیں۔ نیز کم سے کم کاغذ پر آزادی ضمیر، آزادی مذہب، آزادی ارتباط وغیرہ جیسے عمومی تخیلات کو اشتمالی روس میں رائج کیا گیا ہے۔

الغرض اگر یہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی ملک میں صرف وہی حکومت کامیاب ہو سکتی ہے جو اس کے حسب حال ہو، اور بعض عقیدہ پرستی اور سیاسیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ آئندہ باب میں انفرادی حکومتوں کے عمومی اثرات و اختیارات پر تبصرہ کیا جائے گا۔

(بقیہ نوٹ ملے گا) مارچ ۱۹۳۹ء جب پوپ پیئرس کا انتقال ہوا تو موسکو کے
 رہن کینھولک گرجا میں بھی اس کے جنازے کی غائبانہ نماز ہوئی تھی۔

منصور پھانہ راجہ بہنم سے پیار نہ رونا پیار میں دوں

Duty of Govt

باب ۱۰ حکومت کے فرایض

فوج کا دفاع، ملک کی شیرازہ بندی، فوج، مالک غیر، مجال، تنظیم۔ لازمی فرایض
نیم اشتراکی فرایض، اشتراکیت فرایض۔ اشتہالی روس پر انفرادی اثرات
اب سے پچھلے باب میں یہ دکھایا جا چکا ہے کہ علیٰ انتظام ملک میں مذکور
انفرادی نظریہ سے ہی کام نکل سکتا ہے نہ مکمل اشتراکی نظریہ سے، بلکہ جب کسی
ملک میں کوئی فریقی برسرِ اقتدار ہو تا ہے تو سب سے پہلے اسے غایت اور انتہا
پسندی کو خیر باد کہہ دینا پڑتا ہے اور ملک کے حسبِ حال حکومت کرنی پڑتی ہے۔
اسی باب میں یہ بھی سرسری طور پر دکھایا گیا تھا کہ آج کل ان ملکوں میں جہاں انفرادی
اصول پر حکومت ہوتی ہے، ایسے اشتراکی انتظامات جیسے ریل، تار، ڈاک اور
سریستی مصنوعات ملکی نظر آتے ہیں، اور اس کے برعکس روس جیسے ملک میں جہاں
اشتراکیت کا دور دورہ ہے، اب حکومت اپنے اصل اصول سے ہٹ کر فانی
تجارت اور بیع و ستر کی اجازت دے رہی ہے۔ موجودہ باب میں اس موضوع
پر ذرا غائر نظر ڈالی جائے گی اور بالخصوص انفرادی ملک میں حکومت کو معمولی فرایض
و اختیارات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

فرد کا مفاد۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو انفرادی حکومت میں اس کا سبب سے اہم، بلکہ بعض کے نزدیک تو شاید واحد کام یہی ہے کہ وہ جہاں تک اس کے افراد ملک کے سود و بہبود کی کوشش کرے۔ بلاشبہ یہ مقصد یعنی بہبود کی کوشش نہایت ہی اہم ہے، اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ملک والوں کے فائدہ کا تین کون کرے گا۔ اس سئلہ پر آئندہ بحث کی جائے گی، یہاں صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ حکومت خواہ کسی اصول پر کار بند کیوں نہ ہو اس کا ظاہری مقصد ملک والوں کی بہتری کی تلاش ہے اور یہ فرق جو انفرادیت، فترائیت، اشتراکیت، نزاج اور اتحادیت کے مابین نظر آتا ہے، مقصد آخری کا ایسا فرق نہیں جتنا طرز کار کا فرق ہے۔ ایک فریق کہتا ہے کہ ملک کا مفاد ای میں مضمر ہے کہ افراد کے خاگی معاملات میں حکومت کی دہترس ہو تو دوسرا یہ کہتا ہے کہ ملک والوں کے لئے بہترین طرز کار یہی ہے کہ حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کر دیا جائے، بلکہ شاید سب یہی ہو کہ سرے سے حکومت ہی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

مملکت کی تعمیر از سر نو۔ حکومت کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ جتنی الامکان مملکت کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔ اس کے لئے دو مختلف النوع فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، ایک تو اندرونی امن و امان اور تہذیب، دوسرے بیرونی دشمنوں سے ملک کو محفوظ رکھنا۔ گران دونوں مقاصد کے لئے تقریباً ایک ہی قسم کا طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دونوں فرائض دراصل مختلف قسم کے ہیں، اور عورت کیا جسے تو اندرونی حفاظت کا کام بیرونی حفاظت سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی حملوں سے بچاؤ کا انتظام ایک شخص یا مکانی کام ہے،

یعنی اگر حکومت کو فوج کی ایک تعداد یکجا کرنے پر دسترس ہو اور اس کے پاس کافی سامان جنگ بھی موجود ہو تو وہ ایک بڑی حد تک بیرونی خطرات سے محفوظ رہے گی؛ لیکن مملکت کو اندرونی بغاوتوں کا شکار نہ ہونے دینا اور خود اپنی بقا کی تدابیر کرنا یہ اس لئے مشکل ہے کہ حکومت مملکت کی خادم ملے، اور مملکت جملہ باشندگان ملک کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے جس میں بے چین اور شوش پسند عناصر بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فی نفسہ امن و امان اور ترتیب تنظیم کوئی آخری مقصد نہیں بلکہ دراصل کسی آخری مقصد کے حصول کی تدابیر ہیں، اور وہ مقصد مملکت کے وقتی سطح نظر کا حصول ہے۔ جس طرح کسی چڑیا خانے میں ایک قسم کی تنظیم، جیل خانے میں دوسری قسم کی تنظیم، در سے ہیں تیسری طرح کی تنظیم، اور گھر گھر کے میں چوتھی طرح کی تنظیم ہوتی ہے، اسی طرح اگر ملک کسی غیر قوم کا دست نگر ہو تو ایک طرح کی تدابیر امن، اور اگر آزاد ہو تو دوسری طرح کی تدابیر امن کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ تنظیم کے معنی مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ دست نگر ملک میں تنظیم اور امن و امان سے مراد وہ کیفیت ہوتی ہے جس کے تحت ملک پر آسانی سے حکومت کی جاسکے، ورنہ حالیکہ کسی آزاد ملک میں اس سے مراد وہ صورت حال ہے جس میں باہرین وجوہ مفاد عامہ کے حصول کی کوشش ممکن ہو

سطح باب ۲، حسب بالا

۵۔ میک آئیور، "ملکت حالیہ" Mao Tse-tung: The Modern State.

حصہ ۲، باب ۵، جلد ۳۔

الغرض حکومت اپنی حفاظت کی جو تدابیر عمل میں لاتی ہے اور اس کے لئے افراد کو اپنے احکام ماننے پر مجبور کرتی ہے، وہ اسی وقت حق بجانب سمجھی جاسکتی ہیں جب ان سے ان کے مخصوص منافع نظر کے حصول میں سہولت پیدا ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حکومت خواہی نہ خواہی افراد کے ہر نوع کے خیالات و اقوال کو منظم کرنے کی کوشش کرتی ہے، بلکہ اس کے برعکس افراد کی بہت سی حیثیتیں ہیں جنہیں انفرادی حکومت علی العموم چھوٹی بھی نہیں، مثلاً رسم و رواج، اخلاق و عادات گوارے ان میں بھی مداخلت کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ عام طور پر اس کا کام یہ ہے کہ ہر فرد کو دوسرے افراد اور جموعوں کی بے جا دست بردار سے محفوظ رکھے، اس کے ذاتی امور میں بے جا دست اندازی سے باز رہے اور مملکت کو دوسرے سے آزاد رکھے۔ یہ وہ فرائض ہیں کہ اگر حکومت ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو اسے قائم رہنے کا کوئی حق نہیں رہے گا۔ مملکت کی کم از کم مداخلت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مختلف افراد کے باہمی تعلقات کا تعین معمولی دیوانی و نوچداری قوانین کے ذریعے سے، حکومت اور افراد کے باہمی تعلقات کا تعین دستوری و نوچداری قوانین کی مدد سے اور مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کا تعین قانون بین الاقوام کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ لیکن حکومت ان ہی امور میں مداخلت کرنے پر قائل نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ اپنا دائرہ عمل وسیع کرتی رہتی ہے حکومت کو ایک طرف مملکت سے گہرا تعلق ہے، اور دوسری جانب وہ مہینت حاکم کی ساختہ پروا ختم ہے

اور اپنے جملہ فرائض کی انجام دہی میں اس سے مدد ملتی رہتی ہے، چنانچہ ملک کے تمام وسائل و پیداوار عملاً اسی کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ اگر حکومت چاہے تو بہت سے ایسے کام کر سکتی ہے جن سے ملک والوں کی حالت بہتر ہو جائے اور انھیں اپنے ذاتی کاروبار میں مدد مل سکے۔ افراد کی بہ نسبت اس کے پاس روپیہ بڑھ جائے یا وہ ہوتا ہے، اس لئے وہ صنعت و حرفت، زراعت، تحقیقات و شخص میں طرح طرح کے تجربے کر کے ان کی مدد سے پیداوار دولت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتی ہے، نیز چونکہ وہی سکھ سازی کا انتظام کرتی ہے اور محاصل درآمد و برآمد و جنگی کا محصول وصول کرتی ہے اس لئے اگر چاہے تو ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کر سکتی ہے۔

فورج۔ بہرےج ملک کی حفاظت و انتظام کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری اور لازمی ہیں، ایک فورج، دوسرے روپیہ۔ علاوہ بعض مستثنیات کے آج کل کے زمانے میں تمام ممالک کی فوجیں خود اس ملک کے باشندوں پر مشتمل ہوتی ہیں، اردو ممالک خواہ سیاسی یعنی میں کھننے ہی آپس کی دوستی

بلکہ بعض ممالک (مثلاً فرانس) میں ایک "پریسی رسالہ" ہوتا ہے جس میں وہ پریسی بھرتی کئے جاتے ہیں جنہیں اس ملک کے جارجانہ طرز عمل سے ہمدردی ہو۔ فرانس کا ایسا رسالہ جنگ، ریف میں فرانس کے ووٹرز لڑا رہا نوئی غاجگی میں جبرل فرانس کی فوج کے ساتھ بہت سے اطالوی اور جرمن لڑ رہے ہیں۔ گوا اس میں جو مکلفہ پر لطف ہے وہ یہ ہے کہ خود اعلیٰ اور جرمن مجلس عدم مداخلت کے رکن رہتے ہیں۔

ہو خواہی کا دم کیوں نہ بھرتے ہوں کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ علاوہ پر دسی رسالوں کے ایک دوسرے کے شہریوں کو اپنی اپنی فوجوں میں شریک ہونے دیں۔ سو برس پہلے یہ معمولی بات تھی کہ کسی ملک کے شہری دوسرے ملک میں جائیں اور انہیں بغیر کرا کر فوج میں بھرتی ہو جائیں، لیکن آج کل کی عام بین الاقوامی موٹائی سیاسی کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب کوئی آزاد ملک کسی دوسرے ملک دے کے کو اپنے معمولی رسالوں میں بھرتی نہیں ہونے دیتا۔ بعض ممالک میں تو فوجی خدمت پر بعض شہریوں کے علاوہ دوسری شرائط بھی لگائی جاتی ہیں، مثلاً ۱۹۳۷ء سے پہلے روس میں کوئی شخص جب تک اپنے ذاتی کسب سے براہ راست دولت میں اضافہ نہ کرتا ہو اس وقت تک اسے ملک کی حفاظت میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہ تھی، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اکثر ممالک حاضرہ میں صرف ممالک داروں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۷ء سے پہلے روس میں صرف وہی باشندے قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے جو مملکت کے بنیادی اصول پر عمل کرتے ہوں اور اپنی جو خود اپنے اقدار چلا کر اپنا پیٹ یا لٹے اور ملک کی دولت میں اضافہ نہ کرتے ہوں۔ یہی کیفیت عروج دولت اسلام کے زمانے میں شرع و وجہ کی تھی جس کے مطابق فوجی خدمت کے لئے صرف مسلمانوں ہی کو مجبور کیا جاتا تھا اور ”اہل ذمہ“ (یعنی غیر مسلموں) کی حفاظت اور فوجی خدمت سے معافی کے معاوضے میں ان کو جریمہ لینے پر کفایت کی جاتی تھی۔ اکثر قدیم متمدن ممالک میں یہ قاعدہ رائج تھا کہ

شہ جزیرہ کے شفق بہت کچھ غلط تھی پھیلی ہوئی ہے۔ (اس کی مقدار کا تعین یا تو بقدریٹ حسیہ)

خطے کے وقت حکومت جس کسی شہری کو چاہتی ملک کی حفاظت کے لئے طلب کر لیتی، اور چونکہ فوجی قواعد تنظیم و تربیت کا آج کل کی طرح رواج نہ تھا اس لئے حکومت کو اس میں بہت آسانی ہوتی تھی۔ آج کل کی مرتب و منظم افواج کے دور میں بہت سے ممالک ایسے ملیں گے جن میں جبری فوجی خدمت کا طریقہ جاری ہے، مثلاً فرانس میں ہر ۲۱ سالہ شہری کو ایک یا سوا سال کے لئے فوجی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، اور حکومت جب چاہے ۵۲ سال تک کے شہریوں کو باضابطہ فوجی خدمت کے لئے طلب کر سکتی ہے؛ اسی طرح جاپان میں ہر شہری کو جس کی عمر ۱۷ سال سے تو متجاوز ہو لیکن ۴۰ سال سے بڑھ نہ گئی ہو، حکومت ملک کی حفاظت کرنے کے لئے قانوناً طلب کر سکتی ہے سلطنت برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ دو ایسی ملتیں ہیں کہ ان میں فوجی خدمت لازمی نہیں بلکہ اختیاری ہے، گو پچھلی جنگ عظیم میں برطانیہ کال میں بھی فوجی خدمت لازمی کر دی گئی تھی۔

دقیقہ نوٹ ص ۱۸۳ کا، عبد اللہ کے ذریعے سے ہونا تھا ورنہ خلیفہ وقت اس کا تعین کرتا تھا۔ بہر حال یہ محمول دراصل "اہل الذمہ" یعنی غیر مسلموں کے حقوق، جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے میں عاید کیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر فوجی خدمت لازمی تھی اور غیر مسلموں پر معاف تھی، چنانچہ اول الذکر پر ملک کی حفاظت کا پورا بار پڑتا تھا۔ جزیرہ سے عورتیں، بچے، اندھے، مریض اور تارکان دنیا بری تھے۔ دیکھو عبدالرحیم، "اصول قانون اسلامی" Mohammodan : Abdul Rahim

ممالک غیر بیحدت ہیں براہ راست غیر ممالک سے تعلقات کی طرف لے جاتا ہے۔ یوں تو تاریخ عالم کا کوئی عہد ایسا نہیں گذرا جب کہ ملک ہر دوسرے ملک سے غیر متعلق رہا ہو، لیکن آج کل کے زمانے میں جب حکمیاتی انکشافات کی وجہ سے دنیا اس درجہ سکڑ گئی ہے کہ سالوں کا سفر دنوں اور دنوں کا منٹوں میں لے جاتا ہے، یہ تعلقات بالکل ناگزیر ہو گئے ہیں۔ مختلف ممالک ایک دوسرے کے ساتھ ایک تو کچھ اور کچھ عہد ناموں وغیرہ کے ذریعے سے براہ راست قائم کرتے ہیں، درہمین الاقوامی سیاسی ادارات، مثلاً انجمن اقوام، اتحاد ڈاک، ہلال و صلیب احمر، وغیرہ کے ذریعے سے۔ نیز اب یہ اصول مسلط تصور کرنا چاہئے کہ ہر ملک میں ان ممالک کے سفر اور قنصل وغیرہ رہتے ہیں جن سے اس ملک کے تعلقات ہیں یا جن کے شہری اس ملک میں آباد ہیں، تاکہ اپنے ملک اور ہم ملکوں کے رفاہ کی نگہداشت کریں اور تجارتی رسل و رسائل میں مدد کریں۔ ساتھ ہی بڑی بڑی مملکتوں کے فوجی، بحری اور فضائی قائم مقام بھی بعض مرتبہ دوسرے ملکوں میں منتقل طور پر رکھے جاتے ہیں تاکہ ان ممالک کی فوجی تیاریوں اور تنظیم پر نظر رکھیں اور اپنے ملک کی حکومت کو اس سے باخبر رکھتے رہیں۔

محاصل۔ ملک کا انتظام چلانے کے لئے ضروری چیز روپیہ ہوتا ہے، چنانچہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ کاروبار کی انجام دہی کے لئے باضندگان ملک پر محاصل عائد کرے۔ ان محاصل کی نوعیت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ ہندوستان قدیم میں ہندوؤں کے عروج کے زمانے میں سرکاری آمدنی کے ذرائع محاصل در آمد و برآمد کے علاوہ زرد حواہر، جنگلات، پیداوار باغات، پیداوار خورد و نوش

اور سرکاری اراضیات پر مشتمل تھے۔ شیعہ اسلام کے بعد عہد خلافت میں مسلمانوں سے عشر، زکوٰۃ و خمس، اور مسکینوں سے جزیہ لیا جانے لگا۔ ازمنہ و سطلی کے یورپ میں دوسرے امور کی طرح محاصل ہیں اس قدر ترتیب و تنظیم نہ تھی جتنی آج کل پائی جاتی ہے، اور اکثر شاہان مغرب اجاروں اور عہدوں کی خرید و فروخت پیش کش اور جبری قرضوں کے ذریعے سے (جنہیں واپس دینے کا خیال بھی نہ ہوتا تھا) روپیہ کی کمی کو پورا کرتے تھے۔ زمانہ حال کے متہدین ممالک کی آمدنی کا دار و مدار عام طور پر علاوہ محاصل درآمد و برآمد محصول جنگی کے کوئی محصول اور محاصل آمدنی، زمینداری و مکانات پر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اکثر مملکتوں میں بعض ایسے کاروبار انجام دئے جاتے ہیں جن سے حکومت کو خاصہ منافع ہو جاتا ہے، مثلاً ڈاک، ہار، ٹیلیفون، کاغذ، نمک، وغیرہ اور آج کل پیٹنٹ کے جو قوانین رائج ہیں

۱۰ دیکھو ارتھ شناسٹر، ترجمہ انگریزی ڈاکٹر شام شناسٹری، حصہ ۲، باب ۶۔
 ۱۱ اسلامی محاصل کے لئے دیکھو عبدالرحیم، حسیب بالا، باب ۱۱ عشر اس ارضی کی آمدنی کا رسواں حصہ ہوتا تھا جو مسلمانوں کی ملک ہو، اور خمس اس ارضی کی آمدنی کا پانچواں حصہ جو غیر مسلمانوں سے مسلمانوں کے قبضے میں آگئی ہو۔ جزیہ کے لئے دیکھو عاشیہ نمبر ۶ بالا۔ خراج ان ممالک سے وصول کیا جاتا تھا جو غیر مسلمانوں کے قبضے میں چھوڑ دئے گئے ہوں۔
 ۱۲ پیش کش "اور جبری قرضوں" کے لئے دیکھو گرین "تاریخ اہل انگلستان" ترجمہ فارسی محمد حسین (مطبوعات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) یا کوئی دوسری تاریخ دستور انگلستان۔
 ۱۳ کاغذ نمک سے دراصل منافع نہیں ہوتا بلکہ وہ عدلی انتظام کے قیام کی غرض سے لیا جاتا ہے۔

انہیں دراصل قدیم اجارہ فروشی کے باقیات تصور کرنا چاہئے۔ بعض ممالک میں حکومت ہی کو چند مخصوص اشیاء کے تیار اور فروخت کرنے کا واحد اجارہ ہوتا ہے جیسے فرانس میں سگریٹ اور دیسلائی، اور ہندوستان میں افین۔ اسی طرح ان ممالک میں جہاں وفاقی حکومت رائج ہے، عام طور پر بعض محال مرکزی ادارات کے سپرد کر کے جاتے ہیں اور بعض ریاستی ادارات کو تفویض کر دئے جاتے ہیں، مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں محال درآمد و برآمد، محصول آمدنی و دیگر جنس محال کے عائد کر کے گا اختیار مرکزی ادارات کو محال ہے اور محال املاک اور بعض دیگر براہ راست محال کو ریاستوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ برطانوی ہند میں مرکزی اور صوبہ داری مالیات کا درمیان در دونوں ادارات کے باہمی تقسیم کے اوپر ہے، چنانچہ مرکزی ادارات درآمد و برآمد آمدنی، ریل، مار، ڈاک، چمک، ہنڈی، نمک وغیرہ پر محال عائد کرنے کے مجاز ہیں، اور صوبہ جانتا ماگڈاری، مکانات، زراعت، جنگلات کا غنہ مہرہ اور جرہی کی مدت سے روپیہ وصول کر سکتے ہیں، محصول چکی مرکزی اور صوبہ داری ادارات کے باہم اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ علاوہ شراب، الکھلی اور یہ اور افینوں جیسی استنبہ کے باقی تمام استنبہ پر محصول چکی وصول کرنے کا اختیار مرکز کے متعلق رکھا گیا ہے، اور ان مشینوں انبیا کو صوبوں کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

تنظیم۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ملک ایک ایسا فطری ارادہ ہے جو ہماری زندگی کا جزو لا ینفک ہے، اور اس کی ضرورت سب سے زیادہ اس لئے پیش

آتی ہے کہ مختلف افراد کے مابین اور نیز ان کی اجتماعی اور انفرادی خواہشات کے درمیان تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اور اس سے معاشرہ انسانی کو ضرر پہنچے گا اندیشہ ہوتا ہے۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ افراد اور جمہوروں کو مرتب و منظم کرے ایسے قوانین بنائے جن سے اس تصادم کا کم سے کم اندیشہ باقی رہ جائے، نیز اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دے۔ اس ترتیب تنظیم کے لئے سب سے پہلے تو ملک کے حدود و اربعہ کا تعین اور ملک کو مختلف انتظامی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا کام ہوتا ہے۔ جس کے بغیر کسی حکومتی ادارے کے لئے اپنے دائرہ اقتدار کا تعین ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ ہر انسان کے جان و مال کو دوسروں کی دست برد سے بچانے کے لئے قواعد بنائے جائیں اور ایسی سزائیں تجویز کی جائیں جو دوسروں کے لئے باعث عبرت، اور ساتھ ہی (بشرط امکان) خود مجرم کے لئے باعث تنبیہ ہوں۔ ایسے محکمہ جات کا قیام بھی لازمی ہے جو ان قواعد یا قوانین کی خلاف ورزی یا افراد کے باہمی تصادم کی صورت میں حکم یا سزا کا کام کرے اور ان قواعد کے مطابق تجویز کرے اس کا نفاذ کرے۔

لازمی فرائض امیر مصلحہ بالا سے معلوم ہوا کہ حکومت کے فرائض سہ گانہ ہیں یعنی ملک کو بہرونی حملوں اور اندرونی بے چینی سے محفوظ رکھنا، دوسرے افراد کی بیش از بیش آزادی کے حصول و قیام کی غرض سے خاندانی تعلقات، جان و مال، تجارت، حرمت کے لئے قوانین بنا کر انھیں نافذ کرنا اور تیسرے ایسی عدالتیں

قائم کرنا جو قوانین کے مطابق ان افراد سے باز پرس کر کے ان لوگوں کو پاداش کو پہنچائے جنہوں نے قوانین مرد جبکی خلاف ورزی کی ہو۔
 یہ تو وہ فرائض ہوئے جن کے بغیر حکومت ملک کا انتظام چلا ہی نہیں سکتی۔
 لیکن جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ آج کل کے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ حکومت کی مداخلت کا دائرہ اقتدار روز بروز وسیع ہوتا رہے، چنانچہ ان ممالک میں بھی جہاں انفرادی طرز پر انتظام کیا جاتا ہے، بہت سے ایسے امور حکومت کے دائرے میں آگئے ہیں جو نصف صدی قبل اس سے باہر سمجھے جاتے تھے۔ انہیں آسانی و سہولت کی خاطر اختیاری فرائض کہنا مناسب ہو گا تاکہ ان کا امتیاز لازمی فرائض حکومت سے کیا جاسکے۔ (اختیاری فرائض دو قسم کے سمجھنے چاہئیں، ایک میں تو وہ امور شامل ہیں جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بروئے کار آتے ہی نہیں اور دوسرے وہ جو حکومت کی مداخلت کے بغیر بھی انجام پا سکتے تھے لیکن جن کا تعلق ایسی حالت میں افراد سے ہوتا۔ ثانی الذکر امور میں مداخلت گویا اشتراکیت نہا ہوگی، اور اول الذکر امور کی نگہ رانی نیم اشتراکی۔

نیم اشتراکی فرائض۔ سب سے پہلے نیم اشتراکی فرائض کو لیتے، جو حکومت کی مداخلت کے بغیر غالباً پورے نہ ہو سکتے یا کم از کم زیادہ وسیع پیمانے پر انتخاب کو نہ پہنچتے۔ آج کل کے زمانے میں حکومت نے اپنا فرض اس کو سمجھ لیا ہے کہ جہاں تک ہو سکے باشندگان ملک کو بہتر بنانے اور ان کی معاشی حالت کو درست کرنے کی

کوشش کرے، چنانچہ اب شاید مشکل سے کوئی ایسا عقیدہ پرست انفرادی شکل
 گا جو ہر برٹ پیس کی طرح کا پتہ تقاسمے اصل کے مسئلہ پر اعتقاد رکھتا ہو۔ آج کل کی
 انفرادی حکومتیں بھی اس کی کوشاں رہتی ہیں کہ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے بہترین
 وسائل ہم پہنچائیں، کاشتکاروں کی مدد کریں ان کی تندرستی کی نگہداشت رکھیں
 گاؤں گاؤں حفظان کا انتظام کریں، جگہ جگہ شفا خانے کھولیں، تحقیقات و حکمرانی
 بحسب کی خاطر مناسب مقامات پر عجائب اور نوادہ خانے کھولیں، علوم و فنون
 کے ارتقا میں مدد دیں اور کوشش کریں کہ ملک کی صنعتی حرفتی و زرعی وسائل میں
 اضافہ ہو۔ نیز متمدن اور ترقی یافتہ حکومتیں اعداد و شمار کا محکمہ بھی قائم کرتی ہیں تاکہ
 مختلف شعبوں اور محکموں کو ملک کی موجودہ حالت کا اندازہ ہو سکے اور اعداد و شمار
 کو پیش نظر رکھ کر وہ اس حالت کی اصلاح کی کوشش کر سکیں۔

یہ تو وہ فرائض ہوئے جو زمانہ حال کی متمدن انفرادی حکومتوں نے
 اپنے سر لئے ہیں، اور اگر ان کی انجام دی ہیں وہ کوشاں نہ ہوں تو یہ امور شاید
 سرے سے انجام ہی نہ پائیں، اس لئے کہ افراد کے مسائل اس قدر بڑھے
 ہوئے نہیں ہیں اور نہ ان کا حلقہ اثر اس قدر وسیع ہے کہ وہ ان سب باتوں کو
 فرداً فرداً یا ہم شفق ہو کر بھی بڑے پیمانہ پر پورا کر سکیں۔ بلاشبہ امریکہ اور مغربی
 یورپ میں پچھلے چند سالوں میں بعض نہایت عظیم الشان کمپنیاں اور کاروباری
 حلقے قائم ہوئے ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں اور اربوں روپیہ کا ہے، تاہم ان میں
 سے ہر ایک مخصوص تجارت سے متعلق ہے، اور اس کا نصب العین ملکیت کا
 مفاد نہیں بلکہ حصہ داروں کا فائدہ اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہے، چنانچہ یہ بھی

اس کی کو پورا نہیں کر سکتے جو حکومت کے ان نیم اشتراکی فرامین سے دست بردار ہونے پر بیدار ہوگی۔

اشتراکیت کا فرامین (اس کے علاوہ حکومت نے اپنے سیرد ایسے کام بھی کر رکھے ہیں جو بالکل اشتراکی ہیں یعنی جو مجرد انفرادی اصول کے مطابق حکومت کی دسترس میں نہیں رہتے جیسے۔ اس زمے میں سب پہلے زرائع حاصل و نقل آتے ہیں جیسے ریلوں کی تعمیر، سڑکوں کی درستی، ڈاک اور تار کا انتظام، ٹیلیفون کی بنگرانی وغیرہ۔ آج کل کے زمانے میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ان کا آمد اور ضروری وسائل ترقی کو حکومت اپنے حال پر چھوڑ دے، چنانچہ اکثر ممالک میں تو یہ سب حکومت کے اقتدار میں آگئے ہیں، اور بعض میں حکومت نے ان پر اپنی بنگرانی ہی رکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً ریلوں کو لیجے۔ پورب اور ہندوستان میں عام رجحان یہ ہے کہ ریل میں حکومت ہی کی املاک ہیں، چنانچہ پچھلے پانچ سال میں ہندوستان کی ٹین ٹری جڑی ریلیں، یعنی ایسٹ انڈین، گریٹ انڈین پینن سولہ، اور ادوہ ورو بیکھنڈ، اپنی اپنی کمپنیوں سے مل کر حکومت کے قبضے میں آگئی ہیں اور حیدرآباد و میسور کی اکثر ریلیں انھیں ریاستوں کی ملک ہو گئی ہیں انگلستان میں اس کے برعکس ریل کی مختلف شرکتوں کو مدغم کر کے بڑی بڑی شرکتیں

ملک نماہ حال میں یورپ اور امریکہ کے تجارتی ارتقا کی تاریخ و اصل کار و باری جھول کی تاریخ ہے اس کے لئے دیکھو "جورج ونگٹس" کار و باری جھول کا مسئلہ "J. W. Gents: The Trust Problem" باب ۱۲ ضمیمہ د۔

بنائی جا رہی ہیں اور حکومت ان پر براہ راست نگرانی رکھتی ہے، جتنی میں ریلیں حکومت ہی کے قبضے میں ہیں۔ ریلیوں کے علاوہ ملک کے قدرتی وسائل میں ترقی کے سامان بہم پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے، چنانچہ اگر ملک میں کوئی خاص صنعت یا کسی حصہ ملک میں زراعت میں کمی یا سقم ہو تو حکومت خزانہ سرکاری سے روپیہ خرچ کرتی ہے، کاشتکاروں کو تقاضی دیتی ہے، آبپاشی کے سامان فراہم کرتی ہے اور جگہ جگہ نمونے کے کھیت اور کارخانے قائم کر کے لوگوں کو بہترین ذرائع استعمال کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

سب سے آخر میں وہ فرائض ہیں جو بالخصوص مزدوروں اور غریبوں کے مفاد کی غرض سے حکومت پر عائد کئے جاتے ہیں اور یہ وہ ہیں جن پر انتہا اہمیت کا پرتو خاص طور پر نمایاں ہے۔ بچے، افراد ہی بھی اس واقعہ کا انکار نہیں کر سکتے کہ مزدوروں اور محنتیوں کی حالت عام طور پر نہایت زبوں ہے، اور وہ جو ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ملک کی عام ہرزہ اٹھاتی ہیں اضافہ کرتے ہیں، انھیں اس کا صحیح معاوضہ آرام و آسائش کی شکل میں نہیں ملتا۔ اسی وجہ سے فلاحیت زدہ طبقے کی حالت سدھارنا اور مزدوروں کی آسائش کا انتظام، دونوں باتیں ترقی یافتہ حکومتوں نے اپنے ذمہ کر لی ہیں، اور جبری بیمہ، وظائفِ معمرین، ارزاں آرام دہ مکانات کی تعمیر، قوانین کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طریقوں سے غریب اور

سلاہ اس قسم کے مکانات منجملہ دوسرے ہندوستانی شہروں کے بھی اور فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں بنوائے گئے ہیں۔

نیچے درجہ کے طبقے کا معیار زندگی بڑھایا جاتا ہے۔ جبری بیمہ کا قاعدہ ۱۹۳۵ء میں جرمنی میں شروع اور اس کا اتباع ۱۹۳۵ء میں انگلستان میں کیا گیا۔ وظیفہ معمرین کا قاعدہ آسٹریلیا میں مدت سے جاری ہے اور اس کے مطابق ہر دستہ گنار شہری کو جس کی عمر کم سے کم ۶۵ برس کی ہو اور جو کم از کم ۲۰ سال سے آسٹریلیا میں رہتا ہو، اس شرط پر وظیفہ دیا جاتا ہے کہ درخواست گزار کی کل آمدنی کی مقدار تقریباً گیارہ سو روپیہ سالانہ سے متجاوز نہ ہو جائے۔ آج کل کی انفرادی حکمتوں کو مزدوروں کے آرام و تندرستی اور معیار زندگی کا اس قدر خیال ہے کہ بعض انفرادی مالک مثلاً (انگلستان و جرمنی) میں اس کے لئے ایک وزیر مختص کر دیا گیا ہے، اور ایک بین الاقوامی اجتماع ہر سال منعقد ہوتا ہے جس میں مختلف ملکوں کے مزدوروں کے آرام و سائش کی تدابیر کی سفارش کی جاتی ہے۔ اور حکومتیں حتی الامکان ان پر کار بند ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ نیز آج کل کے اکثر متمدن ملک میں کارخانوں اور گریوں کے مزدوروں کے لئے روزانہ اور ہفتہ وار نشستوں کی تعداد مقرر کر دی جاتی ہے تاکہ اپنے کام سے زیادہ بار نہ پڑے اور ان کی زندگی دندرتی ہو قرار نہ ملے۔

۱۹۳۵ء Stateman's Year Book سالنامہ برین
جہاں پچھلے بیس سال کے اجتماعوں کی قراردادیں دی ہوئی ہیں۔ اس اجتماع کے لئے دیکھو کتاب
حصہ دوم، آخری باب۔

۱۹۳۵ء کارخانوں کے متعلق ہندوستان میں جو قواعد رائج ہیں وہ قانون (ابقہ نوٹ ۱۹۳۵ء)

اشتمالی روس پر انفرادی اثرات۔ اوپر کے پاروں میں ان اشترکیت
نما امور کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انجہام
دیتی ہیں۔ یہ مسئلہ ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ محض مفاسد کے خاطر ان
اثرات کو بھی ذرا وضاحت سے دوبارہ بیان کر دیا جائے جو دنیا کی واحد اشتمالی ملک
یعنی روس پر انفرادیت کے پڑے ہیں، گو اس سے پہلے مختصر طور پر اس کا ذکر آچکا ہے۔
ہیں اس موقع پر وہ سیاسی واقعات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جو ۱۹۱۷ء کے
روسی انقلاب سے پہلے اور اس کے بعد پیش آئے، چنانچہ اس وقت یہ بیان کر دینا
بالکل کافی ہو گا کہ مارچ ۱۹۱۷ء سے آٹھ ماہ بعد تک روس میں مختلف سیاسی فریق

دقیقہ نوٹ ملے گا، کارخانہ جات نمبر ۱۲ اسلام آباد پرنٹری میں۔ انگلستان کے قانون کارخانہ جات کے کو
دیکھو لازمی قوانین انگلستان "Halsbury: Laws of England"

جلد ۱۴، حصہ ۵، کارخانہ جات Factories دفعات ۳۳ و ۳۴۔

شلے ل، س، لاین S. Lyon کی کتاب موسومہ "پینے کا انتخاب" Making

a living کے صفحات ۴۲۵ و ۵۲۴ پر دو نہایت نفیس جدول دئے گئے ہیں جن میں

سے اول الذکر میں مالک متحدہ آفریقہ کی مرکزی حکومت کے کاروبار کو اور دوسرے میں دہلی کی

ایک ریاست یعنی مائے سوات کی حکومت کی سامعی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان جدولوں

کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں کس حد تک آزادی کی بہبود کے

واسطے کوشاں ہیں۔

شلے باب ۹، حسب بالا۔

پیدا میں قلت اور اس کی گرانی کی وجہ سے اس کے اور مصنوعات دستکاری و بیگانہ کی قیمتوں کے مابین ایک عظیم نشانِ تفاوت پیدا ہو گیا تھا، ساتھ ہی لینی کا فذی رول کی قیمت تقریباً صفر رہ جانے سے بھی ملک کے مصائب میں گونا گونا گوا اضافہ ہوا۔ بہر حال ان سب باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ طبقہ جو جدید حکومت کا گوا پشت بنا ہوا تھا (یعنی مزدور و کاشتکار) حکومت کے مخالفین میں شامل ہو گیا اور حکومت کو جبر و قہراً اپنا طرز عمل بدل دینا پڑا۔ آخر کار ۱۹۲۱ء کے ابتدائی میں لینن کے مابین ایسا سے "جدید معاشی طرز عمل" کی بنیاد پڑ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ طرز عمل کی اس تبدیلی کے آثار پہلے ہی نظر آ رہے تھے، اور خود لینن ملک کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ دسویں اشتراکی کانگریس میں لینن نے ایک زوردار تقریر میں یہ تحریک کی کہ بجائے غلہ کے حکومتی کھیتوں میں جمع ہونے کے کاشتکاروں کو اس کی قیمت (یعنی دوسرے الفاظ میں ایک مقررہ لگان) ادا کرنا سب ہوگا، اور انہی مقبوضہ پیداوار کے مبادلہ و انتقال ملکیت کا اختیار خود کاشتکار کو ہونا چاہیئے، چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۱ء کو یہ تحریک قانون کی شکل میں منظور ہو گئی اور کاشتکاروں کو غلہ منتقل کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ یہی وہ قانون تھا جسے "جدید معاشی طرز عمل" کی بنیاد کہنا چاہئے۔ بہار سے نزدیک لینن کا شاید سب سے اہم کارنامہ یہی تھا کہ اس نے بھانپ لیا کہ خالی اشتراکی طرز عمل کا رواج بالکل ناممکن ہے، چنانچہ اس نے جان بوجھ کر سرمایہ داری کی طرف قدم بڑھایا اور کہہ دیا کہ "ہم اصل داری کو روک نہیں سکتے لیکن اسے ملکنی اصل داری کے راستے پر لگا سکتے ہیں۔"

۵ جولائی ۱۹۲۱ء کو ایک قدم اور بڑھایا گیا، یعنی کارخانے اور گرنیاں مختلف شرکتوں اور افراد کو بیٹے پردے دی گئیں۔ اس کے بعد پہلے تو انجن مانے اعداد بھی کروپیہ کام میں لانے کی اجازت دی گئی اور رفتہ رفتہ روپیہ کی ترویج کے راستے سے جملہ رکاوٹیں اٹھا دی گئیں روپیہ کی ترویج کی وجہ سے تجارتی کاروبار کا از سر نو احیا ہو گیا، دکانیں کھل گئیں اور از سر نو خرید و فروخت کی کیفیت تین سال بعد نظر آنے لگی۔ ۹ جولائی کو ریلوں پر سفر کرنے کا کرایہ لیا جانے لگا۔ یکم اگست کو ڈاک اور تار کا محصول عائد ہو گیا، ۵ اکتوبر کو پانی، بجلی اور گیس خرچ کرنے کا معاوضہ لگایا جانے لگا اور ساتھ ہی کئی سال بعد ٹراموے کا کرایہ اور کپڑوں کی دھلائی لی جانے لگی۔ ستمبر اور اکتوبر میں آٹھویں گوداموں اور دوکانوں کے کرایہ کا طریقہ دوبارہ رائج کیا گیا اور رفتہ رفتہ ہر ایک چیز کی قیمت یا اجرت روس میں پہلے کی طرح ایک معمولی بات ہو گئی سرمایہ داری کی طرف یہ میلان برابر جاری رہتا ہے تا ۱۹۲۵ء میں دوازدہ سالہ بیٹے کے ذریعے سے اراضی منتقل کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور مردوروں کو چھوٹے چھوٹے کارخانوں کا انتظام کرنے دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی غیر ملک کے سرمایہ کاروں کی طرف منتقل کرنے کی طرز عمل کی ابتدا ہوتی ہے جس کا اولین مظاہرہ یہ ہے کہ اسی سال ”شرکت معدنیات زردریائے لینا“ کو از سر نو سونے کی کان کاٹھیکہ دے دیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۵ء میں اس اصول کے خلاف شاکین نے زراعت کو بھی اشتراک لانے کی کوشش کی اور صریحاً اعلان کر دیا کہ حکومت کسی طرح سے سرمایہ داری کو دیہات اور کھیتوں میں جڑ نہیں بکڑنے دیگی۔ ساتھ ہی اس نے ”پنچ سالہ تنظیم“ کی بنیاد ڈالی جس سے مراد یہ تھی کہ پانچ سال میں روس

پیمانہ کبیر پر پیداوار کا انتظام کرے لیکن "اجتماعی" کھیت قطعاً ناکام ثابت ہوئے۔
 اجتماعی کسانوں نے ان کی پیداوار راتوں رات لوٹنا شروع کر دی، اور بے دلی
 سے کام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کم از کم زرعی پیداوار میں مستندہ کمی پیدا ہو گئی۔ الغرض
 بہت جلد سٹمالین کے مخالف زور پکڑنے لگے، اور گو اس نے بہت سخت انتقام
 لیا لیکن انتہائی اشتمالیت کے خلاف جو آگ لگ گئی تھی وہ بجھ نہ سکی، اور پہلے
 تو ۱۹۳۲ء میں مساوی مزدوری کے اصول سے انحراف کیا گیا اور سرمایہ دار ممالک
 کے ساتھ عہد نامے کئے گئے، پھر پولشویت کے بین الاقوامی تخیل کو جرمنی کے
 خلاف جوش کی وجہ سے ٹھیس لگی اور اب حال میں ۱۹۳۶ء میں ایک عمومی پابندی
 کے قیام سے روس اور مغربی یورپ کے عمومی ممالک کے تخیل میں نسبتاً کم رفت
 رہ گیا ہے۔

الغرض جہاں زمانہ حال کی انفرادی حکومتیں انتہائی انفرادی اصول سے
 ہٹ کر بہت سے ایسے کام کرنے لگی ہیں جنہیں افزاجی آسانی سے انجام دے
 سکتے ہیں، وہاں روس جیسے اشتمالیت پسند مملکت کو جس میں جملہ مذکورہ آثار انفرادیت
 کو بالکل نامور کر کے اشتمالیوں نے گویا ایک جدید باب کی ابتدا کر دی تھی، اپنے
 مرغوب اور جہتے اصول سے بہت کچھ ہٹ جانا پڑا ہے۔ اگر غور کریں تو ہم اس
 نتیجے پر پہنچیں گے کہ انفرادیت، اشتراکیت اور اشتمالیت یہ سب مملکت کے
 حقیقی مقاصد کے حصول کے مختلف طریقے ہیں۔ ان طریقوں کا تعین مختلف ممالک

کی تاریخ ان کی جزائی کیفیات اور وہاں کے باشندوں کی عادات و اطوار پر منحصر ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک کوئی ایسا سیاسی طرز عمل دریافت نہیں ہوا جو کیمیاں جلد ملک پر جاری ہو۔ وہی حکومت بہترین ثابت ہوگی جو ملک کے مقاصد کی ترویج میں حتی الامکان کوشاں ہو، اور ملک کے حقیقی مقاصد کیا ہیں اور کیا ہونے چاہئیں، اس پر آئندہ باب میں بحث کی جائے گی۔

باب ۱۱ مملکت کا مطمح نظر

بین الاقوامیت، نفع، مملکت، افادیت، ترقی، تنظیم، عدل، مذہب، ارتقاء، انسانی
اس سے پہلے ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ مملکت انسانی زندگی کا جزو لا ینفک ہے
اور شخص کو خواہ وہ کتنا ہی اس سے گریز کرے، کسی نہ کسی قسم کی سیاسی زندگی ضرور
بسر کرنی پڑے گی۔ ساتھ ہی حکومت کے مخصوص حیطہ اقتدار اور اس کے معمولی
فرائض و اختیارات پر بھی بحث کی جا چکی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس
تمام کردار کا، جو مملکت کے ادارے یعنی حکومت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، کیا مطمح نظر
ہونا چاہیے، اور اس کے ادارے کا جس کے لئے انسان اپنے جان و مال،
اپنا گھر بار، اپنا آرام و راحت سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے،
آخر حقیقی مصرف کیا ہے، یعنی نبی نوع انسان کے لئے عموماً اور اس کے مخصوص
شہریوں کے لئے خصوصاً آخر اس سے کیا فائدہ مقصود ہے۔

۱۱ باب ۳۔ حسب بالا۔

۱۱ باب ۹ و ۱۰، حسب بالا۔

بین الاقوامیت۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ علم سیاسیات گویا تاریخ ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور چونکہ تاریخ ہر آن بدلتی رہتی ہے اس لئے اصول سیاسیات میں بھی ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ سیاسیات کا موضوع مملکت ہے اور یہ لازمی ہے کہ جیسے جیسے واقعات تاریخی سے لوگوں کے سیاسی خیالات میں تبدیلی ہوتی رہے ویسے ہی مملکت کے معنی اور اس کے مقاصد میں بھی تغیر ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں قدیم یونانیوں کے نزدیک اعلیٰ ترین سیاسی مطمح یہ تھا کہ ہر قصبہ اور شہر بجائے خود ایک مملکت ہو اور ہر طرح سے بیرونی دباؤ سے آزاد ہو، وہاں آج کے سیاسی خیالات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گویا ہر خیال روزانہ بدھم پڑتا جاتا ہے کہ مملکت ایک نہایت ہی محدود ادارہ ہے جو انسان کی سیاسی تشفی و ضروریات کے لئے ناکافی ہے، اور انسان کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ ”اولاد آدم کی پارلیمنٹ اور دنیا کی وفاقیہ“ قائم ہو۔
 مہاتما گاندھی، جو ہمارے زمانے کے انسانوں میں ایک بلند و ممتاز پایہ پر کھڑے ہیں

سید مکرٹسٹ اصول سیاسیات "Gilchrist: Principles of Politics"

Cal Science. باب ۲۔

سید تینیسن: "کیسے مل" Tennyson: Locksley Hall

"Till the war drums throbbed no longer and
 the battle flags were furled,
 In the Parliament of man, the
 Federation of the world."

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ”میری قوم پرستی انتہا درجے کی بین الاقوامیت کے مترادف ہے۔“ اس عظیم انسان ”ہائین کی“ جو قدیم یونانی سیاسی فلسفیوں اور زمانہ حال کے بعض انسانوں کے خیال کے درمیان نظر آتا ہے، ایک درجہ یہ ہے کہ سامانِ حل و فصل کی آسانیوں اور فاصلہ و وقت کے تقریباً فقدان سے بعید تر چیز حصص دنیا کے امین اب شاید اس سے زیادہ تعلقات میں جو کسی زمانے میں (مثلاً، اسپارٹا، ایتھنز اور بھنجر کے باہین تھے، اور مختلف اقوام عالم ایک دوسرے کے خصائص و حالات سے اس سے زیادہ واقف ہیں جتنے قدیم ایرانی پڑائیوں سے یا قدیم یونانی اشوریوں سے واقف تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں صرف ایک یونان یا ایک آٹلی کے باہمی اتحاد میں بے شمار رکاوٹیں نظر آتی تھیں، وہاں بین الاقوامیت کا تخیل محض نظریے سے گزیر گیا ہے، گو حال کی تاریخ اور آٹلی و جرمنی میں آمریت اور غالی ملکیت کے فروغ نے اس تخیل کو ایک عظیم انسان دھکا لگایا ہے اور اس بین الاقوامی اصول کو اب ایک پیش پا افتادہ تخیل سمجھا جانے لگا ہے۔

نفسِ مملکت۔ ساتھ ہی اس میں بھی شکوک پیدا ہو گئے ہیں کہ آخر مملکت کا حقیقی مقصد کیا ہونا چاہئے۔ کوئی سیاست تو مملکت کی غایت افراد کے مفاد کو سمجھتا ہے، کوئی ان کی خوشنودی کو، کوئی ان کی ترقی کو، کوئی ان کی تنظیم کو، کوئی ان کے حسن اخلاق کو، اور بعض ایسے بھی ہیں جو فی نفسہ مملکت، بلکہ

اُس کے آئینہ کاری حکومت ہی کو تمام انسانی کوششوں کا لمبا وادبی قرار دیتے ہیں۔
 یونان قدیم میں ”اوسٹرکزم“ یعنی دس نکالے کا جو طریقہ رائج تھا اس میں سب
 سے بڑا نمکتہ ہی تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو، مملکت کو قائم رکھنا چاہئے خواہ اس کی
 درجہ سے افراد کو جلاوطن ہی کیوں نہ کر دیا جائے، بلکہ اتھنز میں تو اگر کوئی شخص
 اساسی آئین مملکت کے خلاف کوئی تحریک کرتا تو اس تحریک کو بعض صورتوں
 میں زہر کا سالہ مینا پڑتا۔ جب رفتہ رفتہ مملکت ایک فرد یا حدیثی بادشاہ کی
 شخصیت میں مرکوز ہوئی تو مختلف ممالک میں غداری کے قوانین مرتب کئے گئے
 جن کے بموجب بادشاہ کی شخصیت کے خلاف ہتھیار اٹھانے والا یا سازش
 کرنے والا موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ یہی وہ پہل ہے جو انگریز عاقل س ہوبز
 کے قیضے میں اگر ایک نہایت زبردست ہتھیار بن گیا اور اُس سے افراد کو منظم کرنے
 اور ان کے احساسات و جذبات کو زیر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ آج کل مملکت
 اور حکومت کی اس قدر پہل پہل ہے اور ان دونوں ادارات کو مختلف پیرایوں میں اس قدر
 اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی لفظ لکھنا بڑا چبھتا معلوم ہوتا ہے،

یہ اس کی مثال کے طور پر انگلستان ”کانٹون“ ۱۸۵۲ء میں کیا جاسکتا ہے جس کے لئے
 دیکھو سیٹ لیٹر، ”تاریخ دستور انگلستان“ *Mainland English Constitutional History* عہدہ ۵ حصہ ۵۔ جہاں بادشاہ نہیں وطن ”ملک“ کے
 خلاف غداری مستوجب سزا سمجھی جاتی ہے، حال ہی (۱۹۱۸ء) میں ایرستان میں ایک قانون
 منظور ہوا ہے جہاں اسی اصول پر عمل درآمد کیا گیا ہے۔

لیکن ہم مجبور ہیں کہ اس خیال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں جس طرح انسان کی اجتماعی حس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بالکل اسی طرح ان کی انفرادی حس کو بھی بالائے طاق نہیں رکھا جاسکتا۔ ضرورت آئے تو مملکت کی خاطر افراد کو ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑتی ہیں، لیکن یہ نہیں ہے کہ ہر خطہ وہ مملکت ہی کے مفاد کو ڈھونڈے اور اپنی خوشنودی، مسرت اور مفاد کی پرواہ ہی نہ کرے، بلکہ ایسا کرنا خلاف فطرت اور خلاف انسانیت ہوگا۔ یہ کہنا کہ انسان کی کوشش کا واحد مظاہرہ اور اس کی تنہائے پرواز بس مملکت ہی ہے، انسانوں کے ایک نہایت ہی اہم پر اسے یعنی انفرادی حس کو بالکل نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے، افادیت۔ اس کے بالکل برعکس وہ خیال ہے جس کے بموجب مملکت کا اعلیٰ ترین، بلکہ واحد مقصد افراد کا مفاد ہے اس خیال کو نظریہ افادیت کہتے ہیں اور اسے سب سے زیادہ زور کے ساتھ ایک انگریز جرجی ہنٹن نے پھیل صدی کے اوائل میں پیش کیا تھا۔ اس کی رو سے افراد کی بہبود اور ان کی بہتری سے زیادہ مملکت کا کوئی دوسرا مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خیال میں جو مغالطہ ہے وہ صاف عیاں ہے۔ اول تو مملکت محض افراد کی خادم ہوئی اور اس کی حیثیت افراد کے مجبور سے زیادہ نہ ہوئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتہً مملکت افراد کے مجموعے

۱۱۔ ہنٹن کا نظریہ پولک کی کتاب "تاریخ علم سیاسیات" مترجمہ رحم علی ہاشمی (باب ۴) میں دیا ہوا ہے جو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے طبع ہو چکی ہے،

سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقتاً ملکات افراد کے مجموعے سے کہیں زیادہ واقع ہے، بلکہ بعض مرتبہ تو اس کے مفاد کی شکل افراد کے مفاد کی شکل سے بالکل مغایر ہوتی ہے، چنانچہ اس مخصوص پیرائے کو نظر انداز کر دینا حالات و واقعات سے روگردانی کرنا ہے۔ ایسے سیاست دان (مثلاً لاسکی وغیرہ) جو اس ملکیت کو دوسرے انسانی ادارات کا محض ہم پلہ سمجھتے ہیں، اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ملکیت کی ضروریات و احساسات بعض مرتبہ نہیں بلکہ اکثر مرتبہ افراد کے ضروریات و احساسات سے جدا گانہ ہوتے ہیں، اور ان کا پاس دلچاظ رکھنا بھی کم از کم اتنا ہی ضروری ہے جتنا خود انفرادی احساسات کا۔ آج کل کے زمانے میں فرد کی ترقی اور اس کی مدد کے ضمن میں حکومت کو جو کوششیں کرنی پڑتی ہیں۔ وہ اسی کا ایک ادنیٰ مظاہرہ ہیں۔

ترقی، تنظیم، عدل۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ ملکیت کے بغیر ترقی، تنظیم اور عدل ممکن نہ ہوگا، اس لئے ملکیت کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ملک والے شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کے لئے منظم ہوں اور عدل و انصاف کا راج قائم ہو جائے۔ بلاشبہ عدل و انصاف کے بغیر ملکیت کا استحکام ناممکن ہو جائے گا اور حکومت کا فرض ہے کہ ملک میں اسی اصول کی تعمیل کرے، چنانچہ مشرقی ممالک

۹۹ دیکھو باب ۲، حسب بالا۔

۱۰۰ مثلاً دیکھو لاسکی، "مسئلہ اقتدار اعلیٰ" (Laaski: Theory of Sovereignty)

۱۰۱ دیکھو باب ۱۰، حسب بالا۔

میں مدتِ دراز سے غیر جانبدارانہ انصاف حکومت کا بڑا بجاری فرض تصور کیا جاتا ہے، اور مغربی ممالک میں بھی اس کو بیرونی اثرات سے تقریباً تین سو برس سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ لیکن اسے ہم مملکت کا مطمح نظر نہیں کہہ سکتے بلکہ زیادہ سے زیادہ تعدیل و حکیم حکومت کا فرض سمجھا جاسکتا ہے۔ یہی کیفیت تنظیم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان منظم نہ ہوں گے تو مملکت عدم سے وجود میں نہیں آسکتی بلکہ فی لغفہ تنظیم ایسا اصول نہیں جو مقصدِ مملکت ہو، بلکہ وہ دراصل مملکت کی ترکیب کا طریقہ ہے۔ تنظیم بجائے انتہائی مقصد ہونے کے ابتدائی شرطِ قیامِ مملکت کی ہے۔ محض ترقی ہی مطمح نظر نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ترقی کے لفظ سے انتہا کا نہیں بلکہ ارتقا کا خیال پیدا ہوتا ہے؛ بلاشبہ یہ بھی ایک عظیم الشان فرضِ حکومت کا ہے کہ وہ باشندگانِ مملکت کو ہر طرح پر شاہراہِ ترقی پر لگائیں، لیکن حقیقی مطمح نظر نہیں سمجھا جاسکتا۔

مذہب۔ تاریخ انسانی میں ایک زمانہ ایسا گزرا ہے جب مملکت کے

لے مشرقی ممالک میں عدل کو ہمیشہ سے بہت کچھ اہمیت دی جاتی ہے۔ آج بھی دہلی کے لال قلعہ جاذبانِ تھوڑے بہت ایوانوں میں سے ایک میں جو زلے کی دست برد سے خون کے آنسو بہانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں،

عدل کی ترازو نہایت ممتاز انداز سے نظر آئے گی۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ابتدائے اسلام میں فاضی کو دالی سے بالکل آزاد سمجھا جاتا تھا۔ اس کے برعکس یورپ میں عدالتِ عدل کے زمانے تک برابر دیگر اعضاءِ حکومت کی دستِ نگر رہی۔ دیکھو میٹ لیٹڈ، حسبِ بالا، عہدِ ہم، حصہ نہ

تیم کا مقصد ہی ایک خاص مذہب کی ترویج کو سمجھا جاتا تھا، چنانچہ مشرق میں عام طور پر تبلیغ و ترغیب کے ذریعہ سے اور مغرب میں تشدد و احتساب کے ذریعے سے حکومت کے مذہب کی نشر و اشاعت کی جاتی تھی۔ آج بھی بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے حکمرانوں کا کوئی خاص مذہب ہے، مثلاً شاہ انگلستان اگر کلیسے انگلستان سے مخوف ہو جائیں تو سلطانِ عالم کے ”قانونِ بندوبست“ کی رد سے سخت تاج سے دست بردار سمجھے جائیں گے۔ نیز ایسے ملک موجود ہیں جہاں آج بھی کسی خاص مذہب کی تبلیغ کے لئے حکومت بے دریغ روپیہ خرچ کرتی ہے اور بعض ممالک میں ”ملکوتی مذہب“ کے خیال کا از سر نو احیا کر لیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ نفس مذہب کا اثر ملکی معاملات میں روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور

۱۱ باب ۲، حسب بالا۔

۱۱ خود سلطنتِ برطانیہ اپنے سخت ممالک میں تبلیغی انجمنوں کی براہِ راست مدد کرتی ہے، مثلاً برطانوی جنوب مغربی افریقہ اور برطانوی ہندوستان میں تعلیم کا کاروبار کلیتہً انہی انجمنوں کے قبضے میں ہے دیکھو سالانہ مدبرین، ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۹۷ و صفحہ ۲۰۴ وغیرہ۔ نیز قانونِ حکومت ہند ۱۹۳۵ء، دفعات ۳۴ و ۳۵ کی رو سے کیسائی اخراجات میں کلیتہً گورنر جنرل مختار ہیں اور جماعتِ متغنیہ ہند کو اس پر اس کے دینے کا حق حاصل نہیں۔

۱۱ جیسے جوہنسن می۔ اس کے برعکس ترکی نے مذہب کو ملکیت سے بظاہر بے تعلقی کر دیا جو ۱۱ خود پیرِ اسلام علیہ السلام نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر فرمایا تھا کہ ”انتم علم منی باموردینا کہہ“ یعنی تم امور دنیوی میں مجھ سے زیادہ ماہر ہو۔

آج کم ہی ایسی ملکیتیں نظر آئیں گی جو اپنے مذہب کی نشر و اشاعت علی الاعلان بڑھ کر رہی ہوں۔ تقریباً ہی کیفیت اخلاق کی بھی ہے۔ بعض سیاسی فلسفیوں مثلاً ہسٹنگل کا خیال ہے کہ مملکت کا مقصد اعظم صحیح اخلاق کی ترویج ہے۔ اس کی بابت پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ ہر ملک میں اخلاق کا تعین عام طور پر کسی ایک فرد یا مجموعہ افراد کی آزادانہ دسترس سے باہر ہوتا ہے، دوسرے گورنر آج کل کی مملکتوں میں بہت سے ایسے قوانین نافذ کئے جاتے ہیں جن کا ملک کے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے، لیکن یہ مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ادارات حکومت جملہ اخلاقی اور مذہبی باتیں کا تعین کرے، اس لئے کہ اس قسم کی کوشش کے لئے بہت کچھ جبر و اکراہ کی ضرورت ہوگی جس سے سوائے بے عینی اور اختلال کے کوئی نتیجہ مشکل سے نکلا جائے گا۔

ارتقاء کے انسانی۔ ان فرض یہ خیال مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا واحد مطلع نظر ان سب مقاصد میں سے کوئی ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مقصد اعظم یہ ہونا چاہئے کہ ہر طریقہ اور ہر آئین کے اعتبار سے قومی خصائص میں

علامہ بنگالی، "نظر سلطنت"، مترجمہ فارسی، کلمہ چین، کتاب ۵، باب ۲۔ یہ کتاب جامعہ عثمانیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

علامہ اس قسم کے قوانین کا ایک سلسلہ مجموعہ تقریرات میں دیے گا۔

علامہ تاریخی جرنیل ہیں اس کی کوشش کی جا رہی ہے کہ عورتوں کو خالی آزادانہ روش سے روک کر ان کے اخلاق پر باخبر ڈالا جائے۔

حتی الوسع زیادہ سے زیادہ ارتقا پیدا کیا جائے اور اس طرح ہی نوع انسان کی بہبود کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ جیسے ہر ملکیت افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور ہر ایک فرد اپنی بساط کے مطابق اپنی انفرادی اور سب کی اجتماعی ترقی میں کوشاں ہو تو ملکیت بھی خاہرہ ترقی پر گامزن ہوگی، بالکل اسی طرح اعلیٰ ترین مقصد ملکیت کا یہ شمار ہونا چاہئے کہ ہر ملکیت اپنی بہبود کی کوشش کے ساتھ ہی نوع انسان کی فلاح کو بھی مد نظر رکھے۔ جس طرح انسان کا ہر دوسرے انسان سے فطری تعلق ہے اور کسی قسم کی اجتماعی کیفیت کے بغیر انفرادی زندگی ناممکنات سے ہے، اسی طرح خداوند کریم نے مختلف حصص عالم کا ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا ہے، چنانچہ جو قوم محض اپنے ہی مفاد کو مد نظر رکھتی ہے اور ہی نوع انسانی کے مفاد کو نظر انداز کر دیتی ہے وہ اسی فرد کے مانند ہے جو محض اپنی خود غرضانہ خواہشات کے پیچھے بڑ جائے اور اپنی ملکیت کے مفاد کو پس پشت ڈال دے۔ اب جب کہ نیا صلبہ و وقت کا سوال پہلے کی طرح اہم نہیں رہا تو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر شخص کے دل اور ہر ملکیت میں حقیقی معنی میں بین الاقوامی فضا پیدا کی جائے، اور کالے گورے، مشرقی، مغربی ایشیائی یورپی کا فرق صرف اس حد تک رہنے دیا جائے جہاں تک وہ مخصوص رد قبول کی ترقی میں مدد معاون ہو۔ یعنی ”نبی آدم اعضائے یک دیگر اندکاسین دنیا کے سامنے“

مطلع صدی فیراہی، ”گلستان“، باب اشجہ شہزاد کے مطلع نظر کا عنوان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

نبی آدم اعضائے یک دیگر اندکاسین دنیا کے سامنے
چرخ عضوے برد آور و روزگار و اگر عضوے را نماند قیام

از سر نو پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ انسان کی قومی زندگی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی زندگی کی تکمیل بھی ہوتی رہے اور دنیا سے تعصب، تنفر اور تفریح کا استیصال ہو جائے۔

یہی وہ خیال ہے جو ہر ملک کا اعلیٰ ترین مطمح نظر ہونا چاہئے۔ اس کا حصول دشوار ضرور ہے اس لئے جن مضرا حساسات و جذبات کا وہ انداز کرنا چاہتا ہے وہ صدیوں سے اقطاع عالم کے جیسے والوں میں بھرے ہوئے ہیں اور ان سے چھٹکارے کے لئے بہت سا وقت اور بے حد کوشش درکار ہے۔ سب سے پہلی چیز جسے ہر ملک کو اپنا مقصد گردانا چاہئے وہ تنظیم اور عدل و مساوات کی تعلیم ہے۔ اگر عدل و مساوات کے جذبے کو ترقی دی جائے گی تو یقین ہے کہ لوگوں کی اخلاقی حالت بھی درست ہو جائے گی اور لوگ بین الاقوامیت کا اصول سمجھنے کے اہل ہو جائیں گے۔ یہ سب اُسی وقت ممکن ہے جب نسلی، معاشری، لسانی، کوئی اور براہِ عظمیٰ تنگی سے نکل کر دنیا کی مختلف ملکوں میں اس سے اعلیٰ دارِ مطمح نظر اپنے سامنے رکھیں گی اور حقیقی معنیٰ میں نزع انسان کو ہر ایک مرتبہ عالمگیر جہاں چارے، امن و امان اور مکمل انسانیت کے خیال کی طرف گامزن ہونے کا سبق دیا جائے گا۔

۱۱۔ یہ فقرے منسلک ہیں کھمے گئے تھے اور آج بھی انھیں قلمزد کرنے کی وجہ نظر نہیں آتی۔
جاپان کے قبضہ منچوریا و مشرقی چین، اٹلی کے قبضہ حبشہ، (دارِ جہنم) جرمنی کے قبضہ آسٹریا، (اکتوبر ۱۹۱۷ء) سوڈان و (مارچ ۱۹۱۷ء) اٹلی (لٹے ملے پر)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۱۰ کا)

بوہیا و مورادیا، انجمن اترام کی کس میرسی، ہسپانوی خاندانگی، اور خرد ہالے ملک
کے ہر گوشے میں عدم ردا داری، فرقہ داری بدامنی اور بے اطمینانی، ان سب کے باوجود
اگر کوئی تحلیل ایسا ہے جو حقیقی مقصد انسانی ہونا چاہئے، تو یہی اقوامیت ہے۔

organs of state
&
separation of powers
باب ۱۲

اعضاء حکومت اور تفریق اختیارات

حکومت کے ذرائع - ہیئت حاکمہ اور حکومت - ذرائع کی تقسیم - اعضاء حکومت
نظریہ تفریق اختیارات - اس نظریہ کی تنقید - اس میں حقیقت کا پہلو - آمریت
ہم نے کتاب کے پہلے حصے میں مملکت 'ا' کے ارتقا اور دارالعمل پر بحث
کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عام طور پر مملکت ایک مجرد فلسفیانہ خیال
سمجھا جاتا ہے، لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی
طبقہ یقین انسانوں کا ایسا ہوتا ہے جو اس کے کاروبار میں براہِ حصہ لیتا رہتا ہے
اور اسی طبقہ کوئی اجماع ہیئت حاکمہ کا لقب دیا گیا ہے۔ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے
ہیں کہ مملکت کا کاروبار وہ تمام باشندگان ملک سمجھاتے ہیں جن کے سپرد یہ
کام دستور سیاسی کے ذریعہ سے تفویض کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص ہر کام
بیک وقت انجام نہیں دے سکتا، چنانچہ اس دستور کے ذریعہ سے یہ طے
کرایا جاتا ہے کہ تقسیم کار کن کن امور میں ہوگا اور مختلف ادارات سیاسی پس لائح

کے افراد کا تقرر کیا جائے گا۔ حکومت کے فرائض، اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ حکومت کے فرائض و اختیارات کیا کیا ہیں۔ پہلے تو جس چیز کی ضرورت ہے وہ آزادی ہے، اس لئے کہ غیر ملک کا قبضہ ہو جانے پر سیاسی اعتبار سے مملکت ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے نوامین بنائے جائیں جن سے سرزد کو ناپی جان، مال، تلاش معاش اور افزائش دولت کے مواقع کی طرف سے اطمینان ہو جائے، اور ان قواعد کی خلاف ورزی کر لے کہ کسی قسم کی جسمانی یا مالی نقصان کا خطرہ ہو۔ نیز اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے عادل مقرر کئے جائیں جو بالکل غیر جانبدارہ انداز سے جملہ معاملات قانون شکنی پر غور کر کے اور رائج الوقت قوانین کا بلا تعصب الطباق کر کے سزائیں دیتے رہیں۔ مملکت کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ اگر اس کے انتظامات کی طرف سے کسی قسم کی روگردانی یا لغات کا احتمال ہو تو وہ اپنے جملہ وسائل کو کام میں لا کر ملک میں امن و امان قائم کرے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کے لئے روپیہ کی فراہمی کی بہترین صورت کون سی ہے۔ یہ تو وہ فرائض و اختیارات ہونے جن کے بغیر حکومت کا چلنا ہی ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ بھی انفرادی مملکت ایسے امور اپنے قبضہ یا نگرانی میں لے لیتی ہے

۱۰ باب ۱۰۔

۱۱۔ اور اطمینان صرف انفرادی حکومت کے تحت ہو سکتا ہے۔ اشتراکی حکومت میں انفرادی ال بدولت ہی نہیں رہتی۔ دیکھو باب ۹۔

جن سے عام مقررہ الحالی میں اضافہ ہو، مثلاً کارخانہ جات کی نگرانی، ریلیں اور سڑکیں، ذرائع حمل و نقل میں اضافہ، وظائف معمرین، جبری بیمہ وغیرہ اور یہ بھی مملکت حالیہ کے کم و بیش لازمی فرائض تصور کئے جاتے ہیں۔ ان فرائض کو جن افراد مملکت کے زیرِ لائحہ انجام دیا جاتا ہے اسی کو ہم نے ہیئت حاکمہ کا لقب دیا ہے۔

ہیئت حاکمہ اور حکومت۔ ہیئت حاکمہ تو ان باشندگان ملک پر مشتمل ہوئی جو کسی نہ کسی نوع سے کاروبار حکومت میں حصہ لیتے ہیں۔ حکومت اس ہیئت حاکمہ کی گویا فادہ ہے جسے اس کی مرضی پہ چلنا ہوتا ہے اور جسے کسی قسم کے قصور یا تجاوز اختیارات پر بدلا جاسکتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ تا دقتیگہ ہیئت حاکمہ حکومت کے افعال سے خوش نہ ہو، حکومت کو استقلال نصیب نہیں ہوتا اور اسے ایک خاص حد تک ملک میں بے چینی، اختلال اور بغاوت سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہاں تک کہ یہ بھی امکان سے بعید نہیں کہ ہیئت حاکمہ کی (جو مملکت کا گویا کارکن حصہ ہے) اکثریت تنگ آکر بالکلیہ موجودہ حکومت کی مخالفت پر کمر بستہ ہو جائے اور حکومت کو پلٹ دے۔ اگر اختلال اور بے چینی سے ملک کو نجات دینی ہے تو ہیئت حاکمہ اور حکومت کے مابین اول درجہ کا تعلق و تعاون لازمی ہے، ورنہ ملک کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا، اور اس تعلق کی واحد شکل یہ ہے کہ حکومتی ادارات کے سپرد جو فرائض کئے گئے ہیں انہیں جہاں تک

ہو سکے بہترین طریقہ سے پورا کیا جائے۔ اور ان سے تجاوز نہ کیا جائے۔
 فرائض کی تقسیم۔ اگر ہم غور کریں تو جن فرائض کا اد پر شمار کیا گیا ہے وہ
 پانچ شعبوں میں منقسم ہوں گے؛ سب سے پہلے تو قانون سازی یعنی ان قواعد
 کی ساخت ہے جن کے تحت ملک میں امن و امان اور افراد کی زیاد از زیادہ آزادی
 ممکن ہے اور جن کے بغیر انسانی ادارات میں نظم کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔
 دوسرے اس بات کی نگرانی بھی بغایت ضروری اور لازمی ہے کہ ان قواعد کی
 پابندی ہوئی ہے یا نہیں۔ تیسرے اگر کوئی شخص ان قواعد سے انحراف
 کرے تو اسے پاداش کو پہنچایا جائے۔ مملکت کے قیام کے لئے یہ بھی ضروری
 ہے کہ اسے بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس کی قوت کو منظم کیا جائے
 اور دوسرے ملک سے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں۔ حکومت کا آخری فرض
 یہ ہوگا کہ ان تمام انتظامات کے برقرار رکھنے کے لئے روپیہ فراہم کیا جائے۔ یہ
 تقسیم ان فرائض کی ہوئی جو افراد کے کاموں میں کم از کم مداخلت کے بغیر ضروری ہوں
 لیکن اگر غور کیا جائے تو جتنے بھی مقدم اصول اشتراکیت کی طرف بڑھائے جائیں
 گے اور حکومت کے سپرد جتنے بھی مزید فرائض کئے جائیں گے وہ سب کے سب
 قانون سازی، اور ان قوانین کی پابندی کی نگہبانی ہی کے تحت آئیں گے، اس
 لئے کہ روگردانی کی شکل میں حکیم، حفاظت اور محاصل ہر حالت میں لازمی ہیں،
 خواہ مملکت کا رجحان الفردیت کی طرف ہو یا اشتراکیت کی طرف، چنانچہ
 جتنے بھی زیادہ فرائض حکومت کے سپرد کئے جائیں گے اتنی ہی زیادہ ضرورت
 قانون ساز اور پابندی قانون کے نگراں کی بڑھ جائے گی۔

اگر غور کیا جائے تو یہ جو پانچ شقیں فرض حکومت کی بیان کی گئی ہیں ان میں سے بعض فرض ایسے ہیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مطابقت ہیں کہ ان کا ایک ہی ادارہ کے سپرد رہنا مناسب ہے۔ ظاہر ہے کہ پابندی قانون کی نگرانی بذریعہ کسی قسم کے آؤ جبر کے بے سود ہے، ورنہ اگر قانونی تہدید نہ ہوگی تو محض ہدایت و ترغیب سے کام چلنا نہایت دشوار ہے۔ بحسبہ ہی کیفیت ہر دینی مداخلت کے فرض کی ہے، اور گو عام طور پر حکومت محض انہی قوت کو تنظیم کر کے اور دوسرے ممالک سے رشتہ قائم کر کے دشمنوں کو مرعوب کر لیتی ہے لیکن اسے ہمیشہ دشمن سے مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے، اور اس فرض کی ادائیگی میں اسے تقریباً اسی طرح کے طریقے استعمال کرنے پڑیں گے جو اندرونی بے صنی کے روک کے لئے استعمال کرنے پڑتے ہیں، اسی لئے آج کل یہ دونوں فرض علی العموم ایک ہی ادارہ حکومت کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا امر بھی غور طلب ہے۔ اگر دیکھا جائے تو قانون سازی اور محصول عائد کرنا یہ دونوں ایک ہی اصول کے تحت آتے ہیں، اس لئے کہ دونوں میں انسان پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ قانون سازی میں انسان کی جسمانی و روحانی آزادی کی قطع و برید کی جاتی ہے تاکہ دوسروں سے تصادم کا اندیشہ باقی نہ رہے اور زائد از زائد ممکن آزادی باقی رہے، محصول عائد کرنے کا مقصد بھی اس کے مماثل ہوتا ہے وہ یہ کہ انتظامات ملک چلانے کی غرض سے انسان کے گاہر سے پسینے کی گمائی سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے ایک حصہ وصول کیا جائے اور اس طرح آزادی کی باقی آزادی کو محدود کر دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً ہر ملک اور ہر زمانہ میں

قانون سازی اور محصول عائد کرنے کا اختیار ایک ہی ادارے کے سپرد ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان ممالک میں بھی جہاں قانونی اصول کی نوعیت خدائی بھی جاتی ہے، وہاں محال بھی ایسے احکام کے تحت ہی عائد کئے جاتے ہیں جو خدا کی طرف سے بندوں کے مفاد کے لئے نازل ہوئے ہوں۔

اعضاء حکومت - الغرض اگر غور سے دیکھا جائے تو حکومت کا کام تین رٹے شیعہ جات یا اعضاء کے سپرد ہوتا ہے، پہلے تو وہ عضو حکومت ہے جس کے سپرد تنظیم کی خاطر افراد کی حدود متعین کرنے کا فرض ہوتا ہے خواہ یہ حدود جسمانی یا بنیادی پر مشتمل ہوں یا مالی یا بنیادی پر، دوسرا وہ عضو جس کے سپرد ان قوانین کا نفاذ ہوتا ہے اور جس کے متعلق ملک کو اندرونی اختلاف اور بیرونی ممالک کے حرم و آؤسے بچاؤ کا اہم کام سپرد ہوتا ہے، اور تیسرا عضو وہ ہے جو قانون شکنی کے شبہ کی صورت میں یہ طے کرتا ہے کہ فی الواقعہ قانون توڑا گیا ہے یا نہیں، اور اگر توڑا گیا ہے تو پھر مجرم کو پاداش کو پہنچانے کی تجویز یا سفارش کرتا ہے۔ پہلے ادارہ کو عضو مقنن، یا "مقننہ"، دوسرے کو عضو عامل یا "عاملہ"، اور تیسرے کو عضو عدالت یا "عدلیہ" کا لقب دیا جاتا ہے۔ حکومت کے حدود اختیار کا بیان اصل انہی تین عظیم الشان اعضاء حکومت کے تکررے پر مشتمل ہو گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تینوں "اعضائے حکومت" کا ایک

اس کی بدیہی مثال یہ ہے کہ شرع اسلامی میں قوانین کے اصول بھی قرآن مجید اور حدیث نبوی سے اخذ کئے گئے ہیں اور محال بھی انہی کی سند سے عائد سمجھے جاتے ہیں۔

دوسرے سے کس قسم کا تعلق ہونا چاہیے۔ جیسا اور بیان کیا گیا ہے، بعض ممالک میں ملکی انتظام ایک خاص اصول پر مبنی رہا ہے، وہ یہ کہ چونکہ قوانین انسانی سقیم ہوتے ہیں اس لئے خدا گویا قانونی اصول و ولایت کرتا ہے اور علماء و ائمہ تاملان ان کی تامل کرتے ہیں؛ دوسرے جہاں تک عالمانہ اقتدار کا تعلق ہے، سردار قوم کی کیفیت اس کے خادم کی جیسی ہوتی ہے۔ محکمہ عدلیہ کو ہر ملک میں گویا بال کمانی سمجھا جاتا ہے، اور اس کی ذمہ داری کے ساتھ جملہ ادارات حکومت میں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان اصول کا ائمہ سیاست نے بار بار ادا کیا ہے اور ملکی حکام نے ان پر عمل کیا ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جو قاضی مقرر کئے جاتے تھے ان کا تعلق مقامی صوبہ داروں سے نہیں بلکہ خود خلیفہ وقت کے ساتھ ہوتا تھا اور ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خود خلیفہ کو قاضی نے طلب نامہ بھیج کر بلایا ہوا اور اسے حاضر ہونا پڑا ہو۔ مغربی ممالک میں اس اصول پر نسبتہ حال ہی میں عمل ہونا شروع ہوا ہے، گو اس سطح طائیس ہی کے زمانہ سے یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ ہر مملکت میں یہ سب سے

۱۵ باب ۱۲

۱۶ "سید القوم خادیم"

۱۷ مثلاً آثار میں صدی عیسوی سے بیشتر مملکتان کا بادشاہ عدالت پر کلثیہ جاری تھا اس کے لئے دیکھو چیمبرز "تاریخ دستور انگلستان" ترجمہ اردو۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کوں باب ۴، جہاں بیان کیا ہے فقرہ نقل کیا گیا ہے کہ "مناسب ہے کہ عادل بمنزہ شیر دل کے ہوں، گو ایسے شیر جو تخت شاہی کے تابع ہوں تاکہ وہ ملکی اقتدار کے کسی جزو کی طاعت و ریزی، یا مخالفت نہ کریں۔"

ایک دوسرے سے جدا گانہ ہوتے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی کا سیاست داں
 نژاد ہودیں یورپ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے یہ اصول پیش کیا کہ فرمانروا کو عاقلانہ
 فرائض کو خود اپنے آپ پر رکھنے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ عدالت کا کام دوسروں کے
 سپرد کر دینا چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ ”اگر قانون سازی اور عدالت دونوں ایک
 ہی شخص کی سپردگی میں ہوں تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عدل و اختیار معافی
 قانون کا انطباق اور اس سے خود مختار راہ گریز“ ان سب میں غلط بحث ہو چکا۔
 اس کے بعد جس پورہ پنی نے اس تقسیم کاری کے اصول پر فرا زیادہ زور دیا ہے وہ
 انگریز منصف لوک ہے جس نے اپنے ”رسالہ جاث متعلق حکومت“ میں
 حکومت کے متعلق شہروں کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا۔ لیکن اس کے نظریہ
 کی بنیاد وہ اعضا نہیں مہیا جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، بلکہ وہ ایک طرف تو
 حکومت کو ”قانون ساز“ ”عادلانہ“ اور ”وفاقی“ شعبوں کے سپرد کرتا ہے۔
 اور دوسری جانب حکومت کا مرکز ایک ”راہ عامہ“ کو بتاتا ہے جو اس کی خیال
 میں امور مملکت کی ہمیشہ نگرانی کرتا رہتا ہے۔ لیکن جس شخص نے تقسیم کار کے اصول
 پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ فرانسیسی ہیرن ٹوئیسکیو ہے جس نے اپنی

۱۱ اصطلاحات: ”سیاسیات“ Aristotle's *Politics* اشاعت اکسفورڈ باب ۴ پارہ ۴

۱۲ دیکھو منجلی۔ ”نظریہ مملکت“ ترجمہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حصہ ۱ باب ۴۔

۱۳ ”رسالہ جاث متعلق حکومت ملکی“ Locke: *Treatise on Civil*

Government۔ رسالہ ۲۔ ابواب ۱۲، ۱۳۔

کتاب ”روح قوانین“ کو اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھ کر اور اس میں ”تفریق اختیارات“ کے اصول پر زور ڈال کر دنیا کے بعض دستوروں پر براہ راست اثر ڈالا۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مونیکیو کی کتاب کے ایک بارہ کا ترجمہ جینسہ کر دیا جائے وہ کہتا ہے کہ :-

نظریہ تفریق اختیارات۔ ”ہر حکومت میں تین قسم کا اقتدار مرکوز ہوتا ہے، اول اقتدار قانون سازی، دوسرے اقتدار عالم، جس کے سپرد دو کام ہوتے ہیں قانون اقوام کا نفاذ اور ملکی قوانین کی ترویج، پہلے اقتدار کے تحت فرماں روا یا عامل موتی یا متسلط قوانین بناتا ہے۔ اور موجودہ قوانین میں ترمیم و تہمت کرنا ہے اور دوسرے کے تحت وہ جنگ چھیڑتا ہے، اطاعتی ختم کرتا ہے، سفیروں کو بھیجتا اور بلاتا ہے، امن عامہ قائم کرتا ہے، اور ملک کو خارجی دولت کے حلوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا اقتدار بھی ہے جس کی رو سے مجرموں کو سزا دی جاتی ہے، اور افراد کے درمیان جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں انھیں طے کیا جاتا ہے، اس اقتدار عدلی اقتدار کہتے ہیں اور یہ اقتدار عالم سے جدا ہوتا ہے۔ جہاں ایک ہی شخصیت میں اقتدار مقننہ و عالمہ دونوں مرکوز ہوں وہاں آزادی کا بول بالا نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایسی صورت میں لوگوں کو ہمیشہ یہ خوف لگا رہے گا کہ ایک ہی حکمران یا جماعت ظالمانہ قوانین بھی بنائے گی، اور ان کا نفاذ بھی ظالمانہ انداز سے کرے گی۔ اسی طرح اگر عدلی اقتدار جماعت مقننہ میں مرکوز ہو تو گویا عادل ہی قانون ساز بھی ہو گا اور اسی طرح رعایا کی زندگی اور آزادی دونوں پر مطلق العنانی کے ساتھ قابو یافتہ ہو جائے گا۔ اگر عدالت اور عالمہ

اقتدار دولوں ایک شخصیت کے سپرد ہوں، خواہ وہ عیان پر مشتمل ہو یا عموم پر، تو بس ہر چیز کا خاتمہ ہی ہو جائے گا۔

یہ ہے وہ مشہور نظریہ جس نے دنیا کے بعض نہایت اہم و تاثیر پرزور دست اثر ڈالا۔ ٹوشکیو کی کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی اور اس کے بعد سب سے پہلا دستور جمہوریت ہوا اس میں اسی تفریق اختیارات کے اصول پر تقریباً پورے طور سے عمل ہوا۔ ممالک متحدہ امریکہ کے دستور سازوں نے اپنے ساتھ یہ دستور حکومت کی بنیاد ہی اس اصول پر رکھی کہ عالم، متغنیہ، اور عدلیہ تینوں اعضاء حکومت حتیٰ الامکان ایک دوسرے کے اثر اور دست برد سے آزاد رہیں، چنانچہ ممالک متحدہ امریکہ میں

اللہ میں ٹوشکیو کے اس نظریہ ”تفریق اختیارات“ سے خاص طور پر پسپی ہے۔ مدت دراز سے ہندوستانی لوگ برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ حال حکومت کو اس وقت جو عادلانہ و عادلانہ اختیارات حال میں ان کی تفریق کی جگہ مثلاً کلکٹریٹ (ڈپٹی کمشنرز)، ڈپٹی کلکٹروں (اکسپریسٹنٹ کمشنرز) اور تحصیلداروں سے فوجداری کے اختیارات لے لئے جائیں، لیکن اس وقت تک برطانوی ہندی حکومت اس اصلاح پر رضامند نہیں ہوتی اور حالیکہ قلمرو علحضرت حسدوکن خلد اللہ ملکہ اور بعض دوسری ریاستوں میں مدت سے اس اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ آج کل ہندوستانی سیاسی بلے بھنی کے زمانہ میں ٹوشکیو کا یہ خیال بالکل صادق معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ آج کل ہندوستان میں گورنر جنرل مجلس عالمہ ہی قواعد نافذ کرتے ہیں، انھیں کی پولیس گرفتار کرتی ہے اور انھیں کے خاتم مقام عادل لمزموں سے جیل خانے بھرتے ہیں۔ ٹوشکیو کا یہ فقرہ اس کی کتاب ”روح قوانین“ *Essence of Laws* ۱۸۷۱ء میں لکھا۔

آج تک وزراؤں کی جماعت مقننہ یعنی کانگریس کے نہ رکن بن سکتے ہیں نہ ان کے سامنے ذمہ داریاں، اور بہت سی ریاستوں کے عادل اور ان کے علم کا بیشتر حصہ مخب ہوتا ہے گوان سے اگر کوئی حرکت ناشایستہ سرزد ہو جائے تو اکثر ریاستوں میں انہیں جماعت مقننہ یا وہ اور جماعت عاملہ مل کر انہیں خدمت سے علیحدہ کر سکتی ہے۔ نیوٹسکیو کے خیالات کا خود اس کے ملک فرانس پر بھی بہت کافی اثر پڑا۔ چنانچہ ۱۷۹۱ء کے انقلاب کے بعد فرانس کے پہلے تحریری دستور میں جو ۱۷۹۱ء کے انقلاب کے بعد بنایا گیا تھا، یہ فقرہ موجود ہے کہ ”ہر وہ معاشرہ جس میں تفریق اختیارات کے اصول کا تعین نہیں ہوتا اس میں دستور ہی کا فقدان سمجھنا چاہئے“ فرانس میں اس نظریہ کا اس وقت بھی اتنا اثر ہے کہ جمہوری عدالتیں سرکاری عہدہ داروں کی ان خلاف ورزیوں کو مقدمات کی سماعت نہیں کر سکتیں جو ان سے سرکاری فرائض کی انجام دہی میں سرزد ہوتی ہوں بلکہ ان کی سماعت خاص عدالتوں کے انتظامی میں کی جاتی ہے۔ ان شخص نیوٹسکیو کے نظریہ تفریق اختیارات کی وجہ سے ایک جدید طرز کی حکومت کی ابتداء

۱۷۹۱ء کی ریاستوں میں فادلوں کے تقرر اور علی گیلوں کے طریقوں کا نہایت عمدہ تذکرہ برائس کی مستند تصنیف ”ولت عامہ امریکہ“ *Bryce: American Commonwealth* جلد ۱، حصہ ۲، باب ۴۲ میں ہے۔

۱۷۹۱ء دستور فرانس ۱۷۹۱ء حصہ ۱ ”اعلان حقوق انسانی“ دفعہ ۱۶، ”تاریخ مرفین عالم“ جلد ۱۲ *Historians History of the world.*

ہوتی ہے جس میں عالمہ مقننہ اور عدلیہ ایک دوسرے سے جداگانہ عناصر حکومت

سمجھے جاتے ہیں۔ غور کیا جائے تو حکومت کے ان مینبروں (اعضا)

یعنی مقننہ، عالمہ، اور عدلیہ کے درمیان ایسی تقسیم کار جس کی وجہ سے ان مینبروں میں

کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہے، نہ صرف ناممکن ہے بلکہ نقصان رساں بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مؤسسیوں نے جن حالات و واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا

ان کی رفتار کو وہ سمجھا ہی نہیں۔ اس نے اپنی دانست میں دستور انگلستان کا

فارم مطالعہ کر کے اپنے نتائج اخذ کئے تھے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلستان میں نہایت

ممتاز زمانہ تھا، اس لئے کہ دستاویز حقوق ۱۷۸۹ء اور "قانون بندوبست"

۱۷۹۱ء کے ذریعہ سے شاہ انگلستان کے اکثر ایسے اختیارات جو پچھلے پچاس

ساٹھ سال میں اس کے اور پارلیمنٹ کے درمیان مابہ التنازع رہے تھے، اس

کی گرفت سے نکال لئے گئے تھے، اور مؤخر الذکر قانون کی رو سے ایک طرف

تو محکمہ عدلیہ بیرونی اثرات سے تقریباً آزاد ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ قاعدہ

ہو گیا تھا کہ بادشاہ کا کوئی وزیر یا وظیفہ خوار دارالعوام میں نشست نہ کرے تاکہ

پارلیمنٹ شاہی اقتدار سے بالکل آزاد رہ سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ آخری وقت عدہ

باقی رہتا تو شاہی حکومت، جو آج کل کے انگریزی دستور کی جان ہے قطعاً ناممکن

۱۷۸۹ء مکتبہ "منشیہ فقہ" Select Charters: Stubbs تتمہ

"قانون بندوبست" دفعہ ۳۔

ہو جاتی اور یہ طریقہ کہ وزیراعظم پارلیمنٹ کی اکثریت کا رہبر ہوتا ہے، اسی وقت ممکن ہوا، جب عہد ملکہ آئن کے اوائل میں اس میں ترمیم کر دی گئی اور بڑے بڑے عہدہ داران حکومت کا رکن دارالعوام بننا ممکن ہو گیا۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مونٹگیو کے پیش نظر جو جتنا زکلیتیں تھیں، یعنی انگلستان و فرانس، آئن میں سے فرانس میں تو جہاں اختیارات ایک شخص واحد یعنی بادشاہ کی ذات میں مرکوز تھے اور وہ جہاں تھا کرتا تھا، راہ انگلستان، تو اس میں شہنشاہ اور اس کے میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ تینوں اعضاء حکومت کو ایک دوسرے سے آزاد کر دیا جائے۔ جب صورت حال یہ تھی تو کسی قسم کے تعجب کی بات نہیں کہ مونٹگیو نے انگلستان کے مروجہ دستور کو فرانس کے طرز حکومت پر ترجیح دی۔

بہر نوع جیسا ابھی بیان کیا گیا ہے، یہ ناممکن ہے کہ مختلف اعضاء حکومت ایک دوسرے سے بالکل آزاد ہوں۔ سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنی ہے کہ حکومت چند خود مختار اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ادارات کے مجموعہ کا نام نہیں بلکہ اس میں ایک اندرونی وحدت پائی جاتی ہے، اور یہ ادارات اس جائداد کے

تحت ملکہ میں اس ناعدے کی ترمیم کر دی گئی۔ اگر قانون بندوبست کی یہ شرط پائی جاتی تو دستور کا ارتقا بالکل مختلف ہوتا، اور اراکین کا بیڑہ انگلستان جیسے اراکین پارلیمنٹ ہونے کے اس میں نشست دکر سکتے، جس کی وجہ سے بجائے ”کابینہ حکومت“ کے ”ارکیہ کی سی“ صدارتی حکومت“ قائم ہو جاتی، جہاں جس دوزرا جماعت نیا تہی کے سامنے نہیں بلکہ محض صدر جمہوریہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔

اسی طرح اعضاء میں جیسے جسم انسانی میں ہاتھ، پاؤں، کان، ناک، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان اعضاء سیاسیہ کے مابین اعضاء جسمانی سے کہیں زیادہ تعلق پایا جاتا ہے۔ اگر بالمشی سیاسی اعضاء ایک دوسرے سے ایک جہت تک آزاد بھی ہوں تاہم ان میں باہمی تعلق ضرور رہتا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ ان سب میں جو قوت محرکہ ہے وہ ایک واحد سیاسی جسم یعنی مملکت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی غلط ہے کہ یہ اعضاء رستے میں برابر ہیں۔ کوئی ادارہ اس وقت تک کام نہیں کر سکتا تاؤنگیہ اس میں تنظیم نہ ہو اگر کسی قسم کی تنظیم بدون قواعد و قوانین کے ممکن نہیں، لہذا کسی مملکت میں اسی ادارے کو فوقیت حاصل ہوگی جس کے سپر قانون سازی کا اہم کام ہو اور کوئی ایسی حکومت شخصی یا مطلق العنان نہیں کہلائی جاسکتی جس میں قانون کو محض عاملانہ اختیارات حاصل ہوں، لیکن وہ قانون سازی پر حاوی نہ ہو، ضرورت تنظیم کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور وجہ بھی ادارہ مقننہ کے تفویض کی ہے۔ یہ تھا چاہیے ہے کہ چونکہ قواعد و محال دونوں ان بابتوں کا نام ہے جو مملکت تنظیم و انتظام کی خاطر آزاد پر عاید کرتی ہے اس لئے یہ دونوں علی العموم ایک ہی ادارے کے سپرد ہوتے ہیں، اور یہ خیال ہے کہ وہی ادارہ سب پر حاوی ہوگا جسے خزانہ مملکت پر قابو ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی اساس محض ظاہری تفریق اختیارات پر نہیں ہوتی (جیسا مونٹسکیو اور فرانس کے انقلابی سمجھے تھے) بلکہ اس کا دار و مدار ان کا حکومت کی عام روش و طرز کار پر متوقف ہے۔ اگر کسی طرح سے اعضاء حکومت کے مابین کل تفریق بھی ہو جائے تو وہ مملکت کے لئے نہایت مضر ہوگی، اس لئے کہ اسی حالت میں مختلف اعضاء سیاسیہ کے مابین افزائش اور حسد کا مادہ پیدا ہوگا

جس سے مملکت کے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہے۔^{۱۱۴}

اس میں حقیقت کا پہلو۔ اس نظریہ میں جو حقیقت مضمر ہے وہ یہ ہے کہ اگر مختلف اعضاء حکومت کے مابین ایک حد تک تقسیم کار کر دیا جائے تو قانون قدرت کے مطابق ہر عضو کے لئے اپنے متعلقہ امور کو بحسن خوبی انجام دینے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ لیکن یہ خیال کہ تقسیم کار ایسی مکمل ہو سکتی ہے کہ ہر عضو حکومت کو دوسرے سے واسطہ ہی نہ رہے، سراسر غلط ہے، اس لئے کہ ان کے مابین کہیں نہ کہیں تناسل ہونا لازمی ہے۔ مثلاً ہر شخص اس پر تنفیق ہو گا کہ محکمہ عدلیہ کو اپنے مخصوص کام کی نوعیت کی وجہ سے جماعت عالمہ و ادارہ مقننہ دونوں سے آزاد ہونا چاہئے تاکہ جماعت عالمہ کے ارکان سے خلاف قانون افعال پر غیر جانبدارانہ باز پرس کی جاسکے، خود ادارہ مقننہ کو اپنے حدود و اختیارات سے بڑھنے روکا جاسکے، اور قانون کا انطباق بلادرور عایت بڑے چھوٹے پر ہو سکے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عادلوں کے تقرر کا اختیار کسی نہ کسی کو ضرور ہو گا۔ اور قوانین کی شکل کے تعین میں دو یقیناً جماعت مقننہ کے نا اہل رہنما ہوں گے یہ ٹھوس کیوں کہ نظریہ تفریق اختیارات ہی کی برکت ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں عادلوں کا تقرر انتخاب عامہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اور اس کی ترویج کے باعث جو طرح طرح کی رشوت ستانی دہاں عدالت جیسے اہم عضو حکومت میں چلتی ہے وہ اس عظیم شان مملکت کے ماتھے پر

۱۱۴ اس نظریہ کی مزید تنقیہ کے لئے دیکھو گلکرسٹ "اصول سیاسیات" Gilchrist:

Principles of Political Science. باب ۱۲۔

گویا کنگ کانٹیکہ ہے۔ اب اگر عام انتخاب نہ ہو گا تو یا تو جماعت عالمہ عادلوں کا تقرر کرے گی، ورنہ مقننہ، اور جماعت مقننہ کے تقرر میں بھی اسی قسم کی خرابیاں ممکن ہیں جیسے عام انتخاب کی صورت میں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مملکت میں عادلوں کے تقرر کا اختیار جماعت عالمہ کو ہی دیا جاتا ہے گو ایک مرتبہ تقرر کے بعد عادل کے اثر سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور (سوائے سخت بدعلی کی صورت کے) انہیں کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا، نہ ان پر جرمانہ کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ محکمہ عدلیہ کو جو آزادی مختلف خود مختار ممالک میں حاصل ہے اس کا باعث یہی ہے کہ اسے کسی دوسرے محکمہ کے تابع نہیں سمجھا جاسکتا۔ بعض ممالک مثلاً فرانس میں تو نہ صرف عادل محکمہ عالمہ سے آزاد ہیں بلکہ عدلیہ حکومت ان خلاف قانون افعال کے لئے جو سرکاری کارگزاری کے دوران میں سرزد ہوں معمولی عدالتوں میں نہیں بلکہ ان مخصوص ”انتظامی عدالتوں“ کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں

شاہ برس، حسب سابق

شاہ انگلستان میں عادلوں کا تقرر لارڈ چانسلر کی سفارش پر ہوتا ہے اور تاؤٹینکدہ اپنا کام خوش اسلوبی سے رکھے جائیں انہیں علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ فرانس میں وزیر عدلیہ کی سفارش پر صدر جمہوریہ بڑے بڑے عادلوں کا تقرر کرتا ہے۔ جرمنی کے ۱۹۱۹ء والے دستور کی رو سے عدالت عالیہ کے عادل جب تک ان کا جی چاہے اپنے عہدے پر برقرار رہتے تھے اور انہیں اس وقت برخاست نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک ان کے خلاف کسی دوسری عدالت کا حکم نہ ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ کے عدالت عالیہ کے ارکان کی تنخواہ میں کمی قسم کی کمی نہیں کی جاسکتی۔

جو اس تفریق اختیارات کے اصول کے تحت خاص طور پر اعمال حکومت کے مقدرات کے لئے قائم کی گئی ہیں۔

اس اصول کی ترویج کی وجہ سے دنیا کی دستوری حکومتوں کی روشنی میں ایک وہ ممالک جہاں ”کابینی“ یا ”ذمہ دار“ حکومت رائج ہے، جیسے انگلستان، فرانس، کینیڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، یعنی جہاں مجلس کا مینہ، جو جماعت عالمہ کے سرگروہوں پر مشتمل ہوتی ہے، جماعت مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، اور اس کے اکثر افراد اسی جماعت مقننہ کے افراد میں سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور دوسرے وہ ممالک جہاں صدارتی یا غیر ذمہ دار حکومت رائج ہے جیسے ممالک متحدہ امریکہ اور اکثر دوسری امریکی ملکیتیں، یعنی جہاں جماعت مقننہ کا جماعت عالمہ کے تقریر یا برخاستگی پر مطلق کسی قسم کا قابو نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ہر حکومت اپنے ملک اور اپنے ماحول کے تاریخی ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہے، اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان دونوں میں سے کوئی دوسرے طریق پر فوقیت لئے ہوئے ہے۔ ان دونوں قسم کی حکومتوں کا مفصل ذکر متعاقب کیا جائے گا؛ یہاں صرف یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں ایک طرف تو انگلستان جیسے ”پارلیمینٹری“ ملک میں جماعت مقننہ جماعت عالمہ کے ہر فعل کی باز پرس نہیں کرتی اور اکثر ایسے معاملات جیسے جنگ، صلح نامہ، اور فوج کی تفصیلی کھلا

نہ فرانس کی ”انتظامی عدالتوں“ کی بابت دیکھیں نے اپنی کتاب ”فانون و ملٹری“

Dacey: Law of the Constitution.

باب ۱۲ میں مفصل بحث کی ہے۔

عام انتظامات ملکی، خارجی معاملات وغیرہ کو ایک حد تک جماعت عالمہ کی صوابدید پر چھوڑتی ہے۔ اگر خود جماعت عالمہ جماعت مقننہ ہی کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے؟
 وہاں ایسے ملکوں میں بھی جہاں ”غیر ذمہ دار حکومت“ رائج ہے، جماعت مقننہ (یا اس کا کوئی جزو) بہت سے عالمانہ امور میں درخیز رہتی ہے، مثلاً مالک متحدہ امریکہ میں مجلس سنیات کے سپر و اٹلی عہدہ داران جمہوریہ کا مواخذہ کیا گیا ہے جس میں جماعت مقننہ کا دوسرا جزو یعنی دارالائسین بمذولہ مستغیث کے ہوتا ہے، اور جہاں تک حاصل کا تعلق ہے جماعت عالمہ کو کانگریس کے سامنے تسلیم خم کرنا پڑتا ہے پھر تقریباً ہر ملک میں جماعت عالمہ کے رکن اٹلی کو قوانین پر حق امتناع حاصل ہوتا ہے خواہ وہ کیسا بھی کمزور یا محدود کیوں نہ ہو، اور ہر ملک کے ہر محکمہ کو اندرونی تنظیم کے لئے قواعد بنانے اور ان کی تعمیل کرنے کا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

آخر یہ بات۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ان ممالک میں جہاں دستوری حکومت

ایمان حق امتناع... انگلستان میں بادشاہ کو قانوناً حق امتناع حاصل ہے لیکن روئے عمل سے اس سے کام میں نہیں لایا گیا۔ صدر جمہوریہ فرانس کو براہ راست حق امتناع حاصل نہیں ہے لیکن وہ کسی قانون کے باوجود کہہ سکتا ہے کہ ”تا وقتیکہ دولوں اور ان میں نظر ثانی نہ کر لی اس وقت تک اس کا نفاذ نہیں کیا جائے گا“ اگر دوبارہ وہی قانون اٹھائے اور ان میں از سر نو منظور ہو جائے تو پھر اس کا نفاذ کر سکتے ہیں۔ جرمنی میں ۱۹۱۹ء کے دستور کے بموجب اقتدار ایک ایسے اندر کسی ایسے قانون کے نفاذ پر مجبور تھا جسے جماعت مقننہ سے منظور کر لیا ہو لیکن اگر وہ چاہتا تو اس کا فیصلہ طلب بھی کر سکتا تھا۔

ماجھ ہے، یعنی جہاں کے سیاسی تنظیم کا دار و مدار کسی نسبتاً مستقل دستور کے تحت ہوتا ہے، وہاں کسی نہ کسی قسم کی تفریق اختیارات لازمی ہے۔ اس کے عکس حال میں ایسی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں جہاں کا دستور مطلق العنان حکومتوں کی طرح کم و بیش ایک فرد واحد کی مرضی کا تابع ہوتا ہے، چنانچہ آج کل جرمنی میں ہٹلر ملک کے سیاہ و پسیدہ کا مالک ہے، اور ملک کی تمام سیاسی کل اس کی ذات کی تابع ہے۔ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جرمنی کے تمام بڑے بڑے عہدہ داروں سے ہٹلر کی ذات کی وفاداری کا حلف لے لیا گیا ہے، اور اس آمر کا جرمنی پر اس درجہ اثر ہے کہ ایک جرمن دوسرے جرمن کو "ہٹلر کی جے" کہہ کر سلام کرتا ہے۔ جرمنی میں وہاں کی پارلیمنٹ نے اپنے تمام اختیارات مجلس کا مینبر کے سپرد کر دیے ہیں جس کا صدر اور رہنما ہٹلر ہے۔ ایسے مالک میں اگر تفریق اختیارات ہو تو بھی اس کا دار و مدار ایک شخص کی ذات اور اس کی مرضی پر ہو گا، اور جو مقصد اس تفریق سے ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ وہ چیز جسے ہم آزادی تصور کرتے ہیں آمرتوں میں محفوظ ہوتی ہے اور آمر کے سیاسی اسلحہ میں ایک شہنشاہ یہ بھی ہوتا ہے کہ خفیہ سراغ رسانی کے ذریعے سے قہر کی تنقید کو ممکن قرار دیتے۔

۱۹۳۲ جرمنی کی سیاسی مرکزیت کے ارتقاء کے لئے دکھو شرمادہ "میدان دستور سازی میں حالی کے تجربات"۔ *Sharma: Recent Experiments in Consti-tution making* صفحہ ۱۹، باب ۳۔ مارچ ۱۹۳۶ء میں جب ہٹلر نے "امن و

الن کے ساتھ" ایتھروائیٹ سے سیکل کا علاقہ لیتے تو سب سے پہلے جرمن عہدہ داروں میں سے جو جرمن قبضہ ل کر لے گئے تھے ہیں، جرمن خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ بھی تھا۔

Forms of Govt.

باب ۱۳ حکومت کی قسمیں

سیاسی تنوع۔ ارسطو کا تقسیم تالون سازی کی بہت۔ بادشاہی اور جمہوریت۔ خودیہ و دناقیہ۔

ذمہ دار و غیر ذمہ دار۔ تحریری اور دواچی و ساتیر

سیاسی تنوع۔ مختلف شعبہ جات ضروریات حکومت کو سمجھنے کے بعد
اب حکومت کی مختلف قسموں کو سمجھنا دشوار نہ ہوگا۔ سیاسی اداروں کا انحصار ملک اور
آبادی کی ضروریات اور تاریخی و جغرافیائی کیفیات پر ہوتا ہے، اس لئے جیسا اور بیان
کیا جا چکا ہے، یہ لایا ہے کہ ہر ملک کے سیاسی ادارے دوسرے ملک سے
ممتاز و ممتاز ہوں گے۔

اگر ہر ملک کی سیاسی ضرورتیں اور انہیں پورا کرنے کے طریقے ایک ہی طرح
ہوتے تو پھر کسی قسم کا سیاسی تنوع ممکن ہی نہ ہوتا، اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ
ہر ملک اپنی سیاسی لحاظات کے مختلف راستے ڈھونڈتا ہے، اور گو اس میں شبہ نہیں
کہ وہ دوسرے ملکوں کے تجربات سے مستفید ہوتا رہتا ہے تاہم سیاسی ارتقاء کی جو کل

وہ قبول کرتا ہے وہ جزواً یا کلاً دوسرے ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر ملک اس نوع کے ایک سے ہے کہ وہ آبادی ملک کی منظم سیاسی کیفیت کا نام ہے لیکن اگر ہم ذرا غائر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ رقبہ، حکومت کے مرکز، ہیئت حاکمہ کے تعین، افراد کے حکومت کے ساتھ تعلقات، مختلف حصہ جات ملک کے مرکز کے ساتھ تعلقات اور بہت سے دوسرے ضمنوں میں ایک ملک دوسری ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ اس اعتبار کا دار و مدار فی نفسہ ملک کی ہیئت پر نہیں ہوتا بلکہ طرز حکومت یا دستور پر ہوتا ہے اور چونکہ دستور میں بہت سی تفصیلی کیفیات، مثلاً غائبہ، مقننہ، عدلیہ اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کا یقین ہوتا ہے اس لئے حکومت کے اعتبار سے ملک کی قسمیں متعدد عنوانات کے تحت کی جاسکتی ہے۔

ارسطاطالیس کی تقسیم۔ بنیادی سب سے سادہ اور شاید سب سے قدیم تقسیم حکومت وہ ہے جو آج سے دو ہزار برس پہلے ارسطاطالیس کر گیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ”سیاسیات“ میں حکومت کے اعتبار سے ملک کی دو گونہ تقسیم کی ہے، ایک باعتبار مقاصد کے اور دوسری باعتبار شرکت حکومت میں اس کے نزدیک حکومت دو طرح کی ہو سکتی ہے، ایک وہ جو تادم آبادی کے مفاد کو ملحوظ رکھے اور دوسری وہ جو صرف حاکموں کے مفاد کو ملحوظ رکھے، اور چونکہ خود غرضانہ عمل اطلاق اعتبار سے گرا ہوتا ہے اور ملک کے حقیقی مقاصد میں جملہ آبادی کے مفاد کا

حصول ہے، اس لئے وہ تمام آبادی کے مفاد کو ملحوظ رکھنے والی حکومت کو افضل و اولیٰ سمجھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ حکومت یا تو ایک ہی شخص پر مرکوز ہوگی ورنہ چند اشخاص پر یا تمام باشندوں سے مرکب ہوگی۔ یونانی و سائیر سے مثالیں دے کر وہ کہتا ہے کہ حکومت کی خوبی یا خرابی کا دارو مدار جس طرح مقاصد حکومت پر ہے اسی طرح ترکیب حکومت پر بھی ہے۔ اگر حکومت کا مقصد تمام باشندوں کے مفاد کا حصول ہے تو پھر بہترین حاکم ایک بادشاہ ہوگا، اس لئے کہ وہ سیاسی سازشوں اور حرص و آز سے بالاتر ہوگا۔ اسی اصول کے تحت اگر بادشاہ کی بجائے اعلیٰ ترین اختیارات کسی جموعے کے قبضے میں ہوں اور مقصد سب کا مفاد ہو تو بہترین حکومت وہ ہوگی جو چند امیر مرکب ہو، اور یہ نہ ہو تو خیر وہ حکومت ہی اچھی ہے جو تمام باشندوں سے مرکب ہو اور جس کا مقصد کسی ایک حصہ سے آبادی کا مفاد نہ ہو بلکہ تمام طبقوں کے کیاں مفاد کا حصول ہو۔ پہلی قسم کو وہ بادشاہی، دوسری کو امیر سری اور تیسری کو عوام سری کا لقب دیتا ہے۔ اب ان حکومتوں کو سلجیجیجین میں مقصد تمام ملک کے مفاد کا حصول نہیں بلکہ صرف حکام کی بہتری ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں حکومت اعلیٰ اخلاقی معیار سے گر جاتی ہے تاہم زیادہ تر آبادی کا مفاد اکثر آبادی کے مفاد سے بالاتر ہے، چنانچہ اس ضمن میں بہترین حکومت وہ ہے جو تمام طبقوں پر مشتمل ہو جسے وہ عموماً کہتا ہے، اس سے خراب تر وہ جو صرف ایک طبقہ پر مشتمل ہو جسے وہ چندی کا لقب دیتا ہے اور خراب ترین وہ ہے جس میں صرف ایک حکمران ہو اور اس کا مقصد اعلیٰ صرف یہی ہو کہ وہ تخت پر بیٹھا رہے

اور اپنے آرام و آسائش کی فکر میں لگا رہے؛ اس آخری طرز کو وہ خود سری کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔

بنظائر تقسیم نہایت قطعی اور دل خوش کن معلوم ہوتی ہے، لیکن جس لمحہ ہم ان اقسام میں سے کسی ایک قسم کا انطباق دنیا کی کسی مملکت کی واقعی سیاسی حالت سے کرتے ہیں تو ہمیں قدم قدم پر مشکلات نظر آنے لگتی ہیں۔ کوئی بڑی یا چھٹی مملکت ایسی نہیں ملے گی جس میں کوئی واحد حکمران بغیر دوسروں کی مدد کے حکومت کرتا ہو یا کر سکتا ہو، نہ کوئی ایسی مملکت ملے گی جس میں عموم براہ راست بغیر اعیان یا عمال کی مدد کے قانون سازی کرتے ہوں، عالمائے اقتدار رکھتے ہوں اور عدالت کا کام انجام دیتے ہوں۔ اسی طرح کسی انسان کے مقاصد میں صرف کچھ نہ کچھ خود غرضی کا

۱۳۔ تقسیم مفصلہ ذیل نقشے سے واضح ہو جائے گی۔

| مرکز حکومت | صحیح | ناسد |
|----------------|--------------|-------------|
| شخص واحد | (۱) بادشاہی | (۶) خود سری |
| ایک طبقہ آبادی | (۲) امیر سری | (۵) چند سری |
| تمام طبقے | (۳) عوام سری | (۴) عجمیت |

اس میں جو بند سے دے گئے ہیں وہ اسطرح ایسی ترجیح کے اعتبار سے دے گئے ہیں۔
 ۱۔ آج کل کے ان ممالک میں جہاں آمریت کا دور دورہ ہے، جیسے روس، اٹلی اور جرمنی یا جہاں شخصی راج رہا ہے جیسے سلطنت مغلیہ یا انگلستان کا عہد یوڈیا فرانس بعد لوٹی (۱۷۹۳ء)

یہ ملو ضرور ہوتا ہے خواہ وہ کتنی ہی خود فراموشی کیوں نہ ہو، اور ایسی حکومت کا وجود نہایت دشوار ہے جس کا حکمران کلنتہ اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہو اور اپنی رعایا ہی کے مفاد کے لئے حکومت کرتا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ ارسطاطالیس کے کچھ ہی دن بعد جب روما کا دور دورہ ہوا اور اتفاقاً ارسطاطالیس کے ایک ہم ملک پولی توں کو قید ہو کر روما میں رہنا پڑا تو اس نے روما کے دستور کو بجا سے ارسطاطالیس کے

(بقیہ نوٹ ص ۲۳۵ کا) وہاں بھی بادشاہ کو اپنے امرا اور اپنے دور افتادہ صوبہ داروں پر اتنا دار و مدار کرنا پڑتا ہے کہ یہ امرا اور صوبہ دار بعض مرتبہ "بزرگ و اعظم" میں اپنے آقا کی بربادی کر لے سکتے ہیں۔ دوسری طرف آج کل کے "آزاد سے آزاد" ممالک میں جہاں انتہائی عوامیت کا دور دورہ ہے، جیسے سوئٹزرلینڈ، فرانس و جدید ممالک بحرہ ہالک، انھیں بھی قدیم بادشاہی کی جھلک "صدر جمہوریہ" رئیس مملکت "کی شکل میں نمایاں ہے۔

۵۷۷ کسی خالص دیوی حکمران میں اس اعلیٰ اخلاق کی مثال ملتی تقریباً ناممکن ہے کہ وہ کوئی اور مخلوق اعلیٰ میں زندگی بسر کرے، لیکن اس کی ہمسرہ رعایا "دن و دلی رات چوٹی ترقی کرتی رہے۔ تاریخ یورپ میں ہم "رعایا پرورد حکمرانوں" کا ذکر پڑھتے ہیں لیکن سب سے زیادہ رعایا پرورد بادشاہ بھی اس معیار پر نہیں پہنچتے۔ شاید ایک ہی ملک اور ایک ہی زمانہ ایسا ہے جب حکمران واقعی اپنے ذاتی آرام کے خیال کو بھول جاتا تھا، موٹا کھاتا اور موٹا پیتا تھا اور ہرگز اپنے ملک اور اپنی قوم ہی نہیں بلکہ نئی نوع انسان کے مفاد کی فکر میں رہتا تھا، اور وہ زمانہ ان پڑھ، پیوند پوش، جو خور سادہ منس پیغمبر کی صلہ اور ان کے خلفائے راشدین کا زمانہ ہے۔

کسی ایک طبقہ کے تحت لائے گئے ایک مرکب دستور قرار دیا جس میں ملکیت، اعیانیت اور دولت عامہ قیضوں کے عناصر موجود تھے۔ پونی ہوس کا یہ حکم ہر انسانی حکومت پر لگ سکتا ہے، اس لئے کہ کوئی ایسی حکومت نہیں جس میں یہ عناصر مزبور نہ ہوں، اور حیرت تو یہ ہے کہ کس طرح تقریباً دو ہزار برس تک ارسطاطالیسی خیال برابر میدان سیاست پر جاری رہا اور بالکل حال کے زمانے تک کیسے اسے ایک سائنسی عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

اس مفالطہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ حکومت میں ایک شخص یا ایک طبقہ اس قدر غالب ہو سکے کہ اس کی وجہ سے دوسرے طبقات متاثر نہ ہوں اور دستور پر نظر ڈالنے والا سمجھتا ہے کہ حکومت بس اسی ایک شخص یا طبقے پر مرکوز ہے، دراصل ایک یہ ممکن ہے کہ یہ نظام غالب شخص یا طبقہ شخص نمائشی ہو اور حقیقی عمل کا دار و مدار ایک بالکل دوسرے جزو حکومت پر ہو۔ مثال کے طور پر انگلستان کے

ڈکننگ: Political "سیاسی نظریات" قدیم و جدید

Theories, Ancient and Modern.

ڈکننگ: قدیم و جدید سیاسی نظریات کے آئینہ میں شہرہ برآئی سیاسی فلسفہ، قدیم و جدید اپنی کتاب "نظم حکومت عالم"

Bluntschli: Lehre vom modernen Staat.

ترجمہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کی فصل ۶ باب ۱ کے ابتدائی کتبائے کہ "دو ہزار برس سے زیادہ ہوئے کہ ارسطاطالیسی نے انکال مملکت کا تعین کیا تھا اور آج ہم اس کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔"

بادشاہ اور وہاں کے وزیر اعظم کو پیش جاسکتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حکومت کا دار و مدار ایک بڑی حد تک وزیر اعظم پر ہوتا ہے اور بادشاہ کو سولے صلہ اس نیک دینے یا تنبیہ کرنے کے "علا کوئی سیاسی اختیارات نہیں ہیں؛ لیکن شاہ انگلستان کے ساتھ جو بزرگ و اعظام وابستہ ہوتا ہے وہ وزیر اعظم کو حاصل نہیں ہوتا اور نہ شاید وہ اس کا خواہاں ہوتا ہے۔ گو یا شاہ انگلستان حکومت کا ایک ناگشتی عنصر ہے اور وزیر اعظم کا رآمد عنصر۔ تاہم اس سلسلہ طالیس کے نظریہ میں حقیقت ضرور پوشیدہ ہے کہ ملکہ یا حاکم میاں جوازِ حمت و دوا یک رجب جماعت کا نام ہے، ایک شخص یا ایک طبقہ یا بہت سے طبقات ضرور دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں، اور غلط ہے تو صرف یہی کہ وہ غیر ممتاز طبقہ است کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔

قانون سازی کی اہمیت۔ اس سلسلہ طالیس زیادہ تر یونانی شہری

شہ و شہ کے ناشی اور کارآمد عناصر ہیں یہ کامہر اچٹ کے ہے۔ دیکھو اس کی کتاب "نور انگلستان" Bagehot: English Constitution باب ۱۔

یہ ناشی اور کارآمد عناصر کے ظاہری تزک و حشام کے درمیان جو تباہ ہے وہ انگلستان میں شاہ خارج حشام کی تاجپوشی اور مٹرنیول چیمبرلین کے وزارت عظمیٰ پر تقریر سے معلوم ہوتا ہے۔ بالکل نہایت سادگی سے لگے اور بادشاہ کے سامنے اپنا استعفا پیش کیا اور اس سے بھی زیادہ سادگی سے چیمبرلین "بلائے گئے" اور بادشاہ نے تختی ملان وزارت سپرد کر دیا۔ کہ کوئی جیوس نکلا، نہ کوئی دعوت ہوئی نہ کوئی پڑی ہا

ملکیتوں کے دساتیر سے اپنے نظریات کا امتحان کرتا ہے اور غیر یونانی ملکیتوں کو (جنہیں وہ "بربری" کا لقب دیتا ہے) جس میں ایران جیسی متمدن اور مذہب سلطنت شامل سمجھی جاتی تھی، بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر یونان میں بھی قانون کا ایک نہایت ہی مقدس چیز سمجھا جاتا تھا، اور گواہیاں دوسرے ملکوں کی طرح اسے خود ایک مبدوء کا حکم سمجھا جاتا تھا، استاد زمانے سے اس کا تقدس تو قائم رہا لیکن قانون سازی کی کوئی خاطر خواہ کل نہیں بنائی گئی، بلکہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ قوانین کو تبدیل کرنے کا اہم کام کسی بڑے ممتاز و فریضہ مند کے سپرد کر دیا جائے۔ ایٹنز میں تو قانون سازی کو اتنا اہم سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی لیے اس کا قانون کی تحریک کرتا جو کسی موجودہ قانون کے خلاف ہوتا اور ایک سال کے اندر اس سے کوئی بڑے نتائج پیدا ہوتے تو ہر شہر ہی کو اختیار ہوتا کہ وہ اس کے خلاف استغاثہ دائر کرے، اور جرم ثابت ہو جانے پر اسے زیر کاہلہ پٹا پڑتا۔^۱ تو زمین کی اس اہمیت کے مد نظر بعض معاشروں میں قانونی اصول کے تعین کا کام خدا پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرح ایک جدید قسم کے حکومت کی بنیاد پڑی جسے وسیع معنی میں خلافت اللہ یا دین راج کہنا چاہئے اور جس کے تحت حکومت محض خدا کی

۱۔ دیکھو مین، "Law: Ancient Law" باب ۱
 ۲۔ اس کے بارے میں پارٹمن "د" "تحریک خلافت آئین" کے لئے کیمرگراٹ، "تاریخ یونان قدیم"
 تفصیل دیکھو: *History of Greece condensed*
 لندن ۱۹۰۶ء، ced & edited by Michell & Coopers.

تایم مقام اور خدائی احکام کی عمل بن گئی۔ ایسی حکومتوں میں جہاں خلافت کے اصول پر عمل ہوتا تھا، حکومت کے اختیارات ہمیشہ ان احکام کے اثرات سے محدود رہتے تھے جنہیں خدائی احکام سمجھا جاتا تھا اور ظاہر ہے کہ ان کا رنگ ایک بڑی حد تک مذہبی ہوتا تھا۔ گو حکمران جماعت کبھی کبھی اپنی خواہش کے مطابق علماء قانون سے خدائی احکام کی تائید کرانی بھی لیکن خود یہ احکام بالکل اٹل سمجھے جاتے تھے اور کوئی عضو حکومت ان کے اصول سے ذرا بھی مغرب نہیں کر سکتا تھا۔ یہ طریقہ رفتہ رفتہ کم و بیش عالمگیر ہو گیا، یعنی مشرق میں یہودی مملکت، ہندو مملکت جس میں برہمن کو ”بہاراج“ کہا جاتا تھا اور اس کا رتبہ حکمران سے بھی بڑا سمجھا جاتا تھا، اور خلافت اسلامیہ اس قسم کی حکومتیں تھیں، اور مغرب میں ایک طرف پوپ اور دوسری جانب شہنشاہ دونوں اپنے آپ کو خدا کا نائب تصور کرتے تھے۔

اس کے دوش بدوش کلیئہ دنیوی طرز کے حکومتیں تھیں، جو ابتدائی تو ان دینی حکومتوں کے ماتحت باجگزار تھیں لیکن آخر کار جنہوں نے ان سے اپنی خود مختاری اور آزادی کو منازکہ چھوڑا۔ اس طرز کی حکومتیں مشرق میں عرغولی، غوری اور مغرب میں انگلستان اور فرانس اور ولندیزی مملکتیں تھیں جنہوں نے آخر خلافتی حکومتوں کو مچھ گھسٹ کر اٹھا کر چھینک دیا اور خود آزاد ہو گئیں۔ ان جدید دنیوی حکومتوں اور پرانی دینی مملکتوں کے اہن جو امتیاد ہے وہ یہی ہے کہ ان میں نہایت بڑا دی سے قانون کشی ہوتی ہے اور اگر کوئی احکام خدائی سمجھے جاتے ہیں تو بھی روزمرہ بود و ماند کے معاملات

میں ان پر زیادہ لحاظ نہیں کیا جاتا اور انہیں اسی زمانے کے لئے بہترین سمجھا جاتا ہے جب وہ "ماقد" ہوئے تھے۔ زمانہ حال میں نیم دینی طرز سے دنیوی طریق طرف ارتقا کی ایک نہایت دلچسپ مثال جمہوریہ ترکی سے ملتی ہے جہاں یہ ارتقا ۱۹۲۵ء میں مکمل ہو گیا ہے۔

بادشاہی اور جمہوریت بعض مرتبہ حکومت کے اعتبار سے ملکوں کی تقسیم کو کیت اور جمہوریتوں کے درمیان کی جاتی ہے۔ اول تو یہ تقسیم اسی پرانی اصطلاح کی ایک بڑی جھوٹی شکل ہے اور دوسرے اگر غور کیا جائے تو ہر ایک بادشاہی میں تھوڑا بہت جمہوری عنصر پایا جاتا ہے اور ہر ایک جمہوریہ میں بادشاہی عنصر بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت اور بادشاہی میں تباہی ہے اس لئے کہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں کسی بادشاہ کے لئے جگہ نہ ہو۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ دنیا بادشاہیت کے اصول سے پیدا ہوا ہے بلکہ بغیر کسی شخصی مرکز کے حکومت کا چلنا محال ہے، اسی لئے عمومی سے عمومی جمہوریتوں میں بھی کسی شخص کو ایک سال کے لئے (جیسے فرانس میں)

۱۳ ارتقا کے دلچسپ وارج حسب ذیل ہیں :-

(۱) ابتدائے "خلافت" آل عثمان بعد سلطان سلیم خاں ثانی ۱۵۱۷ء

(۲) عزل سلطان و خلیفہ عبدالوحید محمد خاں سادس ۱۹۲۲ء

(۳) عزل خلیفہ عبدالحمید خاں ۱۹۲۲ء

(۴) ترکی جمہوریہ دوسرے پرتو نکال دیا جاتا ہے کہ جمہوریہ ترکیہ کلاس کاری نہ رہا بلکہ ۱۹۲۴ء

گویا دستوری بادشاہ بنا دیا جاتا ہے جمہوریوں میں اس ملوکى عنصر کی کیفیت یہ ہے اس وقت پوری طور پر واضح ہو جائے گی جب ہم جماعت عاملہ پر مبنی بحث کریں گے یہاں یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ایک طرف تو انگلستان کے بادشاہ اور فرانس کے صدر کے اختیارات میں کوئی فرق نہیں اور دوسری جانب مالک متحدہ امریکہ کے صدر کے اختیارات بہت سے بادشاہوں کے لئے قابل رشک ہیں۔ اسی طرح کوئی ملوکیت ایسی نہیں جس میں بادشاہ براہ راست ہر امر کے متعلق قانون بنائے اس کا لٹا ذکر ہے اور اسے حالات و واقعات پر منطبق کر لیتے۔ قدیم چھوٹی چھوٹی پڑوسی ملوکیتوں میں بھی اس قسم کا براہ راست انتظام ناقابل عمل تھا اور یہ اس وقت بھی لاپتہ تھا جب چند اعیان و اعدا، خواہ وہ فائدہ انداز ہی کے رکن ہوں یا نہ ہوں بادشاہ کے صلاح کار یا اس کے عیال ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ آج کل کی پیچیدہ ملوکیتوں میں تو یہ بات کلیتہً ناقابل عمل ہے کہ اس کی کسی نہ کسی قسم کی صلاح مجلس نہ ہو اور وہ بلا شرکت غیر سے اپنی رہا یا حکومت کرے۔

فردیہ و عوامیہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کو ارسطو طائیں کی طرح اس

سلسلہ نام نہاد مطلق العنان بادشاہوں میں بھی کوئی نہ کوئی صلاح کا مجلس ضرور ہوتی ہے جیسے شاہانِ میٹور کے انگلستان میں پری کونسل، قدیم ہندوستانی اور مہاراجا اور سلطنت عثمانیہ کیس میں ”درہال“ ۱۵۹۸ء پڑوسی لڑی ملوکیتوں کی سب سے نما و مثال قدیم ملوکى روم ہے جہاں کا بادشاہ ایک نہایت ہی ختم رقبہ پر حکومت کرتا تھا، یہاں بادشاہ کے صلاح کار سیناٹ یا ”مجلس معین“ شاہی ”مطلق العنانی“ کے زائے میں بھی برابر قائم تھی۔

کی ترکیب یا اس کے متاد حصص کے نام پر معنون کرنا اس لئے مغالطہ آمیز ہے کہ اس میں بہت سے عناصر ترکیبی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اس نوع کی تقسیم برابر پچھلی صدی کے اواخر تک مسئلہ رہی اور پہلا شخص جس نے اس کی تنقید کی پروفیسر سر جان نیلی تھے۔ جنھوں نے کیمبرج میں ایک سلسلہ درس میں اس کا بھلان کیا تھا۔ اور ایک بالکل جدید تقسیم دنیا کے سامنے پیش کی۔ ان کا بیان ہے کہ اول تو ارسطاطالیس کی تقسیم مغالطہ آمیز ہے اور دوسرے آج کل کی کسی ملکیت بھی اس کا انطباق نہیں ہو سکتا، جس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ارسطاطالیس کے خیالات کا ماخذ محض شہری ملکیتیں تھیں اور اس نے اپنے زمانے کی وسیع ”بربری“ (یا غیر ملی ملکیتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ سبکی کے نزدیک علاوہ ”شہری ملکیتوں“ کے کچھ دوسرے کی ملکیتیں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جن کا ہر حصہ ایک ہی مرکز کے ماتحت ہوتا ہے جیسے انگلستان، اور دوسرے وہ جس کے مختلف حصے ایک حد تک مرکز سے خود مختار ہوتے ہیں جیسے مالک متحدہ امریکہ، ان میں سے پہلی قسم کی ملکیت کو وہ فرد یہ اور دوسری کو دفاقیہ کا لقب دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ بعض زد کے ایسے ہوتے ہیں کہ گو اس کے مختلف اجزاء مرکز سے خود مختار نہیں ہوتے لیکن

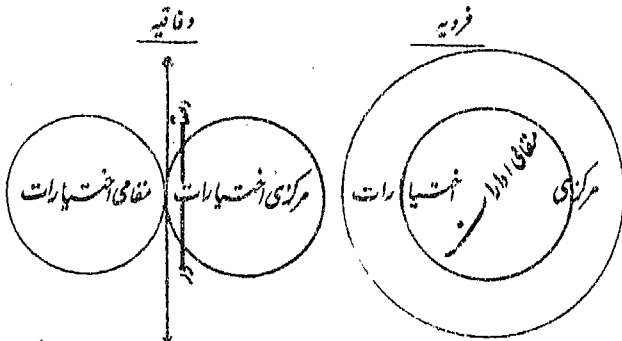
۱۳ سبکی ”التقریب علم ریاست“ Seeby: Introduction to Political Science. ترجمہ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۹ء خطبہ ۲۔

۱۴ شہری ملکیت کے لئے دیکھو جلد اول، باب ۴، عنوان ”یونان“

۱۵ دیکھو جلد اول، باب ۲، عنوان ”ریاست“ (بقیہ نرطی ص ۲۴۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

خود مرکز کی طرف سے ان اجزاء کو وسیع اختیارات دیدئے جاتے ہیں، ایسے فریوں کی شائد سب سے ممتاز مثال انگلستان کی ہے جہاں مرکزی حکومت مقامی معاملات میں کم سے کم مداخلت کرتی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ ان کے مخصوص حلقہ اختیار پر مطلق مداخلت نہیں کرتی، لیکن ساتھ ہی، جو کچھ بھی اختیار راستہ ان مقامی ادارات کو حاصل ہیں وہ سب کے سب مرکزی حکومت ہی کے تفویض کئے ہوئے ہیں، اور ان میں وہ جب چاہے اور جیسے چاہے ترمیم کر سکتی ہے۔^{۱۹} دوسری جانب ایسے مجموعے بھی ممکن ہیں جہاں ہر مملکت اپنے سیاسی معاملات میں کلیدی آزاد ہو کر ساتھ ہی خواہ کسی خطرے سے

(بلیو بٹ ملنگ کا)۔ اسے فریہ اور وفاقیہ کا فرق حسب ذیل شکل سے سمجھ لی آجائے گا:-



شک یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہیے کہ باوجودیکہ ملک متحدہ امریکہ کی ریاستیں اپنی ملک فرمے ہیں لیکن ان کے مقامی رقبات خصوصاً بلدیات کے مشوروں کا دار و مدار ریاستی حکومتوں پر نہیں بلکہ ان رقبوں کے باشندوں کی عام رائے پر ہے۔

خوف زدہ ہو کر رو نہ خاص مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے ایک مرکزی کل برائے ایسے مجموعوں کی مثال سوئیزستان کے ابتدائی مجموعے سے دی جاسکتی ہے جس میں کوئی مستقل مرکزی ادارہ نہیں تھا اور نہ کوئی "صدر مملکت" تھا۔ حال کے زمانے میں اس کی بنی مثال وہ سیاسی شکل ہے جو شام میں امریکہ میں قائم ہوئی، جس میں نہ کوئی صدر تھا، نہ عدالت نہ مستقل جج، اور جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جائے، ایسے مجموعوں کو سبکی "عہدیت" کا لقب دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہ سبکی کی اس تقسیم میں کتنے ہی استقامت کیوں نہ ہوں لیکن ارسطو کا اس کے تقسیم کی بہ نسبت یہ سیاسی واقعات و حالات کے کہیں زیادہ مطابق ہے۔ اس میں جو سب سے بڑا سقم ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف شہری مملکت کا عنوان جدا گانہ قائم کیا گیا ہے اور دوسرے "عہدیت" کو مملکت قرار دیا گیا ہے۔ "شہری مملکت" ہر جہر اہم ایک "مرکزی فردیت" تھی اس لئے کہ اس میں رتبے کے مختصر ہونے کی وجہ سے ہر ایک حصہ مرکز کے کلیتہً تابع تھا، چنانچہ اس کا ایک جدا گانہ عنوان قائم کرنا بے سود تھا، دوسرے جب عہدیت میں مختلف ملکوں اپنا انفرادی وجود قائم رکھتی ہیں تو پھر جو نیا ادارہ قائم ہوا

۱۳ الفاظ "وفاقہ" اور "عہدیت" بعض مرتبہ ایک میں مملکت کے لئے متبادل طور پر بھی استعمال ہوئے ہیں جیسے سوئیزستان کو (غلطی سے) "عہدیت سوئیزستان" بھی کہتے ہیں اور "وفاقہ" بھی حالانکہ دراصل وہ وفاقہ ہی ہے۔

وہ نئی مملکت نہ ہوگی بلکہ اس سے بہت زیادہ وسیلہ وصالاً مجموعہ ہوگا جس کی بقا کا سوال خود مختلف مملکتوں کی خوشی پر منحصر ہوگا نہ کہ مرکزی ادارات پر در آنجا بلکہ مملکت کی وجہ وجود ہی یہ ہے کہ ایک مستقل ادارہ قائم ہو جائے۔ گویا سرہانہ سبکی کے اصول کو پیش نظر رکھ کر مملکت کی طرف دو ہی قسمیں ہوں گی ایک فرد یعنی وہ مملکت جس میں سیاسی و مقامی جملہ ادارات کا دار و مدار مرکزی ادارات پر ہے اور دوسرے وفاقیہ یعنی وہ مملکت جس میں مختلف اجزاء بعض معاملات میں مرکز کے تابع ہیں اور بعض میں خود مختار ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور قسم کی "مملکت" ہے جس کی طرف سبکی اور منتخبی دونوں نے اشارہ کیا ہے۔ نووا میسویں صدی عیسوی میں کم سے کم دو مملکتیں ایسی تھیں جن کے اجزاء کے نقطہ رائے لمس وہاں کے بادشاہوں کی ذات تھی؛ یہ دو مملکتیں سوئیڈن، ناروے اور آسٹریا ہنگری تھیں۔ ان میں سے ناروے سوئیڈن سے بغیر کسی قسم کی ایلانی جھگڑے کے ۱۹۰۵ء میں علیحدہ ہو گیا اور اسپین نے ایک جداگانہ بادشاہ مقرر کر لیا اور آسٹریا ہنگری کی سلطنت کا جنگ عظیم سے فائدہ کر دیا۔ اب جنگ عظیم کے بعد تقریباً ہی کیفیت برطانوی قلمروں کی ہو گئی ہے جنہوں نے پہلے ۱۹۲۲ء کی کانفرنس میں اعلان کیا (اور اس اعلان کی سنہ ۱۹۲۳ء کے "قانون ویسٹ منسٹر" کے ذریعے سے برطانوی پارلیمنٹ نے توہین کر دی) کہ برطانوی قلمروں ایک دوسرے سے اور انگلستان سے بالکل آزاد ہیں اور ان کا آپس میں صرف ایک ہی رشتہ ہے اور وہ بادشاہ کی ذات ہے۔ اس اصول کا امتحان اس وقت ہوا جب ۱۹۳۷ء اور

سلسلہ ۱۹۴۷ء میں اترستان میں ڈپٹی ولیہ آگے "فیناٹیل" فریق کو (جو ابتدا ہی سے جمہوری اصول کا حامی اور انگلستان کا مخالف تھا) وہاں کے پارلیمنٹ یعنی "ڈائل" میں اکثریت حاصل ہوئی اور چشم زدن میں نئے صدر اترستان نے ایک طرف تو اس بات کی تحریک کی کہ ڈائل کے اراکین کو بادشاہ کے دفاع داری کا حلف لینے پر مجبور کیا جائے اور دوسرے اپنے من مانے شخص کو فرمان شاہی کے ذریعے سے اترستان کا گورنر جنرل بنوا دیا اور سلسلہ ۱۹۴۷ء کے نئے دستور اترستان میں یہ عہدہ بھی توڑ دیا گیا اور آزاد ممالک کی طرح اترستانی حکومت کا صدر آزادانہ طور پر پانچ سال کے لئے منتخب ہونے لگا۔ سب موردا ہے اور انگلستان کے وزیر انجمنائے قانوں ویلٹ منسٹر سوائے "اخلاقی دباؤ" ڈالنے اور تقریریں کرنے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ ان فرض ہیں مملکتوں کے ذمے میں اپنے جمہوریوں کو بھی رکھنا پڑے گا جیسے "برطانوی دولت عامہ اقوام" جس کے بعض حصے ہر جیت سے ایک دوسرے سے آزاد ہیں لیکن جو غیر مالک کے مقابلے میں ایک حد تک "ن" واحد کے حیثیت رکھتے ہیں۔ اس "دولت عامہ اقوام" کی نوعیت عہدیت سے پیدا کا نہ ہے اس لئے کہ عہدیت کسی خاص مقصد کے لئے قائم ہوتی ہے، درآئیکہ اس "دولت عامہ" کا قیام مستقل ہے اور اس کے اجراء کی "جبل مشین" آزادانہ اتفاق و اتحاد ہے۔

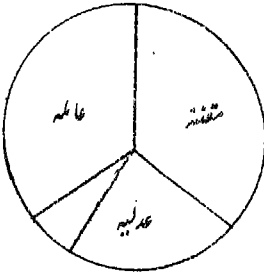
سلسلہ ۱۹۴۷ء کے دستور کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں برطانیہ یا "برطانوی دولت عامہ" اقوام" کا کہیں ذکر نہیں۔

ذمہ دار وغیر ذمہ دار۔ یوں تو حکومت ایک مرکب ادارہ ہے اور اُس کے جتنے اجزاء ہیں اتنی ہی قسمیں ہوسکتی ہیں مگر ممتاز حدود و فاصلہ میں سے جماعتِ عالمہ کی ذمہ داری کا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جماعتِ عالمہ نفاذ قوانین کی ذمہ دار ہے اور اس طرح اس کی حیثیت ایک بہت بڑے عضوِ حکومت کی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت آیا ذمہ دار ہوگی یا غیر ذمہ دار۔ یہ ظاہر ہے کہ جماعتِ عالمہ کے اراکین کسی نہ کسی کے سامنے اپنے کردار کے ضرور ذمہ دار ہوں گے، خواہ حکمران کے سامنے ورنہ خود اپنے صدر یا وزیرِ اعظم کے سامنے، لیکن چونکہ حکمران اور صدر جماعتِ عالمہ دونوں اسی جماعت کے رکن ہو سکتے ہیں اس لئے اگر یہ جماعت سوائے ان اعمال کے دوسرے کسی کے سامنے ذمہ دار نہ ہو تو اسے گویا غیر ذمہ دار کہیں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ جماعت کسی دوسری جماعت، مثلاً کسی نیابتی مجلسِ مقننہ کے سامنے اپنے افعال و کردار کے جواب دہ ہو اور یہ نیابتی مجلس اس سے باہر پرس کر سکے تو پھر یہ ایک ”ذمہ دار“ جماعتِ عالمہ یا کابینہ کہلائے گی۔ اس کے برعکس صورتِ حال انگلستان اور فرانس جیسے ممالک میں پائی جاتی ہے جہاں تقریباً ہر ایک فعل کے بابت نیابتی جماعتِ مقننہ یعنی پارلیمنٹ میں کابینہ سے صرف جواب ہی طلب نہیں کیا جاتا بلکہ اگر مسئلہ اہم خیال کیا جاتا ہے تو اس مجلس کے مخالفانہ اکثریت کے رابر وزارت کو مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ فرانس میں تو یہ صورتِ حال انگلستان سے بھی زیادہ غیر متشکل ہے اس لئے کہ وہاں اگر کوئی رکن دارالمناس کسی دیر سے کوئی سوال

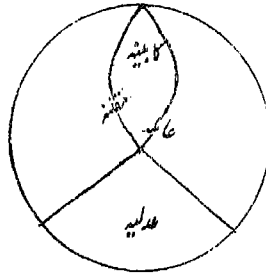
کرے تو وزیر کے جواب پر بغیر کسی اطلاع کے فوراً مباحثہ ہو سکتا ہے، ”قرار داد عدم اعتقاد“ بغیر کسی قسم کے پیشگی اطلاع کے پیش کی جاسکتی ہے اور اگر یہ قرار داد منظور ہو جائے تو اس وزارت کو مستعفی ہو جانا پڑتا ہے۔ فرانس کے اس کارروائی کو ”دضاخت طلبی“ کہتے ہیں اور ارکان کے اس اختیار کی وجہ سے مشکل سے کوئی وزارت ایسی ہوتی ہوگی جسے سال بھر سے زیادہ برسرِ اقتدار رہنا نصیب ہوتا ہو۔ ان تمام شکلوں سے ممتاز وہ شکل ہے جس کا اس وقت

تلاش ذمہ دار حکومت میں کامیاب عالم اور مقننہ کے درمیان واسطے کا کام دیتی ہے اور اس کے اراکین جماعت مقننہ کے منتخب شدہ اراکین ہی میں سے چنے جاتے ہیں۔ ان دونوں شعبوں کا فرق حسب ذیل شکل سے واضح ہو جائے گا۔

غیر ذمہ دار حکومت



ذمہ دار حکومت



بعض سیاست دان ذمہ دار حکومت کو ”کابینی“ اور غیر ذمہ دار کو ”صداری“ کا لقب دیتے ہیں اور یہ غالباً اس لئے کہ ذمہ دار حکومت کا اصولی انگلستان سے نکلا ہے اور ”غیر ذمہ دار حکومت“ کا (بقیہ صفحہ ۲۴۹ پر)

اٹلی جرمنی بعض دوسری ملکوں میں پورے زور سے مظاہرہ ہو رہا ہے، جہاں ملک میں جملہ شعبہ جات و عہدہ داران حکومت بنا استحقاق ایک آمر مطلق کے سامنے جواب دہ ہیں، جو خود محض اپنے زور اور قابلیت سے سرچشمہ سیاسیات بن گیا ہے، اور جو کسی کے سامنے مطلق ذمہ دار نہیں۔ یہ صورت حال مظاہر کسی ہی ناممکن کیوں نہ معلوم ہو، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بہت سے ملک میں اس نے عمومی یا پارلیمنٹی طرز حکومت کی جگہ لے لی ہے اور ان ملک میں بھی، جہاں یہ رائج نہیں، وہاں بھی بعض اہم فرق اس کے کوشاں ہیں کہ اس قسم کی آمریت قائم ہو جائے۔ اس میں اور ملک متحدہ امریکہ کی حکومت میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ امریکہ میں صدر جمہوریہ باوجود اپنے وسیع آمرانہ اختیارات کے دستوری پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے، لیکن آمر ایک بڑی حد تک خود اپنا دستور ساز ہے اور سولے بنادت کے حفظ کے کسی دوسری پابندی کو اپنے اوپر عائد تصور نہیں کرتا۔

Written Constitution

تحریری اور رواجی و سائیر۔ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک اور طرز تقسیم پر نظر ڈالنا مناسب ہو گا۔ حکومت کا دار و مدار سیاسی دستور پر ہوتا ہے اور پس منظر نہایت اہم ہے کہ آیا کسی ملک کا دستور تحریری ہے یا غیر تحریری۔ تحریری

(نوٹ: ۱) اصل ملک متحدہ امریکہ ہے، جہاں کا سب سے بڑا عہدہ دار صدر جمہوریہ کہلاتا ہے، لیکن یہ اصطلاحیں درست نہیں اس لئے کہ امریکی انچی جاعت حاکم کو انگریزوں کی طرح "کابینہ" کہتے ہیں اور انگریزی کا جینہ کابینہ تو آخر ایک صدر یعنی دریا ظلم ہوتا ہے۔

✓ دستور سے پہلے یہ حوالہ ہے کہ حکومت کے متعلق جتنی باتیں اہم ہیں وہ سب کی سب ایک دستاویز میں مندرج ہوتی ہیں اور اس دستاویز کو بدلنا عام طور سے معمولی قوانین سے زیادہ وقت طلب ہوتا ہے۔ تحریری دستور کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہر شخص نہایت آسانی سے یہ معلوم کر سکتا ہے کہ آیا فلاں معاملہ ہر دستور کے مطابق عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ ایسے دستور کی تین مثالیں جاپان اور مملکت متحدہ امریکہ کے دستاویز ہیں جو کئی الترتیب سے ^{۱۸۹۰ء} اور ^{۱۸۷۵ء} میں مرتب ہوئے، اور بعض ضروری ترمیموں کے ساتھ آج بھی ان کی تقریباً وہی کیفیت ہے جو اس وقت تھی۔ اس کے برخلاف ایسے ممالک بھی ہیں جہاں کا دستور تحریری نہیں ہے بلکہ جو طرز حکومت رائج ہے، اس کے اجزاء بعض تو معمولی قوانین پر مبنی ہیں اور بعض محض رسم و رواج پر۔ خارجی دستور کی سب سے ممتاز مثال سلطنت متحدہ برطانیہ کا دستور ہے۔ جہاں کے قوانین میں کوئی ایسی دستاویز نہیں ملے گی جیسے حقیقی معنی میں "دستور" کا لقب دیا جاسکے اور جو مختلف اعضاء کے حکومت کے باہمی تعلقات کا تعین کرے۔ نیز انگلستان جیسے ملک میں دستور اور قانون دونوں کی حیثیت اس درجہ مساوی ہے کہ بڑے سے بڑا دستوری و سیاسی اصول بھی بالکل اسی طرح سے تبدیل ہو سکتا ہے جیسے کوئی معمولی سے معمولی موافقی قانون۔

سلطنت متحدہ برطانیہ میں معمولی قانون دونوں درجوں میں ایک خاص ضابطے کے تحت منظور ہوتا ہے، اس کے بعد بھی دستخطوں کے لئے بادشاہ کے پاس بھی جاتا ہے، اور جس وقت اس کے پاس جاتا ہے فوراً وہ اس پر دستخط کر دیتا ہے۔ سوادہ سو برس سے (بقیہ صفحہ ۲۵۱ پر)

لیکن دوسری اور کبھی ہوئی تقسیموں کی طرح یہ تقسیم بھی ناقص ہے اس لئے کہ ایک طرف تو ایسے ممالک میں جہاں کا دستور تحریری ہے امتداد زمانہ سے رسم و رواج کا اثر ناپید ہوتا جا رہا ہے اور دستور غیر شعوری طور پر بغیر ارادی تبدیلی کے بدل رہا ہے اور دوسری جانب انگلستان جیسے رواجی دستور والے ملک میں ایسی دشاویزات موجود ہیں جن پر مبنی دستور کا دارو مدار ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بغیر ارادی تبدیلی کے جاپان کی ”غیر ذمہ دار کا بنیہ“ ”ذمہ دار ہوئی گئی اور اب روز بروز ہم گری کی طرح کار اختیار کرتی جاتی ہے اور امریکہ میں سنہ ۱۸۷۰ء والی پندرھویں دستور کی زیم کی درستی کے سیاہ نام شہرہ یوں کہ حقوق شہریت حاصل ہیں لیکن اس قسم کے طریقے رائج کئے گئے ہیں جس کی وجہ ایک بڑے حصہ ملک میں وہاں

(بقیہ نوٹ ۱۸۷۰ء) کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مسودہ دونوں ایوانوں سے منظور ہو کر بادشاہ کے پاس گیا ہو اور اس نے اس پر دستخط نہ کئے ہوں، چنانچہ اب یہ ایسا رواج ہے جس کے خلاف کرنا ”خلافت دستور“ سمجھا جاسکے گا۔ ممبروں کی دستور اور قانون میں اس درجہ مماثلت ہے کہ بڑے سے بڑا سیاسی اصول بھی اس طرح سے تبدیل ہو گا، چنانچہ اسی مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر جو بحث کہتا ہے کہ ”اگر ملکہ (وکیلٹریا) کے پھانسی کے حکم کو دونوں ایوان بالفاظی منظور کر لیں اور اس سے دستخطوں کے لئے خود اس ملکہ کے پاس بھیجا جائے تو بھی (جو بوجہ قائم شدہ رواج کے) انہیں اس پر دستخط کرنے پر تیس گے۔ وکیلٹریٹ دستور مصلحت انگشتیہ“ مطبوعہ جامنہ غمانیہ، باب ۳۰۔

نکال اس جہان کے لئے دیکھو رسالہ ”معاملات خارجہ“ Foreign Transactions، جنوری ۱۹۱۶ء۔

حقوق سے محروم ہو گئے ہیں۔ گو انگلستان کا دستور محض رواجی ہے لیکن ایسے
 دستاویزات کے اصول جیسے دستاویز حقوق ۱۷۸۹ء اور "قانون بندوبست"
 ۱۷۹۱ء کو سامانی سے تبدیل نہیں ہو سکے۔
 ان فرض دستاویز دنیا کی جو بھی تقسیم کی جائے گی وہ ایک حد تک ناقص رہے
 گی اس لئے کہ انسانی ذہنیت محض حسابی مساواتوں کے مائل نہیں بلکہ ذہنی جدت
 تزییم، تنبیخ، یہ اس کے ایسے خواص ہیں جس سے گریز ناممکن ہے۔

۱۷۹۵ء اس قسم کے مکتوبات کے لئے دیکھو برائیس، "دوست عامہ امریکہ"
American Commonwealth جلد ۲، صفحہ ۵، باب ۴۵۔
 ۱۷۹۶ء دستور انگلستان کے خصوصیات کے لئے دیکھو چمبرز "تاریخ دستور انگلستان" ترجمہ اردو مطبوعہ
 جامعہ عثمانیہ باب ۲۔

باب ۱۴ مفرد اور مرکب ملکیتیں

فرید، مہدیت، وفاقیہ، مرکزی و اجزائی اختیارات - ہندوستانی صورت حال۔
 فریدیہ نظام ہے کہ سب سے فطری اور سب سے سادہ شکل ملکیت کی
 وہ ہوگی جب اس کے چند ادارات اور جملہ شعبہ جات ایک ہی مرکز کے تحت ہوں گے
 اور وہ مرکز جب چاہے جس شعبہ سے چاہے اس کے اختیارات سلب کر سکے گا
 یا ان کے درمیان تنظیم ناطق کر سکے گا۔ یہ صورت حال اس وقت ممکن ہوتی ہے
 جب ملک واسطے کم و بیش ہم خیال ہوتے ہیں اور ان میں سیاسی اعتبار سے
 زیادہ تنوع نہیں پایا جاتا، یا جب مرکز دوسرے قطعات کو باہم زیر کر لیتا ہے
 کلیتہً کم و بیش یہ سمجھنا چاہئے کہ جب ملک مختصر ہوگی اور جب مختلف اجزاء لازماً مرکزی
 حکومت کے ماتحت ہوں گے اس وقت یہ شکل پیدا ہوگی۔ ایسی ملک کو "فریدیہ"
 کہتے ہیں۔ فریدیہ وہ ملک ہے جس میں مختلف اجزاء کے اختیارات کا انحصار کلیتہً
 مرکز کی حکومت پر ہو۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایسی ملک میں ہر جزو ملک کی دیکھ
 بھال اور نگرانی مرکزی حکومت ہی کرتی ہوگی؛ آج کل کی پیچ در پیچ زندگی میں یہ
 ناممکن ہے کہ کوئی حکومت خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی مختصر ہو، ہر جھٹکے کے ہر معاملہ کا

خود ہی تصفیہ کیا کرے، اور جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے حکومت کا کاروبار روز افزوں ترقی پر ہے، جس کی وجہ سے بہت سے امور کی بابت مرکز کو کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے اور انہیں چند مقامی ادارات کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ اگر مرکزی حکومت شہر شہر، گاؤں گاؤں کے کمزور اور روشنی کا انتظام نہ کرتی پھرے یا اپنے زیر اثر لاکھوں میل کا جو قبضہ ہے اس کے بہرہ پہنے کی ابتدائی تعلیم کی براہ راست نگرانی کرتی پھرے تو ایسی حالت میں اسے اہم تر امور کی کارفرمانی ناممکن ہو جائے گی اور اس کا پورا وقت اسی قسم کے جزوی امور میں صرف ہو جائے گا؛ یہی وجہ ہے کہ مقامی تعلیم کی نگرانی، بعض مرتبہ ضلع داری مجالس، روشنی کا انتظام، بلدیہ اور پٹرکون کی نگہداشت مقامی مجالس کے سپرد اسی طرح کر دی جاتی ہے جیسے ریلوں میں سفری کے آرام و سائش کی ذمہ داری ریلوں کے ادارات کے سپرد کی جاتی ہے، یا پڑے پڑے کمپنیوں کے اندرونی انتظامات کی نگرانی جلسوں کے صدر مشین یا مفید کے سر پڑتی ہے۔ یہ سب اختیارات گویا مفوضہ ہوتے ہیں جو خواہ صراحتاً یا ضمنیاً تحت ادارات کے سپرد کر دئے جاسکتے ہیں اور مرکز جب جاسے انہیں منتقل کر سکتا یا سلب کر سکتا ہے۔ فردی حکمت کا یہی انبیاز ہے اور اس میں وہ مرکب ملکوں سے ممتاز نظر آتی ہے۔

فردی حکمت کی بہترین مثالیں انگلستان، فرانس، جاپان، ایران، افغانستان اور ادب ہٹلر کی اصلاحات کے بعد جرمنی میں جہاں کے مقامی ادارات کلیدی مرکزی حکومت کے تابع ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگلستان کے مقامی ادارات، یعنی بلدیہ اور صوبوں کی مجالس، کو بہت وسیع اختیارات حاصل ہیں، لیکن یہ سب اختیارات

مرکزی حکومت کے رہن منست ہیں اور ان میں ترمیم یا ان کی تسخیر مرکزی حکومت ہی کے قوانین کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ گو یا فردی ملکیتوں میں مقامی ادارات کے کم و بیش ذی اختیار ہونے سے ملکیت کی فردیت میں فرق پیدا نہیں ہوتا اور کوئی ملکیت اس وقت تک فردی نہیں ہے جب تک یہ مقامی ادارات مرکز کے تابع رہیں۔

لیکن جیسا بیان کیا جا چکا ہے، ملکیت کی سب سے سادہ شکل یعنی فردی کا قیام صرف اسی وقت ممکن ہے جب ہر حصہ ملک مرکز کا کلیتہً تابع ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گو مختلف اقطاع ملک ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و علی کے خواہاں ہوں لیکن اپنے آپ کو ایک دوسرے میں کلیتہً جذب کرنا نہ چاہتے ہوں۔ اتحاد عمل کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں جن میں سے سب سے نمایاں وہ اتحاد ہے جو دو ملکیتوں کے درمیان محض متوفی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اتحاد کی بہترین مثال وہ محالفے ہیں جو جنگ کے زمانے میں دو یا دو سے زیادہ ملکیتیں ایک دوسرے کے ساتھ کسی دشمن کے ڈر سے کر لیا کرتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ اتحاد یا محالفہ محض جنگ کے زمانے میں ہی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان دوسرے کے ساتھ تعلقات پیدا کئے بغیر اس دنیا میں نہیں رہ سکتا بالکل اسی طرح یہ لازمی اور لاپس ہے کہ بغیر دوسری ملکیتوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوئے کوئی ملکیت رہ سکے۔ ظاہر ہے کہ ملکیت کی سرحد ضرور ہوگی، اور اگر وہ محض کسی جبر سے پرستل نہیں ہے تو اس سرحد کے دوسری طرف ضرور دوسری مباحثی ہتھیں ہوں گی جن کے ساتھ اس ملکیت کا چلی دھن کا ساتھ ہوگا، اور اگر یہاری ملکیت مفرد و ضا

ایک جزیرہ پر ہی مشتمل ہے تاہم اس کے باشندوں کو کم از کم بعض ضروریات زندگی کے لئے سمندر پار جانا اور وہاں کے باشندوں سے کسی نہ کسی قسم کے تعلقات قائم کرنا پڑیں گے۔ یہاں اس باب میں ہم ان تعلقات پر بحث نہیں کریں گے جو کوئی ملکیت مساویانہ حیثیت سے دوسری کسی ملکیت کے ساتھ قائم کرے؛ یہاں محض ان کیفیات کا ذکر کیا جائے گا جن کے تحت سیاسی ضروریات کے مد نظر کوئی ملکیت اپنے ہمایہ ملکیت کے ساتھ ساتھ اپنے چند اختیارات سے خواہ مجبوراً اور اپنی رضامندی سے، دست بردار ہوتی ہے، اور یہ ملکیتیں کسی نہ کسی قسم کے مستقلاً نہ متبطلز عمل پر رضامند ہو جاتی ہیں۔

لکھنؤ پریس۔ پچھلے باب میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اگرچہ باہمی اتفاقی اتحاد محض موقتی نہیں ہے (جیسے کسی دوسری بڑی ملکیت کے ٹڑ سے یا کسی مشترک دشمن سے جنگ کی بنا پر) تو اس اتحاد کے کئی دارج ہو سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مختلف سیاسی جماعتیں بالکل آزاد رہیں اور اگر کوئی مشترکہ مرکز ہی ادارہ ہو بھی تاہم اس کا اثر ان جماعتوں پر بہت ہی کم ہو یعنی گو خارجی معاملات میں ایک بڑی حد تک یہ مرکز ان کے قائم مقام کے خدایات انجام دے لیکن تقریباً ہر اندرونی معاملے میں اس کا کوئی اختیار نہ ہو، یا اگر ہو تو اس میں اتنی قوت نہ ہو کہ اس اختیار کو کام میں لاسکے۔ حال کے زمانے میں اس قسم کے مجبوروں کی، جسے اصطلاح میں عہدیت کہتے ہیں؛ میں مثال اس عہدیت کی ہے جو شانہ علیہ میں جرمنی میں قائم ہوئی باجوہ سوستان میں ۱۸۱۵ء سے ۱۸۷۱ء تک رہی۔ شانہ علیہ میں سب سے بڑا مسئلہ جو جرمن دہروں کے سامنے یہ تھا کہ مختلف جرمن ملکوں میں

ہم آہستگی کیسے پیدا کی جائے۔ ان جرمن مملکتوں میں آسٹریا اور پروشیا بھی تھے جو کسی طرح ایک دوسرے کی سیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے، چنانچہ جو مرکزی ادارات قائم کئے گئے انھیں شکل سے کوئی اختیار مختلف مملکتوں پر مال تھا، اور چونکہ بڑی بڑی جرمن ریاستوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کسی قسم کے رواداری کا پتہ نہ تھا اس لئے یہ ایسا مجموعہ بنایا گیا جس میں صد ہی سرے سے مفقود تھا۔ یہ اندرونی نزاعات ہی تھے جن کا مظاہرہ آخر کار دو سب سے بڑی جرمنی سلطنتوں، یعنی پروشیا اور آسٹریا والی جنگ میں میدان سادو واپس ہوا جس کے بعد آسٹریا جرمنی سے نکال دیا گیا اور اس کے چار سال بعد پروشیا کی سرکردگی میں جرمن وفاقہ قائم ہو گیا۔ سوئٹزرلینڈ کی کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی سوائے اس کے کہ وہاں کسی طرح کی واحد وفاقی مملکت کے قیام کے راستے میں یہ رکاوٹ حال تھی کہ جتنے بھی اجزاء تھے وہ سب کے سب بالکل آزاد اور سادی اکیثیت تھے، اور مرکزی ادارات صرف شدید ضرورت کے وقت طلب کئے جاتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عہدیت مملکتوں کے اس مجموعے کو کہتے ہیں جسے خواہ

۱۔ عہدیت جرمنی کے دستور کے لئے دیکھو لہین لپس، "یورپ عالیہ" ۱۸۹۹ء، ترجمہ اردو
۲۔ مسلمہ جامعہ عثمانیہ، باب ۳۔

۳۔ سوئٹزرلینڈ کی عہدیت کے دستور کے لئے دیکھو وینسٹ، "حکومت سوئٹزرلینڈ" Vincent:
Government in Switzerland. لندن ۱۹۱۱ء باب ۱۔

متمنی طور پر خواہ مستقل طور پر یہ ملکیتیں آپس میں اتحاد کر کے چند مرکزی ادارات قائم کر لیں، لیکن باوجود ان ادارات کے قیام کے اندرونی اور بیرونی آزادی برقرار رہے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ملکیتیں برابر ایک دوسرے سے مسلسل متحد و متفق رہیں گی تو ان میں یکجہتی و ہم آہنگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب باہمی اعتبار و اعتماد کی وجہ سے وہ اپنے کمزور مرکزی ادارات کو قوی بنا دیتی ہیں اور اپنے حیدرہ حیدر اختیار مرکز کے سپرد کر دیتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہ امریکی نوآبادیوں کی وٹیلی ڈھالی عہدیت جو صرف انگریزوں سے لڑنے کے واسطے قائم ہوئی تھی وہ ۱۸۹۷ء میں ایک مستقل ملکیت بن گئی اور ہر ایک ریاست نے اپنے چند اختیار رشتہ جدید مرکزی ادارات کے سپرد کر دیئے۔

وفاقہ۔ اس عہدیت سے گذر کر (جو دراصل چند ملکیتوں کے ایک طرح کے اتحاد کا نام ہے) ہم وفاقہ کے طرف آتے ہیں جو آج کل کے زمانے میں ایک نہایت ہی اہم قسم ملکیت کی ہے وفاقہ میں عہدیت کے عکس مختلف رقبے اپنے بعض اختیارات مستقل ایک مرکزی ادارے کے سپرد کر دیتے ہیں اور بعض امور میں بالکل آزاد رہتے ہیں۔ وفاقہ کا اصول کسی اقامت فاسٹ کی تنظیم سے سمجھ میں آسکے گا۔ فرض کیجئے چند طرابلس عالم کسی اقامت فاسٹ میں رہتے ہیں، اور اقامت فاسٹ میں جو قواعد جاری ہیں انھیں کی پیروی کرنی پڑتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ علاوہ ٹرسٹس کھلے کھلے کہوں گے اور بہت سے نظام انتہائی ذہنی ایسے ہوتے ہیں جن میں اقامت فاسٹ کا مروجہ منطق دخل نہیں دنیا، مثلاً دن کے وقت باہر جانا کھانا پینا، آرام کرنا، دوستوں سے بات کرنا، ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بعض امور ایسے

ہوتے ہیں جن میں طالب علم کو مرکزی قوا عدلیہ کی پابندی کرنی پڑتی ہے وہ فاقیہ میں بھی
 بس یہی سمجھئے، بعض امور ایسے ہیں جو دستور کے ذریعے سے کلینیہ مرکزی حکومت
 کے متعلق کر دئے جاتے ہیں، جن میں سب سے اہم خارجی معاملات اور مکہ سازی
 ہوتے ہیں، اور بہت سے امور ایسے ہیں جن میں مرکزی ادارات مطلق کسی قسم کا
 دخل نہیں دے سکتے۔ گویا جملہ اختیارات دو قسم کے اداروں، یعنی مرکزی ادارات اور
 اجرائی یا ریاستی ادارات میں منقسم ہوتے ہیں، اور یہ دونوں ادارات ایک دوسرے
 سے کم و بیش آزاد اور ایک مشترک دستور کے تابع ہوتے ہیں۔ وہ فاقیہ اور دوسری
 قسم کے ملکیتوں میں جو چیز اختیار ہے وہ یہی ہے کہ وہ فاقیہ میں اجراء ملکیت بعض
 امور میں آزاد اور بعض میں پابند ہوتے ہیں، فز یہ میں اجراء کلینیہ مرکزی ادارات کے پابند
 ہوتے ہیں اور عہدیت کے اجراء کلینیہ آزاد ہوتے اور محض اپنی مصدقوں کی بنا پر بعض
 امور میں اتحاد عمل کر لیتے ہیں۔ عہدیت اور وہ فاقیہ میں ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ چونکہ
 وہ فاقیہ ایک مستقل چیز ہے اس لئے اس کے اجراء میں ماننے پر وہ فاقیت سے علیحدہ
 نہیں ہو سکتے، درآئی کہ عہدیت میں انھیں اس کی آزادی ہوتی ہے، چنانچہ جب بھی
 یہ دیکھا جائے کہ اجراء اسے علیحدہ ہونا چاہا اور ملکیت نے انھیں علیحدہ نہ ہونے دیا تو
 جھگڑا ہوتا ہے کہ ملکیت عہدیت نہیں بلکہ فرد پر بنی ہے۔ اس کی مثالیں سوستان
 کے جنگ ”عہدیت مفصلہ“ (۱۸۴۷ء) اور امریکہ کی خانہ جنگی (۱۷۷۶ء) سے ملتی ہیں
 جب ملکیت کے چند اجراء اس نے سوستان اور مالک متحدہ امریکہ سے جدا ہونا چاہا لیکن
 انھیں جدا نہیں ہونے دیا گیا۔ ۱۸۴۷ء سے پہلے سوستان اور ۱۷۷۶ء سے پہلے
 مالک متحدہ امریکہ کی حیثیت عہدیت کی تھی، لیکن ان تاریخوں کے بعد وہ تقییداً فاقیہ بن گئی۔

اگر کسی ملک کے مختلف قطعات کے مابین مکمل ہم آہنگی ہو تو پھر وہاں فروریہ قائم ہوتا ہے نہ کہ وفاقیہ؛ وفاقیہ صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب مختلف حصص ملک میں ایک حد تک باہمی مناسرت ہو اور ساتھ ہی مستقل تعال کی خواہش بھی موجود ہو۔ اس قسم کی مناسرت نسی ہو سکتی ہے بالسانی یا مذہبی یا جغرافی یا محض تاریخی، یعنی اگر کسی ملک کے باشندے ہم نسل نہیں، یا ان کی زبان ایک نہیں، یا ان کا مذہب ایک نہیں، یا جغرافی اعتبار سے ملک بہت وسیع ہو، یا پورانے زمانے میں وہ ایک دوسرے سے علیحدہ رہے ہیں، لیکن باوجود اس تنوع کے ان میں خواہش تعال موجود ہے، تو پھر ایسی حالت میں اس ملک میں وفاقیہ قائم ہو گا نہ کہ فروریہ۔ بلاشبہ خواہش تعال مملکت کے قیام کی سب سے زبردست بنیاد ہے، لیکن یہ مختلف رقبوں اور ملتوں کے مکمل امتزاج کے لئے کافی نہیں، اور گو اس کی وجہ سے مملکت قائم ہو جائے گی لیکن ایسی مملکت جس کے اجزاء ایک دوسرے سے یا مرکز سے بہت کچھ آزاد رہیں گے۔ مثال کے طور پر چند وفاقی مملکتوں کو لیجئے۔ وفاقیوں میں شاید سب سے اہم مملکت ممالک متحدہ امریکہ کی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب تیرہ انگریزی نوآبادیوں نے انگریزوں سے جنگ چھیڑی تو اس وقت شاید ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ مل کر ایک مملکت قائم کریں گی بلکہ وہ صرف ایک موثر اتحاد کی خواہش تھیں، تاکہ وہ انگلستان کے جیسی زبردست قوت سے لڑ سکیں۔ جنگ کے دوران میں انھوں نے اتحاد و اتفاق کے برکات کو محسوس کیا، لیکن اول تو وہ ایک دوسرے سے دور افتادہ تھیں اور دوسرے اس

اتحاد سے پہلے ان کی طرز حکومت میں بھی فرق تھا اس لئے کہ بعض کے گورنروں کو خود بادشاہ نامزد کرتا تھا اور بعض جاگیرداروں کے قبضہ و اقتدار میں تھیں، چنانچہ جنگ ختم ہونے پر جو عہدیت قائم ہوئی اس میں نہ صدر تھا نہ عدالت تھی اور چند ہی روز میں یہ اپنی کمزوری اور بے عملی کی وجہ سے مشہور ہو گئی تھی لیکن رفتہ رفتہ اتحاد عمل کی ضرورت روز بروز زیادہ محسوس ہونے لگی، اور آخر کار ہر مارچ ۱۸۹۷ء کو وفاقہ امریکہ کے جدید دستور کا نفاذ ہو گیا۔

اب سوئٹان کو لیجئے۔ یہاں بعض کنیٹوں میں تیرہویں صدی عیسوی ہی ہیں ایک طرح کا اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور ۱۶۴۴ء میں اس ملک کی اجتماعی طور پر آزادی تسلیم کر لی گئی تھی، نیپولیونی دور میں پہلے تو اسے مکمل مرکزیت حاصل ہو گئی اور اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں نیپولین کے حکم سے مختلف اجزاء کو سیاسی اختیارات مل گئے، اور یہ عہدیت اس وقت تک وفاقیت میں تبدیل نہیں ہوئی جب تک ۱۸۴۷ء میں مرکزی فوجوں نے مرکز گریز قوتوں کو میان جنگ میں بچا نہیں دکھا دیا۔

الغرض وفاقہ کے قیام کی وجہ وجود ایک تو مختلف اجزاء کی خواہش تھالی ہے اور دوسرے مختلف اجزاء کے مابین ایک حد تک مغائرت ہے، ورنہ اس کے بغیر یہ مملکت فروہ بن جائے گی۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے یہ مغائرت کئی طرح کی ہوتی ہے اور مختلف اجزاء مملکت نہ ہی لسانی، جغرافی، معاشی، پچھلے تاریخی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ملک میں

ان میں سے کوئی ایک یا متعدد اختلافات پائے جاتے ہوں لیکن زبان کے باشندے انھیں اہم نہ سمجھیں اور باہمی اعتماد کے وجہ سے ان میں ایک فرد یہ قائم کر لے کہ یہ تالیف ہوں۔ اسپین میں علاوہ ہسپانوی زبان کے اندلسی اور باسک زبانیں بولی جاتی ہیں۔ فرانس میں ہر بریطانی، نارمن، اور پروانسال اپنی اپنی زبانیں بولتا ہے تاہم کم از کم اس وقت تو اسپین اور فرانس کا فردوں میں شمار ہے۔ اس کے برعکس سویٹزرلینڈ جیسا چھوٹا سا ملک اس لئے وفاقیہ ہے کہ اس میں چار زبانیں ہیں (فرانسیسی، جرمنی، اطالوی، رومانش) تین مذاہب (رومن کیتھولک، کال دینی، یہودی) ہی نہیں بلکہ کیرکشن کے تاریخی روایات ایک دوسرے سے بالکل جدا گانہ ہیں۔

۱۷ اسپین کے زمانہ حال کی تاریخ سے وہ دلچسپ کیفیت ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح ایک فرد کے غیر ملکی اجزاء ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے جارہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے انقلاب کے بعد جو دستور نافذ ہوا اس میں یہ شرط مروجہ تھی کہ اگر اسپین کا کوئی صوبہ جسے تاریخی یا لسانی یکسانی حاصل ہو، درخواست کرے تو اسے چند خاص شرطیں پورا کر کے کے بعد سواراج کے اختیارات حاصل ہو جائیں گے، لیکن اس اغراضی سواراج کے بعد بھی حسب ذیل امور مرکزی حکومت پر کو حاصل رہیں گے، توپن، پمپری، کلیسیائی معاملات، خارجی معاملات، قومی قرضہ، عدالت، عالیہ کا حد اختیار، مرکز کے مالی قوانین، مرکز کے زیر نگرانی ریل و رسائل مثلاً ڈاک و غیرہ۔ اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا گیا کہ کوئی سواراجی صوبہ چاہتا تو اپنے سواراجی حقوق سے دست بردار بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھو سالانہ مدبرین

State of the Nation Year Book ۱۹۳۶ء ۱۹۳۷ء ۱۹۳۸ء ۱۹۳۹ء سے جو

خانہ جنگی ہو رہی ہے اس میں تو یہ دستور کا دستور مجسم ہو گیا ہے۔

اسی طرح سانی و نسلی مغائرت کی وجہ سے کناڈا، جزائی مغائرت کی وجہ سے آسٹریلیا اور تارنجی، جزائی نسلی مغائرت کی وجہ سے مالک متحدہ امریکہ فرسے نہیں بلکہ وفاقیہ ہیں۔

مرکزی و اجزائی اختیارات۔ وفاقیوں میں مرکزی اور اجزائی اختیارات کی تقسیم دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک تو اس طرح کہ مرکزی اختیارات شمار کر لئے جائیں اور بقیہ اختیارات اجزاء کے ساتھ وابستہ رہیں، اور دوسرے اس طرح کہ اجزائی

۱۷ صوبہ داری مغائرت کے اثرات ہندوستان کے طرز انتظام پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہے ہیں مثلاً،
۱۸ سلسلہ سے پہلے مدراس، بمبئی، بنگال ایک دوسرے سے علیحدہ تھے؛
۱۹ سلسلہ میں صرف ملحقہ جنگ بہا اختیار ان سے لے کر گورنر جنرل کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا، باقی ان میں وہ حسب سائن آزاد رہے؛

۲۰ سلسلہ میں گورنر جنرل کو ہمدردی کی ”ملکی و قومی حکومت اور مالیات کی مکمل نمائندگی“ کا اختیار ملے دیا گیا؛
نیز قانون سازی کے اختیارات کلیتہً مرکز سے وابستہ ہو گئے؛
۲۱ سلسلہ میں محمولوں کو مالیاتی اختیارات دے گئے؛

۲۲ سلسلہ میں مدراس اور بمبئی کو قانون سازی کے اختیارات مل گئے؛
۲۳ سلسلہ میں ڈاراپاک کو ہمدردی حکومت گورنر جنرل باجلاس مجلس انتظامی کے احکام کی تعمیل کرے گی؛
۲۴ سلسلہ میں مرکز اور صوبوں پر تقسیم کار، مرکز کے صوبہ داری انتظام میں ملے دینے کے محدود اختیارات؛
۲۵ سلسلہ میں قانون حکومت، سندھ کی روسیہ عام ہندوستان کے وفاقیہ کے تمام کی تحریک مرکزی اختیار“
”صوبہ داری اختیارات“ اور ”مترازی اختیارات“ کی تقسیم۔

اختیارات شمار کر ائے جائیں اور لبقیہ اختیارات مرکز کے ساتھ وابستہ رہیں، چونکہ حکومتی اختیارات لائحہ دہوتے ہیں اور شمار صرف چند ہی اختیارات کئے جاسکتے ہیں اس لئے وفاقیہ کا وہی جزو قوی ہوتا ہے جسے یہ لبقیہ اختیارات حاصل ہوں یہی وجہ ہے کہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء سے پہلے ہندوستان میں جو سیاسی اور دستوری کشمکش رہی اس کے ابتدائی زمانے میں ایک فریق ایسا تھا جو صوبہ داری کیفیات کے تنوع کی وجہ سے صوبوں کی حکومتوں کو قوی دیکھنا چاہتا تھا اور کہتا تھا کہ آئندہ وفاقیہ ہند کے مرکزی اختیارات شمار کئے جائیں اور لبقیہ اختیارات (یعنی اختیارات کا زیادہ تر حصہ) صوبوں سے وابستہ رکھے جائیں، اور دوسرا گروہ ایسا تھا کہ ہندوستان میں مرکز گیر قوتوں کے استیصال کے مقصد کو مد نظر رکھ کر صوبوں کے اختیارات کو شمار کرنا اور لبقیہ زیادہ تر اختیارات مرکزی ادارات کر دینا پسند کرتا تھا۔ ان تنازعات میں اُس وقت تک یکسوئی نہیں ہوئی جب تک پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی والیان ریاست کی طرف سے بہاراجہ بیگانہ نے صاف صاف یہ نہ کہہ دیا کہ ہم والیان ریاست آئندہ وفاقیہ ہند میں شریک ہونے کے لئے تیار ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ مرکزی ادارات کو صرف چیدہ چیدہ اختیارات دئے جائیں اور لبقیہ جملہ اختیارات صوبوں اور ریاستوں کو حاصل ہوں۔

۱۶ قانون ہند ۱۹۴۵ء (تتمہ نمبر) کی رو سے اختیارات کی سہ گونہ تقسیم کی گئی ہے :-

- (۱) وہ اختیارات جو کلیدیہ مرکز کو حاصل ہیں (۲) وہ اختیارات جو کلیدیہ صوبوں کو حاصل ہیں
- (۳) وہ اختیارات جو دونوں ادارات کو متوازی حاصل ہیں۔

مثال کی طور پر چند خاص خاص وفاقیوں کو لیجئے اور ان میں مرکز اور اجزاء کے اختیارات کے مابین جو تقسیم کار ہے اس پر غور کیجئے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں چند مخصوص اختیارات مرکزی ادارت کو حاصل ہیں اور بقیہ جملہ اختیارات ریاستوں کے ساتھ وابستہ کر دئے گئے ہیں۔ مرکزی اختیارات میں حسب ذیل شامل ہیں:-

محاصل درآمد و برآمد اور جنگی کا محصول عائد کرنا؛ روپیہ قرض لینا؛ غیر اقوام، مختلف ریاستوں اور اندیائی قبائل کے ساتھ تجارت کرنا؛ توطن اور دیوالیہ کے لئے کیسے قوانین عائد کرنا؛ سکے، پیسے اور اوزان مقرر کرنا؛ ڈاک کا انتظام، حقوق طباعت و ایجابات کا تعین؛ عدالت العالمیہ کے ماتحت عدالتوں کا قیام، قانون اقوام کے خلاف ورزی پر سزا دینا؛ جنگ جاری کرنا؛ فوج مہیا کرنا؛ بیڑا؛ مستقر وفاقہ کا انتظام؛ ساتھ ہی اس مقصد کے لئے کہ مرکز یا ریاستیں ایک دوسرے کے حدود اختیار پر حملہ نہ کریں اور ایک دوسرے کے اختیارات کو دبا نہ بیٹھیں، وفاقی عدالت العالمیہ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ اگر ان کے سامنے کوئی مقدمہ ایسا آئے کہ ان میں سے کوئی اختیار زیر بحث ہو تو اس حالت میں ان کا حکم ناطق سمجھا جائے گا اور آئندہ کے لئے ایسے مقدمات کے لئے نظیر بن جائے گا۔

سوویتان میں ایسی ہی احوال پڑیں کیا گیا ہے کہ جو اختیارات مرکز کو حاصل نہیں وہ سب کے سب اجزائی کمیٹیوں کو حاصل ہیں۔ جیسا اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے موجودہ وفاقہ کے احکام سے پہلے سوویتان کی کیفیت ایک عہد سیت کی تھی یعنی خیال یہ تھا

کہ مختلف کمپنئیں صرف ہسپاروں کے حلوں کے بجائے کی وجہ سے باہم متفق ہیں اور جب
 چاہیں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہیں، لیکن جب ۱۸۴۷ء میں جنرل ٹیلور
 کمپنئیں نے ایک ”عہدیت مفصلہ“ قائم کر کے علیحدگی کی کوشش کی تو مرکزی حکومت
 نے اس کے خلاف ایک سخت ہم سر کی اور بالآخر انہیں بچا دکھایا، چنانچہ ۱۸۴۷ء کے
 بعد کی تاریخ قطعی طور پر ایک وفاقیہ کی تاریخ سے ہے۔ لیکن موجودہ دستور میں بھی اسی
 عہدیتی اصول کے اثرات موجود ہیں، یہاں تک کہ گو سوئٹزرلینڈ ایک وفاقیہ ہے لیکن
 ۱۸۴۷ء کے دستور میں اسے جگہ جگہ ”عہدیت“ کے نام سے ملے گا۔ یہاں تک کہ اسے
 فی الجملہ اس اتحاد کے مفاد سے متعلق ہے کہ ”غیر اقوام کے حلوں سے ملک کو
 محفوظ رکھا جاسکے، اندرونی امن و امان قائم کیا جاسکے، اجزاء کی آزادی اور حقوق کی
 حفاظت کی جاسکے اور ان کے مشترک مفاد کا لحاظ رکھا جاسکے“ نیز یہ صراحتاً بیان
 کر دیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی اس تحدید کے ساتھ ہر کمپنئیں کو باقی ماندہ اقتدار حاصل ہے۔
 تاہم جب مختلف اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ مدت تک رہتے ہیں تو
 ان کی باہمی بے اعتباری کم ہوتی جاتی ہے، ان کا مفاد روز بروز مشترک ہوتا جاتا
 ہے اور وہ مرکز کے تقویت میں کچھ زیادہ حرج نہیں دیکھتے، بالوں کہ مرکز روز بروز
 قوت پکڑتا جاتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ ۱۸۴۷ء کے بعد سے سوئٹزرلینڈ کی تاریخ

۵۵ دستور سوئٹزرلینڈ، باب ۱۴ دفعہ ۲۰ اس دستور کے سلسلے دیکھو ونسٹ Vincent:

Government in Switzerland.

۵۶ ایضاً دفعہ ۲۔

تشکیل کینٹن ہی کلیسا اور ملک کے درمیان تعلقات کا تعین کرتی ہے، وہی ایک جہزی حد تک تعلیمات کا انتظام کرتی ہے، سڑکوں اور ریلوں میں توسیع کرتی، شفا خانے اور ہاگل خانے قائم کرتی، مغرب اور حفظان صحت کا انتظام کرتی، زراعت کو صحیح راستے پر لگاتی، پولیس اور عدالت کا انتظام کرتی ہے، اور ایسے ہی بے شمار امور ہیں جن کا تعلق سوکیتانیوں کے عام زندگی سے ہے وہی مقتدر ہے۔

ایسی وفاقیوں میں جہاں اجزاء کے اختیارات شمار کر دئے گئے ہوں اور بقیہ اختیارات مرکز کے تفویض کر کے اسے نسبتہ اہم بنا دیا گیا ہو، کناڈا کا درجہ ممتاز ہے اس ملک میں جان بوجھ کر مرکز کو شاید اس لئے قوی کر دیا گیا ہے کہ کہیں انگریزی اور فرانسیسی آبادی کی باہم دگر کشش کی وجہ سے مرکز پر قومیں وفاقیہ کا خاتمہ نہ کر دیں۔ عام طور پر کناڈی صوبوں کو اپنے مقامی معاملات اور اپنے مقامی مالیات پر پورا قابو حاصل ہے تاہم تنیکہ وہ مرکزی حکومت کے انحال و طرز کار میں خلل نہ ہوں، متحدان امور کے جن پر انھیں مختار کیا گیا ہے، حسب ذیل ہیں:-

صوبہ داری و سائیر (علاوہ ٹیکسٹ گورنر کے اختیارات کے)؛ براہ راست، محصل؛ سرکاری اراضیات کا انتظام؛ صوبہ داری شفا خانے یا آبکاری، مقامی ریل و رسائل کے طریقے (علاوہ ان سڑکوں، ریلوں وغیرہ کے جو مرکزی پارلیمنٹ اپنے متعلق کرے)؛ مناکحت؛ صوبوں کی عدالت کا انتظام؛ تعلیم؛ نیز اگر کوئی صوبائی

ملہ یہاں سوکیتان کا بیان ذرا تفصیل کے ساتھ اس لئے دیا گیا ہے کہ باعتبار تنوع و زبان و مذہب، ملک ہندوستان کی گویا ایک مصغر شکل معلوم ہوتی ہے۔

قانون مرکزی قانون کے متضاد ہے اور مرکز کو صوبوں کے قوانین کو خلاف قانون قرار دینے کا اختیار حاصل ہے؛ ساتھ ہی شہد کی صورت میں صوبہ داری قانون ستر سمجھا جاتا ہے؛ صوبہ داری عادلوں کو مرکزی حکومت ہی مقرر کرتی ہے گو عدالتی انتظام کے ذمہ دار صوبے ہی ہیں۔

جس طرح نئے روس نے میدان سیاسیات و معاشیات میں طرح طرح کے نئے نئے تجربے کئے اور ایک بالکل جدید قسم کی مملکت اور جدید قسم کا انتظام قائم کیا اسی طرح سے وفاقیہ کے سلسلے میں ایک بالکل جدید باب کا افتتاح کیا۔ عام طور پر وفاقیہ بہت سی فردی ریاستوں کی ترکیب سے بنتی ہے، لیکن روس میں انتظام کی شکل کم پیش اس قسم کی ہے کہ ہر ایک رقبہ جو زبان یا ل خیالات کے اعتبار سے منفرد ہو، اسے چند معاملات میں سو اراج حاصل ہے۔ یہ سب ریاستیں مل کر وہ عظیم الشان مملکت بنتے ہیں جنہیں سوویت روس یا روسی

(ایڈیٹڈ ۱۹۲۷ء کا) دیکھو سالنامہ برین "Statesman's year"

Book. ۱۹۳۸ء ۲۹۹

دیکھو برائٹس "زائد حال کی عینیتیں" - Bryce: Modern Democ-

racies. باب ۲۳۔

۱۱ "سوویت" کے معنی روسی زبان میں "مجلس" کے ہیں، اور چونکہ آج کل کے روس میں تمام انتظام کا دار و مدار ۱۹۳۷ء سے پہلے خاص نوع کی مجلس پر تھا اس لئے یہ لقب دیا گیا بلوٹو کی "کے معنی" "اقلیت" کے ہیں؛ آج کل کے روس کے حکمران علی الاعلان اپنے آپ کو (بقیہ صفحہ ۲۷۰ پر)

ملکیت کہتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے جدید قانون سے پہلے اس عظیم الشان وفاقیہ میں چھوٹی چھوٹی وفاقیہیں بھی شامل تھیں، جیسے وفاقیہ ماورائے نھار، لیکن اب ان میں سے اکثر کو توڑ کر مختلف ریاستوں کا براہ راست مرکز سے تعلق پیدا کر دیا گیا ہے۔

روس کے دستور میں مرکز اور اجزاء کے امین تقسیم کار اس طرح پر کیا گیا ہے کہ بعض اختیارات صرف مرکز کو حاصل ہیں، بعض صرف اجزاء کو اور بعض اختیارات ایسے ہیں جو مرکز اور اجزاء دونوں کو حاصل ہیں، لیکن یہ قاعدہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ اگر ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا تضاد ہو تو ریاستی قوانین منسوخ تصور کئے جائیں گے۔ مرکزی محکمہ جات میں خارجی معاملات، تہذیبی حدود، قرضہ خارجی تجارت، معاشی طرز عمل کا تعین، فوج، سفر و جمہوریتوں کے موازنہ جات کی عام نگرانی، سکھ سازی، عدالتیں اور ضابطے، مزدوری، تعلیمات عامہ و تندرستی عامہ کے اصول و قوانین

بقیہ نوٹ ۱۹۳۹ء) اقلیت سمجھتے ہیں، اور جزیری ۱۹۱۱ء میں جو دستور ساز مجلس اقلیت نے طلب کی تھی اور جو صرف ایک دن کے بعد برخواست کر دی گئی اس میں بھی یہ اشتہار لیتا ہے کہ "اقلیت میں ہی تھے" چنانچہ رائے رائے اس اشتہار لیت پسند گروہ کا نام ہی "بولشویکی" رکھ دیا۔ نیز دیکھو باب ۱۳۔

مثلاً دیکھو "سالنامہ سوویت" Soviet Year Book ۱۹۲۹ء ص ۱۱۱ حال ہی میں اپنی ۱۹۳۶ء کے نصف آخر میں ایک حدیث نظر فرماتے ہیں اس کی سیاسی ہیئت مقدمہ تہذیبی کردی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کے تقسیم کا سوال ہے وہ حسب سابق قائم رکھا گیا ہے۔ دیکھو سالانہ رجسٹر Annual Register ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۵۷

اوزان، پیمانے، توطن وغیرہ ہیں؛ اس میں سے مالیات، اقتصادیات، طعام، مزدوری وغیرہ ریاستوں سے بھی متعلق ہیں لیکن مرکز ان کی تہ متزنگدانی رکھتا ہے۔
 خالص ریاستی امور ایسے ہیں جیسے زراعت، مقامی معاملات، عدالتوں کی تنظیم، تعلیم، حفظانِ صحت (جن کے اصول کا تعین مرکز کی طرف سے ہوتا ہے) نیا پارہ ڈاکسٹی کے اس کے منقولہ کہ، ملکیتیں ال کہ عہدیت بنتی ہیں، عہدیت امتداد زمانہ سے وفاقہ میں تبدیل ہوتی ہے اور جب وفاقہ کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے مانوس ہو جائے ہیں تو ان کا رجحان فردی ملکیت کی طرف ہو جاتا ہے، جرمنی کی حال کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی کے دوسری دہائی میں، نپلین کے زوال کے بعد جرمنی میں جو عہدیت قائم ہوئی وہ اس قدر وسیع و گھالی اور اتنی غیر منظم تھی کہ اس میں مرکز کا تقریباً وجود ہی نہ تھا، اور جو ادارے مرکزی کہلائے جاسکتے ہیں وہ نہایت درجہ بے تربیتی میں پڑے ہوئے تھے، چنانچہ بعض مرتبہ مرکزی عدالتوں کی تقاضاں چار چار برس تک برآئینہ رہتی تھیں۔ اس عہدیت کی کمزوری کا باعث یہ تھا کہ قدیم آسٹریا اور جدید پروٹسٹیا کے درمیان بجائے تعال کے مخالف کی کیفیت تھی جو ہر ادارہ عہدیت پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہی۔ یہ صورت حال پورے پچاس برس قائم رہی یہاں تک کہ ۱۸۰۶ء میں پروٹسٹیا نے آسٹریا کو جبراً جرمنی سے نکال دیا، اور ۱۸۱۵ء میں اپنے دوسرے در مقابل فرانس کو شکست دے کر خود فرانس کے باقیہ میں وفاقہ جرمنی کی بنیاد رکھی۔ اس وفاقہ کی ریاستوں کو بہت سے امتیازات حاصل تھے، ابھڑ جنوبی ریاستوں کو ڈاک اور جوئی تنظیم کا بھی جداگانہ اختیار تھا اور ان میں سے چند کے حکمرانوں کو تو بادشاہ کا خطاب بھی حاصل تھا۔ جنگ عظیم کے بعد

بعض ریاستوں نے اپنی کل آزادی کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش بار آور نہ ہوئی بلکہ ۱۹۱۹ء میں جو دستور مرتب ہوا اس میں مرکز کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے اور اس تبدیلی کا ایک مظاہرہ یہ ہوا کہ ریاستوں کو اب ”علاقوں“ کا لقب دیا گیا یہ مظاہرہ ہے کہ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۷۶ء اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک کی جنگ کا سب سے بڑا بار بروسشیا ہی پر پڑا تھا اور یہ ناکہ پڑ تھا کہ ۱۹۱۶ء کے دستور میں اس ریاست کو دوسری ریاستوں پر تفوق حاصل ہو جائے لیکن جو تبدیلی ۱۹۳۳ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۵ء میں کمال کو پہنچی اس کا بڑے سے بڑے پیش گو کو کو بھی علم نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ آسٹریائی نژاد ملکہ جس کا وطن مالٹا بیویریا میں ہے اور جو اب جمہوریہ جرمن کا ”رہنما و صدر اعظم“ ہے اس نے نہ صرف جرمن پارلیمنٹ کے تمام اختیارات خود اپنی ذات کے لئے تفویض کر لئے ہیں بلکہ تمام علاقوں کے وائسرائے کو معطل کر کے اور ان میں خود اپنی طرف سے ”منتظم“ مقرر کر کے جرمنی کو آسٹریا سمیت آخر کار ایک فردیہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکسی کے قول کی تصدیق جرمنی کی حال کی تاریخ سے بہتر کسی سے نہیں ہو سکتی۔

ہندوستانی صورت حال۔ اس بحث کے آخر میں ہم اس زمانے کے آخر ترین دستور میں وفاقی مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کے مابین جو تغیرات کی گئی ہے اسے دکھائیں گے، قانون حکومت ہند میں وفاقی مرکز کے اختیارات، برطانوی صوبوں کے اختیارات اور ان اختیارات کا اعادہ کیا گیا ہے جو دونوں اختیارات کو متوازن طور پر حاصل رہیں گے۔

(۱) وفاقی اختیارات، ہندوستان کی حفاظت، فوج، بیڑہ، ہوائی جہاز

جاگیرداروں اور فرماں رواؤں کے مدارس، علی گڑھ و بنارس کے جامعات، کلیسیائی امور و یورپی قبرستان؛ خارجی معاملات؛ دفاتی عدالت؛ ریل و دیگر طرزیں و رسائل (علاوہ ریاستوں کے ریلوں کے) ڈاک، تار، ٹیلیفون، بجے، تاریخبرسانی، مکہ سازی، بنک، فیون، پیٹرول اور بھیک سے اڑ جانے والی اشیاء، ایجادات، درآمد و برآمد، نمک، بعض علمی ذرائع تحقیقات، محصول آمدنی، محصول وفات، محصول معدنیات؛ وہ کاغذ محروس کا تعلق اس وقت مرکز سے، تہلن، اوزان، وغیرہ۔

(۲) صوبہ داری معاملات، مقامی حکومت، بلدیات وغیرہ کے اختیارات، شفا خانے، پگنل خانے، تعلیم (علاوہ دفاتی تعلیم کے)؛ امور عامہ، ریل و رسائل ریلیں وغیرہ (علاوہ دفاتی ریل و رسائل کے)؛ لنگان، زمینداروں کا شکار کے تعلقات؛ صوبہ داری تجارت؛ جنگلات، عدل (علاوہ دفاتی عدل کے)؛ جیٹری؛ اوقاف؛ اوزان پیمانے؛ صوبہ میں قابل تائش احوال بچا، پولیس، جیل خانے، صوبہ داری خدمات عالیہ، ویسی قبرستان، مجھل، سرکاری املاک سے، آبپاشی، بجلی، بازاروں وغیرہ سے، ایسے جرائموں سے جن کا تعلق صوبوں سے ہو، عدالتی محال سے، ابواب سے جائداد سے، مکانات وغیرہ سے، بنیادیں وغیرہ سے۔

(۳) علاوہ ازیں چند ایسے معاملات میں جن کا تعلق مرکز اور صوبوں دونوں سے

ہے یعنی دونوں ان پر قانون سازی کر سکتے ہیں۔ جو اصول مد نظر رکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ یکسانی کی ضرورت ہوتی ہے کہیں نہ کچھ صوبہ داری احساسات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ سب سے کہہ دیا گیا ہے کہ اگر اس ضمن میں صوبوں کے کسی قانون اور مرکزی قانون کے مابین اختلاف ہو تو صوبہ داری قانون مسترد سمجھا جائیگا

لیکن اگر کسی صوبہ داری قانون پر صرف گورنر صوبہ ہی کے نہیں بلکہ گورنر جنرل کے بھی دستخط ہو جائیں تو ایسی حالت میں صوبہ داری قوانین کو تلفیق حاصل ہو گا۔^۱ ایسے معاملات میں سے اہم حسب ذیل ہیں:-

ضابطہ دیوانی، قوانین آسٹریس، شہادت، مناکحت، تنہیت، تولیت، انتقال جائداد، وراثت، تعزیرات، ضابطہ فوجداری، مزدوری، قوم تہذیبی عمارتیں، دیوالیہ، وکالت، وڈاکٹری، اتحادات تجارتی، بجلی، سینما کی فلمیں وغیرہ۔

اس تقسیم اختیارات کے ساتھ ہی یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ گورنر جنرل کو اختیار ہو گا کہ وہ خاص اعلان کے ذریعہ سے ایسے معاملات جن کا ان فہرستوں میں ذکر نہیں ہے، مرکزی یا صوبہ داری جماعت دئے مقننہ میں سے کسی کو تفویض کر سکتا ہے یا ایسا محصول عائد کر لے کی جماعت مقننہ کو اختیار دے سکتا ہے جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں، نیز کسی صوبے کی امن وامان یا تمام ملک کی امن وامان کے بچاؤ کی خاطر وہ صوبہ داری اقتدار کو عمل میں لانے کے طریقوں کے متعلق بھی ہدایت کر سکتا ہے۔^۲ اس سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ شمار کردہ امور کے علاوہ "باقی ماندہ اختیارات" کا دار و مدار مرکزی صدر عالمہ یعنی گورنر جنرل کی مرضی پر ہو گا، یعنی خواہ ہندوستانی حکمران اور

۱۔ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء، تہہ ہفتم۔

۲۔ ایضاً دفعہ ۱۲۴ (۵)۔ اسی مسئلے پر فروری ۱۹۳۵ء میں محاکم متحدہ اور بہار کی حکومتوں نے استفسار پیش کر کے۔ بالآخر وزارتوں اور اقتدار عالمہ کے درمیان سمجھوتا ہو گیا۔

۳۔ ایضاً دفعہ ۱۰۴۔

”انگلینڈ“ کتنی ہی شہر ہیں کہیں نہ لگائیں کم از کم قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بموجب بہ نسبت اجزاء کے مرکز کو زیادہ قوت حاصل ہے۔

اور زیادہ تر برطانوی ہند کے صوبوں کی بابت غور کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ یہ بھی طے پا گیا ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ بھی اس وفاقیہ ہند میں شریک ہو سکیں۔ ہندوستانی ریاستوں کی کیفیت بالکل ممتاز ہے؛ اس میں سے ہر ایک ریاست کے عہد نامے برطانوی حکومت کے ساتھ جدا گانہ ہیں اور ان عہد ناموں میں ہر ایک کی حیثیت مختلف مانی گئی ہے، چنانچہ بعض ریاستیں مثلاً مالک محروسہ سرکار نظام، گوالیار، میسور، بڑودہ وغیرہ ایسی ہیں جنہیں اندرونی معاملات میں تقریباً مکمل اختیارات حاصل ہیں اور مالک محروسہ سرکار نظام میں تو علیحضرت خیر و کرم کا سکے بھی چلنا ہے، انگریزی ڈاکھانے کے پہلو پہلو خود ان کا ڈاکھانہ ہے اور انہیں کی ریل ہے۔ اس کے برعکس بمبئیوں بلکہ سیکڑوں ایسی چھوٹی چھوٹی جاگیریں ہیں جنہیں بہت ہی جزوی اختیارات حاصل ہیں اور بعض کو تو قانون سازی اور عدالت کے بھی پورے اختیارات حاصل نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی تقسیم جس میں ان سب انواع و

۱۔ نیز کچھ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء حصہ ۶۔

۲۔ سکے سازی اور سکہ رانی، ڈاک کا اختیار بعض دوسری ریاستوں کو بھی حاصل ہے، لیکن کہیں صرف تانے کے سکے ڈھالے جاتے ہیں، کہیں صرف چاندی کے یہ امتیاز صرف حیدرآباد دکن ہی کو حاصل ہے کہ یہاں ہر قسم کا سکہ ڈھالا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نوٹ بھی لائچ بیج بن کالین دین پوری قیمت پر ہوتا ہے۔

اقسام کی ریاستیں ایک ہی ذمہ سے ہیں رکھی جائیں، درست نہ ہوگی؛ اسی لئے جب
 ۱۹۱۹ء میں ایوانِ والیان ریاست موسومہ ”نرندرمل“ قائم ہوا، تو اس کی
 رکبیت کے لئے بعض منفرد ریاستوں کو اختیار ملا، بعض ریاستوں کے مجموعوں کو ایک
 ایک کر کے چھٹنے کا اختیار ہوا اور بعض کو ان کا کتر سمجھا گیا کہ انھیں رکبیت کا سب سے
 اختیار ہی نہیں ملا۔ موجودہ حالات میں اس وقت بھی ہندوستانی شہنشاہی حکومت
 اور ان ریاستوں کے باہمی تعلقات بہت کمزور ایک وفاقیہ کے ہیں، جس میں مرکز کو چند مختصر
 اختیارات مثلاً خارجی معاملات، برطانوی ہند کی ریویں، جران ریاستوں میں حکومتی میں،
 سکس سازی، نار، بحری محال، درگرنک، ایسے امور پر اختیار ملتا ہے، حال میں اگر قبیلہ
 اختیارات سب کے سب ریاستوں کو محال ہیں، لیکن ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۷ء کی گول میز
 کانفرنسوں کے بعد قانونِ حکومت ہند ۱۹۵۰ء سے یہ طے ہو گیا ہے کہ آئندہ وفاقیہ
 ہند میں ریاستیں شریک ہوں گی، بلکہ وفاقیہ اس وقت تک وجود میں نہیں آسکے گی
 جب تک کہ ان ریاستوں میں شریک نہ کریں، کہ ان کا رقبہ جملہ ریاستوں کے رقبے
 کا نصف ہو۔ جب سے قانونِ حکومت ہند ۱۹۵۰ء پر کم سے کم عظیم خارجہ، خزانہ کی
 دستخط کیے ہیں اس روز سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے ریاستوں اور حکومت ہند کے
 درمیان شرائطِ شریک وفاقیہ کے متعلق برابر بحث و مباحثہ ہو رہا ہے۔ یہ تو قدرتی بات ہے کہ
 سے اکثر ریاستیں وفاقیہ ہند میں شریک ہو جائیں گی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
 وہ کون کون سے اختیارات میں جن سے انھیں درست ہر دار ہونا چاہیے گا، یعنی وہ

کون سے امور میں جن کی حد تک وفاقی جماعت متفہم اور جماعت عامہ کو ریاستوں کے اندر اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ اس ضمن میں متحدہ کیٹیڈوں، وفد و کانفرنسوں کو ڈیپٹی سے والیان ملک اور ان کے ذریعہ جن میں حیدر آباد اور اس کے وزیر یا دیگر راسٹ انریل کو اس سر حیدر کو از جنگ بہادر کا بڑا حصہ ہے) اپنے وعا دی حکومت ہند کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

بہار ہندوستانی وفاقیہ، صوبوں اور ریاستوں کی بابت ذرا تفصیل سے اس لئے لکھا گیا ہے کہ اول تو ہم سب اسی ملک کے رہنے والے ہیں، الودھیر سیاسی اعتبار سے ہمارا ملک ایک نہایت دلچسپ ملک ہے، اس لئے کہ باوجود کہ وہاں زبانوں اور جزائیہ کے تنوعات کے اس ملک میں ہمیشہ جذب کی قوت کا رفرار ہے اور جو اقوام باہر سے آئی ہیں وہ اس ملک کی ہو گئی ہیں۔ نیز تاریخ شاہ مسیح کہ جب کبھی مرکز گزیرا اثرات لئے تفوق حاصل کیا فوراً ان کی کاٹ کے لئے ایسی کیفیتیں پیدا ہو گئیں کہ انھوں نے ان اثرات کو زیر کر لیا۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ حالت آدھرا شک اور سدر گہمت، پلکیشن اور ہر ش کے عہدوں میں پائی جاتی ہے تو اس طرف علامہ الدین خلجی، محمد تھان اور اورنگ زیب نے ان اثرات کو دبا یا ہے

لئے اس تمام بحث کے لئے دیکھو پاکیزہ ہندوستانی ریاستیں اور ہندوستان کی حکومت

Panikkar: Indian State and the Government

باب ۱۳ of India

Beotra: The Two Indias.

پرتلا: "دونوں ہندوستان"

اور ملک میں قانونی اور انتظامی اتفاق پیدا کیا ہے۔ آج بھی باوجود ہر طرح کے تفرقوں کے جو ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، مشکل سے کوئی دل نہوگا جو کسی نہ کسی طرح سے اس ملک کو متحد و متفق دیکھنا نہ چاہتا ہو، اور اب جب ایک طرز حکومت ایسی نظر آتی ہے جو منہارت کے ساتھ ساتھ اتفاق و اتحاد عمل کا امکان پیدا کرتی ہے تو تمام ہندوستانی ہندو مسلمان، برہمنوں کی ہندی، ریاستی ہندی، شالی اور کھنٹی سب اپنے اپنے مانتوں سے اسی کی طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ کیا عجب کہ ایسی دفاقی طرز حکومت ہی اس پسماندہ ملک کی آئندہ ترقی کا لازماً ثبوت ہو۔

Legislation

باب ۱۵

مقننہ .
Legislation

قانون سازی کی اہمیت : قانون ساز جماعت مقننہ - دواپروانی جماعت - ایوانوں کی ترکیب اختیارات
حق رائے دہی - اکثریت و اقلیت - تناسبی نیابت - ضابطہ منظوری جماعت عالمہ کی ذمہ داری

براہ راست قانون سازی
قانون سازی کی اہمیت - اس سے قبل یہ بتایا جا چکا ہے کہ
ہر ملک کی اندرونی تنظیم میں تین ادارے دوسروں سے ممتاز نظر آئیں گے یعنی
ادارہ مقننہ ، ادارہ عالمہ اور ادارہ عدلیہ اور چونکہ ادارہ مقننہ وہ ادارہ ہے جس کے
ذریعے سے قوانین بنتے ہیں اور باہمی تصادم کو روکنے کی غرض انسانی اختیارات کی
تحدید ہوتی ہے اس لئے ان تینوں میں سب سے اہم عضو حکومت مقننہ ہے۔ نیز
یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جس طرح قوانین انسان کے افعال کو محدود کرتے ہیں اسی طرح
سے محال کے ذریعے سے اس کی مالی آزادی میں تحدید کی جاتی ہے۔ چنانچہ
یہ دونوں امور ایک دوسرے کے مائل میں جس کی وجہ سے عام طور پر جس ادارے

۱۲ باب ۱۵

کے ذمے قانون سازی ہوتی ہے اسی کے ذمے محال عائد کر کے اختیارات بھی ہوتا ہے۔ اس سے ایک کلیہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حکومت کی ہال کمالی گواہ ادارہ ہے جس کے سید قانون سازی اور محال عائد کر کے اختیارات ہو، اگر یہ اختیار کسی شخص واحد سے متعلق ہے تو وہ شخص کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوگا؛ اور اگر یہ اختیار کسی جماعت سے وابستہ ہے تو یہ کم از کم ادارہ عالمہ پر اس جماعت کا تعلق ہونا ضروری ہے۔

قانون ساز۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قانون سازی کے اختیارات کس کو محال ہونا ملک کے لئے بہترین ہوگا۔ سب سے پیشتر یہ بات صاف کرنا ضروری ہے کہ کوئی سیاسی اصول یا مسلک ایسا نہیں جو تمام عالم کے ملکوں کے لئے یکساں مفید و کارآمد ہو سکے۔ ہر ملک کے رسم و رواج، عقائد و تاریخ اور کیفیت دوسرے ملک سے مختلف ہیں اور ہر ملک کے سیاسی ادارات ان کیفیات کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ملک ہے کہ جس کے باشندوں کے گھٹی ہی

۱۵۔ جب جن میں ہلکے برسر انداز ہونے پر دلوں کی سیاہی بساط پٹی تو ہلکے سب سے پہلے یہ کیا کہ جن پارلیمنٹ سے قانون منظور کیا جائے اختیارات قانون سازی خود اپنے اور اپنی کامیابی کے ساتھ وابستہ کرانے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہلکے کے نزدیک بھی قانون سازی کے اختیارات عالمہ اختیارات سے زیادہ اہم ہیں۔

۱۶۔ دیکھو بھگت "مبادی سیاسیات" جو Sidgwick: Element of
Politics. باب ۲۰۔

میں ملک کے بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان کشمکش کی روایات پڑی ہوئی ہیں اور جب کہ تاریخ دراصل ان دونوں کے باہمی جھگڑوں کی تاریخ ہے، ایسے ملک میں حکمران اور رعایا کے درمیان کسی قسم کا اعتبار و اعتماد اس وقت تک ممکن ہے جب تک کہ ایک طرف دوسرے طرف کے اختیارات سلب نہ کرے۔ دوسرے ایسے ہی ملک میں جہاں حکمران اور رعایا ایک دوسرے کا معاملہ واحد سمجھتے ہیں اور جس میں بادشاہ رعایا کی بھلائی اور رعایا بادشاہ کے انوکھے حفاظت کرنا اپنا فرض عین سمجھتی ہے، ایسے ملک میں گو بادشاہ کے اختیارات میں کوئی ظاہری رکاوٹ نہ ہو لیکن فی نفسہ ملی روایات اور اخلاقی کیفیات ہی ملک والوں کو آزادی کی سب سے بڑی ضمانت سمجھی جاتی ہیں بعض دوسرے ملک ایسے ہیں جہاں کے عقیدے کے مطابق چونکہ انسان کامل قوانین نہیں بنا سکتا اس لئے بہترین قوانین دیئے گئے ہیں جو خدا بنا کے، اور یہاں بعض قواعد و قوانین وقتاً اسی کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

یہاں اس تفصیل کی ضرورت ایسے پیدا ہوئی تاکہ ہر ملک کی ذہنی اور مادی کیفیت

۱۔ انگلستان کی دستور تاریخ اس قسم کی کشمکش سے بھری ہوئی ہے۔
 ۲۔ اکثر مشرقی ملک اس اصول کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں بادشاہ "سید القوم خداداد" کے
 ۳۔ مصلحتی مخدم نہیں بلکہ خادم سمجھا جاتا ہے اور اس کے اختیارات میں کمی کو مملکتی اختیارات میں کمی
 ۴۔ کے مترادف تصور کیا جاتا ہے۔ جاپان میں آج بھی بادشاہ اور ملکی اقتدار دونوں ہم منہ می سمجھے
 جاتے ہیں۔

۵۔ قرآنی تائید اسی اصول پر مبنی ہے۔ یہی کیفیت دھرم شاستر کی ہے۔

دروابات کے اثرات کا پتہ لگ سکے اور سیاست کے طالب علم کے لئے سب سے خطرناک جو معاملہ ہے، یعنی کسی ”عالمگیر“ اصول کو ہر ملک کے حالات پر مطبق کرنا، اس سے اسے بچایا جاسکے۔ آج کل بعض ممالک میں عام خیال یہ ہے کہ ملک کی جملہ سیاسی خرابیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ قانون سازی کا کام ایک منتخب شدہ مجلس کے سپرد کر دیا جائے اور وزارت کو اس مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دیا جائے۔ یہ خیال خاص طور پر جنگ عظیم سے پہلے کی نصف صدی میں نشوونما پاتا گیا اور گو مختلف ممالک اور پھر مثلاً جرمنی، اٹلی میں آمریت کے قیام اور عمومی ممالک کی پے درپے پسپائی کی وجہ اس میں وہ زور نہیں رہا جو پہلے تھا تاہم اس وقت بھی ہندی نو جوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس طرز عمل کو تمام سیاسی سمیات کا نزدیک تصور کرتی ہے۔ اگر غور سے دیکھی جائے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ منتخب شدہ حکومت کا طریقہ ہی انسانی فطرت کے مطابق ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ طریقہ صرف آسانی اور سہولت کے لئے ایجاد کیا گیا ہے اور اس کا دائرہ مار ملک دانوں کی معاشری عادات و اطوار پر ہونا چاہیے۔

جماعت مقصد۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ قانون سازی کے لئے صرف قانون

۷۷ اس خیال کو سب سے زیادہ عروج انیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ اس صدی میں عام خیال یہ پھیلنا ہوا تھا کہ ہر قوم کی عرقی کارا دیہ ہے کہ ملک میں پارلیمنٹی حکومت قائم کی جائے۔ اب یورپ میں یہ خیال روز بروز فنا ہوتا جا رہا ہے۔

۷۸ سبک ”مبادی سیاست“ باب ۲۰

دانی ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ قانون اور ملک کے معاشرتی حالات کے مابین جو تعلق ہے اس کا اندازہ بھی کیا جائے انسانی ضروریات اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے طریقوں سے اگر واقفیت ہو تو پھر جو قانون بنے گا وہ مکمل ہوگا، اور محض اس وجہ سے کہ ان دونوں شعبوں کے متعلق جو معلومات انسان کو حاصل ہو سکتی ہیں وہ غیر مکمل اور ناقص ہیں، بعض اقوام نے الہی قوانین کو اختیار کر لیا ہے، بعض ایک ایسے مکمل حکم کے انتظار میں ہیں جو ضروریات اور انسداد ضروریات کی تدابیر دونوں سے کیا حقہ واقف ہو، اور جو کتاب خدا کی دینی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور ایسا "افلاطونی" حکم ان غنا دشوار ہے اس لئے چارونا چار ایسے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں جن کے ذریعے سے مکمل نہیں تو انسانی اعتبار سے بہترین اور مقتضائے وقت قوانین بنائے جاسکیں۔

الغرض یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منتخب شدہ جماعت مقننہ انسانی کمزوری اور نقص کا ایک مظاہر ہے۔ اگر ملک والوں کو ایسا شخص مل جائے جو ملک کی ضروریات سے واقف تصور کیا جائے اور جو اس کے انسداد کی تدابیر سمجھ سکے تو وہ قانون سازی اسی کے سپرد کر دیں گے، ورنہ ایک مرکب جماعت ترتیب دی جاتی ہے اور اس

۱۵ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آج کل بعض ملکوں میں امریت کا جو دور دورہ ہے اس کی بنیاد اصول پر نہیں ہے کہ آج جو کچھ گادی ملک کے لئے بہتر ہوگا، اور آج کے کردار پر حرف زنی سیاسی اعتبار سے اتنی ہی نقصان رساں تصور کی جاتی ہے جتنی سی بی یا رسول کے کردار پر حرف زنی مذہبی اعتبار سے عذاب الہی کی مستحق تصور کی جاتی ہے۔

میں حتی الامکان ہر شعبہ زندگی یا ہر رقبے کا قائم مقام اور جدیدہ چیدہ افزا و جمع کئے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے اپنے شعبوں یا رقبوں کی ضروریات سے مجلس کو مطلع کر سکیں۔
 یہیں مظاہر ہے کہ اس قسم کی مرکب جماعت کا عوام الناس سے کچھ تعلق ہو گا اور ان کے ذریعے سے ایسے قوانین و قواعد مرتب کئے جائیں گے جو ملکی ضروریات سے مربوط ہوں، اور گوان قائم مقاموں میں سے بہت سے نمبر ہوں گے اور بعض کو زیادہ تجربہ ہو گا لیکن وہ فطری عقل و شعور کے اس عنصر کا اضافہ کر سکیں گے جن کی ہر انسانی تدبیر کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

دو ایوانی جماعت۔ اگر ہم عمومی ممالک کے ادارات کا قانون سازی کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ قانون سازی کا کام ایک ایسی جماعت کے سپرد ہوتا ہے جس کے یا تو دو ایوان ہوں ورنہ ایک ہی ایوان ہو۔ ایوانوں کے تعداد کے دو سبب ہو سکتے ہیں، ایک تو تاریخی اور دوسرے سیاسی۔ جن ممالک میں مقننہ جماعتوں نے نشوونما پائی ہے ان میں سے بعض میں کسی زمانہ میں تین تین چار پارلیان بھی بنے ہیں۔ آئین میں لیکن اس وقت کوئی ایسا ملک نہ ملے گا جہاں دو سے زیادہ ایوانوں کے کسی قانون کی منظور میں کوئی ضرورت بھی جاتی ہو جیسا انی بیان کیا گیا ہے، ممکن ہے کہ کسی ملک میں دو ایوانی جماعت مقننہ کا وجود محض تاریخی ارتقائی وجہ سے ہو جیسا انگلستان میں) ایسے ممالک میں دوسرے ایوان کی وجہ وجود معلوم

علامہ سبک: ”ارتقائی نظم حکومت یورپ (مسلک نصیب جامعہ عثمانیہ)“ خطبہ ۲۔ فرانس میں تو ۱۷۸۹ء کے بعد تک جماعت مقننہ نہ ایوانی تھی۔

کرنے کے لئے دہان کی دستوری تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے؛ یہاں صرف اس اصول سے بحث ہے کہ آیا کسی جدید جماعت مقصد کے قیام پر اس میں ایک ایوان ہونا چاہئے یا نہ۔

جب اس اصول پر کسی ملک والے قایم ہو گئے کہ قانون سازی کا کام عوام کے مختلف طبقوں کے نمائندوں کے سپرد ہونا چاہئے تو لفظ ہر دوسرے ایوان کی گنجائش نہیں رہتی، اس لئے کہ مختلف طبقوں کے جو نمائندے ہیں وہ سب مل بیٹھ کر تہا دلہ آرا کریں گے تو مباحثے کی وجہ سے حق کا پتہ لگ سکے گا۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ایسی جماعتوں میں جہاں قائم مقاموں کا انتخاب عام داری سے ہوتا ہے وہاں زرعی بندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اور جماعتیں فوراً ایک گروہ دوسرے گروہ پر غالب آجاتی ہیں۔ ایسی صورت میں خرافہ ہوتا ہے کہ کہیں باہمی ضد کی وجہ سے غالب زرعی انہی اکثریت کے زعم و تائید میں ایسے قوانین منظور نہ کر اوسے جو مخالف گروہ کے کسی خاص طبقے کیلئے مفید پڑتے ہوں یا بالآخر ملک کیلئے مفید ثابت نہ ہوں۔ مثلاً ظاہر ہے کہ کسی ملک میں زمیندار طبقہ یا اس کے قائم مقام ضرور اقلیت میں ہوں گے، اور یہی کیفیت تعلیم یافتہ طبقے کی بھی ہوگی۔ اگر قانون سازی کیلئے کسی ایک ایوانی جماعت مقصد کے سپرد کر دی گئی تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ ایوان ایسی اقلیتوں کا قائمہ نہیں کر دے گا جو سن و سال یا زرعی ترقی کی پشت دہنا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ زیادہ تر جو لوگ ایوان عمومی میں منتخب ہوتے ہیں، وہ انچا چرب زبانی اور زور خطابت، ورنہ اسپیشل مال دولت کی وجہ سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور یہ

بالکل ممکن ہے کہ ایسے قابل لوگ رہ جائیں جو یا تو فن خطابت کے ماہر نہیں ہیں یا ان کے پاس انتخاب کے اخراجات کے لئے کافی دولت نہیں، لیکن دراصل ان کا سیاسی تجربہ اور قابلیت مسلمہ ہیں۔ اس سلسلے میں تیسری بات یہ کہنی ہے کہ وفاقیوں میں شخص کے سامنے دو چیل ہوئے ہیں، ایک کا مرجع قوم ہوتی ہے، دوسرے کا مرجع ریاست ہوتی ہے، اور مرکزی حکومت دراصل ان دونوں تعینات کے امتزاج کا ہی کرشمہ ہوتی ہے۔ سیاسی تعمیر کاروں کا سب سے بڑا خیال یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے جماعت مقننہ ملک کی عام راز اور عام جذبات کا آئینہ بن جائے، چنانچہ جب انھیں کسی وفاقی کی جماعت مقننہ بنانی پڑتی ہے تو وہ اکثر ایک ایوان کو ”قومی“ یعنی مرکزی عناصر کا قائم مقام، اور دوسرے کو وفاقی یعنی ریاستی عناصر کا قائم مقام بناتی ہیں۔ ایوانوں کی ترکیب و اختیارات۔ انٹریس یہ وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر بہت سے ملکوں میں دو ایوانی مقننہ ترتیب دی جاتی ہے، گو یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے عناصر کی جو عام رائے سے منتخب نہ ہو سکے ہوں، کسی ایک ایوانی مقننہ میں نامزدگی کر دی جائے، جیسے ہندوستان کی جماعتوں میں ہوتی آئی ہے۔

۱۔ وفاقیوں میں ایوان بالا کی ساخت میں دو متبادل اصول برپے جاتے ہیں، یعنی یا تو ہر ریاست کا مرتبہ ایک ہی سمجھا جاتا ہے اور ساری تعداد ارکان کی منتخب کی جاتی ہے جیسے ہالک مئجڈہ امریکہ، سوئٹان اور روس میں، ورنہ ان کی نمایندگی ایک حد تک آبادی کے متناسب سے ہوتی ہے جیسے کناڈا میں۔

اگر دوسرے یا اونچے ایوان کو انھی حلقوں سے یا اس مدت کے لئے یا انھی شرائط پر منتخب کیا جائے جن حلقوں یا مدت یا شرائط کے لئے ایوان عام منتخب کیا جاتا ہے، تو پھر یہ یا تو بے سود ہوگا یا کاموں میں رکاوٹ پیدا کرے گا، اور اس سے وہ مطلب حل نہیں ہوگا جو اوپر کے پارے میں اس کی وجہ وجود بنا یا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس میں نیچے ایوان کے بہ نسبت اعلیٰ وارفع تمدن یا اعلیٰ معیار زندگی یا اعلیٰ تعلیم کی نمایندگی ہو، چنانچہ جو اصول علیٰ العموم اونچے ایوان کے تقرر کے برتنے جاتے ہیں وہ (علاوہ وراثت اور نامزدگی کے) ہیں کہ اس کے حلقہ جات راہی نسبتہ وسیع تر ہوتے ہیں، اس کے اراکین کی عمروں کا معیار طویل ہوتا ہے، وہ نسبتہ زیادہ مدت کے لئے منتخب ہوتے ہیں، اور بعض ممالک میں یہ ایوان ایک ایسٹبلشمنٹ ایوان ہوتا ہے جس کے اراکین کبھی بالکل بے خواست نہیں ہوتے بلکہ اس کا ایک ایک حصہ چند سال کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ایوان کے اختیارات عموماً ایوان اول سے ذرا کم ہوتے ہیں، چنانچہ بعض ممالک میں تو یہ اختیارات صرف اس حد تک محدود ہوتے ہیں کہ ملک کی صحیح راستے دریافت کرنے کی غرض سے ثانوی مسودات کو ایک خاص زمانے تک معطل کر دیا جائے، یعنی کسی مسودہ کو کلیئہ مسترد کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ممالک میں کسی مالی مسودے کی تیسخ کا اختیار ایوان دوم کو نہیں دیا جاتا، تاکہ ملک کے انتظامات اس وزارت کے ذریعے سے جو ایوان زیریں کے سامنے ذمہ دار ہوئے چلتے رہیں، رکین نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض وفاقی ممالک میں جن کی بدیہی مثال ممالک متحدہ امریکہ ہے، ایوان دوم کو

(جسے سینات کہتے ہیں) بہت سے علما نے اور انتظامی اختیارات بھی حاصل ہیں
 (جیسے صدر جمہوریہ کے ساتھ مل کر ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں کا تقرر) لیکن
 ایسے ممالک اکثر وہی ہیں جن میں وفاقی طرز کی حکومت قائم ہے، اور جیسا اور بیان
 کیا گیا ہے ایسے ممالک میں انچا ایوان ایک خاص اصول یعنی وفاقی اصول کا قائم
 مقام ہوتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ممالک میں بھی
 ایوان دوم کو مالی امور میں ایوان اول کے مساوی اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔
 اسی طرح ان ممالک میں جہاں ذمہ دار وزارت، یعنی کابینہ طرز حکومت
 رائج ہے وہاں عام طور سے یہ وزارت صرف ایوان اول یعنی منتخب شدہ ایوان
 کے سامنے ذمہ دار ہوگی ورنہ عمومی حکومت قائم نہ رہے گی اور کابینہ حکومت
 کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا حقیقت یہ ہے کہ جیسا سبک لے لکھا ہے، ایسی
 جماعت متفقہ جس کے دونوں ایوانوں کے اختیارات بالکل مساوی ہوں گی بالکل
 نظام کا ایک نہایت ہی نامور عنصر ہوں گے۔

حق رائے کے ذریعے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ایوانوں کا
 انتخاب کیسے ہو پہلے تو نیچے ایوان یا ایوان عام کو پہنچے۔ لہذا جس وقت ہم نے
 عمومی اصول کو تسلیم کر لیا، یعنی ہم اس اصول کو ماننے لگے کہ ہمارے جماعت متفقہ ملک
 کی عام رائے کی قائم مقام ہوگی، پھر بادی النظر میں ہم خواہی شجاعتی اس نتیجے پر
 پہنچیں گے کہ اس ایوان کو عام ایسے لوگ انتخاب کریں جو خالص و بالغان ہوں، لیکن

بہت سے ملکوں میں اس حق پر کئی طرح کی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ بعض جگہ تو یہ کہا جاتا ہے کہ فی نفسہ عیسویت یا نیا بتی طریق کے معنی نہیں ہیں کہ ہر کس و نا کس خواہ اسے فطری اہلیت ہو یا نہ ہو ضروری رائے دی کا مستحق قرار دیا جائے۔ مثلاً بہت سے ملکوں میں، جہاں قانونی سن بلوغ ۲۱ سال کا سمجھا جاتا ہے، حق رائے دی ۲۵ برس تک حاصل نہیں ہوتا، تاکہ انسان کو اپنے ذاتی معاملات پر اختیارات حاصل ہونے کے بعد کم سے کم چار سال کا مزید تجربہ حاصل ہو جائے پھر بہت سے سرمایہ دار ملکوں میں خیال کیا جاتا ہے کہ تا وقتیکہ انسان کسی نہ کسی طرح کی جائداد کا مالک یا اس پر قابض نہ ہو اس وقت ایک ایسے ملکی معاملات کا درو کیا ہو سکتا ہے، اس لئے کہ محض ادارہ گدراہ گیر کے لئے اچھا قانون کیا اور بُرا کیا، چنانچہ عمر کے ساتھ ایک شرط یہ بھی لگھی جاتی ہے کہ رائے دہندے کو تھوڑی بہت جائداد کا مالک یا کم از کم کسی مکان یا دوکان پر قابض ضرور ہونا چاہئے۔ حال ہی میں جنگ عظیم کے بعد دو ملکوں یعنی روس اور آئی میں نئے قسم کا معیار رائے دی مقرر ہوا، یعنی روس میں ۱۹ سال تک صرف انھیں لوگوں کو سیاسی رائے دی کے حقوق حاصل تھے جو اپنی ذاتی قوت بازو سے روزی پیدا کرتے ہوں اور ساتھ ہی دوسروں سے کام نہ لیتے ہوں، چنانچہ یہاں مدارس کے اساتذہ، مالکان کارخانہ جات اور ایسے ہی دوسرے طبقات کو سیاسی معاملات میں حصہ لینے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا؛ اٹلی میں ہر شخص کو رائے دی کا حق حاصل ہے جو حکومتی تجارتی میں سے کسی نہ کسی کارکن ہو اور اس کا چندہ دیتا ہو۔ پھر آج بھی بعض ملک ایسے ہیں (جیسے فرانس، اٹلی، جرمنی، جاپان) جہاں عورتوں کو رائے دی سے

اس وجہ سے محروم کیا جاتا ہے کہ ان کا دائرہ عمل گھروار کے اندر محدود ہے اور سیاسی معاملات میں حصہ لینے کی نہ انہیں فرصت ہے اور نہ اس کی اہلیت؛ دوسرے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر کسی گھرانے میں شوہر بیوی دونوں سیاست میں دلچسپی لینے لگیں تو کم از کم جزوی مخالفتوں کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی، جو کئی معاشرے کے لئے نقصان رساں ہوگی۔ اس کے برعکس زنانہ حق رائے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ آج کل مشکل سے کوئی شعبہ زندگی ایسا ہوگا جس میں عورتیں مردوں کے روش بدوش حصہ نہ لیتی ہوں، اور عورتوں کو سیاسی معاملات سے کم از کم اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی مردوں کو؛ رہا باہمی مخالفت کا مسئلہ، تو اس اصول کے بنا پر ہر گھرانے میں صرف ایک ہی شخص کو حق رائے دہی ملنا چاہئے، ورنہ شوہر بیوی کی طرح جو ان بیٹے اور باپ کے مابین بھی تو سیاسی اختلافات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بعض ممالک میں رائے دہی مذہبی عقیدے پر مبنی ہوتی ہے، اور یہ ایک نہایت ہی دلچسپ مظاہرہ ہے کہ آج کے جدید یورپ کے شاید سب سے ”ترقی یافتہ“ ملک یعنی جرمنی میں جو کچھ بھی سیاسی حقوق باقی رہ گئے ہیں ان سے بھی یہودیوں کو بالکل محروم کر دیا گیا ہے بلکہ اب تو انکی پوری املاک پر قبضہ کر کے انہیں جالوردں سے

۱۹۱۳ء میں سب سے پہلا ملک جس نے عورتوں کو رائے دہی کا حق دیا وہ فرسٹان ہے؛ یہ حق ۱۹۱۹ء میں دیا گیا اس کے بعد ڈنمارک نے ۱۹۱۵ء میں، ناروے نے ۱۹۱۵ء میں، جرمنی نے ۱۹۱۹ء میں، انگلستان نے ۱۹۲۸ء میں اور ہندوستان نے ۱۹۳۵ء میں عورتوں کو رائے دہی کا حق فراہم کیا۔ ہنگری کے سربراہان نے ۱۹۱۹ء میں یہ حق سلب کر لیا گیا۔

جی بدتر شکل سے ملک سے ہنسکا یا جا رہا ہے اور گزشتہ ۲۸ سالوں سے کانگریز امریکہ سفیدار سیاہ باشندوں کو مساوی حق رائے دی دیا گیا ہے لیکن ان ریاستوں میں جہاں سیاہ اقوام کی تعداد زیادہ ہے، طرح طرح کے طریقے ایسے ایجاد کئے گئے ہیں کہ یہ لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان سیاسیات میں کسی طرح کا حصہ لینے سے محروم ہو جائیں۔ بعض ممالک میں رائے دی کے لئے ایک خاص تعلیمی معیار مقرر کیا جاتا ہے تاکہ رائے دی کے دہریے سیاسی معاملات کو سمجھ سکیں اور بعض میں مختلف مذاہب کے پیروں کے حلقہ رائے دی جدا جدا ہیں اور ایک کا دوسرے سے متعلق سروکار نہیں۔

اکثریت و اقلیت - اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حلقہ جاست

سال ۱۹۲۰ء کی مردم شماری کی روش سے ممالک متحدہ امریکہ میں سیاہ باشندوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد تھی۔ ان طریقوں کے لئے دیکھو برائیس: "دولت عامہ امریکہ - Bryce: American can Commonwealth. جلد ۲، حصہ ۵، باب ۹۵۔

شلے لاسکی اپنی کتاب "صرف نوجو سیاسیات" Lascki: The Grammar of Politics. باب ۸، میں حدود رائے دی کی معائنہ تنقید کرتا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بہترین صورت حال وہ ہے جہاں ہر عامل دباؤ کو رائے دی کے اختیار میں رکھے جائیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو تعلیم یافتہ ہوں وہ ماہرین سیاسیات بھی ہوں، نیز اگر حق رائے کو صاحبان جائیداد تک محدود کیا جائیگا تو پھر باقی ماندہ باشندے کوئی ٹپسی نہیں لے گی اور رائے دی کا اصل اصول فوت ہو جائے گا۔

راے دی کی تنظیم کس نوع سے کی جائے۔ سب سے آسان شکل تو یہ ہے کہ تمام ملک ایک کرنی حلقوں یعنی ایسے حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے، جہاں کے باشندے مختلف امیدواروں میں سے ایک ایک امیدوار کو بذریعہ کثرت رائے منتخب کریں۔ آسانی کی وجہ سے یہ طریقہ بہت مقبول ہے لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اگر فی حلقہ دو امیدوار ہوں تو نصف کے قریب رائیں بے کار جاتی ہیں، اور دوسے زیادہ امیدوار ہوں تو ایسی حالت میں بعض مرتبہ جو شخص منتخب ہوتا ہے وہ بجائے اکثریت کے اقلیت ہی کا قیام مقام ہوتا ہے۔ اس طریقے کو اضافی رائے کا طریقہ

۱۰۰۰۰ کے طور پر ملاحظہ ہو۔

دو امیدوار؛ مفروضاً الف کے لئے ۱۰،۰۰۰ آراء

ب کے لئے ۹،۰۰۰ آراء

الف ۱۰۰ آراء سے منتخب ہوا، یعنی

ب کے لئے ۹۰۰۰ آراء نہیں وہ ضائع ہو گئیں

دوسے زیادہ امیدوار؛ مفروضاً الف کے لئے ۱۰،۰۰۰ آراء

ب کے لئے ۹،۰۰۰ آراء

ج کے لئے ۸،۰۰۰ آراء

الف منتخب شدہ سمجھا جائے گا حالانکہ اس کے

مخالف ۱۰،۰۰۰ آراء ہیں اور ب کے موافق صرف ۹،۰۰۰۔

اگر ہم انگلستان، یعنی اس ملک کی نیا بت پر غور کریں جو اس ”اضافی کثرت رائے“ کا (تبیہ روش قریباً)

کہتے ہیں، اور اس میں علاوہ اس بڑے نقص کے کہ کسی حلقہ میں اقلیت نیابت سے بالکل محروم ہو جاتی ہے، ایک نقص یہ بھی ہے کہ مجلس مقننہ کے ارکان میں حلقہ داری اور صوبہ داری جذبات بہ نسبت قومیت کے جذبات کے کہیں زیادہ ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔

اس نقص کو دفع کرنے کے لئے دو طریقے عمل میں لائے جاسکتے ہیں، ایک تو یہ کہ اقلیتوں کی نمایندگی کی کوئی نہ کوئی شکل نکالی جائے، اور دوسرے یہ کہ بجائے جنرالی حلقے بنانے کے انتخابی حلقوں کا دارومدار پیشوں یا زندگی کے شعبوں پر ہو اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۹۴) سب کا بڑا حامی سمجھا جاتا ہے تو ہم اس طریقے کے عجیب و غریب نتائج نہایت متنازعہ پائیں گے ۱۹۳۱ء کے انتخابات عام کی کیفیت یہ تھی۔

| فریق | آراء حاصل کردہ تقریباً | نشتہائے دارالعلوم |
|-----------------|------------------------|-------------------|
| (۱) حکومتی فریق | ۱۴۰ لاکھ | ۴۹۳ |
| (۲) آزاد مزدور | ۶۶ لاکھ | ۴۶ |
| (۳) آزاد لبرل | ایک لاکھ | ۴ |
| (۴) دیگر | ۳۳ لاکھ | ۵ |
| جملہ | ۲۱۶ لاکھ آراء | ۵۴۸ نشستیں |

یہ اعداد انجمن نیابت متاسبی *Proportional Representation*

Society کی روداد بابت ۱۹۳۱ء سے لئے گئے ہیں (

ہر حلقہ تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ سب سے پہلے تو اقلیتوں کی نمایندگی کے اہم مسئلے کو لیجئے۔ لفظ ”اکثریت“ اور ”اقلیت“ کا دو مختلف مفہوموں پر انطباق ہو سکتا ہے، یعنی سیاسی اکثریت و اقلیت اور تمدنی اکثریت و اقلیت۔ سیاسی اکثریت و اقلیت میں وہ کیفیت شامل تھی جیسے کی جس کے تحت جملہ آبادی کا سطح نظر ملکیت اور ملک کی بہتری ہو، لیکن چونکہ ہر شخص کا طرز کار جداگانہ ہوتا ہے اس لئے اس حصول کار کی تدابیر کے تعین میں ان میں سیاسی فریق بن گئے ہوں۔ لیکن جن ممالک میں حصہ جات آبادی متفق تمدنی اکثریت و اقلیت میں منقسم ہوں، وہاں صورت حال بالکل جداگانہ ہوگی، اس لئے کہ یہاں لوگوں کا فوری سطح نظر ملک کی بہتری نہیں بلکہ خود اپنی جماعت یا اپنے ”طبقہ“ کی بہتری ہوتی ہے۔ جس وقت ہم سیاسی فریق بندی پر نظر ڈالیں تو ہمیں یہ غور کرنا چاہئے کہ جو فریق بندی ہمارے پیش نظر ہے وہ محض طرز کار کے تنوع کی وجہ سے ہے یا اس کی بنیاد حقیقی تمدنی اختلاف ہے۔ اگر تمدنی اختلافات فریق بندی کی بنیاد ہیں تو ہم پر دیکھنا پڑے گا کہ یہ اختلافات کس حد تک جڑ پکڑ گئے ہیں اور فریق کے مابین کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن ہے یا نہیں۔ مثلاً ہندوستان کی صورت حال کو لیجئے، ہندوؤں میں علاوہ چھوٹی چھوٹی ”اقوام“ کے دو بڑی بڑی ”قومیں“ یعنی ہندو اور مسلمان آباد ہیں اور گرو غالباً ہر مسلمانوں پر ۵۵ ہندو اجداد کی اولاد ہیں، لیکن مذہب زندگی پر کچھ ایسا اثر ڈالتا ہے کہ تمدنی اعتبار سے وہ اپنے ہمسایہ (اور بہت سی

صورتوں میں ایک جدی (ہندو بھائیوں سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مقننہ جماعتوں میں ان کی نیابت کیسے ہو۔ علاوہ مشترکہ رائے دی گئی کے اس کا دو طریقے ممکن ہیں اور دونوں طریقے اس ایک پر مبنی ہیں کہ ہندو اور مسلمان کس حد تک باہمی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ اگر دونوں کے درمیان دیوار آمینی حائل سمجھی جائے اور دونوں کا ملکی سطح نظر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو تو پھر ایسی حالت میں نیابتی جماعتوں کو ملک کا صحیح آئینہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک کو جدا گانہ حق نیابت دیا جائے، تاکہ ہندو اپنے ہم خیال ہندوؤں کو اور مسلمان اپنے ہم خیال مسلمانوں کو رائے دیں۔ لیکن اس طرح کار میں کم سے کم دو خرابیاں ہیں؛ ایک تو ایسے صورتوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں (اور اکثر صورتوں میں ایسے ہی ہیں) وہاں عمومی دور میں شکل سے کوئی ایسی صورت پیدا ہونے لگی کہ مسلمان وزیر اعظم پورے اعتماد سے اپنے مدت عہدہ میں کام کر سکیں یا نیابتی ایوان کا بہرہ بن جائے؛ دوسرے، فریقین کے سامنے جو سطح نظر ہو گا وہ ملکی فلاح کا نہ ہو گا بلکہ اپنی ذاتی اور "قومی" بہبود کا ہو گا۔ تیسرے ممکن ہے کہ اس طرح کار سے انتخاب میں امن قائم نہ رہے، بالآخر ملک برابر دو بڑے بڑے مسلح گروہوں میں منقسم رہے گا جو اس کے مفاد کے لئے بغاوت مناسبت نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں فریق آپس میں ذرا سمجھوتہ کریں کہ ملکی مفاد کی خاطر رائے دیں میں ایک دوسرے کے ساتھ خائف رہیں گے، لیکن ایک دوسرے کی جدا گانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے نیابتی مجلس میں ایک دوسرے کے لئے نشستوں کی ایک خاص تعداد محفوظ رکھیں گے۔ اس طرح کار میں ایک حد تک یہ فائدہ ہو گا کہ ہندوؤں کو

مسلمانوں کے احساسات کا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے احساسات کا پاس و لحاظ رکھنا پڑے گا اور دونوں میں سے کوئی ملکی مفاد کو پس پشت نہیں ڈال سکے گا۔ تیسری شکل یہ ہے کہ بعض دوسرے ملکوں کی طرح یہ دونوں خالص سیاسی فریق بنائیں اور ایک طرف مل جل کر ملک کی ترقی کے لئے کام کریں تو دوسری طرف اپنے اپنے فریق کے مفاد کے لئے بھی کوشش کرتے رہیں۔ اگر یہ ہوا تو ان کی مغایرت کسی جداگانہ عمرانی سطح نظر کی وجہ سے نہیں رہے گی بلکہ جو بھی اختلاف ہو گا اس کا دار و مدار ملکی ترقی کے مقصد کے حصول کے طرز کا ہو گا۔

۱۹۳۷ء جیسے جنگ عظیم سے پہلے اور اس کے بعد حال کے ”ہنگری“ حکومت تک جرمنی میں تھا جہاں دن کی بھر لوگ شہریوں کے دو فریق مستقل سیاسی گروہ تھے۔ ۱۹۳۷ء میں ہنگری کے حکم سے یہ گروہ برخاست کر دیے گئے۔

۱۹۳۷ء میں مہاتما گاندھی اور اچھوت جاتوں کے درمیان رائے دی اور انتخاب کے متعلق جو راشنی نامہ ہوا تھا اور جسے انگریزی حکومت نے منظور کر لیا، وہ اس لئے دلچسپ ہے کہ اس میں مغلوط اور جداگانہ انتخاب کے اصول کے درمیان ایک اوسط راستہ قائم کیا گیا ہے اور کیا عجیب ہے کہ بالآخر در ارتفاق کے لئے یہی سمجھوتہ ہندو مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے کارآمد ہو۔ اس سمجھوتے میں یہ قرار پایا ہے کہ ہر صوبہ میں اچھوت جاتوں کی نشستوں کی تعداد مقرر کر دی جائے، اور انھیں مختلف ایک رکنی حلقہ جات رائے دیئے گئے، اس کے بعد اچھوتوں کے حلقے بنا کر فی نشست مقررہ چار امیدواروں کا انتخاب کیا جائے، اور ان چاروں کو تمام ہندوؤں کے سامنے پیش کر کے اس سے (باقی صفحہ ۲۹۷)

اب محض سیاسی اقلیتوں کے نیابت کے مسئلے پر غور کیجئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اقلیتوں کی نیابت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ملک کو ایسے حلقوں میں تقسیم نہ کیا جائے جو ایک سے زیادہ قائم مقاموں کا انتخاب کرتے ہوں، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی قائم مقام اکثریت اور اقلیت دونوں کا نائب نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے جن سیاست دانوں نے اس مسئلے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی وہ انگلستان میں سیر اور مل اور ڈومارک میں آندرے تھے، اور انھوں نے یہ طرز کار پیش کیا کہ بجائے لازمی حلقوں کے ملک کو اختیاری حلقوں میں تقسیم کیا جائے، یعنی شخص کو خواہ کبھی کاربنے والا ہو یہ اختیار ہے کہ جس امیدوار کو چاہے رائے دے، اور ہر امیدوار کو اختیار ہے کہ ملک کے جس کسی شخص سے چاہے اپنے لئے رائے دوائے؛ پھر جن لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ پرچیاں ٹریں گی انھیں بقدر تعدد مطلوبہ کے منتخب شدہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ہماری نیابتی جماعت میں ۱۰۰ مردکان اور ان کے لئے ۱۰۰ لاکھ رائے دہندے ہیں تو اول تو مختلف سیاسی فریق دس دس ہزار راپوں کے حلقے بنائیں گے، اور پھر اطراف ملک سے دس دس ہزار راپوں فی امیدوار حاصل کر لے گی کوشش کریں گے۔ ہر ایک کے طرز کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ایک طرف تو کسی امیدوار کا تعلق براہ راست رائے دہندوں سے نہیں رہے گا، بلکہ جو کچھ

دقیقہ نوٹ ملے گا) ایک منتخب کر لیا جائے۔ اس اصول کا ایک اچھا علمی تجزیہ
 "انجمن نیابت تناسبی" *Proportional Representation Society*
 کے رسالہ "مفاہیم پونا" *The Poona Pact* میں دیا ہوا ہے۔

بھی تعلق ہے وہ سیاسی جوڑ توڑ والوں اور نیکوں کا رہ جائے گا، اور دوسرے چونکہ تمام انتخاب کا دار و مدار کلیتہً سیاسی فریق بندیوں پر ہوتا ہے اس لئے جو لوگ منتخب ہوں گے وہ بجائے اعتدال پسند ہونے کے غالی ہوں گے اور ان کے اصول میں وہ بہت دکشادگی گنجائش نہ ہوگی جو سیاسی کاروبار چلانے کے لئے لازمی ہے۔

تناسبی نیابت۔ اصل میں بہتر ہی کے طرز کار سے تناسبی نیابت کا اصول افذ کیا گیا کہ بجائے ایسے امیدواروں پر آراء بے کار ضائع کرنے کے جو بوج قلت آراء کے منتخب نہ ہو سکیں یا جو بوج بے حد اکثریت کے منتخب ہو جائیں بہرہائے دہندہ کو یہ اختیار ہو کہ ترجیحوں کا ایک سلسلہ اپنی مرضی پر قائم کر سکے، یعنی اگر اس کے نزدیک جو بہترین امیدوار "الف" ہے اسے اس کی رائے کی ضرورت نہ ہو تو پھر اس کی رائے ترجیح نمبر "ب" کو مل جائے تاکہ کسی حالت میں اس رائے دہندہ کی رائے ضائع نہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی عام طور سے یہ اصول بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ باوجود ایسے حلقے مقرر ہونے کے جن کی طرف سے کئی اراکین منتخب ہوئے ہیں، ہر رائے دہندہ کو صرف ایک ایک رائے دینے کا اختیار ہو تاکہ اکثریت والے اعتدال سے زیادہ نہ بڑھنے پائیں۔ انرض نیابت تناسبہ کا جو طریقہ سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ملک کو بڑے بڑے حلقوں

بہتر کے طرز کار پر تجویز دینے والی کتاب "دستور انگلستان" Bagehot: The English Constitution باب ۵ میں مفصل بحث کی ہے۔

تقسیم کیا جائے اور ہر حلقے کی طرف سے چار چار پانچ پانچ یا اس سے زیادہ
 اراکین کے انتخاب کا حق دیا جائے لیکن ہر رائے دہندہ کو صرف ایک رائے
 کا حق حاصل ہو۔ رائیں ضائع نہ ہونے دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے کہ
 ہر حلقے کے حملہ رائے دہندوں کی تعداد کو حملہ نشینوں کی تعداد میں ایک ملا کر
 اس پر تقسیم کر لیا جاتا ہے اور جس کسی امیدوار کے حاصل تقسیم کے برابر رائیں آئیں
 وہ اس کے انتخاب کے لئے کافی سمجھی جاتی ہیں اور اس سے زیادہ جو رائیں اس
 کی پرچوں میں ہوں وہ رائے دہندے کے دوسری ترجیحوں کو دیدی جاتی ہیں اور
 ان کی تقسیم میں وہی تناسب اختیار کیا جاتا ہے جو کسی امیدوار کی پرچوں کے
 دوسری ترجیحوں کا ہو تا ہے۔ اس کے بعد وہی عمل ہوتا ہے جو امیدوار اول کے
 ساتھ ہوا یعنی جس کے لئے حصہ دہی کے برابر رائیں آئیں وہی منتخب ہو گیا۔
 یہ وہ طرز انتخاب ہے جسے ”تناسبی نیابت بذریعہ واحد قابل انتقال رائے“
 کہتے ہیں اور جو باوجود ذرا سی پیچیدگی کے روز بروز نئے نئے ملکوں میں رائج ہو رہا ہے۔

لٹد اس موضوع پر مرگ وائرٹ نے اپنی کتاب ”نیابت متناسب“: *Proportional Representation*
 میں بہت وضاحت سرشار ڈالی ہے،
 نیز دیکھو لیکن نیابت متناسب کی اردو بابت کتاب آئرستان ۱۹۳۳ء
Proportional Representation Society: Irish
Free State General Election 1933.
 لٹد آئرستان کے پچھلے انتخاب میں جو متناسب قائم ہوا اس کا مقابلہ انگلستان کے (تقریباً ۱۹۳۳ء)

اس کے علاوہ دوسرے طریقے اقلیتوں کے نیابت کے بھی ہیں، مثلاً وہ طریقہ جو سویڈن، آئرلینڈ اور بھارت میں رائج ہے جس کی رو سے ہر فریق بنی بنائی ترجیحوں کی فہرستیں پیش کرتا ہے اور رائے دہندہ محض فہرستوں پر رائے دیتا ہے۔ اس میں بڑا نقص یہ ہے کہ رائے دہندہ کی آزادی کم ہو جاتی ہے، اور گواہی سے اختیار ہوتا ہے وہ چاہے تو ترجیحات بدل دے، لیکن وہ ملی الحوم ایسا نہیں کرتا۔

بہت سے سیاسوں نے اس طرز کار کی مخالفت کی ہے اس لئے کہ ان کے نزدیک بڑے بڑے حلقوں میں اُمیدوار اور رائے دہندے کے درمیان روابط ہونا مشکل ہو جائے گا، عمومی حکومت کا جو براہ راست تعلق رائے دہندوں کے ساتھ ہونا چاہئے وہ نہیں رہے گا۔ اور فی نفسہ اس طرز کار کی پیچیدگی ہی اس کی ترقی میں ایک رکاوٹ ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر عمریت کے معنی یہ ہیں کہ جو نیابتی مجلس ہو وہ ملکی عام رائے کا آئینہ ہو اور اس عام رائے کی چھوٹی سی تصویر ہو تو پھر اس سے بہتر متبادل قائم مقاموں کے منتخب کرنے کا کوئی طریقہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا، نقائص ہر انسانی طرز کار میں ہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ کم سے کم نقائص کس طرز کار میں پائے جاتے ہیں۔

(نیشنلسٹ ٹیبل ۲۹ پر) عدم تناسب سے کیا جائے جس کا ذکر اوپر حاشیہ ۱۱ میں کیا گیا ہے۔

| فریق | تعداد آراء | تعداد نشستہاں حاصل کردہ |
|-------------------|----------------|-------------------------|
| وزارت (ڈی دلیٹر) | ۶ لاکھ ۷۰ ہزار | ۸۵ |
| مخالفت (کنزرویٹو) | ۶ لاکھ ۱۵ ہزار | ۶۸ |

۱۱۔ تناسبی نیابت کی تنقید کے لئے دیکھو لاسکی، حسب بالا، ۸، ۲۰۔

معیار اُمید واری - یہ تو رائے دہندوں کے معیار رائے دہی کا مسئلہ ہو؟
 جہاں تک اُمیدواران انتخاب کا تعلق ہے، عام طور پر ان کا معیار بجا طعمر، دولت،
 تعلیم و سکونت رائے دہندوں سے اکثر ذرا زیادہ ہوتا ہے اور بعض ممالک میں
 تو ارکان مقننہ کے معیار میں اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ ان کے انتخاب کنندے
 خود منتخب شدہ ہوتے ہیں تاکہ انھیں مجلس مقننہ کے لئے چنا جانے وہ قطعی طور پر ان کے
 سے زیادہ قابل اور زیادہ ممتاز ہوں۔^{۱۹۱۱} لیکن اس دوسرے انتخاب کے طریقے میں
 چند نقائص ہیں جنہیں ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اول تو جو لوگ ابتدائی رائے دہندے
 ہوتے ہیں ان کا ارکان کے ساتھ کوئی خاص تعلق ممکن نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے
 جہاں سیاسی فریق بندی کے وہ بطور زیادہ سخت ہیں وہاں پہلا انتخاب محض رسمی رہ جائیگا
 اس لئے کہ انتخاب کنندے دوسرے انتخاب کے لئے رائے دہنے کے وقت لازمی
 طور پر اپنے فریق والوں ہی کو رائے دیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے جیسا کہ ۱۹۱۰ء سے
 ۱۹۱۱ء تک ہندوستان میں دستور تھا کہ نیابتی مجالس کے اراکین کا انتخاب مجالس
 بلدیہ اور دوسری مقامی مجالس کریں، لیکن اس طرز میں یہ مشکل ہے کہ جو لوگ ان مقامی
 مجالس کے لئے منتخب ہوں گے وہ زیادہ تر اس لئے منتخب ہوں گے کہ وہ مقامی
 ضروریات وغیرہ سے واقف ہوں گے اور یہ ضروری نہیں کہ انھیں سیاسی معیار جانچنے
 یا کسی قانون ساز جماعت کے اراکین چننے کی اہلیت ہو۔ الغرض دوسرے انتخاب
 کا طریقہ ان ممالک میں مفید ہوگا جہاں ابتدائی رائے دہندوں کو کافی تجربہ نہیں، ورنہ

۱۹۱۱ء یہ طریقہ مصر اور ترکی میں رائج ہے، نیز اسی پر ۱۹۳۳ء تک روس میں بھی عمل ہوتا تھا۔

علی العموم یہ ان ممالک میں زیادہ مقبول نہیں ہے جہاں نیا بنیاتی طریقہ مدت سے کارفرما ہے۔

ضابطہ منظور ہی آج کل کے زمانے میں قانون روزمرہ کے بود و ماند کے مسائل پر اس درجہ حاوی ہو گیا ہے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ یہ تقریباً ناممکن ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں مسودات قانونی کے ہر پہلو پر تمام نیابتی جماعت متفقہ طور پر کر سکے، اور بالفرض اگر غور ممکن ہو تو یہ لازماً سرسری ہوگا۔ اس نقص کے دور کرنے کے لئے اول تو لامرکزیت کے اصول پر عمل کر کے بہت سے معاملات مقامی ادارات (مثلاً مجالس بلدیہ) کے سپرد کر دئے جاتے ہیں، اور دوسرے ہر شرعی نیابتی مجلس کو مختلف ذیلی مجالس میں منقسم کر دیا جاتا ہے جس میں قانون سازی کے کسی نہ کسی مرحلہ پر مسودہ بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ وہ اس پہلو پر سے طور پر غور کر کے مکمل ایوان کو اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ یہ مجالس اکثر نسبتاً مختصر تعداد (۱۵، ۲۰) اراکین پر مشتمل ہوتی ہیں اور زیادہ تر اس میں مختلف سیاسی گروہوں کے نیابت کا اصول برتنا جاتا ہے۔ ساتھ ہی یاد رکھنا چاہئے کہ گویا ذیلی مجالس ہی چھان بین کرتی ہیں لیکن منظور یا منظور کرنے کا اختیار ایوان ہی کو ہوتا ہے۔ غیر مفید قانون سازی کو روکنے کی غرض سے اکثر ممالک میں ہر ایک مسودہ کی کئی کئی خواندگیاں ہوتی ہیں۔ اور آخری خواندگی کے بعد ہی مسودہ منظور سمجھا جاتا ہے۔ حال کے زمانے

۲۵ مثلاً انگلستان کے دارالعوام میں ہر مسودہ کی منظوری کے لئے مفصلہ ذیل درج سے گزرنے کی ضرورت ہے۔

(بقیہ نوٹ ص ۳ پر)

میں بعض سیاست دانوں، مثلاً لاسکی اور ونسٹن چرچل نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اب سیاسیات مختلف مسائل زندگی پر اس قدر عادی ہو گئی ہیں کہ پارلیمنٹ کے اراکین کو ان میں سے بعض مسائل پر بحث کرنے کی اہلیت نہیں ہے اس لئے کہ وہ زیادہ تر اپنی لغظی اور خطابست کے زور پر منتخب ہوتے ہیں، اور اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ بالالتزام ایسے مسائل جیسے کوئی اہم بین الاقوامی مسئلہ یا عالمگیر معاشی مسئلہ، یا کسی ملٹی مسئلے پر کسی صاحب رائے کا اظہار کر سکیں یہی حصول کے تحت، لاسکی جیسے سیاست دانوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پارلیمنٹ کے تحت ایسی ذیلی مجلس ہونی چاہئیں جو زیادہ تر فنی مبصرین پر مشتمل ہوں، اور ایسے مسائل کے متعلق جو ان فنون سے متعلق ہوں ایوان کی رائے کا دار و مدار ان مجلس

(۱) صدر کی اجازت؛

(۲) پہلی خواندگی، برائے نام؛

(۳) دوسری خواندگی، مباحثہ؛

(۴) ذیلی مجلس کے سپردگی، مکمل مباحثہ؛ روداد کی پیشی؛

(۵) تیسری خواندگی، برائے نام؛

(۶) دارالام کو ارسال۔

لنڈن دیکھو فنٹن چرچل کا خطبہ جو انڈیا نے ایکٹر ایونیورسٹی کے لارڈ کریمز منتخب ہونے کے وقت پڑھا اور جو ان کے جریدہ "طالب علم" *The Student* (۱۱ مارچ ۱۹۳۹ء) میں طبع ہوا ہے، نیز دیکھو لاسکی، "صرف و نحو سیاسیات" باب ۱۰، حصہ ۳

کی مبصرانہ رائے پر مبنی۔
 جماعت عالمہ کی ذمہ داری۔ عاملانہ ذمہ داری کے تحت ہمیں دنیا کی
 جماعت ہائے مقننہ کو تین شعبوں میں تقسیم کرنا پڑے گا، ایک تو وہ مقننہ جو ملک متحدہ
 امریکہ کی طرح جماعت عالمہ سے بے تعلق ہے جس میں وزیرانہ نشست کرتے ہیں نہ
 اس کے سامنے ذمہ داری؛ دوسری وہ مقننہ جس میں فرانس کی طرح بہت سے
 گروہوں کے باہن ہمیشہ ایک طرح کی ساکس سی ہوتی رہتی ہے؛ تیسرے وہ
 مقننہ جہاں، انگلستان کی طرح، دو اہم سیاسی گروہ ہیں اور وزارت کا دار و مدار کم و بیش
 مستقل اکثریت پر ہوتا ہے۔ پہلی قسم کے ایوان کا بڑا بھاری نقص یہ ہے کہ ایوان
 کو اعداد و شمار اور موجودہ قوانین کے نقائص معلوم کرنے کا کوئی موقع حاصل نہیں ہوتا،
 دوسرے یعنی فرانسیسی طریقے میں نقص یہ ہے کہ وزارت کی حالت ہمیشہ ڈانڈیل ڈول

۱۷ تقریباً اسی قسم کا بلکہ اس سے زیادہ بڑے ہوئے خیال کا اظہار رائٹ آرمیل نو اسیبہ حیدر نواز
 جنگ بہادر نے اپنے نہایت ہی پر مغز خط جہانگیر اسناد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۳۴۲ھ میں ظاہر کیا
 تھا جہاں وہ فرماتے ہیں کہ حکومت کے پاس ”ایسے ذرائع ہوں کہ اہم معاملات میں اسے یہ معلوم ہو سکے کہ
 جوئی پاسی وہ اختیار کرنے والی ہے اس کے متعلق ان لوگوں کا کیا خیال ہے جن پر اس کا سب سے زیادہ
 اثر پڑے گا اور وہ اس کے متعلق کیا تجاویز پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ مفاد عامہ کے تحفظ کی
 بڑی اچھی صورت ہوگی کہ خاص خاص طبقات کے نمائندوں سے یہ دریافت کیا جاسکے کہ مسائل
 قانون کا کیا اثر پڑ رہا ہے، انھیں اس کی عرض و رائے کیا نقص نظر آتے ہیں اور ان کے نزدیک
 ان کے نقائص کے دور کرنے کی کیا تدبیریں ہوتی ہیں۔“

رہتی ہے اور اسے وہ اطمینان حاصل نہیں رہتا جو ملک کے لئے لازمی ہے، اور قیصر سے
یعنی ”انگریزی“ طرز میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جب ایک دفعہ ایوان کا انتخاب
ہو گیا اور وزارت بن گئی تو پھر ”خانگی رکن“ یعنی اس رکن کی آزادی سلب ہو جاتی ہے
جس کا وزارت سے تعلق ہے لیکن جسے بدقسمتی سے وزارت کا کوئی عہدہ نہیں ملا سکتا
مکملوں میں وزارت کچھ تو انہی مستقل اکثریت کی وجہ سے، جو سالہا سال رہتی ہے،
اور کچھ تو اعداء مباحثہ کی وجہ سے، ذلت پارلیمنٹ تک خود مختار ہوتی ہے۔ بہر حال
ان تینوں میں سب سے طاقتور مقننہ فرانسیسی مقننہ ہے، گو وہ چاروں کے برابر ہے۔
انتظامات میں ذیل ہو کر وزارت کو بیکار کر دیتی ہے۔ بظاہر وہی طرز قانون سازی بہترین
معلوم ہوتا ہے جہاں مجلس قانون ساز امریکہ کی طرح جماعت عالمہ سے آزاد ہو اور وزراء
کو اس میں راسخے دینے کا حق نہ ہو لیکن جس میں وزارت نشست ضرور کریں اور جس
معلومات کی مجلس کو ضرورت ہو اسے ہم پہنچائیں۔

براہ راست قانون سازی۔ اب ہم اس طرز کا پرآئندہ ہے جسے
”براہ راست قانون سازی“ کہنا چاہئے اور جو بعض ممالک میں قانون سازی اور دستور
سازی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ براہ راست قانون سازی کے تین طریقے ہیں، ایک
”تحریک گزاری“ دوسرے فیصلہ طلبی، تیسرے برخواست۔ یہ تینوں طریقے دراصل
ایسی عدم اعتبار کا ایک مظاہرہ ہیں جو نیابتی مقننہ کے خلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے
لئے کہنے، جو انقلاب فرانس کا پیشرو اور عمومی اصول کا ایک بہت بڑا گروہ گذرا ہے، اپنی
کتاب ”معاہدہ معاشرتی“ میں کہا ہے کہ اصل عوامیت وہ ہے جو براہ راست ہو،
یعنی جس میں لوگ براہ راست قانون سازی وغیرہ میں حصہ لیں، اس لئے کہ نیابتی جماعتوں کا

راے دہندوں سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور ان میں وہی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بادشاہی اور دوسری حکومت میں پائی جاتی تھیں۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ انگلستان میں راے دہندے صرف پارلیمنٹ کے انتخاب عامہ کے وقت آزاد رہتے ہیں اور پھر غلام کے غلام بن جاتے ہیں۔ بہر حال آج کل کے عظیم الشان ملکوں اور انتہا درجہ پیچیدہ حکومتوں میں یہ تو ناممکن تھا کہ ہر قانون پر عوام الناس بحث کرتے اور اسے منظور یا نامنظور کرتے، لیکن قانون سازی پر عوام کے اثرات اور اس پر ان کا قابو پیدا کرنے کے یہ تین طریقے نکالے گئے ہیں جو ایک سے زیادہ ممالک میں رائج ہو گئے ہیں۔

حق تحریک گزاری اس حق کو کہتے ہیں جو راے دہندوں کی ایک خاص تعداد کو حاصل ہوا اور جن کے تحت وہ مقننہ میں براہ راست، یعنی بغیر کسی تایم مقام یا وزیر کے کے واسطے کے، دستور یا کسی دوسرے قانون میں ترمیم پیش کر سکیں۔ یہ حق محض تحریک تک محدود ہوتا ہے۔ اس کی سب سے ممتاز مثال سویٹزرلینڈ کے وفاقی اور ریاستی و ساتر میں ملتی ہے جہاں مرکزی دستور کی ترمیم کے لئے پچاس ہزار راے دہندوں کو تحریک کرنے کا حق حاصل ہے اور (غلاوہ جیٹرو اسکے) کمیٹی میں راے دہندوں کی ایک خاص تعداد اسی طرح دستوری ترمیم کی تحریک کر سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سلاوہ تین کمیٹیوں کے ہر ایک کمیٹی میں راے دہندوں کی ایک خاص تعداد معمولی قوانین کی تحریک بھی کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس فیصلہ طلبی ایک منفی حق ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ چند خاص شرائط کے تحت دستوری ترمیمیں اور اہم قوانین کی ترمیمیں رائے دہندوں کے سامنے براہ راست پیش ہوں اور ان کی کثرت رائے کے موافق یا مخالف فیصلہ کرنے کا قطعی اختیار ہو۔ فیصلہ طلبی کا قاعدہ متعدد ممالک میں رائج ہو گیا ہے۔ جن میں سے اس موقع پر سوویتان اور آسٹریلیا کی مثال دینی کافی ہوگی۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک تو لازمی فیصلہ طلبی یعنی وہ شکل جس کے تحت ایک خاص نوع کا ہر مسودہ مثلاً ترمیم دستور (لازمًا رائے دہندوں کے سامنے پیش ہو؛ اور دوسرے اختیاری فیصلہ طلبی یعنی وہ شکل جس کے تحت اگر ایک خاص تعداد رائے دہندوں کے خواہش ظاہر کرے تو پھر مسودہ جملہ رائے دہندوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ ترمیم دستور کے لئے لازمی فیصلہ طلبی سوویتان کے وفاقی اور ریاستی و ساتھیوں آسٹریلیا کے دستور میں اور مسودہ کی تبدیلیوں سے پہلے کے جرمانی دستور میں پایا جاتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں یوگوسلاویہ کے نو اس اصول کا تعلق انسان کے ابتدائی جذبے سے ہے جس کے تحت وہ کسی ایسی چیز کو تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتا ہے جو اس کی پسند نہ ہو۔ تاریخی اعتبار سے اس کا تعلق ہندوستان قدیم کی ”سمجھا“ ایجنٹر کی ”اکلیبریا“ اور قدیم جرمانیہ کی ”مجلس دیمہ“ سے ہے جن میں ہر اہم قانون پر رائے دہنے کے لئے جملہ قاضی و بائع ذکر کسی درخت کے نیچے نشست کرتے تھے؛ اور آج بھی سوویتان کی بعض کمیٹیوں میں بھائے کسی نیابتی جماعت کے سال میں ایک مرتبہ جملہ شہریوں کا جلسہ ہوتا ہے؛ اسی میں قانون منظور ہوتے ہیں اور جماعت عالم کا انتخاب ہوتا ہے۔

اور کہیں کہیں ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں اور بلدیات میں بھی اس کا پتہ لگتا ہے۔
 حق بر خاست وہ حق ہے جس کے تحت اگر رائے دہندوں کی اکثریت
 چاہے تو کسی عہدہ دار کو برخاست کر سکتی ہے، گو اس مسئلے پر اس وقت تک ملے
 نہیں لی جاتی جب تک ایک خاص تعداد رائے دہندوں کی اس کے لئے تحریک نہ
 کرے۔ یہ طریقہ ممالک متحدہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں رائج ہے اور ان میں سے
 بعض میں تو عادلانہ تک کو اس طرح سے برخاست کیا جاسکتا ہے۔ عدلادہ ان
 دلائل کے جو براہ راست قانون سازی کے خلاف پیش کئے جاتے ہیں اور جن کا مختصر
 اعادہ اگلے پارہ میں کیا جائے گا، یہ خاص طریق نہایت ہی نقصان رساں ہے،
 اور بجائے اس کے کہ اس سے کسی طرح کی خوش انتظامی ہو، اس سے طرح طرح کی
 رشوت ستانی اور بخلی کا بازار گرم ہونے کا اندیشہ ہے۔

براہ راست قانون سازی خواہ کتنی ہی دل خوش کن کہوں نہ ہو، یہ ایک واقعہ
 ہے کہ نسبت کم ہی ایسے ممالک میں جہاں یہ رائج ہے، اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ
 اول تو عوام کو قانون سازی جیسی پیچیدہ چیز میں دلچسپی نہیں (حساب لگایا گیا ہے کہ کوئٹا
 میں جو فیصلہ طلبی ہوتی ہے ان میں ۵۰ فیصدی سے بھی کم رائے دہندے حصہ لیتے ہیں)
 دوسرے یہ ظاہر ہے کہ فیصلہ طلبی یا تحریک گزاری میں جو لوگ حصہ لیتے ہیں ان میں بڑے

دورِ تفصیل کے لئے دیکھو "آٹوٹھریٹ" برائے یورپ میں حکومتیں اور سیاسی گروہ "Dowell :
 Governments and Parties in
 Continental Europe"

کا موقعہ مطلق نہیں ملتا اور وہ صرف ان موافق و مخالف دلائل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں جو پرچی میں کسی مسودہ کے متعلق لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوئے کہ جو بات کہ جماعت مقننہ میں دلوں، اور بعض مرتبہ ہفتوں کے مباحثہ کے بعد طے پاتی ہے اس رائے و ہندوں کو غور کرنے کا گویا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ بھر براہ راست قانون سازی کی ترویج سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جن لوگوں کا خیال تھا کہ ان طریقوں کے رائج کیے لے سے قانون سازی میں ترقی ہوگی وہ غلطی پر ہیں، اس لئے کہ جہاں بھی اس کا رواج ہے وہاں کی رائے بجائے ترقی پسندی کے قدامت پسندی کی طرف زیادہ مائل اور جلد جلد تبدیلیاں کرنے کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔

یہ تو براہ راست قانون سازی کے طریقے ہوئے، عام رائے مصدوم کرنے کو، خصوصاً جب وہ کسی عاملہ منغل کے باہر ہو، منشا طلبی کہتے ہیں منشا طلبی کی بڑی بڑی تاریخی مثالیں وہ ہیں جب نپولین اعظم لے، اور اس کے بعد نپولین سوم نے نئے و ساتھ شائع کرنے سے پہلے اور اپنے قبضے میں باضابطہ اقتدار لینے سے پہلے منشا طلبی کی تھی، یعنی فرانسیسیوں سے ان کی رائے دریافت کی تھی۔ حال کے زمانے میں جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جگہ جگہ منشا طلبی کی گئی، مثلاً شیسوگ میں منشا طلبی اس مسئلے کی بابت کی گئی کہ وہاں کے باشندے جرمنی کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں یا ڈنمارک کے۔ اور ۱۹۳۷ء میں وادی سار میں یہ منشا طلبی کی گئی کہ وہاں والے انجمن اقوام کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں یا جرمنی کے ماتحت، یا فرانس کے۔

علاوہ براہ راست قانون سازی (اور دستور سازی) کے بعض (حاشیہ ۳ پر)

اصولی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں نیا بتی جماعتوں کے رحم پر نہیں چھوڑا جانا چاہئے
 ممالک متحدہ امریکہ میں کسی جماعت کو اس کا خست یا نہیں کہ جمہوری طرز حکومت کے
 بجائے لوکی طرز قائم کرے، اور لاسکی کی رائے میں عام معافی دینے کے مسئلے
 کو کسی عمومی جماعت کے سپرد کرنا خالی از خطرہ نہیں ہے۔ نیز اس قسم کی جماعت کو
 یہ حق نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنا لے جس کا اثر واقعات سالہ پر
 پڑتا ہو، مثلاً "بغروت پنجاب" ۱۹۱۹ء کی طرح فوجی قانون کو تاریخ نفاذ سے
 پہلے نافذ فرض نہیں کرنا چاہئے تاکہ اس میں ایسے مقدمات شامل ہو جائیں جو معمولی
 طور پر اس میں شامل نہیں ہو سکتے۔ ساتھ ہی جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ایک واقعہ
 ہے کہ جس طرح پر اور جن خصائص کو لئے ہوئے اراکین جماعت مقننہ منتخب ہوئے
 ہیں اس میں سے اکثر میں یہ قابلیت مشکل سے ہوتی ہے کہ آج کل کے بعض پیچیدہ
 مسائل مثلاً عالمگیر معاشی مسائل یا معاشری مسائل کو پوری طرح سے سلجھ سکیں چنانچہ
 بعض سیاست دان ایسی ماتحت مجالس کے قیام کی رائے دیتے ہیں جو مبصرین پر
 مشتمل ہوں اور جن کی رائے کا نیا بتی پارلیمنٹ پر سے طور پر لحاظ کر لیتے۔

۱۵ دستور سازی کے لئے دیکھو باب ۲۱۔

۱۵ لاسکی حسب بالا، ۱۹۱۹ء و انویہ ہے کہ ان ہی اسباب کی بنا پر ان ممالک تک میں جہاں پارلیمنٹی و نیا بتی حکومت
 گویا لوگوں کی گنتی میں پڑی ہے، روز بروز پارلیمنٹ سے باہر اس قسم کے ادارے قائم ہوتے جیسے ان
 جیسے آجروں اور مزدوروں کی باضابطہ سرکاری پنچائیں (آسٹریلیا میں) اعلیٰ معاشرتی مجلس جرمنی
 کے ۱۹۱۹ء والے دستور میں، اعلیٰ انتظامی جماعت ڈاٹمی، میں نیز خارجی معاملات روز بروز
 پارلیمنٹ کے حدود سے باہر ہوتے جاتے ہیں۔

Examples of Legislation

ضمیمہ باب ۱۵

تمثیلات مقننہ

فریڈے: برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان؛ اجستان؛ نرائس؛ جاپان؛ اٹلی
دفاٹے: مالک پتھہ ادرکیہ؛ سوئیزرستان؛ روس؛ ہندوستان

(الف) فریڈے۔

برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان

دارالعوام۔

اہلیت رائے وہی: قانون نیابت عوام ۱۹۱۱ء؛ ہر مرد (اور ۱۹۲۹ء
کے بعد ہر عورت) جو کسی صوبے میں دس پونڈ تقریباً مال مالک کے مکان
میں سکونت پذیر ہو یا ایسی ہی دوکان میں کاروبار کرتا ہو، رائے لے سکتا ہے،
بشرطیکہ اسی صوبے میں پچھلے تین ماہ رہا ہو۔ نیز جامعات کی طرف سے انتخابات کے لئے

سالہ اس قسم کا مواد پندرہویں کاپی کے سالنامہ مدبرین "Statutory Year
Books" سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ سالنامہ اس قسم کے مخطیات کے لئے بنائیت کا ادارہ ہے۔ جو مواد
اس سے نہیں اخذ کیا گیا اس کا الگ حوالہ دیا گیا ہے۔

ہر طلبہ اپنی رائے دے سکتا ہے۔ کوئی شخص دوسرے زیادہ رائے نہیں دے سکتا، اور دوسروں کی صورت میں بھی ایک رائے کا دار و مدار قیام پر ہونا چاہئے۔ لارڈ ہالبرخ، غیر ملکی، دیوالیہ، دیوانہ، یہ سب رائے نہیں دے سکتے۔ طرز شمار، اضافی اکثریت، لیکن جماعتی قیام مقاموں کے انتخاب کے لئے تناسبی نیابت مع واحد قابل انتقال رائے کا طریقہ نافذ ہے۔

تعداد اراکین و مدت عہدہ: ۱۵۰-۶ پانچ سال کے لئے یا جب بھی پارلیمنٹ موقوف ہو۔

اقتیادات اراکین: آزادی تقریر، آزادی ذات، اندرونی انتظام کی آزادی، تنازعہ انتخابات کا تصفیہ۔

ضابطہ درج منظوری قوانین کے لئے دیکھو حاشیہ ۲۶، بالا۔

دارالامرا

ارکان و تعداد: ۴۰۔ (۱) شاہی شاہزادے، تقریباً ۲۰، لیکن یہ حصہ نہیں لیتے؛ (۲) دینی موروٹی امرا، تقریباً ۶۴۰؛ (۳) حین حیاتی قانون امرا، ۷، لیکن یہ قانون سازی کے وقت شرکت نہیں کرتے؛ (۴) ایستانی امرا منتخب شدہ، ۲۸ حین حیات؛ (۵) اسکاچستانی امرا، منتخب شدہ، نامت پارلیمنٹ (دارالعوام)؛ (۶) کینٹربرجی دیارک کے اساقف عظمیٰ؛ (۷) اسقف لندن؛ (۸) ۲۸ اساقف جو عمر میں باقی سب اساقف سے بڑے ہوں۔

دونوں ایوانوں کے باہمی تعلقات: قانون پارلیمنٹ کے تحت۔ (۱) تمام مالی مسودات، اگر دارالامرا انھیں بلا ترمیم منظور نہ کرے تو بغیر اس کی

رضامندی کے انتظار کے، بادشاہ کے تختہ کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔
 (۲) علاوہ مالی مسودات اور ایسے مسودات کے جن کے ذریعے پابلیشمنٹ
 کی مدت کو بڑھانا مقصود ہو یا جن میں دارالامرا ترکیب پرائیڈتا ہو، باقی ہر مسودہ
 بلارضامندی دارالامرا بادشاہ کے تختوں کے لئے چلا جائے گا، (الف) اگر وہ دارالعوام
 کی مسلسل تین نشستوں میں پیش ہو کر دارالامرا میں جاسکے (ب) دارالعوام کی پہلی
 نشست کی دوسری خواندگی اور تیسری نشست کی تیسری خواندگی کے درمیان
 دو سال کا وقفہ ہو اور (ج) ہر نشست کے اختتام سے ایک ماہ پیشتر ہر مسودہ
 دارالامرا میں بھیج دیا جائے۔

ایسٹان کی نئی مجلس سینات (۱۹۳۹ء)۔

جملہ تعداد اراکین - ۶۰

۱۱ صدر ایسٹان کے نامزد کردہ -

۶ دو جماعت کی طرف سے -

۲۱ ایران زیرین کی طرف سے -

مختلف شعبہ جات زندگی، تعلیم، زراعت،

مزدوری، صنعت و حرفت و تجارت،

تمدن و نظم و نسق کی طرف سے ۲۲

۶۰

مجلس سینات کو کسی مسودے کے نامظور کر کے کا اختیار نہیں لیکن وہ ۹۰ دن

تک اس پر غور کر سکتی ہے تاہم مدینہ کی ایوان لائبرین کے پاس بھیج سکتی ہے۔

فرانس

دارالوکلار

تعداد اراکین ۱۵۔ ہر سال کے لئے ہر شہری مرحہ جس کی عمر ۲۱ سال کی ہو اور جو چھ ماہ تک کسی شہر یا کسی باخستیار بلدیہ میں رہا ہو اور فوج میں ملازم نہ ہو، اسے حق رائے دی جاتی ہے۔ ہر ۲۵ سالہ شہری امیدوار کنیت بن سکتا ہے۔ طرز انتخاب۔ کبھی نیابت تناسب کے اصول اور کبھی ایک رکنی حلقوں کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا ہے۔ آج کل ایک رکنی حلقوں کا طریقہ رائج ہے اور ہر ضلع ایک ایک رکن کا انتخاب کرتا ہے۔

ضابطہ قانون سازی، سرکاری مسودے صدر جمہوریہ کے جانب سے، اور غیر سرکاری مسودے پہلے ایک ”مامور یہ ہدایت“ کے سامنے جاتے ہیں اور اگر اس کی رائے خلاف ہو تو پھر چھ مہینے تک دوبارہ پیش نہیں ہو سکتے۔ ہر مسودہ کسی نہ کسی مستقل موقی ذیلی مجلس کے سامنے جاتا ہے، اور اس مجلس کی روداد طبع ہر ارکان دارالوکلار میں گشت کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ایوان میں دو خواندگیاں کم از کم ۵ روز کے وقفہ سے ہوتی ہیں۔

مجلس سینیات

حلقہ رائے دی میں حسب ذیل شامل ہیں: (۱) ہر کمیون (بلدیہ) کی طرف سے ایک خاص تعداد رائے دہندوں کی جو مجلس کمیون کے اراکان کی تعداد سے متساوی ہے (۲) ہر صوبہ کی طرف سے اراکین دارالوکلار۔ (۳) ہر صوبہ کے اراکین مجلس صوبہ

(۲) ہر صوبہ کے مختلف اضلاع کے اراکین مجلس ضلع۔
 سینا تیوں کی تعداد ۳۰۰ ہے۔ یہ نو نو سال کے لئے چنے جاتے ہیں اور تیسری
 سال ایک تہائی سینا تیوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ امیدواروں کی عمر کم از کم ۲۰ سالہ
 ہونی لازمی ہے۔

اختیارات

دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہیں لیکن (۱) ہر مالی سہ ماہی پر پہلے
 دارالوکلار میں غور ہونا چاہئے اور اس کی منظوری کے بعد یہ سینا ت میں پیش ہونا چاہئے
 (۲) ایوان وکلار کی موقوفی سے پہلے ہمدردی ہو کر سینا ت کی منظوری لینا لازمی ہے

جاپان

ایوان نمائین :-

۴۶۶ ارکان - ہر جاپانی مرد کو جس کی عمر ۲۵ سال کی ہو، اور جو اپنے حلقے میں

(تنبیہ حاشیہ ص ۲۱۷) فرانس میں کل ۸۴ ہزار کسین یا ہدایات ہیں اور ایسے راسے و ہندوں کی
 تعداد ۴۴ لاکھ ہوتی ہے۔

فرانس کے دستور کے لئے دیکھو ڈوڈو سن، "ملکت" Woodrow Wilson
 The State باب ۱۔

دیکھو کیتا زاما "حکومت جاپان" - Kitazawa: The Govern-
 ment of Japan.

ایک سال رہا ہو، رائے دی کا حق حاصل ہے، لیکن درباری عہدہ داروں، پجاریوں اور پاوروں، طلبہ، ابتدائی مدارس کے اساتذہ، ٹھیکہ داروں اور عہدہ داران انتخاب کو رائے دی کا حق حاصل نہیں۔ ۳۰ سال سے کم عمر کا کوئی شخص منتخب نہیں ہو سکتا۔ حلقہ جات انتخاب بڑے بڑے ٹریڈ اور واحد قابل انتقال رائے کے اصول پر عمل پورے ہیں۔

ایوان امراء

۴۰ ارکان۔ ان میں حسب ذیل شامل ہیں:-

عمر بھر کے لئے: (۱) شہنشاہی خاندان کے بالغ شاہزادے، ۱۶؛

(۲) پرنس اور مارکوئیس جن کی عمر ۳۰ سال سے زائد ہو، ۱۵ + ۳۰؛

(۳) ۳۰ سال سے زائد عمر کے لوگ جنہیں شہنشاہ نے ممتاز ہونے کے طور پر

ملکی وجہ سے کابینہ کی رائے کے بموجب مقرر کیا ہو۔ ان کی تعداد

کبھی ۱۲۵ سے زائد نہ ہونی چاہئے۔

سات سال کے لئے: (۱) کاؤنٹ، دالی کاؤنٹ اور بیرن جن کی عمر ۳۰ سال سے زائد

ہو، ۱۰ + ۱۱ + ۱۲ + ۱۳۔

(۲) شہنشاہی اکاڈمی کے نمائندے ۴۔

(۳) ہر صوبے کے دو یا ۲۰۰ اعلیٰ محفل ادا کر لئے والوں کے

ایک یا دو قائم مقام، ۶۶۔

جملہ ارکان: خطاب یافتہ، ۲۱۱؛ بے خطاب، ۱۹۵۔

دونوں ایوانوں کے تعلقات

دوڑوں ایوانوں کے اختیارات بالکل مساوی ہیں، سوائے اس کے کہ
موازنہ پہلے دارالنائین میں پیش ہوتا ہے۔ اگر کسی مسئلے پر دونوں اپنی اپنی جگہ اڑ
جائیں تو دونوں کے مساوی التعداد اراکین کی کانفرنس ہوتی ہے اور اس کا فیصلہ ملحق ہوتا ہے
الحی
فاشی مجلس عظمیٰ؛

تقریباً ۲۵ ارکان، جن میں وزیر اعظم ایسے ارکان کا اضافہ کر سکتا ہے جنہوں
نے ملک کے لئے فاشی انقلاب کے لئے کاروائی نمایاں انجام دے دی ہو۔
یہ ۲۵ ارکان حسب ذیل ہیں :- (۱) روم پر دھارے کے ہم سپہ سالار، تاجدار
(۲) ارکان باعتبار عہدہ :- ارکان کا بیٹہ ملی، سینات و دارالنائبین کے صدر مجلس علی
کا صدر، فاشی جماعت کے معتد و نائب معتد اور بعض دیگر عہدہ دار،
دس، بعض دیگر اراکین، تین سال کے لئے۔

اختیارات، فاشی مجلس عظمیٰ کو یا تمام اطالوی سیاسیات کا مرکز ہے۔
اس کی رائے لازماً حسب ذیل امور پر لی جاتی ہے: شاہی وراثت، بادشاہ
لور وزیر اعظم کے اختیارات، سینات اور ایوان کی ترکیب و کاروبار، صنعتی و دیگر
اتحادیات سرکاری، پوپ سے تعلقات، ایسے عہدے جن کی رو سے اعلیٰ یا
اس کے مقبوضات کی آراغی میں کمی ہوتی ہو۔ سب سے اہم فرض یہ ہے کہ

۵۵ دیکھو لائی، اطالوی شخصیات، نکلت Pitigliani : The Italian

Corporative State. باب ۱۵۔

یہی مجلس دارالوکلار کے امیدواروں کی فہرست تیار کرتی اور رائے دہندوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

ایوان وکلار

۴۰ ارکان ۵۵ سال کے لئے حق رائے دہی ۲۱ سالہ مردوں یا ۱۸ سالہ ایسے مردوں کو حاصل ہے جو شادی شدہ ہوں یا ایسے رٹڈ وے ہوں جن کے بیٹے موجود ہوں۔ ہر رائے دہندہ کو کسی پیشہ بھکا چندہ یا سولیہ (تقریباً ۵۵ روپے) سے زیادہ دوسرا کوئی محصول ادا کرنا ضروری ہے۔ تنخواہ یا بون اور وظیفہ یا بون کو حق رائے دہی حاصل ہے۔

صرف ۲۵ سالہ شہری امیدوار کنیت ہو سکتے ہیں۔

دارج انتخاب : ۱) تمام ملک رقبہ داری نہیں بلکہ طبقہ داری حصوں میں منقسم ہے۔ ملک کی تیرہ بڑی بڑی پیشہ بھکائیں ۸۰۰ نام اور بعض بڑے بڑے تمدنی یا تعلیمی ادارے ۲۰۰ نام پیش کرتے ہیں ؛ (۲) ان ۱۰۰۰ ناموں میں سے فاشی مجلس عظمیٰ ۲۰۰ جن لیتی ہے ؛ (۳) ان ۲۰۰ کو رائے دہندوں کے سامنے نظری یا نا منظوری کے لئے پیش کیا جاتا ہے ؛ (۴) نا منظوری کی صورت میں از سر نو فہرستیں تیار کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

مجلس سینیات

اس میں حسب ذیل شریک ہیں (۱) ۲۱ سالہ شہزادے ؛ (۲) ۲۵ سال کی عمر تک رائے نہیں دے سکتے ؛ (۳) غیر معین تعداد ارکان جن کی عمر کم از کم ۲۴ سال کی ہو ؛ جنہوں نے سیاسیات ، ادبیات یا دوسرے کسی افادہ شہہ زندگی میں نام

پیدا کیا ہو، جو تین ہزار لبر کے (تقریباً ۲۵ روپیہ) سالانہ کے محاصل دیتے ہوں اور جنھیں بادشاہ نے سیناتی مقرر کیا ہو۔ اس وقت سینانیوں کی تعداد ۳۷۶ ہے جس میں ۸ شاہزادے ہیں۔

(ب) وفاقتے ممالک متحدہ امریکہ - مرکزی مقننہ؛ دو دیوان، ایوان ناہین، سینات۔

ایوان ناہین؛

اہلیت رائے وہی ہے۔ ہر ریاست میں جو اہلیت اس ریاست کے ایوان اول کے اراکین کے انتخاب کے لئے ہے وہی اراکین۔ مرکزی ایوان ناہین کے لئے ہے، لیکن دستور کے تحت ہر کسی قسم کا جنسی یا نسلی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔ بعض ریاستوں میں پڑھنا، بعض میں سکونت دہن ماہ سے ۲ سال تک، بعض میں شہریت اور بعض میں شہری بننے کا خیال وغیرہ کافی تصور کئے جاتے ہیں جنوبی ریاستوں میں ”رنگینوں“ کو عملاً حق رائے دہی ملتی حاصل نہیں ہے رائے دہندوں کے لئے ۲۱ سال کی عمر کی قید ہے۔

اہلیت کرشمیت :- ۲۵ سال کی عمر، ۷ سال کی شہریت جس ریاست کا قائم مقام ہو وہی میں سکونت۔

تعداد دار اکین ۱۰-۴۳۵؛ دو سال کے لئے ہر نائب (رکن) ایک ایک رکنی حصے سے جس کا تعین ہر ریاست اپنے طور پر کرتی ہے۔

اندرونی تنظیم و مدارج قانون، مستقل ذیلی مجالس جن کی رکنیت کے لئے مختلف سیاسی گروہوں کی طرف سے امیدوار پیش ہوتے ہیں اور ایوان ان میں سے انتخاب کرتا ہے۔ انھی مجالس کے سپرد مختلف مسودات کی چھان بین کا کام ہے اور یہی عالمہ اور قسطنطنیہ کے درمیان ایک طرح کا رابطہ پیدا کرتی ہیں۔

مجلس سینیات ۱۰۶۷ اکین؛ ایک وفاقی جماعت ہے۔ اس میں ہر ریاست سے ۲۱۲ اکین نشست کرتے ہیں جن کا انتخاب تناسبی نیابت کے اصول پر ریاست کے رائے و منہدے کرتے ہیں۔ یہ چھ چھ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور مجلس کے ترمیم کے حصے کا انتخاب دو دو سال بعد ہوتا ہے۔

اختیار رائت سینیات (۱) قانون سازی۔ علاوہ مالی مسودوں کے اس کے اور ایوان نائبین کے اختیار رائت بالکل مساوی ہیں۔ مالی مسودات کی ابتدا صرف دارالنائین ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن مجلس سینیات جو ترمیم چاہے کہ سکتی ہے۔ (۲) عالمانہ مجلس سینیات کے ۲۱۲ رائے کے بغیر کوئی عہدہ نامہ مرقعہ نہیں بھا جاتا۔ نیز اسے اختیار ہے کہ صلیب پر جس عہدہ دار کو مقرر کرے اس کے تقرر کو نامنظور کر دے۔

(۳) عادلانہ اگر کسی عہدہ دار کا ایوان نائبین مواخذہ کرے تو وہ مواخذہ مجلس سینیات کے سامنے پیش ہوگا۔

ریاستی قانون ساز جماعتیں

ان کے انتخاب وغیرہ میں وہی اصول برتے جاتے ہیں۔ جن پر مرکز میں عمل ہوتا ہے۔ ہر ریاست میں دو ایوانی مقننہ ہوتی ہے، اکثر میں اونچے ایوان کے حلقہ جات نیچے ایوان کے حلقہ جات انتخاب سے بڑے ہوتے ہیں۔ اونچے ایوان مرکزی سینات کی طرح ”مجلس“ ایوانات ہیں۔ معیار کثرت ہر ریاست میں جدا گانہ ہے۔

سویٹان۔ مرکزی مقننہ :-

نیچا ایوان ”مجلس قومی“، اس میں ہر ممبر بڑا کی طرف سے ایک رکن ہوتا ہے۔ لیکن حلقہ جات رائے ریاستی حدود کو نہیں کاٹتے۔ اس وقت ۱۸۷ اراکین ہیں، جو رائے دہی عامہ کے اصول پر تین تین سال کے لیے منتخب ہوتے ہیں اور نیچا ایوان ”مجلس اجزاء“، کینیڈن سے دو دو اور ہر نصف کینیڈن سے ایک ایک رکن۔ اس مجلس میں ۴۷ اراکین ہیں۔ کینیڈن کو اس مجلس کے اراکین کا مشاہرہ طرز انتخاب اور مدت عہدہ کے تصفیہ کرنے کا اختیار ہے، اور عام طور پر ان کا انتخاب ایک سے چار سال کے لیے ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ براہ راست انتخاب کا طریقہ رائج ہو رہا ہے۔

اختیار راست : دونوں ایوانوں کے اختیارات بالکل مساوی ہیں، اور چونکہ ملک میں فیصلہ طلبی کا دستور ہے اس لئے ان میں بہت کم مستقل اختلاف ہوتا ہے۔

وفاقی اسمبلی :- دونوں ایوانوں کے یکجائی جلسے کا نام ہے۔ اس کے سپریم کورٹ ہیں؛
 (۱) وفاقی ادارات کے متعلق مختلف فیہ مسائل طے کرنا؛ (۲) معافی دینا؛
 (۳) بعض بڑے بڑے عہدہ داروں، مثلاً ارکان عدالت عالیہ سپر سالار وغیرہ کا انتخاب۔

اجزائی مقننہ جات

(۱) جہاں عوامی اسمبلی ہے یعنی جہاں براہ راست قانون سازی کا طریقہ رائج ہے ان ریاستوں (کنٹینوں) میں یہ اسمبلی ہر سال صبح ہوتی ہے، آئندہ سال کے عہدہ داروں کا انتخاب کرتی ہے اور سال بھر کے معاملات پر بحث کرتی ہے۔ اس میں تمام رائے دہندے شامل ہوتے ہیں،

(۲) جہاں نیا بتی مجلس ہیں وہاں بھی مقننہ ایک ایوانی ہوتی ہے جو دو تین یا چار سال کے لئے منتخب ہوتی ہے۔ اس کے سپر قانون سازی، محصل اور اہم عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ اس مجلس کو ”بڑی مجلس“ یا ”مجلس کنٹین“ کہتے ہیں۔

براہ راست قانون سازی؛

فیصلہ طلبی، وفاقی حکومت میں؛

(۱) تبدیلی دستور کے لئے جملہ آراء کی کثرت اور کنٹینوں کی کثرت لازمی ہے۔
 (۲) تبدیلی قانون کے لئے جب آٹھ کنٹین (مجموعہ ۲۳) یا ۳۰ ہزار رائے دہندے

اپنی خواہش کا اظہار کریں، اس وقت معمولی قوانین بھی فیصلہ طلبی کے لئے پیش ہو سکتے ہیں۔

کینٹوں میں:-

(۱) تبدیلی دستور کے لئے فیصلہ طلبی لازمی ہے۔

(۲) دوسرے قوانین کے لئے: کینٹوں میں جملہ قوانین کے لازماً، میں جب ایک خاص تعداد (جو کینٹوں میں مختلف ہے) چاہے تین میں بعض قوانین کے لئے لازمی بعض کے لئے اختیاری۔

تحریک گذاری، ذاتی حکومت میں، تبدیلی دستور کے لئے ۵۰ ہزار رائے دہندوں کو تحریک گذاری کا حق ہے۔

کینٹوں میں جنید آ کے علاوہ ترمیم دستور کے لئے خاص خاص تعداد کو تحریک گذاری کا حق ہے اور سوائے تین کینٹوں کے باقی سب میں معمولی قوانین کی تحریک بھی اسی طرح سے کی جاسکتی ہے۔

روس: دستور ۱۹۳۶ء کی تبدیلیوں کے بعد:-

مجلس اعلیٰ جملہ اختیارات کی حامل ہے۔ اس میں دو ایوان ہیں یعنی

(۱) مجلس اتحاد (۲) مجلس اقوام

Revue des Sciences politiques.

شہ "جریڈ علوم پارسیہ"

Annual Register

"سالانہ رجسٹر"

جولائی ستمبر ۱۹۳۶ء

۱۹۳۶ء صفحہ ۳۰۰

مجلس اتحاد: اس میں ہر تین لاکھ نفوس کی طرف سے ایک ایک قائم مقام نشست کرتا ہے۔ لیکن (برخلاف پرانی مجلس اتحاد کے) یہ قائم مقام خفیہ رائے دہی کے اصول پر اسی طرح منتخب ہوتے ہیں جیسے عمومی مالک کی پالیسیوں کے لئے ہوتے ہیں۔

مجلس اتوام میں (بجائے سات جمہوریتوں کے) گیارہ جمہوریتیں اپنے قائم مقام روانہ کرتی ہیں جن کا انتخاب ان کی مجلس کی طرف سے عمل میں آتا ہے۔

مجلس اعلیٰ کو مکمل اختیارات عالمہ و عدلیہ حاصل ہیں اور دستوری ضمانت کا بھی اختیار ہے بشمولیکہ ہر ایوان کا پانچ حصہ اس کے موافق ہو۔ ہر نالین کی تحریک دونوں ایوانوں میں سے کسی ایک ایوان میں کی جاسکتی ہے۔ جب مجلس اعلیٰ نشست نہ کر رہی ہو تو اس کے جملہ اختیارات ایک ”صدریہ“ کو تفویض ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ اسے جنگ کرانے اور عہد ناموں پر دستخط کرنے کا اختیار بھی حاصل ہے۔ اس میں ۴ ارکان ہیں جنہیں دونوں ایوانوں نے مقرر کرتے ہیں۔ اعلیٰ میں روزمرہ کا کاروبار یہی مجلس انجام دیتی ہے درنہ مجلس اعلیٰ سال میں صرف دو مرتبہ چند ہفتوں کے لئے بٹھتی ہے۔ پرانی سوویت حکومت کا دراصل خاتمہ ہو گیا ہے اور گوبیسوویتیں اب بھی موجود ہیں لیکن ان کا کام صرف مقامی حکومت چلانا ہے۔

۱۔ ساتھ میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۷ء کو مجلس اعلیٰ کے جو ۳۳ اراکین جمع ہوئے وہ سب کے سب بلا کسی مقابلے یا مخالفت کے منتخب ہوئے تھے اس لئے صرف اشتیاقی لڑائی ہی کو امیدوار پیش کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔

ہندوستان

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے وفاقی حکومت اس وقت قائم ہوگی جب اس میں اتنی ہندوستانی ریاستیں شریک ہوں گی کہ وہ مجلس مملکت کے ۱۳ ارکان کو منتخب کرنے کی اہل ہوں اور ان کی آبادی تمام ریاستوں کی آبادی سے کم از کم نصف ہو۔

۱۔ ہندوستان کے موجودہ دستور کے لئے دیکھو ایڈری ولوٹن، "ہندوستان کا نیا دستور"
Eddy & Lawton: Indias new Constitutions.
 گیتھ، "ہندوستان کی دستوری تاریخ" *A. B. Keith: A Constitutional*
History of India باب ۱۰۔

مجلس مملکت : برطانوی ہند کی نمائندگی

| صوبہ یا قوم | پیشین | عاشقین | سکھ | مسلم | عورتیں | جدلی ذاتیں |
|------------------|-------|--------|-----|------|--------|------------|
| مداس | ۲۰ | ۱۴ | × | ۴ | ۱ | ۱ |
| بمبئی | ۱۶ | ۱۰ | × | ۴ | ۱ | ۱ |
| بنگال | ۲۰ | ۸ | × | ۱۰ | ۱ | ۱ |
| مالک متحدہ | ۲۰ | ۱۱ | × | ۶ | ۱ | ۱ |
| پنجاب | ۱۶ | ۳ | ۴ | ۸ | ۱ | × |
| مالک متوسطہ | ۸ | ۶ | × | ۱ | × | ۱ |
| بہار | ۱۶ | ۱۰ | × | ۴ | ۱ | ۱ |
| آسام | ۵ | ۳ | × | ۲ | × | × |
| صوبہ شمال مغرب | ۵ | ۱ | × | ۴ | × | × |
| اڈیسہ | ۵ | ۴ | × | ۱ | × | × |
| سندھ | ۵ | ۲ | × | ۳ | × | × |
| بلوچستان | ۱ | × | × | ۱ | × | × |
| دہلی | ۱ | ۱ | × | × | × | × |
| اجمیر وارواڑ | ۱ | ۱ | × | × | × | × |
| کوئٹہ | ۱ | ۱ | × | × | × | × |
| اینگلو ہندی | ۱ | × | × | × | × | × |
| یروڑپی | ۶ | × | × | × | × | × |
| ہندی عیسائی | ۲ | × | × | × | × | × |
| جملہ برطانوی ہند | ۱۵۰ | ۷۵ | ۴ | ۴۹ | ۶ | ۶ |

یہ تو برطانوی ہند کے منتخب شدہ ارکان ہوں گے، ان کے علاوہ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی طرف سے چھ ارکان کو رکن مقرر کرے گا۔
 علاوہ ان ۵۰ نشستوں کی مجلس مملکت میں زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ ارکان ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہوں گے، چنانچہ قانون حکومت ہند کے تتمہ نمبر ۱ میں ہر ریاست کی طرف سے جتنے ارکان بالآخر اس وقت جب ہر ریاست دفاقیہ میں شریک ہو جاوے گی، ان کی تعداد کا شمار کر دیا گیا ہے۔ اس فہرست میں حیدرآباد کا نام سب سے ممتاز ہے اس لئے کہ اس قلمرو کو دیشرطیکہ وہ دفاقیہ ہند میں شامل ہو جائے گا، تمام منفرد ریاستوں سے زیادہ یعنی ۵۸ نشستیں ملیں گی۔
 ریاستی نمائندوں کو ریاستیں نامزد کریں گی؛ برطانوی ہند کے قائم مقام سال کے لئے منتخب ہوں گے اور ایوان کا ایک تہائی ہر تیسرے سال منتخب ہوا کرے گا۔

سطح نشستوں میں سے تین تمام ہندوستان کی تجارت و حرفت کے قائم مقاموں کے لئے اور ایک تمام ہندوستان کے مزدوروں کے لئے وقف ہیں۔

وفاتی اسمی

[illegible]

ان برطانوی ہندی قائم مقاموں کے علاوہ دفائی جمعیت میں زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ ارکان ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے ہوں گے، چنانچہ قانون حکومت ہند کے تحت نمبر ۱ میں ہر ریاست کی طرف سے جتنے ارکان بالآخر ہوں گے (اس وقت جب ہر ریاست وفاقہ میں شریک ہو جائے گی) ان کی تعداد کا شمار کر دیا گیا ہے۔ اگر حیدرآباد وفاقہ میں شریک ہو جائے تو اسے ۱۶ ارکان جمعیت وفاقہ میں بھیجے کا حق حاصل ہوگا۔

برخلاف مجلس مملکت کے انتخابات کے، جو براہ راست ہوں گے، جمعیت وفاقہ کے انتخابات بالواسطہ ہوں گے، یعنی اس جمعیت کے اراکین کو لئے دسترس قوت نہیں کریں گے بلکہ مختلف صوبوں کی مجالس مقننہ کے اراکین منتخب کریں گے۔ اس کے لئے یہ قرار پایا ہے کہ صوبہ واری جمعیت مقننہ کے اراکین قوم داری انتخاب واحد قابل انتقال رائے دہی کے اصول پر کریں گے، یعنی عام نشستوں کے لئے عام اراکین، مسلم نشستوں کے لئے مسلم اراکین وغیرہ۔ عورتوں کے انتخاب کے لئے تمام جمعیت لئے مقننہ کے اراکین اناتل کہ ایک حلقہ رائے دہی بنائیں گی اور اس نوع سے انتخاب کریں گی کہ منجملہ نوعوں میں کم از کم دو مسلمان اور ایک عیسائی ہو۔

صوبہ واری مجالس مقننہ

منجملہ گیارہ گورنری صوبوں کے چھ صوبوں میں دو ایوانی اور پانچ صوبوں میں ایک ایوانی جماعت مقننہ ہیں۔ اونچے ایوان کو مجلس مقننہ اور نیچے ایوان کو مقننہ اسمبلی کہتے ہیں۔ (اراکین کی تقسیم صفحہ ۳۳ پر درج ہے)

صوبہ واری مجالس مقننہ

| صوبہ | پنجتیب | ج | تسم | کریوپی | پیلی | مقام | نمبر کارڈ |
|------------|--------|----|-----|--------|------|------|-----------|
| ملکس | ۵۵-۵۴ | ۳۵ | ۷ | ۱ | ۳ | X | ۱۰-۸ |
| بہائی | ۳۰-۲۹ | ۲۰ | ۵ | ۱ | X | X | ۴-۳ |
| بنگال | ۶۵-۶۳ | ۱۰ | ۱۷ | ۳ | X | ۲۷ | ۸-۶ |
| مالک متحدہ | ۶۰-۵۸ | ۳۴ | ۱۷ | ۱ | X | X | ۸-۶ |
| بہار | ۳۰-۲۹ | ۹ | ۴ | ۱ | X | ۱۲ | ۴-۳ |
| آسام | ۲۲-۲۱ | ۱۰ | ۶ | ۲ | X | X | ۴-۳ |

(مقننہ اسمبلیوں کا نقشہ ۱۳۳۳ء پر ملاحظہ کیجئے)

مضمون نمبر ۱۵۶

[illegible]

اہلیت رائے دی :-

دفاقی اسمبلی کا انتخاب تو صوبہ واری اسمبلیاں کریں گی، اس لئے اس کے واسطے ذرا اہلیت رائے دی کے قواعد کی ضرورت ہی نہیں، مجلس مملکت کے لئے یہ قرار پایا ہے کہ اس میں کم و بیش وہی اصول مدنظر رہیں جو قانون ۱۹۲۶ء والی مجلس مملکت میں مدنظر تھے، چنانچہ اس کے انتخاب میں تقریباً ایک لاکھ رائے دہندے حصہ لیں گے۔

صوبہ واری جمعیوں کے لئے ہر صوبے کو حلقہ جات انتخاب میں تقسیم کیا گیا ہے جو جغرافیائی بھی ہیں اور قوم واری بھی کسی شخص کو ایک سے زیادہ رقبہ واری حلقہ میں رائے دینے کا اختیار نہیں ہے، لیکن عورتیں ایک سے زیادہ حلقہ میں رائے دے سکتی ہیں۔ حلقہ رائے دی میں رائے دہندے کی سکونت کے لئے مختلف مدتیں مشروط ہیں، چنانچہ مدراس میں ۱۲۰ دن، بمبئی میں ۱۸۰ دن ہیں۔ عام طور پر یوروپی رائے دہندوں کے لئے شرطیں نسبتہ ملائم ہیں جبکہ لائی حلقوں میں رائے دی کے لئے کچھ نہ کچھ مانگڈاری یا محصول آمدنی یا لگان معیار قائم کرتے ہیں اور ہر صوبہ میں یہ معیار مختلف ہے۔ نیز رائے دی کے لئے مختلف تعلیمی معیار بھی قائم کئے گئے ہیں اور خاص خاص حلقہ جات کے لئے جیسے تجارت، حرفت، زمینداری وغیرہ کے لئے بھی جدا جدا معیار ہیں۔

دفاقی ایوان کے متعلق قواعد مندرجہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء ۱۶۔

(۱۵) دونوں ایوان سال میں کم از کم ایک مرتبہ نشست کریں گے اور نشستوں کے درمیان ۱۲ ماہ سے زیادہ وقفہ نہ ہو گا۔

(۲) مجلس مملکت ایک "سلسل" مجلس ہوگی؛ وفاقی اسمبلی اگر پہلے ہی موقوف ہوئی ہو تو وہ سال تک برقرار رہے گی۔
 (۳) گورنر جنرل کو دونوں یا ایک ایوان کے طلب کرنے، ملتوی کرنے یا وفاقی اسمبلی کو موقوف کرنے کا حق ہوگا۔
 (۴) ہر وزیر یا صلاح کار کو اختیار ہوگا کہ وہ جس ایوان میں چاہے تقریر کرے۔

(۵) مفصلہ ذیل دونوں میں سے کسی ایوان کے رکن نہیں ہو سکتے؛
 (۱) علاوہ وزراء کے صوبہ جات ریاست اسے، ہر عمدہ دار سرکاری؛
 (۲) تجویز شدہ فائز اعلیٰ؛ (۳) دیوالیہ؛ (۴) وہ شخص جس پر انتخاب کے سلسلے میں رشوت ستانی کا الزام عائد ہو چکا ہو؛ (۵) دو سال سے زیادہ سزا یافتہ۔ لیکن گورنر جنرل اس شرط کو اپنے حکم سے کالعدم کر سکتے ہیں۔
 لیکن دوران سزا میں کوئی شخص منتخب نہیں ہو سکتا۔
 (۶) دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہیں اور عام طور پر کوئی قانون اس وقت تک گورنر جنرل کے پاس منظور کیا کے لئے نہیں جائے گا جب تک کہ دونوں ایوان منظور نہ کریں۔ مالی مسودات پہلے جمعیت وفاقہ میں پیش ہوں گے۔

علاوہ حق امتناع کے گورنر جنرل کو قانون سازی کے حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں:-
 (۱) کسی ضروری امر کے متعلق "احکام" صادر کرنا، لیکن یہ مقصد کے انعقاد

کے بعد صرف چھ ہفتے تک نافذ رہیں گے۔

(۲) کسی ایسے امر کے متعلق جس کا دار و مدار اس کی ذاتی رائے پر ہو، جب کبھی اس کی خواہش اور ضرورت ہو احکام نافذ کرنا۔

(۳) ایسے قوانین جو اس کے نزدیک متفقہ میں منظور ہونے چاہئے تھے لیکن متفقہ نے انہیں منظور کرنے سے انکار کر دیا، انہیں وہ بطور ”گورنر جنرلی قوانین“ کے نافذ کر سکتا ہے۔ ”گورنر جنرلی قوانین“ کی اطلاع فوراً وزیر ہند کو دی جائے گی اور انہیں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

صوبہ جات کے گورنروں کو بھی تقریباً اسی قسم کے اختیارات اپنے صوبوں کی حد تک حاصل ہیں جیسے گورنر جنرل کو ہندوستان کے متعلق حاصل ہیں۔

Executive

باب ۱۶

عالمہ

عالمہ کا کام اور اہمیت - نائشی اور کارزرا - بادشاہی - شخصی بادشاہی - پتوری بادشاہی
جمہوریہ - صدر کا انتخاب - وزارت - پارلیمنٹ - کابینہ - صدارتی کابینہ - آمری کابینہ
مفرد مرکب عالمہ - ترکیب وزارت مجلس متعلقہ کابینہ - سول سروس -

عالمہ کا کام اور اہمیت - اس سے پہلے ایک باب میں یہ بیان
کیا جا چکا ہے کہ حکومت کی ایک بہت اہم شاخ جماعت عالمہ ہے جس کا کام
نی الجملہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے آئین و قوانین کا نفاذ کرے اور ایک طرف جماعت
مقننہ اور دوسری جانب محکمہ عدلیہ کے احکام کو عمل میں لائے۔ نیز یہ بھی بتایا جا چکا
ہے کہ چونکہ اندرونی امن و امان قائم رکھنا اور بیرونی حلوں اور دوسرے خطرات
سے ملک کو محفوظ رکھنا، دونوں کے لئے پولیس، فوج اور بیڑے کی ضرورت
اس وجہ سے خارجی معاملات بھی جماعت عالمہ کے سپرد ہوتے ہیں، گوان شہنوں
کی نوعیت دیگر فراموشداشت سے بالکل جدا گانہ ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے

کہ یہ جماعت ایک کمزور جماعت ہوگی اس لئے کہ جب اس کا کام ہی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین اور عدلیہ کے اعلان کی ہوئی تجویزوں کا نفاذ نہ ہو تو پھر اس کا میدان عمل نسبتاً تنگ ہوا، لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی یہی وہ شاخ ہے جس کا دوسری شاخوں سے کہیں زیادہ بدیہی طور پر مظاہرہ ہوتا ہے اور جو اپنی فوج، پولیس اور بیڑے کے ذریعے سے اس قدر زیادہ لوگوں پہلے اثر ڈالتی رہتی ہے کہ لوگ اکثر حکومت کی باقی ماندہ دونوں شاخوں کو بھول جاتے ہیں اور نہ ہی عالمہ ہی کو حکومت سمجھنے لگتے ہیں۔ مقننہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، جب اس کا میقات ختم ہو جاتا ہے تو اس کے راگین (عام آبادی میں گھل مل جاتے ہیں، اور عدالتوں کا اثر تو زیادہ تر ان ہی لوگوں پر ہوتا ہے جو کسی مقدمہ میں مدعی یا مدعا علیہ، مستغنیث یا ملزم ہوں، لیکن جماعت عالمہ کے نقیب، عمیل نہ جگہ نظر آتے ہیں؛ جہاں دیکھو پولیس کے جوان کھڑے ہیں، فوجی قواعد ہو رہی ہے، حکام کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں، بادشاہ کے لئے سیٹیاں بچ رہی ہیں، مہو جلو ہو رہا ہے، اور سر قیدی کو منکڑیاں بیڑیاں پہنائے جاتے ہیں، آدھ کرسی پر لایو کی کی ڈگر سی ہو گئی ہے تو اس کا مال فرق کیا جا رہا ہے بغض خواہ کسی کو سیاست سے بچسی ہو یا نہ ہو، حکومت کی یہ شاخ ایسی ہے کہ اس کا اثر ہر شخص پر پڑنا لازمی اور لا بد کی ہے۔

حکومت کے بعض شعبے ایسے ہوتے ہیں جو باوجود مقننہ کے اثرات کے اس کے خستہ بیار سے باہر ہوتے ہیں لیکن عالمہ کے اختیار سے باہر نہیں ہوتے۔ آج کل کی جماعتوں میں مقننہ عالمہ پر عادی نظر آتی ہے، اور اس نے حکومت کے

سب سے بڑے بڑے یعنی مالیات پر اپنا قابو جالیا ہے، لیکن آج بھی بڑی سے بڑی عمومی ٹکٹوں میں ایسے شعبے جیسے خارجی معاملات، خاص طور پر عالمہ کے متعلق سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کسی ملک (جیسے ممالک متحدہ امریکہ) میں مقننہ کی کسی شاخ کو ان پر کوئی اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو اسے ایک غیر معمولی حلقہ عالمہ نظر سے سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی ملک کسی خاص مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے یا اس میں کسی طرح کا سیاسی بحران ہوتا ہے تو قانون سازی کے کام کو خود مقننہ عالمہ کے تفویض کر دیتی ہے اور اسے احکام سازی کے وسیع اختیارات دے دیتی ہے، یہاں تک کہ سرگرمی عالمہ کو بعض مواقع پر مطلق بھی بنا دیتی ہے جیسا زمانہ موجودہ میں متحدہ ممالک میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ اگر لیانہ بھی ہو تو کئی انچوائس انتہائی مصروفیت اور قانون سازی کی گونا گوں پیچیدگیوں کی وجہ سے

۱۔ ممالک متحدہ امریکہ کی مجلس مینات کو حسب ذیل عالمہ اختیارات حاصل ہے:-

- ۱۔ مجلس مینات کے پچھلے اکثریت کو عدالت سے مسترد کر کے کا اختیار۔
- ۲۔ مجلس مینات کی تشریف عدہ کے ہر ایک تقریر بلاذنی ہے، گو کانگریس کا اختیار ہے کہ نیچے درج کے تقررات کے لئے مینات کی منظوری کو غیر ضروری قرار دے، اس وقت یہ بھی سفر، قاضی، عادلان عدالت العالمہ اور پڑھنے پڑھنے سے پردہ داروں کے لئے یہ توثیق لازمی ہے۔
- ۳۔ ایسی تفویض کی بھی خالص حال کے زمانے کی آمرتیں ہیں جیسے انکی میں فاشی آمریت اور جرمنی میں نازی آمریت۔ لیکن پیشکل سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں طرز اس کے حکومت بعض غلطی ہیں۔

چند خاص امور میں مقتضی عالم کو اختیار دے دیں ہے کہ جیسا چاہے قانون بنائے۔
 اس صورت حال کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر وسیع سطح میں دیکھا
 جائے تو عالم ایک نہایت ہی فشرحانہت ہوتی ہے جس میں ہزاروں نفوس کسی
 عظیم الشان محل کے پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں، لیکن دراصل اس کا جو حصہ باہمی
 کاغذیں کرتا ہے وہ صرف چند ہی نفوس پر مشتمل ہوتا ہے اور بعض مرتبہ تو اس کا
 عملی مرکز ایک فرد واحد ہوتا ہے جو کئی معاملات پر پوری طرح سے حاوی ہوتا ہے۔ یہی
 سب سے بڑا فرق مملکت اور عالم کے طرز کار میں ہوتا ہے کہ جہاں ایک عالمی مقتضی میں
 ہر مسئلہ پر ہر ایک بعض مرتبہ دونوں اور بعض تو ایک بحث ہوتی ہے اور کئی کا کوئی پہلو
 راز میں نہیں رہتا، وہاں عالم کے مباحث اکثر بالکل راز میں رہتے ہیں اور اس
 میں جو معاملات پیش کیے جاتے ہیں وہ سب جلد سے ہو جاتے ہیں۔ اسی سبب
 سے جیسا اور بیان کیا گیا ہے، جب ملک کسی سیاسی بحران میں ہو کر نکلتا ہے
 تو یہی مناسبت معلوم ہوتا ہے کہ قانون سازی کے اختیارات پھر عالم ہی کے سپرد
 کر دیئے جائیں تاکہ اسے کار مباحث سے چھٹکارا دیا اور ملک جلد سے جلد باہمی اتحاد
 سے نکلا جاسکے۔

یہ اس کی ایک بڑی مثال سلطنت برطانیہ کی شاہی نوادریں کی قانون سازی کی ہے جہاں احکام عوامی
 کے ذریعے سے مل جاتے ہیں نہ کہ پارلیمنٹ کے قوانین کے ذریعے سے۔ دیکھو آئین
 در سوم دستور انگلستان "Law and Custom of the Constitution"
 جلد ۱، حصہ ۱ باب ۲، جدول ۲، حصہ ۱ باب ۵، جدول ۱۔
 ۱۹۵۴ء

نمائشی اور کارفرما۔ اب سے چند سال پیشتر یہ کہا جاسکتا تھا کہ علامہ
اقتدار کو وہ تفوق حاصل نہیں رہا جو کسی زمانے میں اسے حاصل تھا، اور رفتہ رفتہ مقننہ
(دنیائی مجلس) کے دست برد سے ایسے شعبے بھی نہیں بچے جو خاص طور پر علامہ کے
گویا اجارہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن پہلے اگلی ہیں، اس کے بعد جہتیں ہیں اور اب
یورپ، امریکہ اور ایشیا کے دوسرے ممالک میں اکثریت نے جو جگہ ایسے لئے
پیدا کر لی ہے اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقتدار کو پھر دے دیں، بلکہ ممکن
ہے کہ اس سے بھی زیادہ عروج نصیب ہو جائے جو اسے کسی زمانے میں
حاصل تھا۔^۱ واقعی سیاسی اقتدار کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی عمومی ملکوں
آمریوں اور پرانی بادشاہتوں، سب میں ایک چیز مشترک ہے، اور وہ علامہ کا
اثر اور عصب و آفتاب ہے۔ اس کا اقتدار قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا
ہے اس کے قائم مقاموں میں ایک خاص تقدس روا رکھا جائے، فوج اور پولیس
کو دریاں پہنائی جائیں، ان میں سے معمولی سے معمولی سپاہی کو ایسے اختیارات
دئے جائیں جو بڑے سے بڑے شہری کو بھی حاصل نہیں، اس کے منہ دے

(فیوٹ ۱۹۴۸ء) ۵۵ اسپن کے سابق آمر جنرل ریوڈی ریویرا نے کہا تھا کہ ٹومی حکومت ان ممالک کے
لئے بہت موزوں ہیں جن میں روپیہ دانی ہے اور مسائل بھی بہت ہیں اس لئے کہ یہاں کے لوگ لسانی
سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے تصفیہ میں دن بھرے اور پیسے گزار سکتے ہیں، لیکن ان ممالک میں جہاں
افلاس کا دور دورہ ہے اور جہاں ملکی کام بہت کم ہے وہاں آمریت ہی بہتر ہے۔
۵۷ آمری اقتدار کیلئے دیکھئے اسی باب کا پارہ مرسومہ آمری کا مینہ۔

اور وزیر کی حیثیت بڑھائی جائے، ان کے لئے خاص خاص آرام و آسائش کے طریقے مہیا کئے جائیں، بادشاہ ہو یا صدر جمہوریہ اس کا ایک خاص رعب داب قائم کیا جائے۔ یہاں یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ چشم و خدام اور یہ نمائش کوئی غیر ضروری چیزیں ہیں بلکہ ان کا ایک نہایت زبردست افادہ ہی پہلو بھی ہے۔ جیسا دستور انگلستان کے ایک بہت بڑے نقاد نے لکھا ہے، عوام میں سے اکثر و بیشتر اس وقت تک حکومت کی بروکرات اور اس کی وحدت کو نہیں سمجھتے جب تک اس کا مظاہرہ ان کی نظر سے نہ گزر جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے باورچی یا سائیس کے سامنے سیاسیات کے نکات سمجھانے بیٹھے تو اس باورچی یا سائیس کے لئے اس کا سمجھنا اتنا ہی مشکل ہوگا جتنا کسی غیر زبان کا، لیکن کسی شہر میں وائسرائے کی آمد پر وہی باورچی تماشہ دیکھنے جائے، اور مشو بچہ پسند اور پولیس اور فوج کو دور و بیصف بستہ دیکھنے تو حکومتی اقتدار کی تصویر اس کے سامنے ہو کر پھر جائے گی لیکن یہ کہ اگر ہر شخص سیاسیات کے نکات کافی طور پر سمجھ لیتا اور حکومت کی ماہیت اس کے ذہن میں آجاتی تو اس ناٹشی عنصر کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن موجودہ حالات و واقعات اس کے مقتضی ہیں کہ جماعت عالمہ کو جس کا تعلق عوام الناس سے نہایت ہی قریب کار تھا ہے ایک خاص قسم کا نقد بن جائے اور اس مصنوعی طریقے سے اس کا اثر قائم رکھا جائے بعض مرتبہ یہ نمائش کیفیت حقیقی کارفرما جزو عالمہ میں پیدا کی جاتی ہے اور بعض مرتبہ ناٹشی جزو سے واقعی کاروبار کے اعتبارات نکال کر اسے محض اثر قائم

کرنے کے لئے رہنے ویا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا صدر یا ہندوستان کا ولیدرا کے ایک طرف تو واقعی ان ممالک کی عالمہ کا گویا صدر ہے اور دوسری طرف اسے بہت کچھ ظاہری حشمت و خدم حاصل ہوتا ہے، اور اگر ان دونوں کے حشمت و خدم میں فرق ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ایک غیر ملک کے دائرہ کے کہ یہاں کے باشندوں پر زیادہ اثر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے بہ نسبت امریکہ کے صدر کے، اور اسی وجہ سے دائرہ کے کی ناشکی کیفیت زیادہ ہے۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ ان دونوں حالتوں میں ناشکی اور کارکن صدر عالمہ دونوں ایک ہی فرد میں شامل ہیں۔ آج کل کے زمانے میں یہ صورت حال آہستہ میں نظر آتی ہے جہاں کارکن غنیمت اور اس کے صدر کو ناشکی اغراض اور تشہیر کے لئے بڑا حشمت و خدم رکھنا پڑتا ہے، بلکہ بعض کا تو خیال ہے کہ بغیر تشہیر کے محض کارفرمائی سے آمرانہی قوت قائم ہی نہیں رکھ سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص محض ناشکی ہو اور دوسرا محض کارفرما ہو؛ ایک از پیدا کرے دوسرا اس اثر کو کام میں لاکر کار و بار مملکت انجام دے۔ اس کی بدیہی مثال انگلستان اور فرانس سے ملتی ہے جہاں حقیقی مرکزِ عالمہ وہ نہیں ہے جسے سیاسی تقدس حاصل ہے۔ انگلستان کے بادشاہ اور فرانس کے صدر کی نہایت درجہ وقعت ہے نہیں سیاست اور لوگوں کی عام زندگی سے بالائز اور اہم تر سمجھا جاتا ہے، وہ کچھ کہتے ہیں یا کہیں جاتے ہیں تو ہر شخص ان کے قول و فعل کو بہت کچھ مرعوب ہو کر سنتا اور دیکھتا ہے لیکن ساتھ ہی ان کو ملک کی عام سیاست اور عام مملکت علی میں بہت کم دخل ہے، اور کام کرنے والے دراصل وزراء ہیں جن کا راستے نام تقریر بادشاہ یا

صدر کے قبضے میں ہوتا ہے لیکن جو دراصل اپنے حدود کے اندر ان سے کہیں زیادہ
نظارہ ہوتے ہیں۔

بادشاہی - یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اس عظیم الشان نظام کا جسے
مجموعی طور پر جماعت عالمہ کہتے ہیں، صدر کون ہونا چاہئے اور اس کا تقرر کس نوع
سے ہونا چاہئے۔ اس کا سب سے آسان اور ایک بڑی حد تک کارآمد اور قدیم
طریقہ تو وہ ہے جس کے تحت یہ صدر بادشاہ ہو اور اسے حکومت کا صدر بننے
کا موروثی حق ہو۔ یہ ایک عجیب اور بہت آموز کیفیت ہے کہ ان ممالک میں بھی
جہاں جمہوریہ قائم ہے، یعنی جہاں موروثی بادشاہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی بلکہ صرف
چند سال کے لئے کسی شہری کو موتی صدر منتخب کر لیا جاتا ہے، وہاں بھی سوائے
اس کے کہ حکمران موروثی نہیں، باقی اسے جملہ صفات شاہی سے مزین کر دیا جاتا ہے
نہ صرف یہ بلکہ جس طرح بادشاہ کہیں خود مختار بھی ہو سکتا ہے اور کہیں دستوری،
اسی طرح کہیں تو در ممالک متحدہ امریکہ کی طرح، اس صدر کو جزاً و کلاً عالمہ اختیارات
حاصل ہوتے ہیں اور کہیں دفراس کی طرح، اس کا مقصد زیادہ تر مختلف عناصر
مملکت کی یک جہتی قائم رکھنا اور نمائندگی ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت
کا ادارہ خواہ اسے بعض مخالف کتنا ہی از کار رفتہ کیوں نہ سمجھیں، اس میں شبہ
نہیں کہ بعض نام کو نظر انداز کر کے اس کے جو مناصب ہیں وہ مملکت کے لئے ہر
ملک میں ضروری سمجھے گئے ہیں۔

بہر حال ملک کی طریقہ جماعت عالمہ کی صدارت باپ سے بیٹے کی طرف
یا سابق سلاطین آل عثمان کی طرح، بزرگ خاندان کی طرف بلا کسی مزید انتخاب

کے تحویل ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ نہایت حیرت خیز معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کا سب سے ممتاز ادارہ غیر مشروط طریقے سے باپ سے بیٹے یا بھائی سے بھائی کی طرف منتقل ہوا اور اعتراض کرنے والے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ اسی طرح لایعنی ہے جیسے کہ طبیب کا بیٹا طبیب اور ہندس کا بیٹا ہندس ہو، اور اس بات کا کون ضامن ہے کہ سابق فرمانروا کے دار میں خود تہی قابلیت ہوگی کہ وہ مملکت کی نانو کو کامیابی کے ساتھ پار لگا سکے گا۔ یہ اعتراض ایک عہد تک بجا ہو، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسانی ادارت میں کچھ نہ کچھ قائم ہونا لازمی ہے اور غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ موروثی صدارت، یعنی بادشاہی میں جو قسم میں آیا اس کے محاسن ان استقام کو دبا سکتے ہیں یا نہیں۔ سب سے پہلے موروثی بادشاہت میں ایک قسم کے تسلسل کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ کسی دوسری قسم کی صدارت میں نہیں پائی جاتی۔ بادشاہ کا ارتحال ہو گیا، زندہ بادشاہ جہ "یا" اگر یا ایک ہی تسلسل میں دونوں باتیں ادا ہو جاتی ہیں اگر کسی قسم کے وقفے یا بدامنی کا خوف نہیں رہتا، خصوصاً ایسے ممالک میں جہاں کلانیت کا قاعدہ بندھا ہوا ہے۔ جہاں بادشاہی کا دار و مدار خود رعایا کی خواہش اور خوشنودی پر ہے وہاں تو یہ ادارہ اور بھی زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک موروثی بادشاہ کا

۱۔ سلطنت تغلق ایسی سلطنت کی مثال ہے جہاں کلانیت کا قاعدہ نہیں تھا، یعنی جہاں سر بادشاہ کے بعد اس کی اولاد میں جھگڑا ہوتا تھا اور جو غالب ہوتا تھا وہی بادشاہ بن جاتا تھا۔
 ۲۔ سلطنت ہمسہ کی بھی تقریباً یہی کیفیت رہی۔
 (بقیہ نوٹ ۳۵ دیکھا جائے)

اس گئے گذرے زمانے میں بھی دوسرے ممالک میں ایک خاص اثر ہوتا ہے اور جب بھی وہ گویا بطور قومی سفیر کے دوسرے ممالک میں سفر کرتا ہے تو خواہ نہ خواہی اس کی زیادہ خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ اندرونی معاملات میں بھی ایک ذہین بادشاہ کو (خواہ اس کے دستوری اختیارات کیسے ہی سلب کیوں نہ کر لئے گئے ہوں) معاملات مملکت اور اوقتی بدلتی دذراتوں کا اتنا تجربہ ہوتا ہے کہ (خواہ وزارت اسے مانے یا نہ مانے) اس کی رائے کو خاص وقعت سے دیکھا جاتا ہے۔

بادشاہی کی تین چیزیں ہیں، ایک تو وہ طریقہ جس کے تحت یہ عہدہ بادشاہ مثنوی کے بڑے افسر کے کہہ سکتا ہے، دوسرے وہ طریقہ جس کے تحت یہ عہدہ مثنوی کے بعد جو سب سے عمر بزرگ کا خاندان ہوا اسے دیا جاتا ہے، تیسرے (جیسا انگلستان کے قدیم اینگلو سیکسن زمانے میں قائم تھا) بادشاہ کے مرنے کے بعد نئے بادشاہ کا انتخاب ہوتا ہے، اور گویا عام طور سے طرابطا ہی تخت پر بیٹھتا ہے لیکن اگر وہ کم عمر یا نادان ہو تو پھر خاندان شاہی میں سے کسی ایک کو تخت نشین کیا جاتا ہے۔ آخر میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بادشاہ کے مرنے پر اس کی اولاد میں جو شخص سب سے زیادہ اپنا جوہر مردانگی دکھائے اور

(بقیہ نمٹ ۱۲۷) یہ واقعہ ناقابل انکار ہے کہ پچھلے جنگ کے بعد انگلستان کی ملکیت بجائے کمزور ہونے کے شائد پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہو گئی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کے اختیارات سب سے کم ہو گئے ہوں۔

جس میں باقی تمام دعو یا رول کو زیر کرنے کی قوت ہو ورنہ تاج شاہی پہننے کا مستحق سمجھا جائے، یہ طریقہ خاندانِ مغلیہ اور خاندانِ ہہمنہ میں مروج تھا۔

شخصی ملکیت - بادشاہت یا ملکیت کو باجست بار اختیارات و حقوق میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی ایک تو مطلق العنان یا شخصی ملکیت اور دوسری آئینی یا دستوری ملکیت، شخصی ملکیت تو ہر ملک میں ایک ہی طرح کی ہوتی ہے یعنی جہاں جہاں یہ رائج ہو وہاں بادشاہ کا جزو کل پر اختیار ہوتا ہے وہی دوزار مقرر کرتا ہے جو اس کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہی قانون بناتا ہے، وہی عادلوں کو مقرر کرتا اور انھیں معزول کرتا ہے، اپنی فوجی مہات سر کرتا ہے، گو یا کہ مملکت اس کی جاگیر ہے اور حکومت کا نظام اسی کے ذاتی احکام سے قائم رہتا ہے۔ ایسا دور تقریباً ہر ملک میں گذرا ہے جب وہاں کی حکومت کم و بیش مطلق العنانی پر مبنی تھی۔ انگلستان میں عہد ہنری فرانس میں عہد بوریوں، جرمنی میں ہونزولرن عہد، غرض مطلق العنانی کی ایک رو تھی جو ایک زمانے میں دنیا کی ملکیتوں پر چھائی ہوئی تھی۔ آج بھی یہ طرز حکومت ناپید نہیں ہے بلکہ آہستہ آہستہ اس کا دوبارہ احیاء ہوا ہے۔

دستوری ملکیت - ملکیت کی دوسری قسم یہ ہے جسے دستوری ملکیت کہتے ہیں۔ اس میں بادشاہ قوم اور حکومت کے نمائندے کی فرض انجام دیتا ہے، لیکن عملی طور پر کاروبار حکومت میں علاوہ صلاح اور رائے فیصلے کے اسے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ وزارت اس کے سامنے نہیں بلکہ قومی مجلس کے سامنے (جو اکثر قائم منتخب شدہ جماعت کی ہوتی ہے) ذمہ دار ہوتی ہے

یہ صورت حال کہیں تو (انگلستان کی طرح) صدیوں کے غیر شعوری دستورى ارتقا کا نتیجہ ہوتی ہے، اور کہیں (بہت سی دوسری بادشاہتوں کی طرح) اس کے اختیارات کی حد بندی کسی خاص دستاویز میں کر دی جاتی ہے جو ملک کے دستور کا منبع و ماخذ ہوتا ہے۔ دستوری بادشاہتوں میں حکمران کی حیثیت زیادہ محض تمکینی ہوتی ہے اور حقیقی صدر عالمہ و زیراعظم ہوتا ہے جو بادشاہ کے بکس حکومت کا کارفرما عنصر ہوتا ہے۔ یہ طرز عمل ایک طرح پر قدیم و جدید سیاسی خیالات کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے، یعنی ایک طرف تو قدیم ملوکى ادارہ قائم رکھا جاتا ہے اور دوسری جانب حکومت کو ایک ایسے شخص پر مرکوز کر دیا جاتا ہے جو جمہوریوں کی طرح عوام میں سے منتخب کیا گیا ہو اور جو قومی مجلس کے سامنے جواب دہ ہو۔

شلہ حق امتناع - تقریباً ہر ملک میں خواہ اس میں عموماً کتنا ہی انوکھوں نہ ہو، صدر عالمہ کو تھوڑا بہت اختیار امتناع کا ہوتا ہے، یعنی جو قوانین کہ جماعت عالمہ منظور کرے اسے نامطلوب کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو یہ اختیار حاصل ہے لیکن شلہ حق سے اس کا استعمال نہیں ہوا اور شاید اب بھی نہ ہو لیکن یہاں چونکہ خود کا بیٹہ وزارت نیابتی مجلس یعنی پارلیمنٹ کی ایک ذیلی مجلس ہوتی ہے اس لئے اس قسم کا دانشی حق نہ ہونے سے کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوتا۔ فرانس میں بھی (غالباً انگلستان کی نقل کے طور پر) صدر جمہوریہ کو حق امتناع حاصل نہیں، گو صدر افسر نو غور کے لئے کسی قانون کو پارلیمنٹ کے سامنے بھیج سکتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اگر صدر کسی سودنے کا امتناع کر دے تو وہ واپس کانگریس کو جا کے گا اور اگر ہیرالڈ انٹیم اکثریت سے (بقیہ حاشیہ ۳۴۶ پر)

جمہوریہ - جمہوریہ اس حکومت کا نام ہے جہاں بادشاہ نہ ہو بلکہ ملک کا انتظام قوتی قومی نائبوں سے متعلق ہو۔ دستوری ملکیت اور اس میں فرق یہ ہے کہ یہاں نمائشی موروثی عنصر کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، ورنہ (جیسا اور بیان کیا جا چکا ہے) آزاد سے آزاد جمہورتوں میں بھی جو شخص ملک کا مرکز سمجھا جاتا ہے اور جسے صدر جمہوریہ کا لقب دیا جاتا ہے وہ کم دیش شاہی اختیار کا حامل ہوتا ہے۔ جمہوریتیں دو شعبوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں، یعنی باعتبار مدت صدارت و باعتبار اختیار مدت صدارت عام طور پر زیادہ سے زیادہ سات برس (جیسے فرانس میں) اور کم سے کم ایک سال (جیسے سوئٹزرلینڈ میں) ہوتی ہے۔ بعض ممالک میں ایک ہی شخص کو کئی مرتبہ صدر منتخب ہو سکتا ہے، بعض میں صرف دو مرتبہ اور بعض میں صرف ایک ہی مرتبہ، چنانچہ جہاں ترکی میں جمہوریہ کے قیام سے لے کر اپنے انتقال تک کمال اتاترک (غازی محمد مصطفیٰ کمال پاشا) مسلسل صدر جمہوریہ رہے، وہاں ممالک متحدہ امریکہ میں راجا کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ صدر نہیں ہو سکتا اور فرانس میں کوئی شخص ایک ہی مرتبہ

(ذبیحہ ثانیہ ص ۳۲۷) اسے منظور کر دے تو پھر وہ خود بخود قانون بن جائے گا۔

۱۹۳۷ء کے قانون حکومت ہند کی دسویں کمیٹی مسودہ کا، جو دونوں ایوانوں میں موکر گزرجا ہے گورنر جنرل خود بھی افسار کر سکتا ہے اور اسے بادشاہ کی مرضی کے لئے محفوظ کر سکتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر بادشاہ کی مرضی ایک سال تک معلوم نہ ہو تو مسودہ نامعلوم سمجھا جائے گا۔

صدارت جمہوریہ منتخب ہو سکتا ہے۔ باعتبار اختیارات، صدارت تین نوع کی ہو سکتی ہے۔ ایک تو اس جمہوریہ کی صدارت ہے جس میں صدر عاملانہ، مقننہ اور عادلانہ تینوں مناصب کا حامل ہو۔ ایسی صدارت کا جسے اصطلاح میں "آمریت" کہتے ہیں، سب سے زبردست مظاہرہ اٹلی، جرمنی اور بعض دوسرے ملکوں میں ہو رہا ہے جہاں مسولینی اور شکلر جملہ اختیارات حکومت پر قابو حاصل ہے اور منسٹری کے اس قول کی صداقت ثابت ہوتی نظر آتی ہے کہ نفرت اختیارات کے فقدان میں حقیقی آزادی بھی معقود ہو جائے گی۔ آمر اعضاء حکومت پر اس قدر قابو یافتہ ہوتا ہے کہ ایک طرف مسولینی نے شاہ اٹلی کو معطل کے طور پر نظر انداز کر دیا ہے، تو دوسری طرف اپنی صدارت کے زبانی میں شکلر نے آزموہ کار اور ہر دلعزیز فون ہنڈنبرگ صدر جمہوریہ جرمنی کو اختیارات کی حد تک بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس سے یقیناً مختلف وہ طرز کار ہے جو غیر اسلام صلح کے بعد کی خلافت راشدہ کے عہد میں کارفرما تھا، اس لئے کہ گو خلیفہ کا ماحین جیتا انتخاب ہوتا تھا، اور گو وہ اپنے زمانے میں جملہ اختیارات حکومت کا مرکز تھا،

۱۹۱۹ء کو فرانس کے دستریں اس قسم کی کوئی تحدید نہیں ہے لیکن ۱۹۳۹ء تک یہ گویا دستوری بھوتہ تھا کہ کوئی شخص ایک مرتبہ سے زیادہ صدر منتخب نہ ہو سکے۔ لیکن فرانسیسی پارلی کو شکم کرنے کی غرض سے ۱۹۴۰ء میں فرانس کے صدر بیریول دوسری مرتبہ سات سال کے لئے صدر منتخب ہوئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اب صدر جمہوریہ نے علی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔

لیکن اسے اس الوی قانون کے سامنے سرخم کرنا پڑا تھا جسے عملی طور پر قرآن مجید کہتے ہیں۔ آج کل کے زمانے کی عمومی ملکیتوں میں سب سے زیادہ ذی اختیار امریکہ کی متحد ریاستوں کا صدر ہے جسے اپنی جماعت عالمہ پر پورا قابو حاصل ہے، جو عالمانہ امور میں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں اور قانون سازی کے معاملات میں اپنے ”عدالتی پیامات“ کے ذریعے سے قومی مجلس یعنی ”کنگریس“ پر انڈالنا ہے، جسے جملہ قوانین پر ایک محدود حق انتفاع حاصل ہے، اور مجلس سنیات سے مل کر نہ صرف سفرا بلکہ وفاقی عدالت (الحالیہ کے عداوں کا بھی تفرک کرنا ہے) ”میسری نوع“ ”دستوری“ یا ”آئینی“ صدور کی ہے جس کی بددی مشال فرانس میں ملتی ہے۔ فرانس کا صدر جمہوریہ انگلستان کے آئینی بادشاہ کی طرح وزارت کے سامنے بالکل بے دست و پا ہے اور ایک زبردست وزارت کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ ایک عجیب و غریب حقیقت ہے کہ فرانس میں لوگوں کا سامنے جیسے حوصلہ مند مدبر کے لئے صدارت جمہوریت کا کافی علو نہیں نظر آتا، اور وہ ساٹھ سال تک اس بظاہر بڑے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد بھی ایک نئے صدر جمہور کے ماتحت وزیر اعظم بننے پر تیار ہوتا ہے۔

صدر کا انتخاب۔ ظاہر ہے کہ صدر جمہور عوام ہی میں سے منتخب ہو گا اور اگر یا تو عوام منتخب کریں گے ورنہ جماعت مقننہ اور انھیں ممالک میں ایک مجلس نیابتی مجلس کے سپرد صدر کا انتخاب کر دیا جاتا ہے۔ سب سے زبردست صدارت وہ ہوتی ہے جسے عوام الناس براہ راست منتخب کریں یا عوام الناس کی کوئی مجلس نیابتی مجلس منتخب کرے۔ آج کل کے فرنی سیاسیات میں ہر ایک شخص پر

فرقی رنگ اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ دوسری صورت میں نیا تہی مجلس خود دریا
زیادہ فریقوں کی مصنفہ شکل بن جاتی اور مجلس کے انتخاب کے فوراً بعد یہ مسلم
ہو جاتا ہے کہ وہ کس فریق کے امیدوار کو منتخب کرے گی۔ یہ کیفیت صدر جمہوریہ
امریکہ کے انتخاب میں خاص طور پر پائی جاتی ہے جہاں عین انتخاب سے ہفتوں
پہلے محض مجلس انتخاب کی ترکیب ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ کس فریق کا کون
شخص آخر صدر منتخب ہوگا۔ بہر حال انتخاب صدر اس طرح سے برائے نام بالواسطہ
یا ذاتیابراہ راست ہو رہے ہیں جیسے ۱۸۷۵ء کے انقلاب کے بعد ۱۸۷۵ء میں فرانس
میں ہوا (دونوں صورتوں میں صدر جمہوریہ کے انتخاب کنندے دی ہوئے ہیں جو عادت
مقننہ کے ہوتے ہیں، اور یہ کہ اس پر عاملانہ اقتدار یعنی فورج پولیس کے قابو کا
اضمانہ ہوتا ہے اس لئے عاملانہ اقتدار کا پڑا بھاری ہو جاتا ہے، چنانچہ تمام
امور پر نہیں تو کم از کم عاملانہ اقتدار کی حد تک وہ جماعت مقننہ سے بے نیاز
ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں فرانس کی طرح صدر جمہوریہ جماعت مقننہ کا نامزد
کر دے ہوتا ہے وہاں اسے بہت کم اختیارات ہوتے ہیں اور واقعی اختیار اس کا

ملاہ ملک متحدہ امریکہ کے صدر کا واقعی انتخاب، جنوری کو ہوتا ہے لیکن چونکہ منتخب کنندگان کے
انتخاب کا نتیجہ نومبر میں نکلتا ہے اس لیے اور منتخب کنندگان کی بابت یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس
فریق کی اکثریت سے منتخب ہوئے ہیں اس لئے جس صدر کے واقعی انتخاب میں کئی ہفتے
باقی ہوتے ہیں اسے پہلے ہی سے مبارکبادیں دیا جاتی شروع ہو جاتی ہے اور وہ خانگی
طور پر امریکہ کے معاملات عام میں ایک طرح کا حصہ لینا شروع کر دیتا ہے۔

منع جماعت مقننہ ہی ہوتی ہے۔

وزارت۔ اب وزارت کی طرف آئیے۔ تاریخ عالم میں وزیر کی حیثیت بہت بڑی ہے، چنانچہ مشرق میں وزیر ہمیشہ بادشاہ کا نفسِ ناطق سمجھا جاتا تھا اس لئے کہ وزیر ہی تو تھا جو نیم پوشیدہ بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان آتا تھا اور اپنی مدد سے نصیحتوں کے ذریعے سے بادشاہ کے کام کو لٹکا کرتا تھا۔ تاریخی زمانے میں ہندوؤں میں منتری گویا راجہ کے تخت کا پشتیبان سمجھا جاتا تھا اور اسلامی خلافت کے زمانے میں ”وزیر نفوذیض“ اور خلیفہ وقت میں صرف میراث ہی کا فرق رہ جاتا تھا۔ آج کل کے زمانے میں باعتبار ذمہ داری، مناصب و فرائض و وزارت تین قسم کی ہوتی ہے، ایک کو پارلیمنٹری دوسری کو صدارتی اور تیسری کو آمری کہتے ہیں۔ پارلیمنٹری وزارت اسے سمجھنا چاہئے جو پارلیمنٹ کے سامنے اپنے افعال کے لئے ذمہ دار ہو، صدارتی وہ جو بادشاہ یا صدر جمہور کے سامنے ذمہ دار ہو اور آمری وہ جو دراصل کسی کے سامنے ذمہ دار نہ ہو بلکہ برائے نام بادشاہ یا عوام کے سامنے ذمہ دار سمجھی جائے۔

پارلیمنٹری کا پس منہ۔ سب سے پہلے پارلیمنٹری طرز کی وزارت کو لیجئے جو خاص طور پر انگلستان کے دستوری ارتقا کا نتیجہ ہے اور جس کا چرچہ انیسویں صدی میں تقریباً تمام یورپی ممالک میں اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کا سب سے ممتاز

نمونہ دیکھ کر لیا: ارٹھ شاہنشاہ

نمونہ دیکھ کر لیا: الاحکام السلطانیہ (ترجمہ اردو جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن) باب ۱۱۔

خاصہ یہ ہے کہ وزیر اعظم اور دیگر وزرا اس ذریعہ کے سرگرم ہوتے ہیں جن کی دارالعلوم میں اکثریت ہو۔ انگلستان کی دستوری تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صورت بالکل زمانہ حال کی پیداوار ہے ورنہ اٹھارہویں صدی تک وزراء بادشاہ کے ذاتی ملازم سمجھے جاتے تھے اور بعض مرتبہ وہ دارالعوام سے مخالفانہ برتاؤ بھی کرنے لگتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ جس قسم کے قوانین کی بادشاہ کو ضرورت ہوتی تھی اس قسم کے قوانین نہیں بنتے تھے، اور اس خرابی کو رفع کرنے ہی کی غرض سے چارٹر آئل کے وزیر اعظم سر رابرٹ والپول نے ان کے دارالعوام کو ریشوت کے ذریعے سے سموار کرنا چاہا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جو سیاسی ذریعہ دارالعوام میں برسرِ اقتدار ہوتا ہے، اس کے سرگرمہ کو بادشاہ کی طرف سے وزیر اعظم مقرر کیا جاتا ہے اور وہ اپنے ممتاز رفقاء کو دوسرے عہدے تفویض کر دیتا ہے۔

پارلیمنٹ عالمہ کے خدائیں یہ ہیں کہ گورنر سے طور پر جماعت مقننہ کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے، ایک طرف تو وہ نیابتی ایوان کی گواہ ایک ذیلی جماعت ہوتی ہے اور دوسری جانب دکن انگلستان اور دوسرے ممالک میں اسے شدید اختلاف کی صورت میں نیابتی ایوان کو برخاست کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ گو یا کہ قانون سازی اور عدالت اختیار دو ذیلوں میں باہمی تعامل شرط اول ہے، اگر یہ شرط کسی وجہ سے پوری نہ ہو تو یا تو وزارت کی تبدیلی عمل میں آئے گی، اور اگر وزارت کو فلک کی تائید پر اعتماد ہو تو پھر نیابتی ایوان بدل دیا جائے گا۔ دوسری خصوصیت اس طرح کی وزیر کی کئی ایک جماعتی ہے، یعنی جہاں تک عام حکمت عملی کا

تعلق ہے وزیراعظم اور جگہ وزرا کو ہم آواز ہونا چاہئے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کا بینہ
 ایک فریقی جماعت ہوئی تو اس فریق کی مجموعی آواز ہی کا بینہ کی مجموعی آواز ہوگی، اور
 وزیراعظم کو احوالہ دوسرے وزرا کے ساتھ ہم آہنگی برتنی پڑے گی ورنہ مستغنی ہونا
 پڑے گا۔ نیز ایسے ممالک (جیسے فرانس) میں، جہاں بجائے دو بڑے سیاسی
 فریقیں کے، نہایت ہی ایوان میں دس دس بارہ بارہ فریق ہوتے ہیں، وزیراعظم کی
 سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مختلف النوع گروہوں کو کسی مشترک
 لائحہ عمل میں متحد رکھا جائے، چنانچہ جب کسی حکمت عملی پر اس مملوہ وزارت کا
 کوئی رکن اور اس کے ساتھ اس رکن کا سیاسی گروہ کا بینہ کی رائے سے مخرب
 ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے دارالنائین میں مخالف کا باطلہ الجھک جاتا ہے
 تو کا بینہ کو خواہی خواہی استعفا دینا پڑتا ہے۔ تیسری اہم خصوصیت اس پارٹیی
 کا بینہ کی یہ ہے کہ حکومت کا روزمرہ کام مستقل حال کے قبضے میں ہوتا ہے جو اپنے
 اپنے محکموں کے کام میں گویا ماہر ہوتے ہیں اور وزرا کے زیر ہدایت کام کرتے
 ہیں، لیکن خود وزرا محض شوقین سیاست باز ہوتے ہیں اور عمدہ وزارت قبول کرنے
 سے پہلے وہ اپنے محکمے کے کاروبار سے اکثر بیگانہ ہوتے ہیں۔ لہذا ہر اس
 سے تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اس بیگانگی کے کام برابر چلتا رہتا ہے، لیکن اس
 کی وجہ بس یہی ہے کہ پارلیمنٹی کا بینہ کسی امر کی تفصیل پر زیادہ توجہ نہیں کرتی بلکہ اس
 کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے سیاسی گروہ کے اصول کو پیش نظر رکھ کر قانون
 سازی کرے اور اس مخصوص طرز کے اصول کو مستقل عہدہ داروں کے سامنے
 رکھ دے۔ آخری قابل لحاظ خصوصیت اس طرز کی یہ ہے کہ اس کے تحت وزرا

خود اراکین پارلیمنٹ ہوتے ہیں اور نہ صرف عاملانہ امور کی نگرانی کرتے ہیں بلکہ انہی کی رائے اور صلاح سے قانون سازی بھی ہوتی ہے، اور چونکہ سائبان کا مینہ کے بھی اکثر ارکان رکن ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک قانون کی پورے طور پر چھان بین ہوتی رہتی ہے۔ آخری خصوصیت یہ ہے کہ یہ پارلیمنٹی وزارت (جیسا کہ خود اس کے نام سے ظاہر ہے) اپنے جملہ افعال کے لئے خود نیا تہی ایوان کے سامنے ذمہ دار ہوتی ہے، چنانچہ اگر کسی اہم مسئلے پر نیا تہی ایوان اس کے خلاف رائے دیدے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ فرانس میں تو یہ قاعدہ برتا جاتا ہے کہ اگر کسی وزیر سے کوئی معمولی سے معمولی سوال کیا جائے اور اس سوال پر ردِ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے (مباحثہ شروع ہو جائے اور اس مباحثہ کے درمیان میں اکثریت کاٹنے کے خلاف ہو جائے تو کا مینہ کو یا کم از کم اس خاص وزیر کو فوراً مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اس عمل کو اصطلاح میں وضاحت طلبی کہتے ہیں۔

صدارتی کا مینہ :- صدارتی کا مینہ اس وزارت کو کہتے ہیں جو صرف صدر یعنی بادشاہ یا صدر جمہور کے سامنے ذمہ دار ہو۔ اصل میں ان تمام ممالک میں جہاں لوکیت کا رواج تھا، وزیر بادشاہ کے ملازم، اس کے مشیر کار اور اپنے افعال کے لئے صرف اسی کے سامنے ذمہ دار ہوتے تھے، اور اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے

۱۵ پارلیمنٹی حکومت کے حسن درجے کے لئے دیکھو بجاک : "مادی سیاست"

Sidgwick: Element of Politics. باب ۲۱۔

لاٹکی "صرف و نحو سیاست" The Government of Laotki: باب ۶۔

کہ بیٹرز پارلیمنٹی کا بنیہ سے قدیم اور اس سے زیادہ تاریخی ہے۔ بادشاہ اور وزیر کی ہم آہنگی سے پرانے قصے اور تاریخیں بھری پڑی ہیں، درآنحالیکہ پارلیمنٹی کا بنیہ کو زیادہ تر انیسویں صدی عیسوی کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔ جمہوریہ ممالک متحدہ امریکہ اور انقلاب فرانس کی کامیابی کے زمانے میں مونٹسکیو کے خیالات کا بول بالا تھا۔ اور اس کے نظریہ تفریق اختیارات کو تمام سیاسی امراض کا گویا واحد علاج سمجھا جاتا تھا، چنانچہ (باوجودیکہ یہ جمہور تئیں ملکیت کے سخت خلاف تھیں تاہم) ان میں تفریق اختیارات کے اصول کے بد نظریہ صدر جمہور اور جماعت عالمہ کو جماعت مقننہ سے ہمارے کھنے کے لئے دڑا رکھے گا بنیہ کو صدر جمہوریہ کے سامنے ذمہ دار قرار دیا گیا۔ امتداد زمانہ سے فرانس کا جمہوریہ بہت سے چولے بدلنے کے بعد اب ۱۸۷۵ء سے پارلیمنٹی جمہوریہ بن گیا ہے، لیکن ممالک متحدہ امریکہ اور اس کی نقل سطلی اور جنوبی امریکہ کی جمہوریتوں میں اراکین کا بنیہ کا تقریر صدر جمہور (ممالک متحدہ امریکہ بعض دوسری ملکوں میں مجلس سینیٹ کی منظوری کے بعد) خود کرتا ہے اور جبہ دڑا اسی کے سامنے ذمہ دار ہوتے ہیں، وہی ان سے جواب طلب کر سکتا ہے اور چاہے تو وہی انھیں برخواست کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں پارلیمنٹی کا بنیہ کے ہر ایک رکن کو اپنے افعال کی تنقید کا خوف لگا رہتا ہے،

لئے انقلابی و سائبر فرانس کے لئے دیکھو مونٹز اسٹینز، انقلابی یورپ
Monse Stephano: Revolutionary Europe. ترجمہ جادو غمانیہ حیدر آباد دکن۔ نیز دیکھو باب ۱۲، بالا۔
 علی شلا ارضان۔

دراں صدارتی کا مینہ کے ارکان عوام سے گویا پس پردہ رہتے ہیں، اور گو انھیں بعض جگہ حق رہتا ہے کہ وہ دارالناہین میں جا کر تقریر کریں، لیکن علی العموم انھیں دواں مسلسل نشست کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ وہ تقسیم آراء کے وقت رائے ہی دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صدارتی کا مینوں میں جو کچھ تعلق دارالناہین سے ہوتا ہے وہ زیادہ تر سیاسی فریق بندی کے ذریعے سے ہوتا ہے، اور اگر سیاسی فریق بندی نہ ہو تو پھر دشواریاں بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ صدارتی طرز کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ان کے طرز کے بموجب وزراء نہایت یکسوئی سے ایک مرکز یعنی صدر جمہور کی ہدایات کے مطابق قوانین کا بہترین طریقے سے نفاذ کرتے ہیں اور پارلیمنٹی عالمہ کی طرح قانون سازی اور بلے کا رواج میں نہیں پڑتے، اور محض اپنی تقریر بازی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی حکومتی قابلیت اور تجربہ کی وجہ سے مفرد ہوتے ہیں۔

آمری کا مینہ۔ عالمہ کی تیسری شکل، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، امری عالمہ ہے۔ انیسویں صدی میں (جو سیاسی اور دستوری اعتبارات سے گویا جنگ عظیم ختم ہوتی ہے) پارلیمنٹی طرز کی حکومت کو ہر سیاسی مرض کے لئے زیادتی تصور کر لیا گیا تھا، لیکن اس خیال کو جنگ عظیم میں بڑا زبردست دھکا لگا، اور دنیا کا بڑا حصہ ایک طرف تو اشتالی بولشویت پسند ممالک اور دوسری جانب آمریت پسند ممالک کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ آٹلی اور جرمنی کے بعد اب دوسرے یورپی ممالک نے امری چولہہ پہن لیا ہے اور آمری اصولی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے تیاریاں، اور ایسے ملک بھی جو نظام اس اصول سے بعید سمجھے جاتے تھے جیسے

انگلستان، فرانس، ممالک متحدہ امریکہ، وہاں بھی ایک فرق ملک میں آمریت کو رائج کرنا چاہتا ہے۔ جیسا اور بیان کیا جا چکا ہے آمریت والے ملکوں میں نیابتی مجلس کے اختیارات آمر اور اس کی تاہم ذکر وہ جماعت عالمہ سلب کر لیتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ذمہ داری کا اصول باقی نہیں رہتا۔ فوج کو آمر اپنی بنا لیتا ہے، اور گو آج کل کے زمانے میں اس کا مقصد ملک کی فلاح و بہبود ہوتا ہے، لیکن کم از کم فی الفور تو وہ سب سے مطلق العنان بادشاہ سے بھی زیادہ مطلق العنان معلوم ہوتا ہے، بلکہ داخلی کی طرح، اصلی بادشاہ اور (سٹورٹ) کی جگہ کی طرح، صدر جمہوریہ کی حیثیت بالکل ثانوی ہو جاتی ہے۔ آمری کا بنیہ اور پارلیمنٹی و صدارتی کا بنیوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ آمری کا بنیہ نہ صرف عاملانہ بلکہ مقننہ اور بعض مرتبہ عادلانہ اختیارات کا بھی حامل ہو جاتا ہے۔

مفرد و مرکب عالمہ۔ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ دوسرے سیاسی ادارات کی طرح حکومت کی ساخت کا تعین بھی محض مصنوعی طرز پر، جیسا جی چاہے نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ زیادہ تر ملک کے سیاسی حالات اور تاریخی اسباب کی وجہ سے

شعہ جہتی کی برسر اقتدار جماعت ناسی کے سرگروہ بننے، جو پہلے وزیر عظم اور فون ہینڈن برگ کے انتقال پر رہنے کے جراتیہ بن گیا، جو ۱۹۱۲ء میں اپنے مخالفوں کو بغیر کسی قسم کے مقدمے کے گولی کا نشانہ بنا دیا، شریک کے الحاق کے بعد ۱۹۱۰ء میں ۱۹۱۲ء کو جرمنی میں نئے ماتحت شاہ کا جو "انتخاب" ہوا تھا اس میں "دارد ہندوں" کے سامنے ہٹلر کی بنائی ہوئی اراکین کی فہرست پیش کی گئی تھی اور "دارد ہندوں" سے صرف "ہاں" یا "نہیں" کا استفسار کیا گیا تھا۔

ہوتا ہے، ظاہری تشکیل کچھ بھی کیوں نہ ہو، یہ امر خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ حکومت ایک وحدت ہے اور اس کے ارکان میں مکمل یگانگت لازمی ہے، اس لئے کہ اس کے اجزاء کے درمیان ایک ہی عضویت کے اجزاء ہونے کی وجہ سے باہمی ربط و تعلق لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں جماعت عالمہ کا مرکز ایک واحد شخصیت ہوتی ہے، خواہ وہ وزیر اعظم ہو یا صدر جمہوریہ یا بادشاہ، اور اسی کے سامنے جملہ وزرا جواب دہ ہوتے ہیں، چنانچہ ایسے ملکوں میں جہاں پارلیمانی حکومت قائم ہے وہاں اگر کوئی وزیر وزیر اعظم سے کسی اہم معاملے میں اختلاف رکھتا ہو تو یا تو اسے کاہنہ سے الگ ہو جانا پڑے گا، ورنہ اگر وہ کاہنہ کے زیادہ تر ارکان کو (جو دراصل ایوان عام کے قائم مقام ہوتے ہیں) ایوان عام کی اکثریت کے خلاف اپنا ہم رائے بنائے تو وزیر اعظم اور تمام کاہنہ کو مستعفی ہونا پڑے گا۔ گویا عالمی علوم جماعت عالمہ ایک مرکز کے تابع ہوتی ہے اور مرکز سے ہٹ جانے کی صورت میں یا تو اسے مرکز کا مطیع ہونا پڑتا ہے ورنہ اس کا مرکز جدا گانہ بن جاتا ہے۔ چونکہ یہ بمنزلہ ایک فرد کے ہوتی ہے اس لئے اسے اصطلاح میں مفرد عالمہ کہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسی عالمانہ جماعتیں بھی ملتی ہیں جو بظاہر مرکب ہوتی ہیں، یعنی جن میں ذمہ داری اجتماعی نہیں ہوتی بلکہ ہر وزیر افراد کسی جماعت کے سامنے ذمہ دار ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ جس میں اقتدار حکومت کی حیثیت، اجتماعی نہیں ہوتی بلکہ اس کا ایک ایک جزو ہر وزیر کے سپرد ہوتا ہے۔ ایسی عالمہ کو مرکب عالمہ کہتے ہیں۔ اصولی اعتبار سے یہ طریقہ پسندیدہ نہیں اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے حکومت کی فطری وحدت کو خدوہ پیچنے کا اندیشہ ہے، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو آج کل

کے زمانے میں شاید سوائے سوئیٹان یا امریکہ کی اجڑائی رہائشوں کے باقی شکل سے کوئی مملکت ایسی ہوگی جہاں اس پریل در آمد ہو تا ہو اور ان ممالک میں بھی دراصل علامہ اقتدار نیابتی جماعت میں مرکوز ہوتا ہے، یعنی ہر وزیر راہ راست اس کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ضرور اسپارٹا، ایتھنز و روم میں علامہ اقتدار مرکب ہوتا تھا، چنانچہ اسپارٹا میں دو بادشاہ، ایتھنز میں نو "آرخن" اور روم میں دو فیصلوں کا ذکر پڑھنے میں آتا ہے، لیکن یا تو یہ مرکب ادارہ جان بوجھ کر علامہ اقتدار کم کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا تھا (جیسے روم میں) یا اس طرح سے غیر شعوری طور پر یہ اقتدار رفتہ رفتہ کم ہو گیا (جیسے اسپارٹا اور ایتھنز میں) اور ان عہدہ داروں کی جگہ دوسرے عہدہ داروں نے لے لی۔

ترکیب وزارت جہاں تک دوزار کی تعداد اور ان کے درمیان تقسیم کار کا تعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ممالک میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ اصولاً تو وزارت کو دو بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، یعنی وہ شعبہ جس کا تعلق ممالک غیر سے ہو اور وہ جس کا تعلق اندرونی انتظام سے ہو، ان میں ایک تیسرے شعبہ یعنی شعبہ قانون و عدالت بڑھایا جاسکتا ہے۔ لیکن حکومت کا کام اس درجہ بڑھ گیا اور پیچیدہ ہو گیا ہے اور اس کا علی حلقہ اقتدار اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ دفنی معاملات کے لئے بھی متعدد وزارتیں بنانی پڑی ہیں، جیسے تعلیم، حفظان صحت، مقامی ادارات کی نگرانی، تجارت صنعت و حرفت، ریل و رسائل، فوج، بیڑا، ہوائی جہازیں، اور حال میں بعض دوسرے شعبہ جات بھی کھل گئے ہیں جن کا مقصد عوام الناس کی بہبودی ہے، جیسے مزدوری اور رفاہ عام۔ اس کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ملک میں

بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے صلاح و مشورے سے وزارت مستفید ہونا چاہتی ہے لیکن جو بوجہ اپنے بڑھاپے یا کسی دوسرے سبب کے تلمذ ان وزارت نہیں سنبھال سکتے۔ دوسرے آج کل کے زمانے میں جب سیاسی فزین بندی کا نیا بتی اپان ہی میں نہیں بلکہ کا بینہ پر بھی عظیم نشان اثر پڑتا ہے اور بعض مرتبہ کا بینہ کی زندگی ہی کا فرضی تنظیم پر دار و مدار ہوتا ہے، ایسے لوگوں کو وزارت میں جگہ دینی پڑتی ہے جن کے سپرد کوئی ملکی کام نہ ہو بلکہ جو مقتدر سیاسی فزین کو منظم و مستحکم رکھیں۔ ایسے وزراء کو وزراء کے بالاعمدان کہتے ہیں۔

گو یہ امر بادی النظر میں بالکل صاف معلوم ہوتا ہے کہ جماعت عالمہ کے فرائض عالمانہ ہونے چاہئیں، یعنی اس کا کام صرف یہ ہونا چاہئے کہ جو قوانین مقننہ نے منظور کر لئے ہوں یا جو قوانین قابل نفاذ ہوں انہیں اپنے اثر و ثروت کے ذریعے سے نافذ کرے، لیکن یہ اصول ہر حالت میں صادق نہیں ہوتا بلکہ بہت سے ممالک میں عالمہ کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف مقننہ کو اپنا تابع کرے بلکہ عدلیہ پر بھی اپنا اثر ڈالتی رہے، خصوصاً ایسے ممالک میں جن سے اسے خاص طور پر دلچسپی ہو۔ تاریخ میں بار بار پڑھنے میں آتا ہے کہ مطلق العنان بادشاہ محض فراہمن کے ذریعے سے حکومت کرتے ہیں، اور گو وہ خود کسی عظیم نشان سلسلہ قانونی

۱۹۱۹ء کیفیت انجمن تان کے "صدر پریوی کونسل" اور "لارڈ پریوی سیل" دشما ہی ہر ہر دار، کی ہے جن کے سپرد تفسیر یا کوئی کام نہیں سوائے اس کے کہ وزارتی سیاسی فزین کو یکجا منظم رکھیں۔

جیسے دھرم فاسٹر، شرع اسلامی، انجیلی اصول، یا رواج کے ماتحت ہوتے ہیں لیکن ان فرامین میں بہت مرتبہ ان بالاتر اصول کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے، اور گویا کوشش کی جاتی ہے کہ باضابطہ قوانین کی جگہ فرامین لے لیں۔ انگلستان جیسے آزادی پسند ملک میں خود جماعت مقننہ یعنی پارلیمنٹ نے ۱۷۰۱ء میں ایک عجیب و غریب قانون منظور کیا جس کی رو سے قانون سازی کے اکثر اختیارات بادشاہ کے حوالہ کر دئے گئے، اور تا وقتیکہ یہ منسوخ نہ ہوا قانون سازی کا یہ طریقہ برابر قائم رہا۔ باوجود سیاسی خیالات میں اس قدر ترقی ہو جانے کے آج بھی یورپی ممالک تک میں وہاں کے نیابتی مجالس اس قسم کے خود کش قوانین منظور کرتی رہتی ہیں جن میں سب سے زیادہ ممتاز مثالیں آٹلی اور جرمنی کی ہیں جہاں کے پارلیمنٹوں نے اپنے وسیع اختیارات میں سے تقریباً سب کے سب باضابطہ طور پر اصرار مطلق کے حوالہ کر دئے ہیں۔ اسی طرح جماعت عالمہ کی یہ کوشش

۱۷۰۱ء قانون ۱۷۰۱ء سے ۱۷۰۱ء تک نافذ رہا۔ ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فرامین صرف اس وقت قابل نفاذ قرار دئے جاتے جب مجلس فرامین کی اکثریت ان کے موافق ہوتی اور جب وہ کسی کی "میراث" "عہدہ"، "آزادی"، مال منقولہ وغیرہ منقولہ یا موجودہ قوانین کے منافی نہ ہوتے۔ دیکھیں دیل لینگ میڈ، "تاریخ دستور انگلستان"۔ Langmead: English Constitutional History, باب ۱۰۔

۱۷۰۱ء میں ۱۷۰۱ء میں اور آٹلی میں ۱۷۰۱ء میں پارلیمنٹ اپنے تمام اختیارات سے دست بردار ہو گئی، اور جرمنی میں محض کاہنہ نے اور آٹلی میں دہشتی مجلس عظمیٰ نے ایک حد تک اس کی جگہ لے لی۔

بھی رہتی ہے کہ محکمہ عدلیہ پر اثر ڈالے، گو صدیوں کی کشمکش کے بعد محکمہ عدلیہ ذاتی مقدمات کی حد تک ضرور اس دست برد سے آزاد ہو گیا ہے اور اکثر ممالک میں عادلوں کو عمر بھر کے لئے عادل رہنے کی ایک طرح پر ضمانت سی ہو گئی ہے لیکن آج بھی یہ امر شبہ ہے کہ اگر کوئی منظمہ ایسا ہو جس میں عالمہ کو براہ راست چسپی ہو تو وہ مقدمہ واقفان قانونی اصول پر طے ہو گا یا نہیں۔

مجالس متعلقہ کا بیٹہ۔ بعض ممالک میں یا تو وزارتوں کے متعلق مجالس بھی ہوتی ہیں جو عالمہ کی صلاح کار ہوتی ہیں ورنہ انھیں خود بھی عاملانہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز مجالس وہ ہیں جو تاجیکی یا آئینی امتبار سے خود دستور کا جز ہیں جیسے انگلستان میں پریوی کونسل، ممالک متحدہ امریکہ میں مجلس سیناٹ اور فرانس میں مجلس مملکت۔ جہاں تک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے انگریزی پریوی کونسل کے اختیارات اب بمنزلہ محدود کم کے ہیں اور اس کی جگہ مجلس کا بیٹہ نے لے لی ہے۔ لیکن ممالک متحدہ امریکہ کی مجلس سیناٹ کو نہایت اہم سیاسی حقوق اس وقت بھی حاصل ہیں

۱۹۲۱ء اس کا ایک چھپ چھپا نظارہ اتنی جرتی کے مشعلہ کے ایک کامیابی قانون کے ذریعے سے ہوا ہے۔ جس کے بموجب اگر عادل محسوس کر لے کہ موجودہ قانون کا مقدمہ زیر بحث پر منطبق کرنے سے ملک کو کوئی نقصان ہو گا تو اس قانون کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ذاتی صلاحیت پر عمل کر سکتا ہے۔ ”سانامہ دہرین“ ۱۹۲۳ء، صفحہ ۹۶۔

۱۹۲۴ء دیکھو ”دیس“ حسب بالا جلد ۲، حصہ اول، باب ۲۔

چنانچہ یہ کسی عہد نامے کو منظور کر سکتی ہے اور اسے بڑے بڑے عہدہ داروں کے عہدوں کے نام منظور کر لے کا اختیار ہے۔ فرانس کی مجلسِ مملکت کے اراکین کو صدر جمہوریہ فرانس نامزد کرتا ہے اور یہ چار ذیلی مجلس میں منقسم ہو جاتے ہیں اور ہر ذیلی مجلس ایک ایک شعبہ حکومت کے متعلق کر دی جاتی ہے۔ یہ تو دستوری مجلس ہوئیں، ان کے علاوہ بھی بعض شعبہ جات کے متعلق صلاح کار جماعتیں ہوتی ہیں، جیسے وزارتِ بحریہ اور وزارتِ فوج کے متعلق مبصرانہ ذیلی جماعتیں یا توابع کے بابت ذیلی مجالس۔ ان میں سے بعض مجالس کے امتداد زمانے سے فنا ہو جانے کے باوجود دستوری ان کا ذکر باقی رہتا ہے، جیسے انگلستان میں ایک وزیر "صدر مجلس تجارت" کہلاتا ہے حالانکہ مجلس تجارت کا صرف نام ہی نام باقی ہے، اور یہی کیفیت انگلستان کی مجلس تعلیمات کی بھی ہے۔

سول سروس۔ اب علامہ اقتدار کی ایک نہایت اہم شق بیسی سول سروس کا ذکر باقی ہے۔ ہم وزراء کا ذکر سنتے ہیں، بادشاہ کا ختم و خدمت دیکھتے ہیں، پولیس کو برتتے ہیں لیکن وہ لوگ جو دراصل حکومت کی گریباں کانی ہیں، جو بس پردہ حکومت کا دائمی کاروبار انجام دیتے ہیں، ان سے ہمیں نسبتاً کم سروکار ہوتا ہے۔ سول سروس دراصل ان منخواہ یا ب عہدہ داروں کا

۱۷۷ ذیلی مجلس کا بیان ملگر سٹ: "اصول علم سیاسیات" Gilchrist :
 Elements of Political Science. باب میں کیا گیا ہوا ہے

نام ہے جو ابتدا میں خواہ انتخاب کے ذریعے سے یا امتحان کے ذریعے سے حکومت کے مگر بن جاتے ہیں اور جو اس کے انتظامی صیغوں کی ترتیب و تہذیب میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسے مالک میں، جہاں پارلیمنٹی حکومت کا طریقہ رائج ہے، یعنی جہاں وزرا دراصل اپنی تقریر بازی اور فرنی بھیری کی وجہ سے وزیر مقرر ہوتے ہیں، دلوں پر مکی خدمت نہایت درجہ اہم ہوتی ہے اس لئے کہ گوتھام طرز عمل کا تعین کا مینہ ہی کرتا ہے لیکن اسے چلانے کا فرض خاص طور پر ان مستقل عہدہ داروں کے سر رہتا ہے۔

مکی خدمات پر تقرر کے لئے کئی طریقے ممکن ہیں۔ پہلا اور بادی النظر میں آسان ترین طریقہ تقرر کا ہے، یعنی کوئی حاکم مناسب امیدواروں میں سے کسی کا تقرر کر دے۔ لیکن تجربے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول تو اس سوال کا جواب مشکل ہے کہ کون سی شخصیت ایسی ہونی چاہئے جو بلا درودر رعایت اچھے سے اچھے امیدوار کا تقرر کر سکے گی۔ پھر آج کل کے زمانے میں جب ملک میں اس قدر غربت و افلاس ہے اور کساد بازاری کے سبب سے اس درجہ بے روزگاری ہے، یہ ناممکن ہے کہ تقرر کرنے والے عہدہ دار کے پاس ایسے لوگ طرح طرح کی سفارشیں نہ پہنچائیں جنہیں محض اپنی قابلیت کی بنا پر تقرر کی امید نہیں ہے یا عہدہ دار ان بالادست اپنے دوستوں اور عزیزوں کو برسر کار لانے کی کوشش نہ کریں۔ دوسرا طریقہ امتحان کے ذریعے سے مختلف عہدے پر کرنے کا ہے لیکن محض امتحان سے انسان کی تربیت اور چال چلن کا پتہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر خدمت ملی کا تقررات کے لئے بہترین طریقہ ایک مستقل

مامور یہ مقرر کرنے کا ہے ؛ اس میں عام طور سے کم از کم تین ارکان ہوتے ہیں جن میں معتد بہ تنخواہ ملتی ہے ، اور یہ مامور یہ تقرر اور امتحان دونوں طریقوں کو یکجا کر کے مختلف عہدوں کو پُر کرتا ہے ۔ ان دونوں طریقوں کو یا تو اس طرح یکجا کیا جاسکتا ہے کہ پہلے امیدواروں کی سرکاری طور پر نامزدگی ہو جائے یعنی جو امیدوار ایک خاص معیار پر نہ اُترتے ہوں انہیں سرسری طور پر خارج کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کا امتحان لے لیا جائے اور اس میں انہی کو اولیت حاصل ہو جو امتحان میں بہترین طور پر کامیاب ہوں ۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے مقابلتی امتحان لے لیا جائے اور جو لوگ اس میں کامیاب ہوں ان میں سے جن کو بلحاظ تربیت و قابلیت کا تقرر کر دیا جائے ۔ لیکن دوسری شکل میں خوف اس بات کا ہے کہ خارج شدہ امیدوار سمجھیں گے کہ ہمارے ساتھ بالخصوص کی گئی اور حکام بالادست سمجھیں گے ہم نے انصاف کیا ، اس لئے پہلا طریقہ ہی بہتر معلوم ہوتا ہے ۔

آخر میں یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ کسی حالت اور صورت میں خدام ملکی محض اپنے افسروں کی خوشی کی خاطر علیحدہ نہیں ہونے چاہئیں بلکہ ان کی خدمات منتقل ہونی چاہئیں ، اور تا وقتیکہ وہ اپنے فرائض اوسط درجہ کی قابلیت سے ادا کرتے ہیں انہیں علیحدہ نہیں کرنا چاہئے ۔ یہ طرز کہ خدام ملکی کو ان کے سیاسی فرائض بند یا سیاسی خیالات پر بغاوت کر دیا جائے یا موقع سبب موقع

انھیں علیحدہ کر دیا جائے نہایت مضر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے
 کہ خدام ملی براہ راست سیاسیات میں حصہ نہ لیں اور ملک اور حکومت کے
 وفادار رہیں۔

Examples of exercises

ضمیمہ باب ۱۶ تمثیلات ترکیت عالمہ

(الف) فریے؛ برطانیہ کلاں؛ ریشالی؛ ایرستان؛ فرانس؛ جاپان؛ جرمنی؛ ترکی
دب؛ دفائیے؛ مالک متحدہ امریکہ؛ سوئیٹان؛ روس؛ ہندوستان

(الف) فریے

برطانیہ کلاں و شمالی ایرستان

(۱) یہاں بادشاہت موروثی ہے لیکن خود شاہی حق تخت نشینی ایک
ضابطہ قانون یعنی قانون ہندوستان پر مبنی ہے۔ اس قانون کی
روسے بادشاہ کا پرنسٹنٹ ہونا لازمی ہے۔

(۲) حقیقی عالمہ ایک وزارت ہے جس کا صدر وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وزارت کے
دو حصے ہیں، (۱) دزرا اندرون کا بیٹہ (۲) دزرا بیرون کا بیٹہ۔

وزرا اندرون کا بیٹہ :-

(۱) وزیر اعظم (اول امیر خزانہ، رہبر دارالعوام) (تقریباً بے قلمبانی) (۲) صدر مجلس

لسہ دیکھو ڈروکس: "ملکت" Woodrow Wilson: The State (باب

دقیقہ حاشیہ ۲ شکہ ص ۳۰ پر ملاحظہ ہو)

شاہی (بے قلمدانی)۔ (۳) لارڈ چانسلر، اول امیرِ نصفت، صدر دارالامرا۔ (۴) چانسلر آف دی کچکر (وزیر خزانہ)۔ (۵) متہد ملکیت متعلق صبیحہ دا غلمہ (وزیر داخلہ)۔ (۶) متہد ملکیت متعلق صبیحہ خارجہ۔ (۷) متہد ملکیت قلمروائے۔ (۸) متہد ملکیت متعلق نوآبادیات (۹) متہد ملکیت متعلق جنگ۔ (۱۰) متہد ملکیت متعلق ہند (وزیر ہند)۔ (۱۱) متہد ملکیت متعلق فضائیہ۔ (۱۲) اول امیر بحریہ۔ (۱۳) صدر مجلس تجارت (یہ مجلس بمنزلہ مفقودہ کے ہے)؛ صرف صدر کار فرما ہے۔ (۱۴) وزیرِ مختارِ صحت (۱۵) وزیرِ زراعت و ماہی گیری۔ (۱۶) متہد اسکاچستان (۱۷) صدر مجلس تعلیمات (اس کی بھی وہی کیفیت ہے جو نمبر ۱۶ کی ہے) (۱۸) شاہی مہر بردار (بے قلمدانی)۔ (۱۹) وزیرِ مزدوری۔ (۲۰) وزیرِ سیم بٹلی و نفاع۔ (۲۱) وزیرِ ریل و رساکی۔

وزیرِ ابرہیرون کا بنیہ :-

(۱) صدر وکیل سرکار۔ (۲) چانسلر لارڈچی آف اسکاٹلرڈ (بے قلمدانی) (۳) صدر ناظم ڈاک و تار۔ (۴) وزیرِ وظائف۔ (۵) مشیرِ قانونی (۶) لارڈ ایڈوکیٹ اسکاچستان۔ (۷) مشیرِ قانونی اسکاچستان۔ (۸) اول امور امورِ عامہ۔

۲۷ سالانہ مدبرین *Statesman's year Book* ۱۹۳۷ء

۲۷ بے قلمدانی عہدہ سے یہ مراد ہے کہ جو کام اس عہدہ دار کو تفویض کئے گئے ہیں وہ محض برائے نام ہیں اور انھیں اس عہدے کے متعلق کوئی اہم قانونی نزاع نہیں ہیں۔ ایسے وزراء کا کام زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ فرقی تنظیم قائم کریں۔

بادشاہ کے ہر حکم پر کسی نہ کسی وزیر کے دستخط لازمی ہیں۔ ان کے دذرا کے تقریر وزیر اعظم کرتا ہے اور وزیر اعظم دارالعوام کی اکثریت کا رہبر ہوتا ہے سیاسی فریق مندی اور صرف دو بڑے بڑے فریق ہونے کی وجہ سے ایسا کم ہوتا ہے کہ دارالعوام کی اکثریت کسی اہم معاملے پر اپنی ہی بنائی ہوئی وزارت کے خلاف رائے دے۔

۲۵) پرلوی کونسل اب برائے نام رہ گئی ہے، گو اس کی بعض ذیلی مجلس "باضابطہ قوانین کے ذریعے سے مستقل جماعتیں ہو گئی ہیں، جن میں سے "عدالتی ذیلی مجلس" علاوہ برطانیہ عظمیٰ کے باقی تمام سلطنت برطانیہ کے لئے عدالت مرافعہ کا کام دیتی ہے، اور "جزائر رودبار کی ذیلی جماعت" وہاں کے انتظامات کی نگہداشت رکھتی ہے۔ دراصل اس قسم کی جماعتوں کو اصلی پرلوی کونسل سے کوئی تعلق نہیں۔ اصلی پرلوی کونسل صرف بعض رسمی کاروبار سے کرنے کے لئے جمع ہوتی ہے، لیکن اس وقت اس میں علاوہ بادشاہ اور "صدر مجلس خاص" کے باقی صرف دو تین ارکان ہوتے ہیں اور یہ اکثر وہی دذرا ہوتے ہیں جن کے متعلق کام پیش ہونے والا ہے۔ اس قسم کے امور فرامین، احکام مجلس یا بیت لڑاؤ یا دیاات شاہی وغیرہ ہیں۔ ہر رکن پرلوی کونسل کو رائٹ آفیسر کا لقب دیا جاتا ہے اور یہ خطاب اب ایک حد تک محض اعزازی رہ گیا ہے۔

۲۶) مختلف وزارتوں کے متعلق مجلس

۱۔ واقعی مجلس :- مجلس بحریہ، مجلس ہند۔

(الف) مجلس بحریہ، جس کا صدر اول امیر بحریہ ہے اور ارکان چابری امرا اور ایک ”دیوانی امیر“ ہیں۔ ان کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں، لیکن فنی معاملات کے علاوہ اول امیر بحریہ کو، جو کابینہ کا رکن ہوتا ہے، ملحق اختیارات حاصل ہیں۔

(ب) وزیر ہند کی صلاح کار مجلس ہند تھی جس میں ۱۹۱۹ء کے قانون حکومت ہند کے بموجب ۸ سے ۱۲ تک اراکین تھے۔ ۱۹۳۷ء سے مجلس ہند کو تخفیف کر کے اب وزیر ہند کی ایک صلاح کار جماعت بنائی گئی ہے جس میں ۴ سے ۶ تک رکن ہیں۔ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد وزیر ہند کے عہدہ مناصب ایک نامور اعلیٰ کے سپرد کر دئے گئے ہیں۔ بانی مناصب، جن سے اہم ترین حکومت ہند کی عام نگرانی ہے، دوڑے بڑے صیغوں میں منقسم ہیں یعنی صیغہ رسل و رسائل اور صیغہ حساب کتاب۔

(۵) سول سروس :-

علاوہ اعلیٰ ترین عہدہ داروں مثلاً وزرا، پارلیمینٹری مستدین و وزراء اور بعض دوسرے ایسے عہدہ داروں کے جن کا کام فنی نوعیت کا ہے، انکے متان کی سول سروس کے اکثر اراکین امتحان کے ذریعے سے لئے جاتے ہیں اور ان کی کارگزاری کے زمانے تک برابر لازم رہتے ہیں اور اسی کی بنا پر ترقی پاتے ہیں۔ یہ مستقل مکی خدمت کہلاتی ہے۔ کام نہایت خوبی سے چلتا رہتا ہے۔ مستقل سول سروس کے اراکین کو سیاسی رائے دہی کا حق ہے لیکن براہ راست سیاسیات میں دخل

دینے، سیاسی تقریر کرنے، سیاسی مضامین لکھنے، اور پارلیمنٹ کے کسی حلقے کی طرف سے امیدوار ہونے کی ممانعت ہے۔

فرانس

(۱) صدر جمہوریہ سات برس کے لئے منتخب ہوتا ہے اور انتخاب کا حق دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں، جو در سالی میں منعقد ہوتا ہے اور جسے "قومی جمعیت" کہتے ہیں، بنیادی قسم کی تحریک یا تائید کے قطعی کثرت رائے سے جوتا ہے۔ صدر جمہوریہ کو قوانین کے نافذ کرنے، معافی دینے اور غیر ملک سے عہد نامہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ایسے عہد نامے جن کا اثر فرانس یا اس کی نوآبادیوں پر پڑتا ہو ان کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری لازمی ہے۔ یہ دونوں ایوانوں کے اراکین میں سے وزراء مقرر کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ فنی عہدوں، مثلاً وزارت جنگ، وزارت بحریہ وغیرہ پر وہ ایسے لوگوں کو بھی مقرر کر دیتا ہے جو رکن نہ ہوں۔ صدر کے ہر حکم پر کسی نہ کسی ذریعہ کے تحت لازمی ہیں۔

چونکہ دونوں ایوان بجائے دو بڑی بڑی سیاسی جماعتوں میں منقسم ہونے کے بہت سے سیاسی جمہوریوں میں منقسم ہوتے ہیں اس لئے ہر وزارت ایک طرح سے مخلوط وزارت ہوتی ہے جس میں ہر فریق اس فریق کے قائم مقام ہوتے ہیں

۵۵ انگلستان کی سول سروس کا بہت اچھا بیان آگسٹ اسکوتھام نے یورپ:

Government of Europe. باب ۶ میں دیا ہوا ہے۔

۵۶ ڈیروین، حسبِ بالا، باب ۷۔

جن سے ایران کی اکثریت ہر وقت مرکب ہو۔ ایسی وزارت کو کچا رکھنے کے کام میں بہت کچھ ترکیب و تدبیر ضروری ہیں۔ اسی لئے وزارت کی دوہشتیں ہوتی ہیں ایک سرکاری حیثیت، جس کا صدر وزیر اعظم ہوتا ہے اور دوسری سیاسی فرنی حیثیت؛ ایک کو ”وزارت“ دوسرے کو ”کابینہ“ کہتے ہیں۔ فرانس میں وزارتوں کی عمر بہت کم ہوتی ہے اور حساب لگایا گیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ سے ۱۹۳۷ تک وزارتوں کی اوسط عمر صرف ۱۵۰ ہینے رہی ہے۔ اس کی وجہ ایک تو فرنی تعداد ہے اور دوسری وہ طرزِ کار ہے جسے ”دفاعتِ طلبی“ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس میں وزارت کی شکل انگلستان کی کابینہ جیسی ہے لیکن روح اس سے بالکل مغایر ہے۔

(۳) سول سروس۔

فرانس میں کوئی عالمگیر قانون سول سروس کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر وزارت نے اپنے محکموں کے لئے جداگانہ قواعد بنائے ہیں۔ سفارتیں اور دوست پروردی بہت چلتی ہے اور بعض مرتبہ کوئی وزارت صرف چند مخصوص لوگوں کے لئے اشتہار بھی کرتی ہے

جاپان

(۱) فہنشاہ :- شاہی دراشت کا دار و مدار فہنشاہی قانون ۱۸۸۹ء پر ہے

۱۷ دیکھو ای باب کا عنوان ”پارلیمنٹی کابینہ“

۱۸ ”اؤگ“ ”حسب بالا“ باب ۲۲۔

۱۹ دیکھو گیارہواں باب حکومت جاپان Hitagawa : The Govt. of Japan

بقیہ حانیہ صفحہ ۳۷۳ پر

جس کے مطابق شہنشاہ کے بعد اولاد کو تخت پہنچتا ہے۔ اگر اولاد ذکر نہ ہو تو قریب ترین عزیز کو تخت جانا ہے۔

شہنشاہ کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ وہ سپہ سالار اور امیر البحر ہے، وہ قانون کو منظور دیا یا منظور کر لے، پارلیمنٹ طلب کرتا ہے، ملٹی کرے، منتشر کرتا ہے، پارلیمنٹ نشست نہ کر رہی ہو تو اس شد ضرورت کے وقت احکام صادر کرتا ہے (جو پارلیمنٹ کے نشست کرتے ہی اس کے سامنے منظوری یا نا منظوری کے لئے پیش ہوتے ہیں)، تقررات کرتا ہے، انتخابات مقرر کرتا ہے، جنگ، صلح اور عہد نامے کرتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی حکم اس وقت تک قابل نفاذ نہیں جب تک کہ اس پر کسی وزیر کے دستخط نہ ہوں۔

(۲۵) وزیر: ہر وزیر اپنے صیغے کے معاملات کا ذمہ دار ہے۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر وزارت کا تیار کردہ موازنہ پارلیمنٹ منظور نہ کرے تو سال ماضی کا موازنہ منظور نہ سمجھا جاتا ہے اور اس طرح وزارت کے پاس کام چلانے کے لئے کافی رقم رہتی ہے، خواہ پارلیمنٹ منظور کرے یا نہ کرے۔

شہنشاہ وزیر اعظم کا تقرر کرتا ہے اور وہ دوسرے وزراء کا جملہ وزراء شہنشاہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔

(۲۶) پریوئی کی کونسل: شہنشاہ کی صلاح کار مجلس۔ اس میں جملہ وزراء اور ۲۶

مزید ارکان میں جنہیں شہنشاہ ان کے عمر اور تجربہ کی بنا پر مقرر کرتا ہے مجلس صرف اس وقت نشست کرتی ہے جب کاہنہ کے کہنے سے شہنشاہ اسے طلب کرتا ہے۔ اس کے سامنے جو معاملات شہنشاہ پیش کرتا ہے اس پر بحث ہوتی ہے اور ریوی کی کونسل اپنی رائے پیش کرتی ہے۔

(د) ، سول سروس :- چار قسم کے عہدہ دار ہیں :-

(الف) شہنشاہی - وہ عہدہ دار جنہیں خود شہنشاہ نامزد کرتا ہے جیسے وزراء وغیرہ۔

(ب) چوکن - وہ عہدہ دار جنہیں شہنشاہ وزراء کے کہنے سے نامزد کرتا ہے۔

(ج) سون - وہ عہدہ دار جنہیں شہنشاہ صدر ان شعبہ جات کے کہنے سے نامزد کرتا ہے۔

(د) ڈن - وہ عہدہ دار جنہیں خود صدر ان شعبہ جات نامزد کرتے ہیں۔

جرمنی :-

ناٹھی فری کے برسر اقتدار ارکان سے پہلے اس ملک کی حکومت کی

بنیاد ۱۹۱۹ء کا دستور تھا جس کے مطابق مرکزی عالمہ ایک صدر (جو سات برس

کے لئے انتخاب عامہ کے ذریعے سے منتخب ہوتا تھا) ایک وزیر اعظم (جانشین)

جو مجلس سلطنت (رائنشتاغ) کے اکثریت کا سربراہ تھا اور ایک وزارت پر (جسے

وزیر اعظم نامزد کرتا تھا) مشتمل تھی۔ لیکن تسمیوں کے برسر اقتدار آلے پرانے

میں مجلس سلطنت نے ایک قانون کے ذریعے سے اپنے تمام اختیارات خود کاہنہ

کے سپرد کر دیئے، اور صدر جمہوریہ پنڈت نبرگ کی وفات کے بعد نائسبیری کے رہنا اور مملکتی چانسلر پنڈت نے اعلان کیا کہ صدارت کے اعلیٰ عہدے کا فائزہ پنڈت نبرگ کے ساتھ ساتھ ہو گیا اور آئندہ بجائے صدر کے اس ملک کے اعلیٰ ترین عاملانہ عہدہ دار ”رہبر سلطنت“ ہو گا جس کی ذات میں صدارت اور وزارت عظمیٰ دونوں شامل ہیں۔ رہبر سلطنت مقننہ اور عالمہ دونوں شعبوں کا رہتا ہے؛ اب تو راجستھاغ کے اراکین کی فہرست یہی ترتیب دیتا ہے اور محض ان یا نہیں کہنے کے لئے دیکھ لوں کہ صرف ان کہہ دینے کے لئے ”رائے“ و ”مہندوں“ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ ملک بجائے وفاقیہ ہوئے کے کلیتہً فردین گیا ہے اور مختلف صوبوں میں پنڈت کے ”ذاتی قائم مقام“ بطور صوبہ داروں کے کارفرما ہیں۔ ہر بڑے عہدہ دار کو پنڈت کی وفاداری کا حلف لینا پڑتا ہے؛

ترکی پٹو

۱) صدر: مجلس ملیہ عظمیٰ اپنے اراکین میں سے کسی کو چار سال کے لئے صدر منتخب کرتی ہے لیکن ایک ہی شخص کا بار بار انتخاب ہو سکتا ہے۔ دوران صدارت میں صدر نہ تو اس مجلس میں بیٹھ سکتا ہے نہ رائے دے سکتا ہے۔ لیکن ہر سال نو مہینے سال گذشتہ کی کارروائی سنانے یا دوسرے سے پڑھوانے کا اسے حق حاصل ہے۔ غیر ملک کو جو سفر بھیجے جاتے ہیں انھیں صدر ہی

شاہ دیکھو دستور ترکی، ضمیمہ ب۔ نل۔ بھارگوا، ”کنال پاشا“: B. L. Bhargava.

Kamal Pasha.

نامزد کرتا ہے۔ اسے حق انصاف حاصل نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر اسے کوئی قانون پسند نہ آئے تو دس روز کے اندر اپنے دلائل نگاہ کر مجلس عظمیٰ کو بھیج دے، اگر پھر بھی یہ مجلس اس قانون کو منظور کرے تو وہ خود بخود قابل نفاذ ہو جاتا ہے۔ لیکن دستوری ترمیمات اور موازنہ کی کارروائی صدر کے اس حق سے بھی مستثنیٰ ہیں۔

(۲) ”صدر مامورین عالمہ“۔ یعنی وزیر اعظم۔ اسے صدر جمہور منتخب شدہ اراکین میں سے مقرر کرتا ہے اور یہ پھر باقی ماندہ وزراء کی فہرست صدر جمہور کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ہر مجلس ”مامورین عالمہ“ کے اراکین انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح مجلس عظمیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں اور کوئی صدر ان کی حکمت عملی نفاذ نہیں سمجھا جاتا جس کی کسی نامور کے دستخط نہ ہوں۔ ہر نامور کو تقرر کے ایک مہینہ کے اندر مجلس عظمیٰ سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

(۳) مجلس مملکت۔

اس کے اراکین کو مجلس عظمیٰ منتخب کرتی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ٹھیکوں، تعمیرات اور اجاروں کی بابت حکومت کو مشورہ دے اور جدید قوانین کا مسودہ کر کے پیش کرے۔ اس میں بڑے بڑے تجربہ کار اور مبصر لوگ ہوتے ہیں۔

(ب) وفاقی۔

ممالک متحدہ امریکہ۔ مرکزی حکومت

(۱) صدر جمہور۔ اس کا انتخاب چار برس کے لئے ہوتا ہے اور دہلیز کے اعتبار سے اس انتخاب کے لئے ہر ریاست سے اتنے ہی ارکان چنے جاتے ہیں جتنے ارکان اس ریاست کی طرف سے دارالائیکین اور سیناٹ میں بیٹھتے ہیں۔ خیال یہ تھا کہ اس طرح ملک کے چیدہ چیدہ لوگ ملک کے سب سے بڑے رہبر کا انتخاب کریں گے، لیکن سیاسی فریق بندی کی تنظیم اور تادیب کی وجہ سے صدر کا واقعی انتخاب مہینوں پہلے ہی محض اس مجلس انتخاب کے اجتماع کی ترکیب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کو صدر منتخب کیا جائے گا۔ دستوریں اس کی صراحت نہیں ہے کہ کتنی مرتبہ ایک شخص صدر ہو سکتا ہے، لیکن رواج ایسا پڑ گیا ہے کہ دو مرتبہ سے زیادہ ایک ہی شخص صدر منتخب نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص صدر مقرر ہو سکتا ہے جو پیدائشی فہری مالک متحدہ کامبو جس کی عمر ۴۵ سال یا اس سے زیادہ کی ہو اور کم از کم ۱۴ سال ملک میں رہ چکا ہو۔

(۲) نائب صدر۔ اس کا انتخاب بھی صدر کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے لیکن اس کے سپرد کوئی عاملانہ کام نہیں بلکہ وہ مجلس سیناٹ کی صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے اور صدر کی غلطی کی یا وفات پر باقی ماندہ مدت کے لئے صدر بن جاتا ہے۔

کابینہ دس وزراء پر مشتمل ہے جنہیں اصطلاح میں مہتمدین کہتے ہیں اور صدر کے صواب و دیر پر (سیناٹ کی منظوری سے) مقرر ہوتی ہے اور کابینہ صدر کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے، صدر جس وزیر کو چاہے اور جب چاہے بغیر کسی منظوری کے علیحدہ کر سکتا ہے۔

(۲) سول سروس

مالک متحدہ امریکہ میں بہت کم ایسے عہدہ دار ہیں جن کا تقرر صحت حیات ہو اکثر محض چند سال کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور انہی مدت کے بعد اگر سیاسی اہمیت بار سے وہ عہدہ دار بالادست کے ہم رانے ہوں تو اس حالت میں ان کی توسیع ہوتی ہے ورنہ عہدہ دار بالادست اپنے ہمراہ لوگوں کو مقرر کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت ایسے محکموں میں بھی ہوتی ہے جیسے ڈاکخانہ اور معمول خانہ جن سے سیاسی مفاد کو کچھ تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اسے اصطلاح میں ”عہدہ ٹائی“ کہتے ہیں جس سے یہ مطلب ہے کہ یہ عہدہ گویا مال غنیمت میں جو عہدہ دار بالادست کے سیاسی پیروں کو مال غنیمت کے طور پر دئے جاتے ہیں۔ حال میں اس طرز کے خلاف ایک طرح کا رد عمل پیدا ہو گیا ہے اور ۱۸۸۶ء سے عہدوں کو چکر کرنے کے لئے ایک ”مامور یہ سول سروس“ مقرر ہو گیا ہے جو صدر جمہوریہ کے سامنے جواب دہ ہے اور سابقہ ہی مقابلتی امتحان کا طریقہ بھی بہت سے عہدوں کے لئے جاری کر دیا گیا ہے۔ اب عہدوں کی تقریر یا نصف تعداد اس قانون کے تحت آگئی ہے۔

ریاستی حکومت

گورنر :- دور یا ستوں میں ایک ایک سال کے لئے اور باقیوں میں دو دو چار سال کے لئے براہ راست رائے دہی کے ذریعہ سے انتخاب ہوتا ہے۔ اس کے لئے محض شہریت کافی ہے جس کی کم سے کم مدت کہیں صرف دو سال کہیں زیادہ ہے؛ بعض ریاستوں میں میں سال کی شہریت لازمی ہے اور صرف

ایک ریاست (دین) میں اس کا امر کی نشا دہونا ضروری ہے۔ گورنر کو اپنے باقی ساتھیوں پر کوئی خاص تفویض حاصل نہیں ہے اس لئے کہ ان میں سے تقریباً سب اسی طرح منتخب شدہ ہوتے ہیں۔ علاوہ انفرادی فرائض کے گورنر کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اسے قانون سازی پر ایک حد تک قابو ہوتا ہے۔ بعض ریاستوں میں اسے سمندر ریاست بھی تقرر کرنے کا (ایوان دوم کی رضامندی سے) حق حاصل ہے، لیکن ایسا بہت کم ریاستوں میں ہے۔ ریاستی وزارتیں مرکب ہوتی ہیں نہ کہ مفرد یعنی اعلیٰ عہدہ دار گورنر کے سامنے نہیں بلکہ ایوانوں کے سامنے یا راجہ ہندوں کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

سویتستان

مرکز: ۱۔ صدر اور نائب صدر جمہور ان معنی میں گویا ہیں بھی نہیں جن معنوں میں دوسرے جمہوریوں میں ہوتا ہے، بلکہ دو عہدہ داروں کو جنھیں "صدر جمہوریہ" اور "نائب صدر مجلس وفاقہ" (مجلس عالمہ) کہتے ہیں، عالمہ کے ارکان میں سے وفاقی اسمبلی یا پارلیمنٹ سالانہ منتخب کرتی ہے۔ لیکن سوائے اس کے کہ یہ دونوں اپنے اپنے مخصوص شعبوں کا دوسرے ارکان مجلس عالمہ کی طرح کام کریں اور "صدر جمہوریہ" جمہوریت کی قائم مقامی دوسرے ممالک کے مقابلے میں کہے ان دونوں عہدہ داروں کو کوئی امتیازی تفویض دوسرے ارکان پر حاصل نہیں ہے۔

۲۔ دیکھو ایضاً، باب ۱۴، تتمہ۔ سویتستان میں "وفاقی اسمبلی" پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو اور "وفاقی مجلس" مجلس عالمہ کو کہتے ہیں۔

سالانہ انتخاب و اصل صرف نائب صدر مجلس وفاقہ کا ہوتا ہے اس لئے کہ علی العموم نائب صدر ہی صدر بنایا جاتا ہے۔

(۲) وفاقی مجلس یہ عالمہ کا نام ہے۔ اس میں سات شعبے ہوتے ہیں:-

(۱) خارجی معاملات (۲) داخلی معاملات (۳) عدالت و کوٹوالی (۴) فوج

(۵) مالیات و محاصل (۶) اقتصادیات عامہ (زراعت و صنعت) (۷)

ڈاک و ریل۔

ان سب عہدوں پر ایک ایک رکن ہوتا ہے، اور خارجی معاملات کا کام عام طور پر صدر جہوریہ کرتا ہے۔ وفاقی اسمبلی، وفاقی مجلس کے ارکان کا انتخاب تین تین سال کے لئے ہوتا ہے اور یہ شرط ہے کہ کسی کینڈن سے ایک سے زیادہ رکن کا انتخاب نہ ہو۔ یہ مجلس حقیقی معنوں میں جمیعت کی ذیلی جماعت اور اس کے حکم کے تابع ہے۔ اور ہر رکن فرداً فرداً اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ گو اکثر معاملات عام میں اس کے اراکین متفق ہوں لیکن بہت سے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں آپس میں اتفاق نہیں ہوتا، لیکن اس کی پرواہ نہیں کی جاتی۔ نیز اگر کسی رکن کی کسی تحریک کو جمیعت مسترد کر دے تو بھی وہ رکن برابر قائم رہتا ہے۔ یہاں کے وزرا کی اوسط مدت عہدہ ۱۰ سال سے، اور یہ وزارت (اگر اسے یہ لقب دیا جائے) دنیا کی مستقل ترین وزارتوں میں سے ہے۔

کینڈن :- کینڈن یا ریاست میں عالمانہ اختیار ایک مجلس کے سپرد ہے اور کینڈن میں اس کا نام مختلف ہے، گو اکثر میں یہ انتظامی مجلس کہلاتی ہے، اس کے اراکین مثل مرکزی مجلس وفاقہ کے بار بار منتخب ہوتے رہتے ہیں۔ اور کینڈن

ان کے انتخاب کا حق جملہ شہریوں کو، کہیں مجلسِ مقننہ کو حاصل ہوتا ہے۔ نہیں جماعتِ مقننہ میں نشست کرنے اور اس کے معاملات میں آزادانہ حصہ لینے کا اختیار حاصل ہے اور دراصل اسے جماعتِ مقننہ کی ہی ایک کاروباری ذیلی مجلس کہنا چاہیے۔
روس ۱۹۰۶ء

۱۹۰۶ء کے نئے دستور کے اعتبار سے جماعتِ عالمہ کے طرزِ انتخاب میں تبدیلی ہوئی ہے۔ پہلے اس کا انتخاب سو ویتوں کی کانگریس میں ہوتا تھا، لیکن اب اسے ”مجلسِ اعلیٰ“ مقرر کرتی ہے۔ روس کی مجلس کا ہنیہ کو ”مجلسِ مامورینِ عوام“ کہتے ہیں۔ یہ عالملانہ اختیارات کی حامل ہے اور ۱۹۰۳ء کے بعد پوری طور سے مجلسِ اعلیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس مجلس کا ایک صدر، چار نائب صدر اور حسبِ ذیل شعبوں کے سرگروہ ہیں: ۱۔ خارجہ، مدافعت، اشیاءِ خوردنی، داخلی تجارت، خارجی تجارت، زراعت، برقی ریل و رسائل، ڈاک و ”مار“، بھاری مصنوعات، ہلکی مصنوعات، کڑھی، مہکتی کھیت، مالیات، داخلی امور۔ اس مجلس کے فرائض و اختیارات حسبِ ذیل ہیں: ۱۔ ”مجلسِ اعلیٰ“ اور ”صدریہ“ کے سامنے مسودات کا پیش کرنا، بین الاقوامی عہد ناموں کو مسودات تیار کرنا، موازنہ تیار کرنا، جملہ محلی امور کا تصفیہ، مختلف جمہوریتوں کے مابین

۱۱ دیکھو ایسکی مالے وچ: ”روسیں“ Malovsky - Malovitch: Russia

۱۲ U.S.S.R. باب ”نظمِ ریسی“ دفعہ ۱، حال کی تبدیلیوں کے لئے دیکھو ”جریہ علمِ سیاسیہ“ Revue
des Sciences politiques جولائی - ستمبر ۱۹۳۶ء؛ سالانہ جلد ۳۶ ۱۹۳۶ء۔

نقیص کا تصفیہ عام طبع پر قانون سازی کی تحریک کرنا۔

ہندوستان

دچمکہ باوجود قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی منظوری کے مرکزی حکومت اس وقت تک ۱۹۱۹ء کے قانون ہی پر مبنی ہے اس لئے اس کی ترکیب دونوں قوانین کے بموجب دکھائی گئی ہے، اس کے برعکس عوبہ داری حکومتوں میں تبدیلی عمل میں آگئی ہے اس لئے ۱۹۱۹ء کے اثرات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے (الف) انگلستان کی نگرانی حکومت ہند پر۔

۱۔ ملک معظم شاہ انگلستان قیصر ہند۔ جو اختیارات تاج کے ساتھ وابستہ ہیں وہ سب برطانیہ کھال کے دستوری ذرا (بالخصوص وزیر ہند) کی صلاح منظوری سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان اختیارات میں سے حسب ذیل بھی ہیں:-
”صلاح کاران وزیر ہند“ کے کسی رکن کو دونوں ایوانہاں کے پارلیمنٹ کی متفقہ عرضداشت پر علیحدہ کرنا، مفصلہ ذیل عہدہ داروں کا تقرر، ملکی کثیر سلطنت ہند، گورنر جنرل، ارکان مجلس انتظامی گورنر جنرل، گورنر ایوان اور مستقل مجلس عدالت الاعلیٰ

۱۹۳۵ء کے قانون کے لئے دیکھو حکومت ہند ۱۹۳۵ء، سالنامہ ہندوستان Indian Year Book ۱۹۳۶-۳۷ء، ایڈیٹر کوٹن، حسب بالا۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے لئے دیکھو ”امان“، ”برطانوی ہند کا نظام سیاسی“ اردو ترجمہ مطبوعہ جامعہ عثمانیہ، رپورٹ، ۱۹۳۶ء، ص ۱۳۱ وغیرہ

نیز دیکھو کیتھ، ”ہندوستان کی دستوری تاریخ“ Keith: Constitutional History of India.

صوبہ جات کے وکلاء کے سرکار، اساتذہ، سکالرز، مدراس، مجلسی، نیز تاج کو اختیار ہے کہ ان قوانین کی آخری منظوری دے جو گورنر جنرل کے امتنا سے منظور ہونے لگیں۔

۲۔ وزیر ہند - یہ کامیابہ، انگلستان کا رکن ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کے بموجب اس کے متعلق ایک "مجلس صلاح کاران" ہے جس کا ذکر انگلستان کے تحت کر دیا گیا ہے، وزیر ہند کو ہندوستان کی آمدنی اور حکومت پر "کمل نگہداری" کا پورا ہدایت کے اختیارات حاصل ہیں اور ہندوستان کے ملکی اور قومی انتظام میں گورنر جنرل اس کا تابع ہے۔ حکومت ہند کے ہر اہم سیاسی عمل کے لئے تقریباً لازمی ہے کہ پہلے وزیر ہند کو اس کی اطلاع ہو جائے، اور پھر اس کے احکام کے جنگ صلح یا عہد نامہ نہیں ہو سکتا۔ گورنر جنرل کے احکام کے چھ ماہ کے اندر وزیر ہند کے دستخط لازمی ہیں۔ نیز بعض امور کے متعلق اس وقت تک قانون سازی نہیں ہو سکتی جب تک وزیر ہند کی اجازت نہ دی جائے، جیسے عیسائی مذہبی علماء کی حیثیت۔

۳۔ ہندوستان کا دی کنشنر، انگلستان میں ۱۔ اس کے سپرد اشیا و اسباب کے خرید و فروخت کے اختیار است، جو پہلے وزیر ہند کے متعلق تھے، کر دئے گئے ہیں۔ ابتدا ہی سے اس عہد سے پر کوئی نہ کوئی ہندوستانی قائم ہوتا ہے۔
(اسب) مرکزی حکومت ہند۔

(۱) گورنر جنرل - پانچ سال کے لئے بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں
نظیر دوسرے اختیارات کے (الف) پٹنہ کو طلب کر سکتے ہیں، منتشر کر سکتے ہیں
اس کی مدت بڑھا سکتے ہیں (ب) اجیران کی سفارشات کے کسی رقم کو کسی میں ختم

کرنے کی تحریک نہیں ہو سکتی (ج) علاوہ ٹیگی منظوری کے حسب ذیل امور پر کوئی تحریک مقننہ میں نہیں ہو سکتی :

- ۱۔ ہندوستان کا قرضہ عامۃ یا ہندوستان کی آمدنی عام (۲۳) مذہبی معاملات (۳) فوجی معاملات (۴) غیر ممالک یا ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ تعلقات۔
- (۵) وہ صوبہ داری امور جو مرکزی مقننہ کے حدود سے باہر ہیں (۶) کسی مقامی مقننہ کے قوانین کا استرداد یا ترمیم (۷) گورنر جنرل کے احکام کا استرداد یا ترمیم (۸) ان کی رائے کے مخالف مرکزی مقننہ کوئی قانون منظور کر لیتا ہے تو گورنر جنرل کو "استنار" کا حق حاصل ہے کہ وہ یہ کہیں کہ یہ قانون برطانوی ہند کی حفاظت، امن، امان یا مفاد کے لئے ضروری ہے (۹) انھیں حق امتناع حاصل ہے اور وہ ۶ ماہ کے لئے احکام صادر کر سکتے ہیں۔

(۶) گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ ۱۔

۱۔ محکمہ معاملات خارجہ۔ خود گورنر جنرل جائزہ دے رہے ہیں اور اپنے معتمد خارجہ کے ذریعے سے کام کرتے ہیں۔ اس محکمہ کا تعلق غیر ممالک اور ہندوستانی ریاستوں سے ہے (۲) محکمہ داخلہ (۳) محکمہ مقننہ۔ اس کا کام قانونی سوئے تیار کرنا ہے اور حکومت کو قانونی رائے دینا ہے (۴) محکمہ ریل و تجارت (۵) محکمہ صنعت و حرفت و مزدوری۔ اس کے سپرد ڈاک و تار بھی ہیں (۶) محکمہ تعلیم حفظان صحت و اراضیات (۷) محکمہ مالیات (۸) محکمہ افواج۔

یہ مجلس گورنر جنرل کی صدارت میں ہر ہفتہ نشست کرتی ہے اور عام طور پر معاملات اکثریت کے اصول پر چلتے ہوئے ہیں، لیکن گورنر جنرل چاہیں تو مجلس

اکثریت کے خلاف حکم دے سکتے ہیں۔ نیز ہر شعبہ کے مندرجہ ذیل گورنر جنرل سے مشورہ کا اختیار حاصل ہے۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء

۱۔ وزیر ہند کے صلاح کاروں کے لئے دیکھو بالا۔ مامور اعلیٰ کی حیثیت اور امتیازات حسب سابق میں۔ جدید قانون کی رو سے وزیر ہند اس حد تک گورنر جنرل کے افعال کے نگران رہیں گے جس حد تک وہ خزانہ کر کوئی ذاتی رائے پیش کرنے کا اختیار ہوگا۔

۲۔ گورنر جنرل کی مجلس وزراء:- اس میں زیادہ سے زیادہ ۱۰ ارکان ہوں گے اور جب گورنر جنرل کی خواہش ہوگی وہ اس مجلس پر صدارت کریں گے۔ اگر کوئی وزیر جماعت متفقہ کارکن عرصہ ۱ ماہ تک نہ رہے تو وہ وزارت سے علیحدہ ہو جائے گا۔ وزیر کی تنخواہ دوران کارکردگی میں کم نہ ہو سکے گی وزیر عیسوی کلیسائی معاملات، ملکی دفاع اور خارجی معاملات کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ نیز حسب ذیل امور گورنر جنرل کی "مخصوص ذمہ داریوں" میں شامل سمجھے جائیں گے:- ہندوستان کا امن و امان، مالیاتی توازن، اقلیتیں، سول سروس کے حقوق، سلطنت متحدہ اور برہما کے اسباب کی آزادانہ درآمد، ہندوستانی ریاستوں کے حقوق۔

گورنر جنرل کا جی چاہے تو ایک مالیاتی صلاح کار مقرر کر سکتا ہے۔

۳۔ صوبہ داری انتظام:-

صوبہ داری ذرا کا انتخاب خود گورنر کریں گے اور ان کی خوشنودی تک

تلمدان وزارت اُن کے پاس رہے گا۔ گورنر اپنی صوابدید پر مجلس وزرا کی صدارت کریں گے۔ اگر کوئی وزیر مسلسل چھ ماہ تک جماعتِ متفہنہ کا رکن نہ ہو تو وہ وزارت سے علیحدہ ہو جائے گا۔ کسی وزیر کی تنخواہ اس کی مدتِ عہدہ تک کم نہ ہو سکے گی۔ گورنر کی مخصوص ذمہ داریاں تقریباً وہی ہیں جو گورنر جنرل کی، ان کے علاوہ صوبہ متوسط کے گورنر کی خاص ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھیں کہ محال کا کافی حصہ براہِ پر صرف ہوتا ہے یا نہیں۔ نیز ایسے صوبوں کے گورنروں کو، جن کے بعض ”مستثنیٰ رہنے“ رقبہ جات و زر کی دست برد سے علیحدہ کر دے گئے ہیں (اور ایسے قلعے بہت سے ہیں) یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ وزراء کی کسی شخص سے ان رقبہ جات کے انتظام میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا۔ گورنروں کو اختیار ہو گا کہ وہ کسی کو اپنے صوبہ کا وکیل سرکار مقرر کریں۔ گورنر کو اختیار ہو گا کہ پولیس کے قواعد میں ترمیم کریں، اور اگر وہ دیکھیں کہ بعض لوگ حکومت کو تہ و بالا کرنے کی فکر میں ہیں اور اس سے صوبہ کے امن و امان کو خطرہ ہے تو وہ جو انتظامات چاہیں اپنے قبضہ میں کر سکتے ہیں۔ نیز وہ اس قسم کے قواعد بنا سکتے ہیں کہ کسی خاص مسئلے کے متعلق پولیس والے بغیر ان کی اجازت کے کسی کو کاغذات نہ دکھائیں۔

۴۔ سول سروس۔

سول سروس کے ارکان کا تقرر مرکزی خدمات پر گورنر جنرل اور صوبہ داری خدمات پر گورنر کریں گے۔ جو لوگ اس قانون سے پہلے سول سروس کے

اداکین تھے ان کی بابت کوئی ایسے قواعد نہیں بنائے جاسکتے جن سے ان کے حقوق، تنخواہ وغیرہ میں کسی قسم کی کمی واقع ہو؛ اس قسم کا اختیار صرف ان عہدہ داروں کو حاصل ہوگا جنہیں یہ اختیار ۱۹۲۶ء سے پہلے حاصل تھا۔

انڈین سول سروس، انڈین میڈیکل سروس، انڈین پولیس سروس کے تقررات خود وزیر ہند کی طرف سے عمل میں آئیں گے۔ وزیر ہند اس کا تعین کریں گے کہ کتنے تقررات ایسے ہوئے چاہئیں جو ان کی جانب سے عمل میں آئیں۔ ان ”محفوظ خدمات کے قواعد مشاہدہ، رخصت و وظائف کی بابت خود وزیر ہند قواعد تیار کریں گے۔ ہر مقرر شدہ شخص کو کسی ایسے احکام سے گورنر جنرل یا گورنر کے سامنے مرفوعہ کا اختیار ہوگا جسے وہ خلاف انصاف تصور کرے۔ ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ ہر شخص کو وہی عہدہ دار پر غاست کر سکتا ہے جسے اس کا تقرر کرنے کا اختیار ہو۔

(بقیہ حاشیہ ۲۸۷)

۱۵۔ یہ سب قانون کے الفاظ میں لیکن جب سے موبل میں سوراخ کا عمل درآمد ہوا ہے، گورنر بہت سے مخصوص اختیارات سے عملاً دست بردار ہو گئے ہیں۔

Palatinal Party

باب ۱

سیاسی فریق بندی

فریق بندی کے عناصر: فریق بندی اور یوٹیٹ۔ سیاسی فرقوں کے اصول جس دفع
فریق بندی کے عناصر: پچھلے باب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بہت سے
عمومیت پسند ممالک میں وزارت کا دار و مدار جماعت متقنہ کی سیاسی اکثریت پر
ہوتا ہے۔ یہ کوئی محض اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ آج کل جب عمومیت پسند
ممالک میں نیابتی جماعتوں کا رجحان یہ ہے کہ وہ نہ صرف قانون سازی کے
معاملات کا تصفیہ کریں بلکہ عاملانہ امور میں بھی مداخلت کریں، تو عالمہ اور مقننہ کے
ماہمی تضادم کا سد باب بھی ہو سکتا ہے کہ کسی نہ کسی ترکیب سے دونوں کی رائے
ایک ہی ہو یا کم از کم دونوں میں گہرا تعلق پیدا کیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ ارکان
چند بڑے بڑے اہم معاملات پر ہم رائے ہو جائیں تاکہ فریق مخالف کی طرف
سے زک پہنچنے کا احتمال کم رہے۔ خود ان ممالک میں بھی جہاں ”صدارتی طرز حکومت“
موجود ہے، یعنی جہاں عالمہ اور مقننہ کے حلقہ جات اقتدار جدا گانہ ہیں، وہاں بھی
اس کی ضرورت ہے کہ کوئی انتظام ایسا ہو جس کے ذریعے سے دونوں اعضائے
حکومت کے مابین ربط و یگانگت پیدا ہو جائے۔

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ مختلف انفرادیتوں کے مابین مکمل ہم خیالی بالکل ناممکن ہے، اور جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص ہم خیال ہیں تو اس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ ہم خیالی زیادہ ہم امور میں ہے نہ کہ فرد میں۔ سیاسیات میں باہمی مفاہمت کے عنصر کی بڑی اہمیت ہے، اور تا وقتیکہ اہم اور ممتاز امور میں بہت سے لوگ متفق نہ ہو جائیں کسی طرح کی سیاسی تنظیم ناممکن ہے بلکہ خود حکومت کا چلنا بھی محال ہے۔ ہر سیاسی تحریک پر نظر ڈالنے کے متعدد پیرائے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ممالک میں باوجود جمہوریت کی کوشش کے تمام ملک واسطے ایک ہی نقطہ نظر پر متفق نہیں ہو سکتے جس کی وجہ سے کہیں دو اور کہیں دو سے زیادہ سیاسی فریق بن جاتے ہیں، اور ان ممالک میں جن کے باشندوں کو خدا نے مفاہمت کا مادہ کم دیا ہے، دس دس بیس بیس سیاسی جموعے بن جاتے ہیں جنہیں بعض مرتبہ باہمی مخالفت اور عناد سے فائدہ اٹھا کر کوئی مطلق العنان حکمران یا آمر مطلق سب کو زیر کر دیتا ہے اور خود اپنی قوت قائم کر لیتا ہے۔

۱۰۔ یہ تو امریت کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جمہوریت انہیں ممالک میں کامیاب ہو سکتی جن میں بغیر اسپرین کے سابق آمر یا کیوری دیو یا برائے قدرت نے وقت، دوست اور عام جاہلیت تنظیم پر غور وانی دی ہو (جیسے انگلستان)، اور جہاں معمولی معمولی مسائل پر بھی بطور بحث ایسے ہو سکے کہ ان کی وجہ سے ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے؛ اس کے عکس جن ممالک کو کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے وہاں عمومی حکومت اور سیاسی فریق بندی ملک کے لئے ہر سچا مضرت رساں ہوں گی۔

فریق بندی اور کمیونیت۔ بہر حال یہ اطمینانی ہے کہ عمومی اصول پر کی گئی حکومت نہیں چل سکتی تا وقتیکہ ملک میں دو یا دو سے زیادہ سیاسی فریق نہ ہوں، یعنی دو یا دو سے زیادہ ایسے سیاسی محسوس نہ ہوں جو اپنی اپنی حد تک چند خاص اصول پر متفق نہ ہو سکیں ہوں۔ یہ اصول مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں، لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ ہر مسئلے پر اپنی طرح کی رائے ہو سکتی ہے، ایک وہ جو بہر حال ترقی کے خواہاں ہے، دوسرے وہ جو قدیم روایات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور تیسرے وہ جو قدیم روایات کا خیال رکھتے ہوئے ملک کے لئے معتدل ترقی پسند کرتے ہیں۔ اب بعض ممالک (مثلاً انگلستان) ہیں جہاں لوگ اندرونی معاملات میں مفاہمت کے عادی ہیں، سیاسی فریق انھیں تین اصول کے حامل ہیں، خواہ ان کا نام کوئی بھی کیوں نہ رکھا جائے، لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، دوسرے ممالک (مثلاً فرانس) ایسے ہیں جہاں دونوں انتہا پسند فریقوں اور اعتدال پسند فریق کے میسجوں چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جو بعض فردی امور پر آپس میں مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ سیاسی فریقوں کے اصول۔ جن امور کو سیاسی فریق بندی کی بنیاد بنایا جاتا ہے وہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں مختلف ہوتے ہیں۔ بعض جگہ تو یہ فریق بندی

۱۵ بقول فائزر، "حکومت عالیہ کا نظریہ اور عمل" *Feiner: Theory and Practice of Modern Government*، باب ۱۵، فرانس میں ہر ایک انتخاب کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی فریقوں کی نہ صرف حکمت عملی میں فرق پیدا ہو جلتے ہیں بلکہ نام بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، اور جن جن پیروی پر یہ "فریق" مشتمل ہوتے ہیں وہ بھی بدلی جاتے ہیں۔

مضامین اصول پر مبنی ہے جو ان پر لگائے گئے ہیں، بعض انتہا پسند اور اعتدال پسند، بعض جگہ اس کی بنیاد معاشی ہوتی ہے، جیسے تجارت کی آزادی یا حفاظت، بعض جگہ نسلی اختلاف ہوتا ہے، جیسے نالیوں سے پہلے جرمنی میں یہودی گروہ یا آئرستانی سوراخ سے پہلے برطانوی پارلیمنٹ میں آئرستانی، تیسری وجہ اختلاف تمدنی ہو سکتی ہے، جیسے ہندوستان میں مسلمانوں کے گروہ اور یہاں میں ہندوستانی گروہ۔ ان ممالک میں جہاں کسی غیر ملک کی حکومت ہوتی ہے ایسی حکومت کا وجود ہی باعث تفریق بن سکتا ہے، جیسے ہندوستان میں، جہاں کی سیاسی فریق بندی ایک بڑی حد تک برطانوی حکومت ہند کے ساتھ ملوک پر مبنی ہے، اور جہاں تقریباً ہمیشہ ایک فریق ایسا رہتا ہے جو اس حکومت کو ممکن طریقے سے ناک و برباد کرنے پر تیار رہتا ہے۔ یوں تو اس طرح کے بہت سے اسباب اختلاف ہو سکتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں مختلف اسباب فریق بندی پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن ایک وجہ اختلاف ایسی ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں وفاقی طرز حکومت رائج ہے وہاں علی العموم ایک فریق تو ایسا ہوتا ہے جو مرکز کو اجزاء کے مقابلے میں تقویت دینا چاہتا ہے اور دوسرے فریق کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے اجزاء کے اختیارات بڑھائے جائیں۔ یہ صورت حال ایک بڑی حد تک نہ صرف ممالک متحدہ امریکہ میں پائی جاتی تھی بلکہ تقریباً ہر ایک وفاقیہ میں نظر آتی ہے۔

۱۔ ملک متحدہ امریکہ میں جو دو بڑے فریق ”عمومی“ اور ”جمہوری“ ہیں (بقیہ حاشیہ ملاحظہ)

حسن وقوع۔ ان اصول کو شمار کرنے کے بعد جو مختلف ممالک میں سیاسی فریق بندی کا باعث ہوئے ہیں اب ہم اس کے حسن وقوع پر بحث کریں گے۔ سیاسی فریق کی بابت سب سے پہلی بات تو یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر عوامیت کے اصول پر حکومت چلائی ہے، یعنی اگر عوام ملک کو حکومت پر تھوپا رہیت قابو دینا ہے تو سیاسی فریق بندی ناگزیر ہے۔ یہ نامکن ہے کہ ہر ایک فرد مملکت میں اس قدر سیاسی احساس ہو کہ وہ بغیر کسی قسم کی رہبری کے حکومت کے پیچیدہ معاملات کو سمجھ سکے اور ان کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکے، اور جب کسی قسم کی تنظیم ہوئی تو لامحالہ ملک والے اپنے خیالات کے مطابق چند مخصوص فرقوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ اسی سے ایک دوسری بات معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ سیاسی فریق عوام الناس کے ایک طرح کے مظہر ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے سے عوام الناس کو چند خاص راستے معلوم ہوتے ہیں جن ریل کر داپنے اپنے تئیں کے بموجب، ملک کی نجات ممکن ہے۔ ساتھ ہی چونکہ (فریق بندی) فی لفظہ باہمی مفاہمت کا نتیجہ ہوتی ہے اس لئے انتہا پسند فرقوں کی حکمت عملی بھی بہت سی

(الفیہ حاشیہ ۱۷) کا، اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ عمومی فریق جمہوریت پسند نہیں اور جمہوریت پسند نہیں بلکہ جمہوریت اور جمہوریت دونوں کی حکومت کی جان ہیں اور دونوں میں سے کوئی فریق ان دونوں سے کسی سے بھی متفرق نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں نامخص اصطلاحات ہیں اور ان کا کیا وہ تضاد داکم کی خاطر جنگی سے ظاہر ہوتا ہے جب ایک گروہ مرکزی اقتدار کے حقوق کا خطرہ سمجھتا ہے اور دوسرا جانتا تھا کہ راستوں کے اختیارات کو تقویت پہنچے۔ ان دونوں کے ناموں سے ان سے مفاد کا مطلق اظہار نہیں ہوتا۔

افراد کی حکمت عملی سے زیادہ مقبول ہوتی ہے، اور اعتدال اکثر حالتوں میں کامیاب سیاست کی جان بھگنا چاہئے۔ اس سلسلے میں آخری بات یہ کہنی ہے کہ سیاسی فریق بندی میں خصوصاً اس فریق بندی میں جس کے تحت دو بڑے بڑے فریق ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں، ہر مسئلے کے موافق اور مخالف پہلوؤں کی چھان بین ہو سکتی ہے، اور وہ بھی اعتدال کے ساتھ، اس لئے کہ فریق مخالف کو بھی یہ خیال رہتا ہے کہ میری طرف سے کوئی ایسی مبالغہ آمیز بات نہ کہی جائے کہ کل کو جب وزارت میرے قبضے میں آئے تو مجھے قائل ہونا پڑے کہ جو اعتراض میں نے دوسروں پر کیا تھا وہ خود مجھ ہی پر عائد ہو رہا ہے حقیقت میں دوزخ فریق نظام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ ایک تو ”فریق مخالف“ کو یہ خیال ہوتا ہے کہ تنقیہ حد اعتدال سے آگے نہ بڑھے دوسرے اس حالت میں جب وزارت موجودہ کو ملک کے اکثریت یا کم از کم اس کے قائم مقاموں کی تائید نصیب نہیں ہوتی تو دوسری وزارت فوراً جائزہ لینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ سیاسی فریق بندی میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔

لاہور لائسنس اپنی کتاب ”صرف دھو سیاست“ *Dasht: Grammar of Politics* باب ۹ میں کہتا ہے کہ دوزخ فریق نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں لوگ واقف حکومت کے ارکان کا انتخاب کر سکتے ہیں، درآنحالیکہ جہاں بہت سے فریق ہوں وہاں، گویا جی میں حقیقت حال کا آئینہ ہوتی ہے، لیکن حکومت ہمیشہ مکر در رہتی ہے اور اکثریت کے عدم استقلال کا شکار رہتی ہے۔

بکری حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح عمومی اصول کے تحت اس وقت انسان اس اصول سے آگے نہیں بڑھ سکا کہ اکثریت کو اقلیت پر تفوق حاصل ہو اسی طرح سے سیاسی فریق بندی کا نظام اس اصول کا ایک ناگزیر نتیجہ سمجھنا چاہیے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکثریت کا اقلیت پر تفوق اور ملک کو مختلف سیاسی گروہ میں تقسیم ہونا یہ دونوں عمومیت سے پیدا ہے اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ گویا توام ہیں، چنانچہ اچھے بول یا بُرے اولاد ہونے کی وجہ سے انھیں بہرِ پنج پالنا پوسنا پڑتا ہی ہے۔ حکومت کا ایک یا چند خاص سیاسی فریقوں کے ارکان پر مشتمل ہونے سے فی نفسہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ ملک کی ایک بڑی اقلیت ملک کی حکومت میں حصہ لینے سے محروم رہے گی، اور بقول کسی کے بہت سے ناقابلِ حکومت کے رکن بن جائیں گے اور بہت سے قابلِ لوگ حکومت سے باہر رہ جائیں گے۔

۱۹۲۵ء کے عام انتخاب کے موقع پر جنوبی انگلستان میں ساڑھے گیارہ لاکھ برلرل اور مزدوروں کی طرف سے صرف دو برلروں کا انتخاب ہوا، درانحالیکہ اس سے دو گنے سے بھی کم یعنی ساڑھے بیس لاکھ اتحادیوں نے ۱۱ ارکان کو منتخب کیا۔ اسی طرح ۱۹۳۱ء کے برلاس کے انتخابات میں عام نشستوں کے لئے ۲۵ لاکھ کانگریسی رائے دہندوں نے ۱۳۰ نشستیں اپنے قائم مقاموں سے چکیں لیکن ان کے ۱۱ لاکھ مخالف صرف ساتیستیں چکر کیے۔ عمومی ممالک میں جہاں حکومت کا دار مدار نشستوں کی اکثریت پر ہوتا ہے، یہ اعداد نہایت عبرت ناک اور سبق آموز ہیں۔ دیکھو کتنا بھجنِ نیابت مناسبہ لندن میں (نئی ۱۹۳۶ء) و ۱۱ (نئی ۱۹۳۶ء) ۵۶ فائزر، حسبِ بالا، باب ۱۵۔

علاوہ ازیں چونکہ اب تو سیاسی فریق بندی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح حکومت پر قابو حاصل ہو جائے، اور اس مقصد کے لئے بعض مرتبہ اسے اصول اختراع کرنے پڑتے ہیں جن پر زیادہ سے زیادہ تعداد اراکین متفق ہو سکے، اس لئے یہ اراکین اس قدر زیادہ ملک کے ہی خواہ نہیں ہوتے جتنے اپنے اپنے گروہ کے ہی خواہ، اور ممکن ہے کہ ملک کی ہی خواہ کی حیثیت ثانوی ہی رہ جاتی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ منظم ممالک میں جہاں ملکی خدمت انسان کے ذہنی و مذہبی کا اول ترین رکن ہوتا ہے، فرقی و فساداری ملکی وفاداری کے منافی نہیں ہوگی۔ لیکن نیم منظم ممالک میں جہاں حب وطن کے علی مظاہرہ کے لئے نسبت کم مواقع ہوں وہاں یہ خطرہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ فرقی و فساداری ملکی وفاداری کے جذبہ کو بالکل پست نہ کر دے۔

۷۔ اس کا ایک عجیب و غریب مظاہرہ ۱۹۱۴ء میں ہوا جب ان تمام مختاصم سیاسی فریقوں نے جو انگلستان کی پارلیمنٹ میں اور اس کے باہر لڑ رہے تھے، جنگ عظیم شروع ہوتے ہی آپس میں صلح کر لی اور دو دشمن بدوش آکر دشمن کے زیر کرنے میں مشغول ہو گئے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو اصولاً اس جنگ کے مخالف تھے جیسے لارڈ مورلے، لیکن انھوں نے سرے سے سیاست ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دیکھو تو لے کا خط وزیراعظم کے نام جو استعفیائے وقت لکھا تھا Morley's letter to the Prime Minister on his Resignation.

حقیقت یہ ہے کہ زمانہ حالیہ میں صرف انہی ممالک میں عمومیت کا راج باقی ہے جہاں ملک کو فریق پر ترجیح دی جاتی ہے اور جہاں سیاسی فریق بندی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے سے رہبران ملک اپنی ذات کا بھلا کرے، ورنہ روٹس، جرتنی، اٹلی اور ایسے دوسرے ممالک میں، جہاں یہ دیکھا گیا کہ سیاسی فریق بندی سے بجائے اس کے کہ ملک کی عام رائے منظم ہو، ملکی مفاد کو نقصان پہنچ رہا ہے، اس فریق بندی کا سرے سے خاتمہ کر دیا گیا ہے، یا یوں کہہ صرف برسرِ اقتدار فریق قائم رہا ہے اور دوسرے فریق کو فنا ہونا پڑا ہے۔ سیاسی فریق بندی اسی وقت سودمند ہوتی ہے جب وہ مملکت سے باہر ہو کر جھگڑنے کے بجائے، مملکت کا ایک جزو بن کر محض حکومت کے طرز کار پر جھگڑے۔ یعنی جو ملک کی یہ حالت میں شدت کے ساتھ وفادار اور صرف موجودہ حکومت کے طرز عمل کو ناقص سمجھ کر اس کی تہ کنی کے درپے ہو، اور ساتھ ہی ناؤتیکہ وہ خود برسرِ اقتدار نہ ہو جائے ان قوانین پر بار عمل پیرا رہے جو موجودہ حکومت کے زیرِ سیاست منظور کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا کہ عمل جو سیاسی فریق کے قبضے میں ہوتا ہے، یعنی وسیع ترین

۱۹۳۳ء میں سب سے سبق آموز تدریجی خاتمہ جو مختلف سیاسی گروہوں کا جرمنی میں ہوا ہے وہ قابلِ لحاظ ہے۔ دیکھو سالانہ رجسٹر "Annual Register" ۱۹۳۳ء جس میں اس خاتمہ کا مفصل ذکر دیا ہوا ہے۔

۱۹ فائزر حسب بالا

معنی میں تبلیغ، اسے بھی اس طرح استعمال کیا جائے کہ بجائے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے اس کے ذریعے سے انھیں صحیح حالات یا کم از کم صحیح نقطہ نظر سے مانوس کرایا جائے، ورنہ اگر جھوٹی تبلیغ کے ذریعے کوئی سیاسی فریق برسرِ اقتدار ہو گیا اور عہدہ قبول کر لے کے بعد وہ وعدہ وعید پورے نہ کر سکا تو لوگوں میں رفتہ رفتہ اس فریق کے خلاف بے اعتباری پیدا ہو جائے گی اور پھر گھڑی کے رقاص کی طرح عام رائے یک بیک دوسرے فریق کی جانب چلی جائے گی۔

سیاسی فریق بندی میں سب سے اہم خرابی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ”آزاد“ یا ”خانگی“ اصول کے کسی شخص کو کامیابی کی امید نہیں ہوتی تا وقتیکہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی بڑے سیاسی فریق کا تابع نہ کر دے۔ جیسے جیسے سیاسی گروہ منظم ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے انسان سیاسی گروہ کی زبردست مشین کا ایک پتیا بنتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کی وقعت شطرنج کے مہرول کی سی ہوتی جاتی ہے یہ سیاسی فریق بندی کی تکمیل ہی کا نتیجہ ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر کے وقتی انتخاب سے پہلے ہی نتیجہ نکل آتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ اس کے انتخاب کے لئے منتخب ہوتے ہیں وہ پہلے ہی سے ایک یا دوسرے سیاسی بڑے گروہ کے ارکان ہوتے ہیں اور یہ پہلے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان انتخاب کنندوں کی اکثریت وقت آنے پر کس طرف رائے دے گی۔

مثلاً یہ کوئی راز نہیں کہ موجودہ صدر فرکلن روز ویلٹ کے پہلے انتخاب کے اعلان سے کم از کم چار ماہ پیشتر یعنی انتخاب کنندگان کے انتخاب کے وقت، نہ صرف یہ معلوم (بقیہ صفحہ ۳۹۸ پر)

کلاں میں سیاسی فریق بندی اس درجہ منظم نہیں، تاہم آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے ہی لارڈ کرٹس نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ”اب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ اگر حکومت کسی بات کو طے کرے اور طے شدہ اصول پر عمل کرنے لگے تو اس میں ذرا شک نہیں کہ جو حکمت عملی حکومت اختیار کرے گی اس کی موجودہ دارالعوام لازماً توثیق کرے گا“ انگلستان میں اگر کسی ایوان میں ایک حد تک آزادانہ رائے زنی ہوتی ہے تو وہ دارالامرا ہے، اور یہاں رائے زنی کو اس لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہاں کی اکثریت اور اقلیت کا کامینہ کی ترکیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہر حال جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے، کامیاب سیاست کار سب سے اہم عنصر باجمعی مفاہمت کی قابلیت ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا ہو جس میں قابلیت مفقود ہو، یعنی جو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہی پر قانع ہو، تو پھر ایسے ان لوگوں کی شکایت نہیں کرنی چاہئے جو باجم منظم ہو کہ اسے زک پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔

بہر حال کچھ بھی ہو، جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، عمومیت اور سیاسی فریق بندی لازم و ملزوم ہیں، اور آج کل جو جگہ جگہ آمریت کا راج ہوتا جا رہا ہے وہ دراصل

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۹۹) ہو گیا تھا کہ اس میں سے اکثر نوڈ ویکٹ کے لئے رائے دیں گے، بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ملک کی اکثریت جواز سکرات کی طرف ہے، اس لئے چند ماہ میں سکرات کی ساخت اور اس کا بنیادوں میں ممالک متحدہ امریکہ میں جائز ہو جائے گا۔
 (۱۱) یہ اتھکس فائٹرز کی کتاب، جلد ۱، صفحہ ۶۲، حاشیہ پر دریا ہوا ہے۔

سیاسی فریق بندی کے خلاف ردِ عمل کا مظاہرہ ہے، اگر ملک میں امن وامان اور اطمینان ہو اور مختلف سیاسی فریق ملک کے مفاد کو پیش پیش رکھیں، نیز ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور باہمی اختلاف کو مخالفت اور غداری کا جامہ نہ پہنچاؤ تو پھر جو ان مواقع کے جوہر اور پراسے زنی کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، سیاسی فریق بندی ملک کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ لیکن اگر صورت حال اس کے عکس ہے، یعنی ملک کسی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہے، لوگوں میں ذاتیات اور باہمی بغض و عناد پیدا ہو گیا ہے اور ملک پر فریق اور ذات کو ترجیح دی جانے لگی ہے، تو پھر سیاسی فریق بندی سے زیادہ کوئی چیز قابلِ ملامت نہیں ہوگی اور ایسی حالت میں ملک کے لئے شاید وہی طرزِ حکومت بہترین ثابت ہو جس کے تحت ہر ایک فریق کی عملداری ممکن ہے اور دوسرے فریقوں کو ملک کا دشمن سمجھ کر دبا دیا جاتا ہے۔

۱۱۔ خوینبر اسلام مستعمر آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما گئے ہیں کہ ”میری امت کا اختلاف باعثِ رحمت ہے لیکن قسمتی سے یہ اختلاف آج کل اکثر صورتوں میں مخالفت ہی نہیں بلکہ محاندت کی شکل میں رونما ہونے لگتا ہے“ اور پھر وہ باعثِ رحمت ہونے کے بجائے باعثِ رحمت بن جاتا ہے۔

ضمیمہ باب ۱۷ سیاسی فرقی بندی کی تشکیلات

متعدد فرقی :- فرانس ؛ ہندوستان
دو فرقی :- انگلستان ؛ ممالک متحدہ امریکہ -
ایک فرقی :- روس ؛ اٹلی ؛ جرمنی -
(الف) جہاں بہت سے سیاسی فرقیوں کی تقریباً مساویانہ قوت ہے :-
فرانس

یہاں سیاسی فرقی بندی میں اس قدر تلون برتا جاتا ہے کہ سینات کے گروپوں کے نام مختلف ہیں اور ایوانِ دکنلاز یہ نام تقریباً ہر انتخاب پر بدلتے رہتے ہیں -
حقیقت یہ ہے کہ ایک حد تک مکمل فرقی نظام صرف تین یا چار سیاسی فرقیوں میں پایا جاتا ہے ،

اور ہر انتخاب کے بعد نہ صرف رکنیت بدلتی رہتی ہے ، بلکہ سیاسی فرقیوں کے ناموں

۱۷ فرانس کی سیاسی فرقی بندی کے لئے دیکھو "واگ" ؛ "حکومت اے کے یورپ" ۱۹۹۹
Government of Europe باب ۲۷ ، فائزر ، حسبِ بالا باب ۱۵ ، حصہ ۳ -

میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ بعض فریقوں کے ارکان کی تعداد سو سو سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں بارہ بارہ پندرہ پندرہ رکن بھی ہوتے ہیں۔ ایوانوں میں نشستوں کا انتظام بھی اسی اصول پر کیا گیا ہے کہ نسبتہ گروہ دایاں طرف اور نسبتہ افراطی گروہ بائیں طرف اور نسبتہ معتدل گروہ مرکز میں بیٹھتے ہیں۔ دراصل انگریزی یا امریکی طرز کی سیاسی فریق بندی یہاں مفقود ہے، صرف ”میلانات“ ہیں جن کی ظاہری شکل بدلتی رہتی ہے۔ جو ”فریق بندی“ ہے وہ صرف پارلیمنٹ تک محدود ہے اور اس کی رکنیت تبدیلی پذیر ہے اور عام طور پر جو امور نزاعی ہیں وہ اکثر ذاتی یا خانگی یا مقامی ہیں۔ دو فریق صورت حال اس لئے ناممکن ہے کہ فرض کیجئے کہ دایاں ارکان جو زیادہ تر ملوک یا خدمت پسند میلانات کے ہیں، برسرِ اقتدار ہو جائیں تو پھر سوال یہ ہے کہ آیا ملوک حکومت ہو جائے گی؟ دوسرا سبب چند فریقیت کا یہ ہے کہ فریسی قوم حساس اور نظریہ پرست واقع ہوتی ہے اور مختلف گروہ کسی قسم کے مستقل مفاہمت کے لئے تیار نہیں۔

بند و مثال

الغور کیا جائے تو اسی معنی میں منظم سیاسی فریق بندی کا اس ملک میں حال ہی میں ظہور ہوا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو نام نہاد غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سرسید احمد خاں دہلی کی تحریک علی گڑھ کے ایک رسالہ ”اسباب بغاوت ہند“

پر لکھا تھا جس میں انھوں نے (ہندوستان کے لئے) یہ اس وقت کے لئے اچھی
 ”تحریر پیش کی کہ ہندوستانی مجالس متفقہ میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے تاکہ
 وہ اپنے نقطہ نظر سے حکام کو مستفید کرتے رہیں۔ لیکن سیاسی فریق بندی حقیقی
 معنی میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام (۱۸۸۵ء) سے پہلے نہیں کہی جاسکتی۔
 اس ادارے کے ذریعہ سے حکومت کے سامنے باضابطہ دعویٰ پیش کئے
 جانے لگے۔ پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کی تھوڑا بہت انتخاب کا حق ۱۹۰۹ء کے
 ”مستو مارے“ اختلافات کے تحت دیا گیا اور اس کے تحت جب سوال
 کرنے اور موازنہ پر بحث کرنے کا موقعہ دیا گیا تو کہنا چاہئے کہ چند فریق
 مستقل طور پر مجالس متفقہ میں ایسے پیدا ہو گئے جن کا کام حکومتی معاملے
 پر نکتہ چینی کرنا تھا، اور چونکہ انھیں بھی حکومت میں حصہ لینے کا موقعہ
 نہیں تھا اس لئے یہ نکتہ چینی بعض مرتبہ غیر ذمہ دارانہ بھی ہوتی تھی۔ ملک
 میں حکومت کے علاوہ دو یا تین بڑے بڑے گروہ تھے ایک
 ”معتدل“ یعنی وہ جو حکومت کے ساتھ تھے لیکن خود حکومت کے ہی
 مفاد اور بقا کی خاطر اس کے ایسے تحریکات پر نکتہ چینی کرتے تھے جو ملک
 کے لئے مضر ہوں۔ اس کے رہنماؤں میں شاید سب سے ممتاز گوگلے
 تھے۔ دوسرے وہ فریق تھا جسے انتہا پسند کہتے تھے اور جو حکومت کی
 مخالفت کرنا ہی اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھا، ابتدائی زمانے
 میں اس کے رہنما سر بنیر دتا تھے، نہرچی اور تلک سمجھنے چاہئیں۔ تیسرا وہ
 گروہ تھا جو سیاسی اعتبار سے کلیہ انگریزوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھا

چوتھے بحیثیت قوم کے مسلمان تھے، جنہیں سرسید احمد خاں مرحوم نے
سیاسیات سے علیحدہ رہنے اور اپنے آپ کو سیاسی کشمکش کے لئے تیار
کرنے کے لئے کہا تھا، لیکن جو ۱۹۰۷ء سے ایک حد تک منظم ہو گئے
تھے اور کانگریس کے جتنے کے خلاف اپنی ایک جدید انجمن مسلم لیگ
کی شکل میں بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں سے مل کر مسلمانوں
کے لئے جداگانہ حقوق حاصل کریں۔ اس تحریک کو ۱۹۰۹ء میں یہ
کامیابی ہوئی کہ علاوہ عام حلقہ جات رائے دہی کے مسلمانوں کو ہر مجلس
مقتنہ کے لئے چند جداگانہ نشستیں مل گئیں۔ اس طرح ایک جدید سیاسی
فرق یعنی مسلم فرق کا اضافہ ہوا جس کا مطلع نظریہ ہو گیا کہ سب سے پہلے
مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اس لئے کہ ان کی مستقل قیادت
ہے اور اکثریت سے اس کا مفاد جداگانہ ہے۔ جنگ عظیم کے دوران
میں لوگوں کے قلوب میں نئی نئی انگلیں اور آرزوئیں پیدا ہوئیں۔ اور ۱۹۱۵ء
ہی سے خود مسلمانوں کے خیالات میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا، چنانچہ وہ
روز بروز کانگریس کی طرف آنے لگے، یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں کھنواٹے کے
نظام پر کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان وہ عہد آفریں سمجھوتہ ہوا جسے عرف
عام میں ”کانگریس لیگ سمجھوتہ“ کہتے ہیں۔ اس سمجھوتے کے بموجب کانگریس
نے مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب کو تسلیم کر لیا اور مسلمان اکثر باقی ماندہ
ملقہ جات انتخاب میں حصہ لینے سے دست بردار ہو گئے۔ اس کا فوری
تجربہ یہ ہوا کہ ہندوؤں مسلمانوں کے وہ طبقے جنہیں سیاسی مس تھا، باہم متفق

ہو گئے اور ۱۹۲۱ء کے عدم تعامل کے زمانے میں دونوں کا سیاسی مقصد بظاہر ایک ہو گیا، وہ یہ کہ ملک سے برہمنی اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ بہت جلد ثابت ہو گیا کہ اتحاد کا یہ مظاہرہ محض ایک خواب ہے، حقیقت میں ہندو مسلمانوں کے درمیان کی خلیج وہ دراصل وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کا انتخاب اب صرف مسلمانوں کی طرف اور ہندوؤں کا صرف ہندوؤں کی طرف ہو گیا، اور باوجودیکہ بہت سے اتحاد پسند رہنماؤں مثلاً مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ہاتھما گاندھی، ہندو موٹی لال نہرو وغیرہ نے ہندو مسلمانوں کا دل ملانے کی کوشش کی، لیکن اس اتحاد سے پانچ چھ سال بعد ہی مسلمان بحیثیت قوم کے کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔

اس وقت متفقہ جماعتوں میں جو سیاسی فریق ہندی ہے وہ سیال حالت میں ہے اور بنگال، پنجاب، آسام، بمبئی کی اسمبلیوں میں تو بارہ بارہ پندرہ پندرہ سیاسی گروہ ہیں۔ فرانس کی طرح یہاں کی مجالس میں بھی فریق ان کے اصول اور کنیت برابر بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں صرف چند اہم ترین سیاسی گروہوں کے اصول کا ذکر کرنا کافی ہو گا:-

(۱) سب سے منظم گروہ کانگریس کا ہے جس نے کئی سال کے عدم تعامل کے بعد از سر نو جماعت ہائے مقننہ میں شرکت منظور کر لی ہے اور جدید قانون حکومت ہند کی رو سے جو صوبہ داری جماعتیں مرتب ہوئی ہیں ان میں سے متحدہ میں اس کی اکثریت ہے۔ یہ جماعت انتخابات کے علاوہ گورنری صوبوں کی اسمبلیوں میں کانگریسی فریق ۱۔ بقیہ نوٹ مشابہ

میدان میں نئے قانون کا خاتمہ کرنے کے لئے آئی تھی، چنانچہ جن صوبوں میں اس کی اکثریت ہوئی اور گورنروں نے اسے وزارت ترتیب دینے کی دعوت دی تو اس کی طرف سے یہ جواب دیا گیا کہ تاوقتیکہ گورنر اپنے اختیار خصوصی کو استعمال نہ کرنے کا وعدہ نہ کرے اس وقت تک ہم وزارت ترتیب نہیں دیں گے۔ آخر کئی مہینے کی کشمکش کے بعد جب آخر کار جولائی ۱۹۳۵ء میں کانگریس نے چھ صوبوں میں، جہاں اس کی اکثریت تھی، قلمدان وزارت سنبھال لئے، اور اس وقت سے اس وقت تک یہ ایک بدیہی واقعہ ہو کر (۱۹۳۵ء کے ابتدا کے جب سیاسی قیدیوں کے چھوٹے پر ایک نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی) کسی صوبے کا گورنر بظاہر کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا بلکہ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ گورنروں نے اپنے مخصوص اختیار سے بھی (جو قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء میں انھیں دئے گئے تھے) کمزور کشتی اختیار کر لی ہے۔

بقیہ نوٹ: کانگریسی اکثریت: - مدراس، ۱۵۹؛ صوبہ متحدہ، ۱۳۵؛
 بہار، ۹۹؛ اڑیسہ، ۵۶؛ صوبہ وسط و براہ، ۶۱؛ بمبئی، ۸۹۔
 کانگریسی اقلیت: - صوبہ سرحد، ۱۹؛ سندھ، ۱۶؛ آسام، ۳۸،
 بنگالہ، ۵۴؛ پنجاب، ۱۵۔

سرحدی صوبہ آسام میں کانگریسیوں نے بعض دوسرے فریقوں کے ساتھ سمجھ کر کے خود اپنی سیادت میں کا سینے ترتیب دے لئے ہیں اور سندھ میں جو مخلوط وزارت ہے گورنر کانگریسی نہیں لیکن اس کا میدان بہت کچھ کانگریسی اصول کی طرف ہے۔
 لہذا ان ذمہ داروں کے لئے دیکھو ضمیمہ باب ۱، بالا۔

(۲) مسلم لیگ ۱۹۳۷ء تک مسلمان بحیثیت ایک سیاسی گروہ کے اتنے منظم نہیں تھے جیسے کانگریس، اور ان ہی طرح طرح کے تقریریں پڑے ہوئے تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں ایک نئی روح پھونک دی اور بمبئی، لکھنؤ، کلکتہ اور ٹیٹنہ کے جلسوں سے اسے وہ استحکام اور تفریق پیدا ہو گیا جو اس سے پہلے نظر نہ آتا تھا۔ کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ نے بھی کانگریس کی طرح ہندوستان کی مکمل آزادی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا لیکن ایسا ہندوستان جو آزاد دھوبہ داری ریاستوں کا ایک وفاقیہ ہوا جس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو۔

(۳) سکھ۔ یہ صرف پنجاب میں پائے جاتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنی ان کی آبادی پنجاب میں ہے اس مناسبت سے زیادہ حقوق انھیں ملیں۔

(۴) یورپی و ہندوستانی عیسائی۔ ان کی تنظیم نسبتاً مکمل ہے۔ گوانڈا میں یہ حکومت کی گورنر تقلید کرتے تھے اب رفتہ رفتہ انھیں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اس ملک کے مفاد کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہے، خواہ اس کا حصول حکومت کا ساتھ دینے میں مضمر ہو یا مخالفت کرنے میں۔

(۵) زمیندار۔ ان صوبوں میں جہاں زمینداری اور جاگیر داری کا طریقہ رائج ہے، انھوں نے بھی اپنے فرین بنائے ہیں۔ حال میں ایک رجحان حکومت اور عوام دونوں کے چند خاص طبقتوں میں پایا جاتا ہے کہ ان کے اقتدار اور آمدنی میں کمی کی جائے، چنانچہ انھوں نے اپنی حفاظت کی خاطر یہ جتنے بنائے ہیں۔

انتہائی سزا کا معیار دیا جوتا ہے اور اس معیار کے پہنچنے تک جتنے دارج سزائے کے ہیں وہ سب کے سب عادل کے اختیار میں ہوتے ہیں۔

الغرض گونظامر عادل قانون کی محض تاویل اور اس کا انطباق و اعات پر کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طرح کا قانون ساز بھی ہوتا ہے، اور بعض ممالک میں تو اعلیٰ عدالتوں کے تصفیوں کی ماتحت عدالتیں اسی طرح پابندی کرتی ہیں جیسے محکم قانون ساز کے رائج کردہ قوانین کی۔

انسان کا خاصہ ہے کہ اگر اس میں دانائی اور فراست ہو تو وہ دوسروں کے تجربہ سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ تاکہ اسے ایسے امور میں نا تجربہ کاری اور ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے جن میں دوسرے کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب اگر کسی عدالت کے سامنے کوئی ایسا مقدمہ آئے جس کے مماثل کسی اعلیٰ عدالت میں کوئی مقدمہ پیش ہو کر تجویز پا چکا ہو تو اس دوسری عدالت کے لئے نہ صرف اس میں آسانی ہوگی کہ وہ اس پیشرو تجربہ کا پاس کرے اور اس کا اتباع کرے بلکہ سہولت اور کیسانی کے خاطر یہ بہتر ہوگا کہ اس اعلیٰ عدالت کا تصفیہ ماتحت عدالتوں کے لئے بمنزلہ نظیر سمجھا جائے، یعنی آئندہ

مثلاً چور کی سزا زیادہ سے زیادہ سات سال ہے اور اس کے اندر کسی موت کے لئے قید کا اختیار حاکم عدالت کو ہے۔ برطانوی ہند میں تو قتل کی سزا بھی مقرر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ سزائے موت ہے۔ عدالت اس سے جتنی کم چاہے سزا دے سکتی ہے۔ اس کے لیس انگلستان میں قتل عمد ثابت ہو تو موت کی سزا لازم ہے۔

(تاؤنٹیکل قانون ہی تبدیل نہ ہو جائے) اس کی ہر ماتحت عدالت پر دی گئی ہے یہی نظائر کا اصول ہے جس کی وجہ سے بعض مرتبہ عدالت عالیہ کے ارکان کو "قانون ساز" کا لقب دیا جاتا ہے اس لئے کہ وہ تنہا اپنی کریپوں پر بیٹھ کر ایسی تجاویز شائع کرتے ہیں جن کا رتبہ آئندہ کے لئے وہی ہوتا ہے جو باضابطہ مقننہ میں بنے ہوئے قوانین کا۔

وفاقی عدلیہ۔ علاوہ ازیں بعض ممالک میں، بالخصوص ان ممالک میں جہاں وفاقی طرز حکومت رائج ہے اور جہاں اجزاء ملکیت اور اعضاء کے حکومت کے حدود اختیار کے مابین نزاع کا امکان ہے، وہاں بعض مرتبہ عدالت عالیہ کو یہ طے کرنے کا اختیار ہوتا ہے کہ جو مسئلہ نزاعی ہے وہ کس ادارے کے دائرہ اقتدار میں ہے۔ یہ اختیار سب سے ممتاز حیثیت سے ممالک متحدہ امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ جہاں (کسی نزاعی امر کے مقدمہ کی شکل میں پیش ہونے پر) عدالت عالیہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ طے کرے کہ جس قانون کے احاطے میں مقدمہ آتا ہے اس کی منظوری کا اختیار ریاستی جماعت مقننہ کو حاصل ہے یا مرکزی کانگریس کو۔ اگر غور کیا جائے تو وفاقیوں کے دساتیر دراصل اجزاء اور مرکز کے مابین ایک طرح کے عہد نامے ہوتے ہیں

یہ طرز عمل زیادہ تر سلطنت برطانیہ اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔ اس پر عام بحث کے لئے دیکھو گئے: "قانون کی اصل اور اس کے ماخذ" Gray: *Nature and Sources of the Law*.

اور عدالت عالیہ کا یہ اختیار دراصل ان عہد ناموں کی تاویل کا اختیار ہے جس کے ذریعے سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ دستور سازوں کا رجحان نزعی معاملے کے متعلق کیا ہوگا۔ یہ کیفیت فردی مملکتوں میں نہیں پائی جاتی جہاں جملہ اختیارات کا ماخذ مرکزی مقننہ ہوتی ہے، اور یہاں عدالتوں کو کسی قسم کے دستوری نزاعات کا فیصلہ کرنا نہیں ہوتا۔ تاہم یہ امر یقینی ہے کہ جب کوئی مسئلہ ایسا ہوتا ہے جس میں کوئی دستوری امر نزعی ہو جیسے فرد اور حکومت کے درمیان تنازعات، تو ایسی حالت میں عدالت کو تاویل و تجویز کے بہت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

یہ سب امور میں جن سے ہمیں محکمہ عدلیہ کی دستوری اہمیت کا انداز ہوتا ہے۔ عادل نہ صرف قوانین کی تاویل کرتا ہے اور اسکا انطباق نزعی مسائل پر کرتا ہے بلکہ بعض حالات کے تحت ایک نوع کر کے قانون سازی بھی کرتا ہے، اور بعض مرتبہ دستوری معاملات پر نہ صرف رائے زنی کرتا ہے بلکہ اس کا حکم ناطق سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عہدہ دار کے انتخاب اور شرائط خدمت میں بہت ہی ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا، اور جہاں تک انسانی امکان کا تعلق ہے ہمیں اس کے لئے ایسی کیفیات پیدا کرنی پڑیں گی کہ وہ کسی طرح پر دوسروں کا دست نگر نہ رہے اور جو کرے نہایت درجہ آزادی اور پوری دیانت داری کے ساتھ کرے تاکہ قانون کے تحت کسی کا بھی حق تلف نہ ہو۔

ججوں کا تقرر۔ انرض سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے

وہ یہ ہے کہ عادل کا تقرر کون کرے اور کیسے کرے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر کہیں ”تفریق اختیارات“ کے مسئلے کی حقیقی معنی میں اہمیت ہے تو وہ عدالت کا محکمہ ہے اور اس کی بہت ضرورت ہے کہ عادل بیرونی دباؤ سے بالکل آزاد ہو۔ کہتے ہیں کہ انگلستان کی آزادی کی سب سے قوی بنیاد قانون بندوبست سائنس ہے جس کے بموجب ”حسن کارکردگی“ کے دوران میں عادلوں کو کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا، اور وہ صرف اس وقت علیحدہ ہو سکتے ہیں جب پارلیمنٹ کے دونوں ایوان متفقہ طور پر بادشاہ کے حضور میں کسی عادل کے خلاف محضر پیش کریں۔ بعض ممالک مثلاً سوئٹان اور ممالک متحدہ امریکہ کی دو تین ریاستوں میں عدالت عالیہ کے ارکان کا تقرر مجلس مقننہ کرتی ہے۔ سوئٹان کو نظر انداز کر دیا جائے (اس لئے کہ یہاں کے جملہ ادارات کی ایک خاص نوعیت ہے اور مقننہ عالمہ عدلیہ سب کے سب اعضاء حکومت دراصل مقننہ عموم کے عہدے سمجھے جاتے ہیں) تو صرف ممالک متحدہ امریکہ کی چند ریاستیں ہی رہ جائیں گی جہاں عادلوں کا اس طرح سے تقرر کیا جاتا ہے۔ اس طرز تقرر اور عام انتخاب میں کوئی خاص فرق نہیں، اس لئے کہ بالخصوص ان ملکوں میں جہاں سیاسی فریق بندی منظم ہے، ان عادلوں کا تقرر ان کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے ہو گا کہ

اُن کی قانون دانی کی وجہ سے، اور جہاں یہ انتخاب صرف ایک محدود مدت (مثلاً دو چار سال کے لئے) ہوتا ہو وہاں تو اتنی ہی حد سے گزر جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے کہ اول تو تقرر کی بنیاد ہی غیر قانونی جذبات ہوئے، اور پھر تقرر کے بعد بجائے بے لوث عدلی خدمت کے عادل کو یہ خیال نگارہ کہ کسی نہ کسی طرح اپنے مویدوں کو خوش رکھے، تاکہ آئندہ انتخاب کے وقت وہ اپنی پیٹھ نہ دکھائیں۔ دراصل اُن ہی مالک میں عادل سب سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہوتے ہیں جہاں انہیں استقوال نصیب ہوتا ہے۔

عام انتخاب اور تقرر بذریعہ جماعت متفہنہ کو نقصان رساں تصور کرنے کے بعد اب دو ہی صورتیں باقی رہتی ہیں، یعنی ایک تو یہ کہ جماعت عامہ نامزد کرے اور دوسرے یہ کہ نامزدگی کا اختیار خود اعلیٰ ترین عدالت یا اس کے افسر اعلیٰ کو حاصل ہو۔ سب سے پہلے تو عدالت عالیہ کے طرف سے نامزدگی کو لیجئے۔ آج کل کے زمانے میں یہ بات گویا طے شدہ سمجھنی چاہئے کہ کسی پیشے کے کارکن کے انتخاب کے لئے اس پیشے والوں کو تقرر نہیں کیا جاتا، تاکہ جہاں تک ہو سکے دسوت نظر سے کام لیا جائے۔ عموماً یہ کہ دونوں طریقوں، یعنی کاہنی طریقے اور صدر قری طریقے دونوں میں کسی فوجی یا بحری عہدے کے لئے جو انتخاب ہوتا ہے اس کی بابت علی العموم حکم ناظر کا اختیار اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو نہ سپاہی ہوتا ہے نہ ملاح، بلکہ جو اپنی فراست و درایت کی وجہ سے حکومتی کاروبار کا صدر

ہوتا ہے۔ خود انتخابی کا طریقہ (کم سے کم عمومیت پسند ممالک میں) پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ عادلوں کے انتخاب کے وقت یہ بات صرف تجربہ کار عادل ہی سمجھ سکتے ہیں کہ غلال امیدوار کی قانونی قابلیت کتنی ہے، اور اس میں مختلف قوانین کو حالات مقدمہ پر مطبق کرنے کی کس حد تک اہلیت ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی عمر بھر ایک ہی کام کرتے کرتے ممکن ہے کہ وسعت نظر میں کمی پیدا ہو گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ گواہ تحت عادلوں (منصفوں) وغیرہ کا تقریقاً عدالت عالیہ کی سفارش سے ہوتا ہے، لیکن اس کی بابت آخری حکم کا اختیار جماعت عادلہ کے ارکان ہی کو حاصل ہوتا ہے، اور وہی ان کی ترقی کے بھی ذمہ دار ہوتے ہیں۔

لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ عادل جہاں تک ہر مسئلے عالمہ کے دباؤ میں نہ آئیں، اور اس کے لئے مختلف ممالک میں مختلف طریقے رائج ہیں۔ انگلستان میں تو، تاؤنٹیکہ دوزں اپوان ہائے پارلیمنٹ بادشاہ کے سامنے محضر پیش نہ کریں، عدالت عالیہ کے ارکان کو برخاست نہیں کیا جاسکتا، اور ممالک متحدہ امریکہ میں نہ صرف یہ بلکہ ان کی

۱۔ اس اصول کے خلاف بریٹش شمالی آئرلینڈ کی ہے جہاں لارڈ چانسلر عدالت کا یا تو خود تقرر کرتا ہے وہ اس کی سفارش پر ان کا تقرر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ لارڈ چانسلر صرف عادل ہی نہیں بلکہ وہ کاؤنسلر آئرلینڈ کا ایک ممتاز رکن اور دارالامرا کا صدر بھی ہوتا ہے۔

تنخواہ میں کسی حالت میں کمی نہیں کی جاسکتی تاکہ ان پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا جاسکے ترقی یافتہ ممالک میں عادل کا رتبہ اس قدر بلند تصور کیا جاتا ہے کہ شاہی ایسا مہمان ہو گا کہ عدالتِ عالیہ کا کوئی رکن حکومت مستعدی تو کیا، وزیر بھی بننا پسند کرے، شاید اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر بعض علاقے سیاست کا خیال ہے کہ بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ نہ لو کوئی وزیر کبھی عادل بنایا جائے نہ کسی عادل کو کبھی کوئی عاملانہ خدمت دی جائے۔

معاوضہ خدمت۔ عادلوں کی آزادی رائے کی ایک ضمانت یہ بھی ہونی چاہئے کہ انھیں جو معاوضہ ملے وہ اتنا ہو کہ وہ کسی قسم کی ناجائز آمدنی کے خیال سے بھی محفوظ رہیں۔ عدالتوں میں جو دیوانی اور فوجداری کے مقدمے آتے ہیں ان میں فریقین یعنی مدعی اور مدعا علیہ دل کھول کر خرچ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اور بعض مقدمات میں تو کچھ ایسی ضد پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ تعین مقدمے سے بدرجہا زیادہ رد یہ خرچ کر دیتے ہیں، چنانچہ یہ گویا ایک راز آشکارہ ہے کہ جو گواہ مختلف مقدمات میں پیش ہوئے ہیں ان کی ایک بہت بڑی تعداد مصنوعی ہوتی ہے اور جو فریق انھیں پیش کرتا ہے انھیں معاوضہ دینا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مقدمہ جیتنے کے لئے مدعی اور مدعا علیہ کس طرح اچھے وکیلوں کی خدمات حاصل کرنے کے لئے بیش بہا معاوضے دیتے ہیں۔ ان حالات اور اس فضا کے تحت عادل کو خواہ اسے ہر یا مات

نہ صرف ایک عمدہ قانون دیا اور صاحب فراموش ہونا چاہئے بلکہ اس کے کردار کا معیار بھی نہایت بلند ہونا چاہئے تاکہ کسی قسم کی ترغیب و تحریص اسے انتہائی غیر جانبداری کی شاہراہ سے سر مو بھی نہ ہٹا سکے اور حکومت کو اس قسم کا انتظام کرنا چاہئے کہ ہر درجہ کے عادلوں کی تنخواہ اپنے اپنے طبقے کی عام طرز معاشرت کے اعتبار سے وافر ہو۔ یہی وہ اصول ہے جس کے تحت انگلستان میں لارڈ چانسلر یعنی میر عدل کی تنخواہ وزیر اعظم کی تنخواہ کی برابر ہے اور خود برطانوی ہند میں مختلف عدالت ہائے عالیہ کے چیف جسٹس کی تنخواہ اکثر غریب دارین حکومت سے زیادہ ہوتی ہے۔

اعزازی عمال۔ یہاں ایک خاص ادارے کی طرف توجہ مبذول کرنی ہے، اور یہ ادارہ اعزازی عمال (آزیری جسطیٹوں) کا ہے۔ اعزازی عمال بہت سے ممالک میں مقرر کئے جاتے ہیں اور ان میں سے اکثر زمیندار یا تاجر ہوتے ہیں جن کی اپنے اپنے ضلع میں وقعت ہوتی ہے اور ساتھ ہی جنھوں نے حکومت کی سیاسی خدمت کی ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اعزازی عامل بنانا دراصل ایک طرح کا معاوضہ یا خطاب ہے جسے حکومت زمینداروں یا تاجروں کو دیتی ہے جو کم از کم ابتدائی وقتی خطاب کے اہل نہیں سمجھے جاتے لیکن ساتھ ہی جو آگے چل کر (بشرط وفاداری و کارکردگی) خطابوں کے امیدوار بن جاتے ہیں۔ اس موقع پر سیاسی خطابوں یا دوسرے خطابوں پر بحث نہیں کی جاسکتی، لیکن صحیح سیاسی نظر سے اسے کسی سیاسی خدمت کے معارف سے کسی شخص کو "آزیری جسطیٹ" یا "آزیری اسٹنٹ کلرک"

بنانا یقیناً ان تمام اصول سے روگردانی کرنا ہے جن پر محکمہ عدلیہ ہی ہونا چاہئے۔ اکثر اعزازی مجسٹریٹ ابتدا میں قانون سے واقف نہیں ہوتے اور اس سے واقفیت کے حاصل کرنے میں انھیں مہینوں برسوں لگ جاتے ہیں جس دوران میں وہ میسوں مقدموں میں انصاف کا خون کر چکے ہوتے ہیں، ان کے پیشکار علی العموم جہاں دیدہ ہوتے ہیں اور چونکہ حکومت کی طرف سے انھیں اکثر معاوضہ نہیں ملتا (گو خود مجسٹریٹ صاحب فرید خوشنودی حکام کی عوض سے آتے ہیں) انہیں جیب سے کچھ دیتے ہوں) اس لئے وہ اہل معاملہ سے لینے دینے میں ذریعہ نہیں کرتے، خصوصاً اس لئے کہ اعزازی حاکم عدالت خود کم علمی کی وجہ سے نگراں نہیں کر سکتا، اور چونکہ عدالت عام طور پر کسی قصبے میں ہوتی ہے اس لئے پیشکار کو کسی دوسرے کا در نہیں ہوتا۔ آخری بات یہ ہے چونکہ مجسٹریٹ صرف چار یا پانچ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں، مستقل نہیں ہوتے، اس لئے انھیں کسی قسم کے آزادانہ طرز عمل کا موقع نہیں ملتا بلکہ بعض بالا تر حکام کے کہنے پر چلنا اپنے لئے ضروری تصور کرتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کے بعد ہندوستان کے بعض صوبوں میں اس مسئلے پر خاص طور پر غور کیا گیا ہے، مثلاً صوبہ متحدہ میں شریع میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جسے اعزازی عدالت کے نام پیش کرنے کا اختیار ہے۔ نیز ان کا دائرہ اقتدار ان کی زمینداری یا

اللہ اس مسئلے پر لاسکی نے..... نہایت اچھی بحث کی ہے "صرف، و غیر سیا سیاست"

ذاتی اثر کے رتبے سے باہر رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کا انیس ہے کہ اس اصول کے تحت جو عمل مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر تقرر میں بھی ان کی سیاسی خدمات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ سیاسی خدمت خواہ بطانوی حکومت کی ہو یا کانگریسی حکومت کی، اس کی نوع ایک ہی ہے اور صیغہ عدالت میں تقرر یا ترقی میں مہر نہیں ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ کم از کم ہندوستان میں بھائے ان ”اعوازی“ عمال کے مناسب یہ ہے کہ قدیم پنچائتی طریقے کو آج کل کی کیفیات کے سانچے میں ڈھال کر از سر نو رائج کیا جائے تاکہ اس کے ذریعے سے ایک طرف تنخواہ دار عالموں اور عادلوں کے کام میں کمی ہو اور دوسری جانب ان کے ذریعے سے ملک کی معاشرتی حالت میں ترقی ممکن ہو۔

انتظامی عدالتیں - جیسا پہلے ایک باب میں بیان کیا گیا ہے، بعض ممالک، خصوصاً ان ممالک میں جہاں موٹسکیو کے نظریہ تفریق اختیارات کا اثر پڑتا ہے، یا جن میں فرانس کی طرح ”ضابطہ نیولین“ کا رواج ہوا ہے، علاوہ معمولی عدالتوں کے انتظامی عدالتیں بھی ہیں جن میں وہ مقدمات پیش ہوتے

۱۹۱۹ ہندوستان میں پنچائت کا طریقہ صدیوں سے جاری ہے۔ اگر اس کو پیسے کی سی توت دی گئی تو تنخواہ دار عادلوں اور عالموں کا کام بھی گھٹ جائے گا اور مقامی سواراج کے لئے گاؤں واسے تیار بھی ہوگی گئے پنچائتوں کے عام مشورون کے لئے دیکھو راجہ کمال کر جی: ”مشق میں عمر میں“ Radha Kamal Mukerjee: Democracies in East. (۱۹۲۳ء) باب ۱۵۔

۱۹۱۹ دیکھو بالا، باب ۱۲۔

ہیں جن میں ایک فریق حکومت کا کوئی رکن ہوتا ہے، بشرطیکہ نزعی امر اس سے دوران فرائض منصبی میں سرزد ہوا ہو۔ دراصل یہ عدالتیں اس خیال کی وجہ سے قائم ہوئی ہیں کہ جس طرح عالمہ کو عدلیہ پر اختیار نہ ہونا چاہئے اسی طرح سے عدلیہ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ارکان عالمہ کے افعال پر تجویز دے، چنانچہ انتظامی عدالتوں میں اکثر عہدہ داران عالمہ میں بیٹھتے ہیں، اور سب سے بڑی عدالت انتظامی کا صدر عام طور سے میجر جنرل عدالت عالیہ نہیں بلکہ وزیر عدلیہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یوں تو انگلستان کی طرح ”قانون کا راج“ ہے یعنی معمولی سے معمولی ذریعہ ہند اور حکومت ہند کو کسی مقدمے میں مدعا علیہ نہالیتا ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مال کی عدالتیں ایک طرح پر انتظامی عدالتیں بھی جاسکتی ہیں اس لئے کہ مالگداری اور رگان کی تشخیص جو عمال حکومت کرتے ہیں وہی ان کے متعلقہ مقدمہ مات میں ”محکمہ بھی کرتے ہیں۔ انتظامی عدالتوں کے قیام میں دو امور قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ محض غیر پیشہ در اشتخاص جب قانونی حکم کرنے بیٹھیں گے تو وہ قانون کی ”خود دہ قانون“ انتظامی“ ہی کیوں نہ ہو ”صحیح“ تاویل کر بھی سکیں گے نہیں دوسرے یہ کہ ایسی عدالتیں جو علانیہ جماعت عالمہ کے ارکان کے ماتحت ہیں اور یہ ارکان یا ان کا کوئی ماتحت مقدمہ زیر بحث میں مدعی یا مدعا علیہ ہے صحیح معنی کی غیر جانبدارانہ انصاف بھی کر سکتی ہیں؟ پہلا امر تو اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ جن مالک میں ”انتظامی عدالتیں قائم ہیں“ ان انتظامی قانون بھی راجح ہے جو علی العموم سیدھا سادہ ہوتا ہے اور اس میں پیچیدگی نہیں ہوتی۔ دوسری بات کا

جواب یہ ہے کہ جانبداری اور غیر جانبداری، انصاف اور بے انصافی کا معیار ملک ملک اور عدالت عدالت میں مختلف ہے، اور انتظامی عدالتوں کے مرکز یعنی فرانس میں جہاں تک علمائے سیاسیات کی رائے کا تعلق ہے، غیر جانبداری کے شکایات زیادہ سننے میں نہیں آتے۔

قانونی مساوات۔ اس کے علاوہ اس طرز عمل کے خلاف یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ جن ملک میں انتظامی قوانین کا رواج اور انتظامی عدالتوں کا قیام ہے وہاں قانونی مساوات کے اصول پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اگر اس مسئلے پر نظر غائر ڈالی جائے تو یہ افسوسناک امر محسوس ہوگا کہ ان نام نہاد ملک میں بھی جہاں کا تمام ضابطہ اسی "قانونی مساوات" کے اصول پر مبنی ہے، حقیقی مساوات بالکل غیر موجود ہے۔ اول تو عام طور پر بیچارے غریب آدمیوں کے پاس اتنا روپیہ ہی کہاں ہوتا ہے کہ وہ عدالت میں چارہ جوئی کریں۔ اگر کوئی شخص کسی غریب کو زد و کوب کرے تو عام طور پر اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہیں کی جاتی، لیکن امیر پر ہاتھ اٹھانے کا نتیجہ نہایت تلخ نکلتا ہے۔ یہی کیفیت یوگانی مقدرمات کی ہے۔ اس لئے کہ کوئی غریب آدمی مدعی ہو تو رسوم عدالت اور وکیل کی فیس کے لئے روپیہ کہاں سے لائے اور بدعا علیہ ہو تو وہ اسی میں بہتری سمجھتا ہے کہ مدعی سے معاوضہ کر لے اور قسط بندی کر لے، جبکہ اس کے کہ اس سے

یہ انتظامی قانون کے مسئلے کے لئے دیکھو داسی۔ "قانون دستور" : *Discry : Law*

of the Constitution. باب ۱۲ -

لکر اپنے آپ کو بر باد کرے۔ اسی طرح کسی امیر پر کوئی فوجداری مقدمہ قائم ہو تو بالفرض عدالت پرسی قسم کے اثرات نہ ہونے کی حالت میں بھی اودہ ایک اعلیٰ درجہ کے وکیل کی خدمات خرید سکتا ہے جو پوشیدہ قانونی پہلوؤں کو آشکارا کر کے اور قانونی دائروں پہنچ کر کام میں لاکر اسے چھڑائے، اور اگر بالفرض اس امر پر جانہ ہو بھی جائے تو اس جرم کا (بوجہ اس کی دولت کے) اس پر کہیں کم اثر پڑے گا بہ نسبت اس غریب کے جس کے پاس دو وقت کی روٹی بھی نہیں اور جس کے لئے منجھ فتنہ روپیہ کی حقیقت ایک قارون کے خزانے سے کم نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس نقطہ نظر سے شکل سے کسی ملک کا قانون ہو گا جس کی تادیل مدعا علیہ کی پونجی کے اعتبار سے کی جاتی ہو، اور تاوقتیکہ جج اس کا لحاظ رکھیں، مساوات قانونی کے راگ الاپنا بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔

جیوری۔ قانونی مساوات کی خاطر ایک اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یعنی ججائے اس کے کہ صرف ایک عادل مقدمے کا تصفیہ کرے، اس تصفیہ میں عوام الناس کے ایک چھوٹی سی تعداد اسے مدد دیتی ہے، جسے عدت عام میں جیوری کہتے ہیں۔ جیوری میں اکثر متوسط طبقے، اور زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں ادلے طبقے کے بھی افراد شریک ہوتے ہیں اور مقدمہ ختم ہونے پر عادل ان سے واقعہ زیر بحث کے بابت استفسار کرتا ہے، جیسے کہ آیا ملزم زید کے گھر میں گھسایا نہیں اور جودی کے ارادے سے اسے بندوں کا نشانہ بنایا یا نہیں۔ اس جیوری کو مقدمے کے قانونی پہلو سے تعلق نہیں ہوتا اور اس کے تصفیہ کا عادل خود کلیتہً مختار ہوتا ہے۔ برطانوی ہند میں ایک اور طریقہ ایسروں کا رائج ہے، وہ یہ

کہ ہرگز مقدمہ میں تین یا چار غیر سرکاری اصحاب بلائے جاتے ہیں اور مقدمے کے اختتام پر (جیوری کی طرح) ان سے راقعات مقدمہ کی بابت رائے لی جاتی ہے۔ ایسروں اور جیوری کے درمیان جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ جج ایسروں کی رائے سے نہایت آزادی کے ساتھ اختلاف کر سکتا ہے، درآنحالیکہ وہ جیوری کی رائے سے عام طور پر اختلاف نہیں کر سکتا۔ عام خیال ہے کہ ان شرائط کے تحت ایسی سروس میں کام کرنا ایک بڑی حد تک تفسیع اذقات ہے اس لئے کہ اگر مقدمہ کی سماعت کے بعد جج محض اپنے ذاتی خیال کی بنا پر جو چاہے کر سکے تو پھر ان لوگوں نے جو ایسی سروس کی خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وقت کو خرچ کیا ہے ان کے دامن رہنے سے کیا فائدہ ہوا۔ جیوری کا طریقہ جن محکمہ میں رائج ہے وہاں یا تو اہلایاں جیوری کا مکمل اتفاق رائے لازمی سمجھا جاتا ہے ورنہ محض کثرت رائے اس میں شبہ نہیں کہ چونکہ جیوری رائے قانونی داؤں پیچ سے واقف نہیں ہوتے اور مقدمہ پوری قانونی پیچیدگی کے ساتھ ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے اور عالمی نقطہ نظر خصوصاً اہم مقدمات میں بالکل صریح اور عیاں ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۲ (یا ۹) آدمیوں کا ایک ہی نقطہ نظر متفق ہونا بعض مرتبہ نہایت ہی دشوار ہوتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب مقدمہ پیچیدہ ہو یا اس میں ایسے سلی امتیازات ہوں جو نقطہ نظر کو تبدیل کرنے کے لئے کافی ہوں، اور کسی پیچیدہ مقدمے میں ۱۵ شہادت ملک آنجنابی کے مشہور مقدمہ بشارت میں انگریز اہل جیوری سزایابی کے موافق تھے اور ہندوستانی برادرت کے۔

از سر نئی جیوری کے سامنے مقدمہ چلایا جانا نہایت درجہ تکلیف دہ امر ہو گا۔ یہ مسئلہ کہ جیوری کا طریقہ کس قسم کے مقدمات میں جاری کیا جائے، مختلف ممالک میں مختلف طریقے پر طے ہوا ہے۔ انگلستان اور برطانیہ میں جیوری جملہ اہم مقدمات میں استعمال ہوتی ہے، خواہ وہ دیوانی کے متعلق ہوں یا فوجداری کے باقی جن جن ممالک میں جیوری رائج ہے وہاں یہ صرف اہم فوجداری کے مقدمات میں بٹھائی جاتی ہے۔

جن ترقی یافتہ ممالک میں جیوری کا رواج عام نہیں وہاں یہ قاعدہ ہے کہ عام طور پر معمولی مقدمات بھی ایک عادل کے سامنے نہیں بلکہ متعدد عادلوں کے سامنے ”جلسہ کالمہ“ کے سامنے پیش ہوتے ہیں جس میں کم از کم تین عادل ضرور ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا وسیع ترین رواج فرانس میں یا ان ممالک کیا گیا ہے

جلسہ جوری کا طریقہ مختلف ممالک میں :-

۱۔ انگلستان میں دیوانی مقدمات میں جیوری سے کام لینا اختیاری ہے۔ اہم فوجداری مقدمات میں ایک فہرست میں سے ہر مقدمے میں بارہ جیوری والے چنے جاتے ہیں لیکن ملزم کو غداری میں ۲۵ اور دوسرے اہم مقدمات میں ۲۰ ناموں پر اعتراض کر لے کا اختیار ہے۔ سزا بانی کے لئے اس جیوری کا متفق الراء ہونا لازم ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں تقریباً اسی قسم کا رواج ہے، سوائے اس کے کہ اتفاقاً اسے کی ضرورت نہیں بلکہ محض اکثریت کافی سمجھی جاتی ہے۔ برطانوی ہند میں پرچشمن کے مقدمے میں جیوری یا ایسیسوں کا ہونا لازمی ہے اور عدالت العالیہ کے ابتدائی مقدمات میں ایسیس نہیں بلکہ جیوری کے سامنے مقدمہ ہوتا ہے۔ (بقیہ نوٹ ص ۳۳۵ پر)

جہاں عدلی معاملات میں فرانس کا اتباع ہوا ہے۔ جیوری اور اجلاس عادلین میں جو اصولی فرق ہے وہ یہی ہے کہ جیوری میں واقعات کے متعلق ہجوم اکثریت کی جماعت سے استخراج کیا جاتا ہے اور جہاں اجلاس کا قاعدہ ہے دہل واقعات اور قانون دونوں میں تین یا تین سے زائد عادلوں کی رائے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عدالتی تنظیم۔ عدالتوں کی تنظیم متعدد اصول کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے اول تو یہ ظاہر ہے کہ قانون کی پیچیدگیوں اور بعض مرتبہ نظائر کے اختلاف کی وجہ سے اس کی ضرورت ہے کہ اہل معاملہ کو اپیل کی اجازت دی جائے

(بقیہ نوٹ ۴۴) بعض اضلاع ایسے ہیں جن کی بابت حکومت اعلان کر دیتی ہے کہ ان میں جیوری کے ذریعے سے اہم مقدمات کا تصفیہ ہوگا۔ اگر کسی مجسٹریٹ کے سامنے یورپی برطانوی رعایا پر مقدمہ پیش ہو تو اسے اختیار ہے کہ اس غیر اہم مقدمہ میں بھی جیوری طلب کرائے، اہل جیوری کی تعداد برطانوی ہند میں ۳ سے ۹ تک ہوتی ہے اور محض کثرت رائے کے مطابق تصفیہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں میں شاید حیدرآباد ہی ہے جس میں جیوری کا رواج ہے۔ یہاں جو اہم نوحداری ابتدائی مقدمہ عدالت عالیہ میں پیش ہو جس میں جیوری طلب کی جاتی ہے۔ ہر تین ماہ کے لئے ایک فہرست ۵ ارکان جیوری کی طیار ہوتی ہے اور اس میں سے ۹ انخاص کو کورٹ کے ذریعے سے کسی مقدمے کے لئے خاص طور پر چن کر جاتے ہیں جو جیوری سے اختلاف رائے کا اختیار ہے لیکن ششمنوں کے رد سے یہ اختیار محض مشنات سے سمجھنا چاہئے۔ اختلاف کی حالت میں اسباب بتانے ضروری ہوتے ہیں۔

تاکہ قانونی اختلافات کو یکسو کیا جاسکے، لیکن اس قسم کی قانونی نگرانی کا اختیار نسبتاً محدود ہوتا ہے۔

اگر ایک عادل نے صحیح تاویل کرنے میں خطا کی ہے تو دوسری عدالت اسے اغلباً درست کر دے گی۔ دوسرا سبب مرافعہ کا وہ ہے جس کے تحت تجویز سے شاکی فریق کو واقعات مقدمہ کی بنا پر مرافعہ کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اگر عدالت مکمل طور پر بغیر جانبدار ہو پھر بھی واقعات کے نقطہ نظر میں فرق ہونا ممکن ہے، اور یہ فرق یقیناً قابل لحاظ ہوگا اگر اس پر کسی ایک فریق کے مفاد کا دارد مدار ہو۔ اسی لئے علی العموم ایک سلسلہ عدالتہائے مرافعہ کا قائم کیا جاتا ہے جو بالآخر جا کر عدالت عالیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ انہی عدالتوں اور عدالت ہائے مرافعہ کے علاوہ، عدالتوں کو ان کے کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے بھی تقسیم کیا جاتا ہے، یعنی بعض عدالتیں فوجداری کے کام کے لئے، بعض دیوانی مقدمات کے لئے اور بعض ایسے معاملات کے لئے جن کا تعلق مالگذاری سے ہو، مقرر کی جاتی ہیں اور ہر ایک کا سلسلہ مرافعہ جداگانہ ہوتا ہے۔ نیز بعض ایسے ممالک میں جہاں بجائے فردی حکومت کے وفاقی حکومت رائج ہے دو متوازی عدالتی سلسلے قائم کئے جاتے ہیں، ایک مکمل سلسلہ ان عدالتوں کا جن کا تعلق مرکزی قوانین سے ہو اور دوسرا مکمل سلسلہ ایسی عدالتوں کا جن کا تعلق ریاستی قوانین سے ہو، لیکن بعض وفاقی ایسے بھی ہیں جہاں عدالتوں کا ایک ہی سلسلہ دونوں قسم کے قوانین کی تاویل و انطباق کرتا ہے۔ ایسے وفاقیوں کی بہترین مثال قیصری جرمنی سے ملتی ہے جہاں مختلف ریاستوں میں مختلف قوانین رائج تھے اور

عدالت عالیہ، جو لائبرگ میں نشست کرتی تھی، مراغبہ کے وقت ان میں سے ہر ایک کی تاویل کرتی تھی۔ اسی نوع کی برطانوی پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی بھی ہے جو برطانوی سلطنت مختلف حصوں کی مراغبی عدالت کا کام دیتی ہے اور جیسے جیسوں قسم کے قوانین اور احکام کی تاویل کرنا پڑتی ہے۔

علیہ حال ہی میں ایرسٹمان کے وزیر خارج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ برطانوی پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کو ایرستانی مقدمات کی سماعت کا اختیار ہائی نہیں رہا۔ اس بارے میں برطانوی حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی اور اب اس اختیار کو معطل سمجھنا چاہئے۔

Examples of Judicial

ضمیمہ باب ۱۸ تمثیلات ترکیب جماعت عدلیہ

انگلستان - فرانس - مالک متحدہ امریکہ - سوئزرستان - ہندوستان
انگلستان :-

(۱) تعزیری عدالتیں مع عدالت مراۃ

محافظان امن (ہر صوبے میں تقریباً ۳۰۰ - غیر تنخواہ دار
مقررہ کردہ ہر سفارش لارڈ لفسٹنٹ)

باضابطہ

سرہری

(اہم مقدمات)

چھوٹے مقدمات

صرف ابتدائی تحقیقات (محافظان امن کے سامنے)

مراۃ کو اٹریشن

(۱) مکمل مقدمہ کو اٹریشن کے سامنے

جس میں جتنے محافظ امن چاہیں بیٹھ

جیوری کے ساتھ جس کا تعلق رائے ہونا لازم ہے

سکتے ہیں بصدرت لارڈ لفسٹنٹ

۱۵ دیکھو آرگن "حکومت ہائے یورپ" باب ۱۲ - نیز این "قانون و رواج دستور" : Anson

Law and Custom of the Constitution. جلد ۲ حصہ ۱ باب ۱۵

۲) عدالت العالیہ کے دورہ دار عادل
کے سامنے ”ایسٹریز“ میں مکمل مقدمہ

مع جیری حسب بالا

مرافعہ

عدالت مرافعہ تعزیری میں

(۱) واقعات پر حلیہ قدمات میں (۲) قانون پر اس عدالت کی اجازت

آخری مرافعہ

دارالامرا میں ملہ

(صرف قانونی نکات پر بشرطیکہ انکی کوئی

اہمیت عامہ ہو)

(۲) دیوانی عدالتیں

(الف) چھوٹے مقدموں کے لئے انگلستان میں تقریباً ۵۰۰ ”صوبہ داری“

عدالتیں ہیں۔ لیکن چونکہ کام اتنا زیادہ نہیں کہ ہر عدالت کے لئے ایک ایک عدالتی
مقرر کیا جائے اس لئے ملک بچاس بڑے بڑے عدلی اضلاع میں منقسم ہے

ملہ جب دارالامرا کا اجلاس عدالت مرافعہ کی حیثیت سے رہتا ہے (خواہ دیوانی صیغہ
میں یا نوعداری صیغہ میں) تو اس میں صرف لارڈ چانسلر اور جس سے کم سے کم دو قانونی
ادرا یا ایک قانونی امیر اور ایک سابق لارڈ چانسلر ہوتے ہیں اور معمولی درجہ دارالامرا میں سے کوئی
نشت نہیں کرتا۔ قانونی امر خواہ یا ب ہوتے ہیں، عمر بھر کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں اور انہیں اور
جوں میں کوئی نوعی فرق نہیں ہوتا۔

اور ضلع میں ایک ایک جج ہے جو اپنے ”صوبہ داری“ عدالتوں میں مقدمہ کرتا رہتا ہے اور ہر عدالت میں ایک ماہ میں تقریباً ایک مرتبہ اجلاس کرتا ہے۔
نسبتاً اہم مقدمات میں مرافعہ عدالت عالیہ میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے عدالت عالیہ کے جج ملک میں دورہ کرتے ہیں تاکہ فریقین پر اخراجات کا زیادہ بار نہ پڑے۔

(ب) بڑے مقدموں کیلئے { صوبہ داری عدالتوں کے لئے عدالت مرافعہ۔
عدالت عالیہ { اہم مقدمات کے لئے عدالت ابتدائی۔

اس کے تین اجزاء ہیں :-

۱۔ عدالت شاہی۔ ۵۱ جج بصدارٹ لارڈ چیف جسٹس۔

۲۔ عدالت نصف۔ ۵ جج بصدارٹ لارڈ جانسلر۔

۳۔ عدالت وراثت، طلاق و معاملات بحری۔ ایک جج ایک صدر۔

(نمبر ۱ و نمبر ۲ کے درمیان تقسیم کار محض برائے نام ہے)

عدالت مرافعہ۔ عدالت عالیہ سے مرافعہ جات آتے ہیں جب قانونی شکتے

ماہ النزاع ہوں :-

اس میں ۶ ”امراٹے قانونی“، عدالت عالیہ کے تینوں صدور سابق لارڈ

جانسلر (حسب خواہش) بصدارٹ ماسٹر آف دی رولز نشست کرتے ہیں۔

اس کا نصف تین سبب اور عام طور پر ایک عدالت میں تین نشست کرتے ہیں۔

دج) ”دارالامرا“ جو انگلستان کی اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ ہے۔

فرانسس

عادلون قانونر وزیر عدالت کی سفارش پر صدر جمہوریہ کرتا ہے۔ اور صرف عدالت

تسلیم ہی انھیں برطرف کر سکتی ہے۔ عدلی نظام ایک حد تک انگلستان کے نظام کے مماثل ہے۔ یہاں بھی محافظان 'من' دیوانی، نو جداری اور تجارتی، ابتدائی اور ثانوی عدالتیں ہیں اور اسٹرنز اور جیوری سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن جیوری میں اتفاق رائے کی بجائے اکثریت کی رائے کافی سمجھی جاتی ہے، اور جن عدالتوں میں جیوری نہیں ہے وہاں کئی کئی جج (تحت عدالتوں میں بھی) ایک ایک مقدمہ سننے کے لئے بیٹھتے ہیں۔ دیوانی اور نو جداری دونوں کا مراعات ایک عدالت تسلیم کے سامنے جاتا ہے جس میں ایک صدر، تین نائب صدر اور ۴۴ عادل ہیں۔ یہاں بھی مقدموں کی سماعت کے لئے کئی کئی جج نشست کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ "انتظامی عدالتیں" بھی ہیں۔ سب سے چھوٹی عدالت صوبہ واری مجلس پریکٹس کی ہے اور مراعات "مجلس مملکت" میں ہوتا ہے جس میں ۴۵ معمولی ارکان ۶۶ غیر معمولی ارکان، ۴۴ "نظامی معروضات" اور ۴۴ "مستوفی" ہوتے ہیں۔

"معمولی" اور "انتظامی" عدالتوں کے باہمی تقصیر رفع کرنے کی نوعیت سے ایک "نارتی عدالت" قائم ہے جس کا صدر وزیر عدل ہوتا ہے اور ارکان میں تین قائم مقام مجلس مملکت کے اور تین عدالت تسلیم کے ارکان ہوتے ہیں۔

ممالک متحدہ امریکہ

(الف) وفاقی عدالتیں - حدود سماعت، علاوہ ان مقدمات کے جن کا

سرپرست: "مملکت حالیہ کے کل پرنس" *Mariott: Mechanism*

باب ۳۳ (۳) of the Modern State

تعلق وفاقی قانون سے ہے، وہ تمام مقدمات جن میں دویا ریاستیں یا دوریاستوں کے شہری فریق ہوں۔

(۱) عدالت عالیہ۔ ایک میجر مجلس اور ۸ جج۔ ان میں سے نصاب کے لئے چھ ججوں کی موجودگی لازمی ہے۔ اسے ان مقدموں میں ابتدائی اختیار سماعت حاصل ہے جن میں یا تو کسی ملک کے سفیر در نہ کوئی ریاست فریق ہو۔ نیز اسے ریاستی عدالتوں سے ایسی حالت میں مرافعہ کا حق حاصل ہے جب ریاستی و مرکزی توازن یا ریاستی و مرکزی دستور کی تاویل نزاعی ہو۔ ایسی حالت میں اس کی تجویز ناظرین سمجھی جاتی ہے۔ نیز قسمت داری عدالت ہائے مرافعہ سے بھی مرافعوں کی سماعت ہوتی ہے۔

(۲) قسمت داری عدالت ہائے مرافعہ۔ ۹ عدد۔

(۳) ضلع داری عدالت ہائے ابتدائی۔ ۸۱ عدد، ایسے کہ ہر ریاست کم سے کم ایک عدالتی ضلع سمجھی جاتی ہے، اس عدالت کے ساتھ ساتھ مرکزی عدالت بھی ہوتے ہیں جو ان عدالتوں کے احکام کا نفاذ کرتے ہیں۔

(ب) ریاستی عدالتیں:-

(۱) ریاستی عدالت عالیہ۔ عام طور پر ۷ جج کی عدالت مرافعہ

(۲) ”برتر عدالتیں۔ ۷ جج کی عدالت مرافعہ اور اہم مقدمات میں عدالت ابتدائی

(۳) کونٹری کی عدالتیں۔

(د) محافظان امن

ریاستی عادلوں اور مرکزی عادلوں میں عظیم الشان تباہی پایا جاتا ہے چنانچہ

- (۱) مرکزی عادلوں کو صدر جمہوریہ مجلس سینا کی اجازت سے مقرر کرتا ہے۔ ریاستی عادلوں کا عوام الناس انتخاب کرتے ہیں۔
- (۲) مرکزی عادل تقریباً عمر بھر کے لئے ہوتے ہیں۔ ریاستی عادل عام طور پر دو دو چار چار سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔
- (۳) مرکزی عادل سوائے موافقے کے کسی طرح سے نہیں ہٹائے جاسکتے۔ کم سے کم چھ ریاستوں کے عادلوں کو محض عام رائے کے ذریعے سے علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔

سویٹان

”محکمہ وفاقیہ“ یا عدالت عالیہ ۱۔

محکمہ وفاقیہ میں ۳۳ ارکان ہیں جن میں چھ سال کے لئے جماعت مغنہ منتخب کرتی ہے، اور گورنر (دفعہ ۱۰۸) میں اس کی قید نہیں کہ یہ قانون داں ہوں، عام طور پر صرف قانون داں لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک کو صدر اور ایک کو نائب صدر دو دو سال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ عادلوں کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ جرنی، فریسی اور اطالوی سویٹان کے قائم مقام منتخب ہوئے۔ اس محکمہ کا صدر مقام ہرن نہیں، جو ملک کا دارالحکومت ہے، بلکہ لوزان ہے۔ یہ شاید

۵۵ دیکھو نام و تہما: ”نظریہ سیاسی دیکھو تہما“ عالیہ: Ram & Sharma

Political theory and modern

Govt. جلد ۲، باب ۲۔

اس لئے کہ عدلیہ عالمہ سے آزاد ہے۔

محکمہ عدلیہ کا اختیار سماعت :-

- (۱) وہ مقدمات جن میں دفاعیہ ایک فریق ہو۔
- (۲) وہ مقدمات جن میں کوئی کیٹن ایک فریق ہو۔
- (۳) غداری یا بغاوت کے مقدمات۔

(۴) بین الاقوامی قانون کے خلاف مقدمات۔

اس ”محکمہ“ کے ماتحت کوئی عدالت مختلف کیٹنوں میں نہیں ہے۔ بلکہ کیٹنوں میں خرداچی عدالتیں ہیں جو ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستی عدالتوں کی طرح بالکل مکمل ہیں۔

ہندوستان :-

دیوانی و فوجداری (۱) اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ، جو ڈیش کیٹی پر لوی کونسل لندن۔

(الف) مرافعہ دیوانی۔ کسی عدالت عالیہ کے کسی فیصلے کے خلاف خواہ مرافعی ہو یا ابتدائی، بشرطیکہ تعین نامش یا تعین مرافعہ متعلقہ روپیہ سے کم نہ ہو، اور اگر عدالت مرافعہ نے عدالت ماتحت کی رائے سے اتفاق کیلئے تو مزید مرافعہ کے لئے کوئی قانونی امر ہو۔

جیکوگلکرسٹ: ”اصول سیاسیات“ Gilchrist: Principles

of Politics باب ۲۳، فصل ۶۔

دب، فوجداری مرافعات میں جمن کی کسی ہائی کورٹ میں ابتدائی طور پر سماعت ہوئی ہو یا جس میں عدالت ماتحت نے عدالت عالیہ سے کسی قانونی امر کے بابت استفسار کیا ہو۔ بہرینج پریوی کونسل میں فوجداری مرافعات پیش کرنے کے لئے عدالت عالیہ کی رضامندی لازمی ہے۔

جوڈیشل کمیٹی میں حسب ذیل ارکان ہیں:-

۱۔ صدر پریوی کونسل (عام طور پر نہیں نشست کرتا)

۲۔ پریوی کونسل کے وہ ارکان جو بڑے بڑے عدالتی عہدوں پر فائز رہے ہوں۔

۳۔ قانونی امرا (دیکھو عدلیہ انگلستان)۔

۴۔ ہر قلمرو اور ہندوستان کے کم سے کم دو دو ارکان جنہیں رائل کاغذاً تجویز ہو۔

ہر سماعت پر کم سے کم چار ارکان کا ہونا لازمی ہے اور صرف وہی ارکان نشست کر سکتے ہیں جنہیں سماعت کے لئے طلب کیا جائے۔ جوڈیشل کمیٹی کی تجاویز کی شکل سفارشوں کی ہوتی ہے۔
(۲) عدالت اس کے عالیہ:-

ہر بڑے صوبے میں ایک ایک عدالت عالیہ اور ہر بعض صوبوں میں

وہ جو ڈیشیل کشر کی عدالتیں ہیں جن کے اختیارات اکثر امور میں عدالت ہائے عالیہ کے مماثل ہیں۔ صوبہ دہلی پنجاب کے عدالت عالیہ کے ماتحت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ۲۰ عادل ہونے چاہئیں جن کے علاوہ گورنر جنرل موقعی طور پر زائد جج مقرر کر سکتا ہے۔ ان عادلوں میں کم سے کم ۱۰ انڈین سروس کے ارکان ہونے چاہئیں۔

اختیارات :-

(۱) مال کے مقدمات ان عدالتوں کے اختیار سماعت کے بالکل باہر ہیں اس لئے کہ یہ کلیتہ بورڈ آف ریونیو (محس مال) کے تابع ہیں جو ہر صوبے میں ہے۔

(۲) اہم مقدمات میں سیکشن، بمبئی، مدراس کے شہروں کے لئے عدالت عالیہ کو ابتدائی اختیارات حاصل ہیں۔ مرافعہ جلسہ کاملہ میں ہوتا ہے۔ اس

(انٹیم نوٹ ۱۹۲۲ء کا) وفاقی عدالت کا قیام عمل میں آیا ہے جس میں ایک ”میر مجلس عدالت ہند“ اور دو جج مقرر کئے گئے ہیں۔ اس عدالت کو ان تمام امور کی بابت اختیار حاصل ہو گا جن کا تعلق اس قانون سے ہے اور یہ اختیار ابتدائی بھی ہو گا اور مرافعی بھی۔ نہ صرف یہ عدالت برطانوی ہند کی عدالت ہائے عالیہ سے مرافعہ سننے کی بلکہ جو ریاستیں وفاقیہ ہند میں شریک ہو گئی ہوں ان کی عدالت ہائے عالیہ سے بھی اس میں مرافعہ جائیں گے، بشرطیکہ ان میں اس قانون کا کوئی نکتہ زیر بحث نہ ہو۔ نیز مرکزی جماعت مقننہ اس کے اختیار کو وسیع بھی کر سکتی ہے۔ جب ابتدائی عدالت کی حیثیت سے فیضیت کر رہی ہوگی اس وقت اس کا مرافعہ جوڈیشل کمیٹی میں جاسکتا ہے۔

اختیار کی رو سے عدالت عالیہ کسی مقدمہ کو بھی اپنے یہاں رجوع کر سکتی ہے (۳) یہ عدالت عالیہ اپنے حدود کے اندر اعلیٰ ترین عدالت مرافعہ ہے۔
 ماتحت فوجداری عدالتیں :- عدالت عالیہ کے ماتحت تعزیری امور کے لئے عدالت ماتحت سشن میں جو تقریباً ہر ضلع میں ہوتی ہیں، اور ان کے ماتحت بعض مرتبہ زائد سشن جج اور دگڑ گار سشن جج بھی ہوتے ہیں۔ ان عدالتوں کو ہر قسم کی سزا دینے کا اختیار ہے، لیکن سزائے موت بغیر عدالت عالیہ کی توثیق کے نہیں دی جاسکتی۔

ان کے نیچے مجسٹریٹوں کی عدالتیں ہیں۔ بعض مجسٹریٹ درجہ اول کے ہیں، بعض درجہ دوم کے اور بعض درجہ سوم کے، اور یہ درجہ بندی اختیارات عدالت کی رو سے کی جاتی ہے۔ درجہ سوم اور درجہ دوم کے مجسٹریٹوں کا مرافعہ درجہ اول کا مجسٹریٹ سنا ہے اور درجہ اول کے مجسٹریٹ کا مرافعہ سشن جج۔
 اہم مقدمے، جو عدالت سشن کے متعلق ہوتے ہیں ان کی ابتدائی تحقیقات مجسٹریٹ ہی کرتا ہے، اور اگر بادی النظر میں الزام معلوم ہو تو سشن سپرد کیا جاتا ہے ورنہ اسی عدالت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈپٹی کلکٹر ہی ضلع کا درجہ اول کا مجسٹریٹ ہوتا ہے اور تحصیلدار درجہ دوم و سوم کے مجسٹریٹ ہوتے ہیں، اور چونکہ ان میں سے بعض مالی معاملات سے فرصت نہیں ملتی اس لئے عدالتی کام کا بیشتر حصہ درجہ اول دوم و سوم کے اعزازی مجسٹریٹوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے جو عام طور پر پانچ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور انھیں اپنے اپنے حلقوں میں تعزیری اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

ماتحت دیوانی عدالتیں:-

(۱) ضلع کالج جو عام طور پر سشن جج بھی ہوتا ہے { ان دونوں کا مراعات
(۲) نائب جج جو عام طور پر ناڈیشن جج ہوتا ہے { عدالت عالیہ میں جاتا ہے
(۳) منصف۔ اس کا مراعات ضلع کالج سنٹ ہے اور اگر وہ چاہے تو اسے
نائب جج کے سپرد کر دیتا ہے۔ اسے چھوٹے چھوٹے مقدمات کے
اختیارات ہوتے ہیں۔

مال کی عدالتیں:-

(۱) بورڈ آف ریلو نیو۔

(۲) کنشنر

(۳) کلکٹر

(۴) اسٹنٹ کلکٹر درجہ اول و درجہ دوم۔

(۵) تحصیلدار

ہندوستانی عدالتوں کا نظام:-

| دیوانی | نوجہاری | مال |
|------------------|----------------------|----------------------|
| مجسٹریٹ درجہ سوم | مجسٹریٹ درجہ سوم | تحصیلدار |
| مجسٹریٹ درجہ دوم | اسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم | اسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم |
| مجسٹریٹ درجہ اول | ڈپٹی کلکٹر درجہ اول | ڈپٹی کلکٹر درجہ اول |
| | کلکٹر | کلکٹر |
| | کنشنر | کنشنر |

منصف

تشکیلات عدلیہ

۴۴۸

ضمیمہ باب ۱۸

زائیدشن جج
سنشن جج

سب جج
ضلعواری جج

عدالت العالیہ

دفاعی عدالت

جورڈیشیل کمیٹی پریوی کونسل

LOCAL GOVT.

باب ۱۹

مقامی حکومت

مقامی حکومت کی تاریخ مقامی ادارات۔ ان کا انادی پہلو۔ مقامی رستے۔

تقسیم اختیارات

اس وقت تک جتنے اداروں ہدایت کی گئی تھی وہ سب اس اعتبار سے ممتاز ہیں کہ ان کا تعلق ملک کے ایک مرکز سے ہے، لیکن اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا ان افراد سے جو متفرک ملک یا پائے تخت سے دور رہتے ہیں اتنا قریب کا تعلق نہیں ہے، اور وہیات و قصبات میں رہنے والوں کے بود و ماند پران کے اثرات کی حیثیت محض بالواسطہ ہے منفرد لوگوں پر اس کا نہایت ہی کم اثر پڑتا ہے کہ جماعت مقننہ کے کئے ایوان ہیں اور ہر ایوان میں کئے مکن ہیں، عدالت العالیہ کے عادلوں کے اختیارات کیا کیا ہیں اور دربار بادشاہ کے سامنے ذمہ دار ہیں یا جماعت مقننہ کے۔ اس کے برعکس انسان خواہ غریب ہو یا امیر، ذی اقتدار ہو یا بے اقتدار، شریف ہو یا رذیل، اس پر اس امر کا براہ راست اثر پڑتا ہے کہ اس کی سواری کے آنے جانے کے لئے کس قسم کی سڑکیں ہیں، راستے میں پل ہے یا نہیں اور ان کی مرمت ہو چکی ہے یا

وہ غیر مستحکم ہیں، اس کے بچے کے لئے اس کے گاؤں یا قصبے یا تحصیل میں کس قسم کے مدارس ہیں، اس کے نواح کی آب و ہوا کس قسم کی ہے، اور اس کے مکان کے قریب کسی جگہ پانی ٹھہرنے سے غلاظت تو نہیں ہوگی۔ الغرض انسان کی روزمرہ زندگی کی کیفیات کا براہ راست تعلق اس قدر مرکزی حکومت سے نہیں جتنا مقامی حکومت سے ہے۔ اس باب میں اس ادارے پر بحث کی جائے گی جس کے ذریعے سے ان امور کا انتظام عمل میں آتا ہے۔

مقامی حکومت کی تاریخ۔ مقامی حکومت کی تاریخ دراصل حکومت ہی کی ابتدا کی تاریخ ہے، اس کے لئے بڑی بڑی وسیع منطقتیں تو نسبتاً حال کی پیداوار ہیں اور ابتدا میں تو ہمیں زیادہ تر ایسے چھوٹے چھوٹے رقبے نظر آتے ہیں جن کے باشندے اپنا کام خود انجام دیتے ہوں۔ ایسے سواراجی رقبے تقریباً ہر ملک میں نظر آتے ہیں، لیکن یہ نسبت مغربی ملک کے مشرقی ملکوں میں زیادہ متنازع ہیں۔ مغربی ایشیا میں زمانہ قبل اسلام میں (جسے اصطلاحاً ایام جاہلیت کہتے ہیں) شہر مکہ کی حکومت ایک نہایت منظم جماعت کے سپرد تھی جس نے شہر کے پانی کا انتظام، مجلس شوریٰ کے زائین کے آرام و سائش، کعبہ کی حفاظت اور ایسے ہی دوسرے ضروری امور کو جہاں شعبہ داروں کو تفویض کر دیا تھا۔ مشرقی ایشیا میں جاپان میں

دیکھو شریانی، "اسلامی دولت عامہ کی ابتدا" *Shewanani: The Origin of Islamic State*.

حیدر آباد، ۱۹۲۶ء *of Islamic Polity*.

گو جاگیرداروں کا ملک پر بہت بڑا قابو تھا اور ملک شوگن کے چنگل کے اندر پھنسا ہوا تھا، تاہم دیہات کا اندرونی انتظام خود کسان کرتے تھے۔ یورپ میں یونان کو ایسے تو داں نظر آئے گا کہ شہری مملکت کی مرکزی حکومت، خواہ عمومی ہو یا امیر سری دیہات کا انتظام تقریباً بلا استثناء خود دیہات کے شہریوں کو حاصل تھا۔ روم کی حیثیت محض ایک بلدیہ کی تھی، اور جب تک روم روم بنا رہا اس وقت تک بلدیہ ہی رہا۔ اسی طرح تمام فنیقی تہذیب د تہذیب کا مرکز اور سدا دوفنیقی بلدیات ضرور سیدھے اور ان کا یہ فقر و س وقت بھی برابر واجب نفیقوں نے بڑھتے بڑھتے تمام بحیرہ روم ایک فنیقی سمندر بنا لیا۔ ہندوستان اس مقامی حکومت کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے اور کون ایسا ہے جو پنجپیت کے لفظ سے واقف نہیں، جو حقیقت میں قدیم ہندوستان کے جذبہ مفاہمت کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہاں صرف رقبائی انتظام کافی نہ تھا بلکہ ملک علاوہ رقبوں کے ذاتوں میں بھی منقسم تھا اس لئے اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ رقبائی پنجپیتوں سے بھی زیادہ اہم مختلف ذاتوں کی پنجپیتیں قائم ہوں اور ان پنجپیتوں کو (رقبوں یا) ذاتوں کا اندرونی انتظام یا تادیب سپرد کی گئی۔

۱۵ مکرجی: "مشرقی عمومتیں" *Mutcejee: Acenocrocies of the East.*
 ۱۶ رابٹس، ۱۹۱۶ء، ص ۱۵

۱۷ رام و شرما: "مبادی مدنیات"،
Ram & Sharma: Elements of Civics. باب ۱۰۔

مقامی ادارات۔ اصل میں مقامی حکومت ہی ہے جس میں وحدت ہوتے ہوئے آج کل کی عظیم الشان سلطنتوں کی تشکیل ہوئی ہے، اور اب مقامی ادارات کو جو بھی اختیارات حاصل ہوئے وہ علی العموم مرکزی ادارات ہی کے دئے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سبکدہ نے مقامی ادارات کی تعریف کی ہے کہ ”مقامی ادارات ایسے اعضا ہیں جو مکمل طور پر مرکزی مقننہ کے ماتحت ہونے کے ساتھ تقررات اور ایک حد تک اپنے تجاویز کے بارے میں مرکزی ادارات سے آزاد ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مالیات عامہ کے چند اجزاء پر ایک حد تک نیم مختارانہ طور پر قابو یافتہ ہوتے ہیں۔“ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف عالمگیر نہیں قرار دی جاسکتی، اس لئے کہ گو یہ سچ ہے کہ اکثر و بیشتر ممالک میں مقامی ادارات کے اختیارات مرکزی ادارات کی طرف سے تفویض کئے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں مقامی اختیارات ریاستوں کی طرف سے تفویض نہیں کئے جاتے بلکہ اسی طرح دستور کا جزو سمجھے جاتے ہیں جیسے کہ خود ریاستوں کے دستاویز، یعنی جس طرح ریاستوں کے اختیارات کا تعین مرکزی دستور کرتا ہے بالکل اسی طرح مقامی اختیارات کا تعین ریاستی دستاویز کی طرف سے ہوتا ہے، اور جیسے مرکزی حکومت کو ریاستی اختیارات میں کمی پیش کرنے کا اختیار نہیں ویسے ہی

سید سبک: ”مبادی سیاسیات“ Sidgwick: Elements of

ریاستی حکومتیں مقامی اختیارات میں کمی بیشی نہیں کر سکتیں یہ علاوہ اس اہم استثناء کے، کسی فردیہ کے مقامی حکومت اور وفاقیہ کی ریاستوں کے درمیان جو فرق عام طور پر نظر آتا ہے وہ یہی ہے کہ فردیہ میں مقامی اختیارات مرکز کے مفروضہ ہوتے ہیں اور وفاقیہ کی ریاستوں میں ریاستی ادارات مرکزی حکومت کے تابع نہیں ہوتے۔

مقامی ادارات کے سپرد دو طرح کے کام کئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ امور جن کے واسطے یہ ادارات قائم ہیں، یعنی مقامی لوگوں کے فوری بہبود کے انتظامات، جیسے ان کی صحت و تندرستی، ان کا آرام و آسائش، ان کی تعلیم و تربیت کے انتظامات۔ اکثر مقامی ادارات کے سپرد روشنی، پانی کا انتظام، حفظان صحت، موریات، نالیاں، جمالیاتی اور طبی نقطہ نظر سے تعمیرات کی عام نگرانی، ابتدائی تعلیم، بازی گاہیں، مقامی سڑکیں، پل اور سواریل کی نگرانی درجہ جات، یہ سب امور ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے امور بھی ہیں جو بعض مرتبہ محض آسانی اور سہولت کے خاطر ان ادارات کے سپرد ہوتے ہیں، جیسے بعض دفعہ مقامی رقبوں کو انتخابات کے لئے اکائی قرار دیا جاتا ہے بعض ممالک میں مقامی مالی نگرانی اور پولیس انھیں کے سپرد ہوتی ہے اور زیادہ ترقی یافتہ مقامی رقبوں میں ان رقبوں کے عدالتی امور بھی انھیں کے متعلق ہوتے ہیں۔

۵۵ ہیرس: "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" Harris: Local

Government-in many lands. باب ۱۵۔

۵۶ دیکھو آرام و شہر کا حسب بالا۔

مقامی اوارات کا افادی پہلو۔ پہل میں جو اصول مقامی اختیار کیا کی گویا بنیاد ہیں وہ متعدد ہیں۔ اول تو یہ واقعہ ہے کہ جس شخص کا کام ہو گا اسے وہی شخص بہترین طریقے پر انجام دے گا۔ اس اصول کو آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہو گا کہ مختلف رقبوں یا ملٹوں والے خود اپنے ہی کام بہترین طور پر انجام دیں گے اور ہمیشہ یہ خیال آن کے مد نظر رہے گا کہ اپنا بہبود کم از کم خرچ پر حاصل ہو جائے۔ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ اگر اسے یہ احساس ہو جائے کہ بہبود میرا اپنا ہے اور جو روپیہ میں خرچ کر سکتا ہوں اسے خرچ کرنے پر جو بچے گا اس پر میرا ہی اختیار رہے گا، تو وہ اپنے حصول مقصد کی کوشش کے ساتھ اس کے لئے کم از کم خرچ کرے گا، تاکہ وہ روپیہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرے، اور یہی اصول انسانی جموعوں پر بھی صادق آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیمی یا مدراس کی جماعت مقننہ کے ارکان کا احمد نگر یا گنیا کوئم کے باشندوں کی تعلیم و تربیت، آرام و آسائش سے اس قدر لگاؤ نہیں ہو سکتا جتنا خود احمد نگر یا گنیا کوئم والوں کو۔ علاوہ ازیں آج کل کی عمومی پسند ملکوں میں، جب سیاسیات کی کیفیت اس درجہ پیچیدہ ہو گئی ہے، ان مقامی رقبوں کا انتظام بہتر لہ سیاسی تعلیم کا ہوں کے ہے اور جو لوگ مقامی محاسن کے معاملات میں منجھ کر نکلتے ہیں ان کے لئے مرکزی جماعت کے مقننہ کا کاروبار اچنبھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جتنا مختصر مقامی رقبہ ہو گا اتنی ہی اس کی انتظامی نوعیت برتر ہوگی، لیکن چھوٹے چھوٹے رقبوں میں کارکن نسبت کم ہوں گے، اور

جو ہوں گے ان کی نظر علی العموم اس قدر وسیع نہ ہوگی جتنی نسبت بڑے رقبوں میں، اس لئے کہ جن لوگوں کو باعث بار اپنے علم یا ہنر کے امتیاز حاصل ہے وہ چھوٹے رقبوں کے کاروبار میں حصہ لینا اپنے لئے ممکن ہے کہ باعث عار سمجھیں اور یہ رقبے ان کی رفیع خدمات سے محروم رہ جائیں۔

مقامی رقبے۔ مقامی انتظامات کے لئے جو رقبے میں کئے جاتے ہیں وہ کئی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ اول تو بعض ممالک میں بعض رقبے تاریخی اعتبار سے گریابے بنائے ہوئے ہیں۔ انگلستان کے صوبے سیکڑوں سال قدیم ہیں اور یہاں ہر صوبے کے باشندوں کو باہمی تعامل میں کسی قسم کی رقت پیش نہیں آتی، چنانچہ صوبے ہی کو ایک حد تک مقامی حکومت کا مرکز بنادیا گیا ہے۔ فرانس کا صوبہ اور ضلع دونوں نسبت جدید ہیں یعنی ان دونوں کی تاسیس انقلاب فرانس کے زمانے میں ہوئی تھی، چنانچہ اس تاسیس کے بعد ان رقبوں سے مقامی انتظامات کا کام لیا جانے لگا۔ لیکن یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ضلع کے اجزاء کمیون یا بلدیات میں جو نہایت درجہ قدیم ہیں اور جن میں قدیم فرانس کے مقامی سواراج کا (جس کی مطلق العنانی کے زمانے میں بھی اتنی ہی اہمیت تھی جتنی جمہوریہ کے زمانے میں ہے) ایک پرتو نظر آتا ہے۔ تاریخی رقبہ جات کے علاوہ ممکن ہے کہ ملک قدرتی یا جغرافیائی رقبہ جات میں منقسم ہو، جیسے یونان میں، جہاں بڑی بڑی کھاڑیوں، پہاڑوں اور دریاؤں سے ملک کے قدرتی حصے بن گئے ہیں۔ پھر آبادی کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بھی ملک کے ایک ٹکڑے کا نقطہ نظر دوسرے ٹکڑوں سے جدا ہوتا ہو

جس کی بدیہی مثال قصبات اور دیہات کے درمیان مغائرت ہے۔ آخر میں وہ رقبے آتے ہیں جن میں بعض مرتبہ کسی ملک کو کسی ظاہری اصول کے نسبت مساوی حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جیسے ہندوستان کے بیشتر اضلاع یا ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں کے ٹکڑے جنہیں کاؤنٹیاں کہتے ہیں اور بعض ریاستوں میں محض مستطیل شکلوں پر مشتمل ہیں۔

تقسیم اختیارات۔ جہاں تک مرکز اور مقامی ادارات کے درمیان تقسیم اختیارات کے اصول کا تعلق ہے، ہمیں تین انواع نظر آئیں گی پہلی قسم تو ایسے مقامی رقبوں کی ہے جس میں مقامی امور پر قانون سازی تو مرکز کرتا ہے لیکن ایسے قوانین کا نفاذ مقامی ادارات کرتے ہیں۔ جو اصول اس قسم کی صورت حال میں مد نظر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے مفاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ قانون تمام رقبہ جات کے لئے ایک ہی وضع کا ہو، اور اگر مقامی محاسن کو اختیارات دے جائے تو وہ زیادہ تر محض ذیلی قاعدہ سازی کے ایسے

مجھے ایک اعتبار سے یہ مغائرت محض ظریعی نہیں بلکہ نوعی ہے۔ دیہات میں کھلی ہوا اور بانی کے انتظام کی اس قدر ضرورت نہیں جتنی شہروں اور قصبوں میں، نیز چونکہ بار بار دیہاتی اور سواریلوں کی موخر الذکر میں کثرت ہوتی ہے اس لئے سڑکوں اور سواریلوں کی رزک ٹوک کا انتظام بھی لازمی ہے۔ اس کے برعکس گاؤں میں اکثر ذرا ملتی مالیات، دیہی پولیس کے انتظامات سڑکوں کی مرمت وغیرہ کے انتظامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیز چونکہ قصبوں اور شہروں کی آبادی گنجان ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں کے انتظامات کے لئے مقامی رقبے بہ نسبت دیہی رقبوں کے کم وسیع ہوتے ہیں۔

اختیارات ہوتے ہیں جو مقامی انتظامات میں مدد ہوں۔ یہ طرز کار ایک بڑی حد تک انجمنستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ مقامی ادارات کو تھوڑی بہت قانون سازی کے اختیارات دے دئے جائیں لیکن جو عملہ ان قوانین کا نفاذ کرے وہ مرکزی حکومت کا مقرر کردہ اور اس کا عہدہ ہو۔ یہ طرز کار زیادہ تر فرانس میں رائج ہے جہاں صوبہ دار مقامی انتظام کے کم و بیش سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے۔

تیسرے اصول کے تحت قانون سازی اور قوانین کا نفاذ دونوں کام مرکزی اور مقامی ادارات کے درمیان منقسم ہوتے ہیں، یعنی انہم امور پر مرکز قانون سازی کرتا ہے اور محض مقامی امور مقامی ادارات کے لئے چھوڑ دیتا ہے اور اسی طرح زیادہ اہم عہدہ دار مرکز کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اس طرز کار کی طرف ممالک متحدہ امریکہ کی ریاستوں کا میلان نظر آتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اگر مرکزی حکومت کی طرف سے مقامی معاملات میں زیادہ مداخلت رہی تو باشندوں کی جو رہی سہی دلچسپی مقامی ادارات سے ہوگی وہ بھی کم ہو جائے گی اور باشندے خود بخود بے پرواہ اور آرام طلب ہو جائیں گے۔ ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ مرکز مقامی معاملات سے آگاہ رہے تاکہ باشندوں کی تنگ خیالی کی وجہ سے مقامی رقبوں اور ان کی ترقی کو نقصان نہ پہنچے۔ اس اصول کے تحت مقامی ادارات کو جو بھی اختیارات قانون سازی یا قاعدہ سازی کے دئے جائیں وہ نہایت محدود ہوں تاکہ ملک کو قانونی تنوع کی وجہ سے زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ حقیقت میں جیسا سبک

کہتا ہے، 'مقامی حکومت میں حکمت عملی کا سوال نہیں بلکہ عہدگی انتظامات کا سوال ہونا چاہئے، اور جو بھی اختیارات مقامی ادارات کو حاصل ہوں ان میں اسی اصول کو مد نظر رکھا جانا چاہئے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ملک متحدہ جیسے عموماً پسند ملک میں بھی مقامی حکومت روز بروز غیر معمولی ہوتی جا رہی ہے اور جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی مجلس یا بعض مرتبہ تو ایک ہی ایک شخص کے قبضے میں آتی جا رہی ہے۔'

لیکن اس کا بھی خیال رہنا چاہئے کہ 'جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے، مقامی ادارات کا ایک انفرادی پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے مقامی آبادی کو امر عامہ میں دلچسپی لینے کا موقع مل جاتا ہے اور انھیں امر عامہ کی تعلیم ہوتی ہے تاکہ رفتہ رفتہ وہ مرکزی امور میں بھی حصہ لے سکیں اور ان کے ذریعے سے ملک کی خدمت کر سکیں۔ ایسی حالت میں بہتر ہوگا کہ نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات میں بھی چھوٹی چھوٹی مجلس ترتیب دی جائیں جو منتخب شدہ ہوں، اور ان مجلس یا ان کی ذیلی جماعتوں کو مختلف مقامی امور کی کارفرمائی کا اختیار دیا جائے۔ راولپنڈی کا اہم مسئلہ تو اس کی شکل عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ یا تو مرکزی حکومت مقامی خدمات کے اغراض کے لئے بعض محصل (مثلاً، گزاری) پر

شہر سبک، حسب بالا۔

ملک متحدہ امریکہ کے مقامی ادارات کی اصلاح کے لئے دیکھو مٹروپولیٹن شہروں کی حکومت
Munro: Government of American Cities.

کچھ فیصدی زیادہ محصول عائد کرتی ہے، جسے مرکزی عیال وصول کرتے ہیں، اور اس کے بعد اسے مقامی ادارات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود مقامی ادارات بطور خود اس قسم کے محاصل عائد کریں، جیسے چنگی کا محصول، سائیکلوں پر محصول وغیرہ۔ لیکن جو روپیہ جمع ہو مناسب ہے کہ اسے سوائے قطعی طور پر مقامی ضروریات کے کسی دوسری مد پر خرچ نہ کیا جائے، ورنہ مقامی ضرورت پوری نہ ہو سکیں گی اور جس مقصد کے لئے یہ ادارات قائم ہیں وہی فوت ہو جائے گا۔

ڈاکٹر وکھو کا ویسٹرز "شہری زندگی کے عمرانی پہلو" *Sociology: Carpenter of City Life* باب ۱۲۔

ضمیمہ باب ۱۹ مقامی حکومت کی تشکیلات

انگلستان - فرانس - جاپان - ممالک متحدہ امریکہ - ہندوستان -
انگلستان

انگلستان میں مقامی حکومت کسی خاص اصول پر مبنی نہیں ہے بلکہ امتداد زمانے کے ساتھ ساتھ جیسی جیسی ضرورتیں پیش آتی گئیں ویسے ویسے نئے نئے مقامی حلقے ان خاص ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے بنتے گئے اور یہ حلقے قائم رہے۔ یہ بھی نہیں کہ ایک سلسلہ حلقہ جات دوسرے سلسلے کی قسمیں ہوں بلکہ ان میں سے اکثر سلسلے ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں اور ہر ایک سلسلہ اپنے اپنے انتظامات میں مصروف ہے۔

لے دیکوینکس ویل: "انگلستان کی مقامی حکومت" *Manuvelt: English local Government* بیرس: "مقامی حکومت بہت سے ملکوں میں" *Harris: local Government in many land*. باب ۱۱۳ ماکرسٹ: "اصول مابیات" فصل ۳
لے اس عجیب و غریب صورت حال کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں لیکاک کی کتاب "بادی مائتیا" اور ترجمہ (مطبوعہ جامعہ عثمانیہ) باب ۱۱ میں دیا ہوا ہے۔

(۱) انتظامی صوبے ۶۲۰۔ ان میں اور جزائی یا تارنجی صوبوں میں یہ فرق ہے کہ ”انتظامی صوبے“ بعض مرتبہ درجیے یا رکشائز یا لکھن کشائز میں انسانی اکثریت کا جزو ہوتے ہیں۔ یہ آبادی اور رقبہ دونوں میں غیر مساوی ہوتے ہیں یعنی رقبہ تقریباً ۸۰ مربع میل سے ۲۵۰۰ مربع میل تک اور آبادی تقریباً ۲۰ ہزار سے تقریباً ۲۰ لاکھ تک ہے۔ انتظامی صوبوں میں ایک مجلس صوبہ ہوتی ہے جس کے معمولی ارکان ۴ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور یہ ارکان پچھل سال کے لئے الڈرین کا انتخاب کرتے ہیں جن میں سے نصف ہر تین سال کے بعد برخاست ہو جاتے ہیں۔ معمولی ارکان اور یہ الڈرین دونوں مجلس صوبہ کے رکن ہوتے ہیں۔ اس مجلس کا اجلاس سال میں ۴ مرتبہ ہوتا ہے لیکن ہر مرتبہ پورا اجلاس صرف ایک دن رہتا ہے اور کام ذیلی مجالس کے سپرد کر دیا جاتا ہے اسے ”شہری اضلاع“ قائم کرنے اور اضلاع اور پیرشوں کے حدود میں تبدیلی کا حق حاصل ہے۔

(۲) برو۔ صوبہ جاتی برو۔ یہ بڑے بڑے شہر ہیں جنہیں ”صوبہ جاتی بلدیات“ کہتے ہیں۔ یہ انتظامی صوبوں سے آزاد ہیں اور انہیں وہ تمام اختیارات حاصل ہیں جو صوبہ داری مجالس کو حاصل ہیں۔ ایسے بلدیات تعداد میں ۸۰ سے زیادہ ہیں اور ان کی آبادی علی العموم ۵۰ ہزار اور لاکھ کے درمیان ہے۔ بلدی برو۔ ان کی تعداد تقریباً ۲۵ ہے اور علی العموم ان کی آبادی ایک ہزار سے ایک لاکھ تک سمجھنی چاہئے۔ مجلس برو (بلدی اور صوبہ جاتی برو دونوں میں) کی شکل تقریباً وہی ہے جو صوبہ جاتی مجلس کی ہے، سوائے اس کے

کہ دونوں قسم کی برو میں ایک میر بلدی بھی ہوتا ہے جسے مجلس برنخب کرتی ہے۔
 (۳) اضلاع، بلدی اضلاع برو سے ان اضلاع کو ذرا کم اختیار است
 حاصل ہوتے ہیں۔ مگر نام کو یہ بلدی کہلاتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر میں ذراستی
 آبادی بھی شامل ہے۔ ایسے اضلاع کی تعداد تقریباً ۸۰۰ ہے اور آبادی تقریباً
 ۲۵۰ سے تقریباً ۲ لاکھ تک ہے۔ ہر شہری ضلع میں ایک شہری ضلع داری مجلس
 ہے۔ اس کے سپرد ضلع کی حفظان و صحت کی نگرانی، ایسی سڑکوں کی نگہداشت
 جو براہ راست مجلس صوبہ کے ماتحت نہیں، اور تعمیر و کمز کی نگرانی ہوتی ہے۔ اگر
 ۲۰۰۰۰ سے زیادہ آبادی ہو تو ابتدائی تعلیم بھی اسی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔

دیہی اضلاع، تمام ملک، علاوہ شہری اضلاع اور برو کے دیہی اضلاع
 میں منقسم ہے۔ ان کی تعداد تقریباً ۶۵۰ ہے جن میں سے بعض کی آبادی ایک ہزار
 سے بھی کم اور بعض کی ۱۵ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ ہر دیہی ضلع میں ایک دیہی
 ضلع داری مجلس ہے۔ جسے اپنے ضلع میں تقریباً دیہی اختیارات حاصل ہوتے
 ہیں جو شہری ضلعوں کے مجلس کو۔

(۴) سب سے چھوٹی اکائی پیرش ہے جس کی بنیاد تعلیم ملک کی پیرش پر
 رکھی گئی ہے۔ دیہی پیرشوں کی تعداد تقریباً ۱۳ ہزار ہے، اور ان میں سے ہر ایک
 میں تمام پائے رہندوں کا ”جلسہ“ ہوتا ہے اور اگر اس کے رہندوں کی تعداد ۳۰۰
 سے زیادہ ہو، یا مجلس صوبہ کی اجازت لے لی ہو، تو ایک مجلس پیرش کو تین سال
 کے لئے منتخب کیا جاتا ہے، جس میں ۵ سے ۱۵ تک ارکان ہوتے ہیں۔ ہر پیرش
 کسی نہ کسی دیہی ضلع میں شامل ہوتی ہے، اور یہی واحد منظم شکل انتظام میں

مقامی تقسیم کی ہے۔

(۵) لندن کا انتظام

(۱) لندن کی صورت واری مجلس۔ اس میں ۱۴۴ ارکان ہیں جن میں سے ۱۲ کا انتخاب براہ راست تین سال کے لئے ہوتا ہے اور یہ ۲۰ آلڈرمن کو چھ سال کے لئے چنتے ہیں۔ اس کے فرائض نہایت اہم ہیں مثلاً مورچوں کا رکھ رکھاؤ، آتشیں رسالہ، پل، باغ عام، تعلیم، تعمیر، پاگل خانے، سڑکیں وغیرہ (۲ الف) ہندی لندن کا کارپوریشن۔ اس میں ۲۰۶ ”عام ارکان“ جن کا سالانہ انتخاب ہوتا ہے، اور ۲۶ عین حیاتی آلڈرمن ہیں۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ایوانوں میں نشست کرتے ہیں۔ ایوان آلڈرمن ایک سال کے لئے ایک امیر بلکہ کا انتخاب کرتا ہے۔ اس ہندی جماعت کے ذمے منجملہ دیگر امور کے ہندی پولیس، پاگل خانے، پل، اوقاف اور بہت سے قدیم حقوق حاصل ہیں۔

(۲ ب) لندن کے ۲۶ ہندی بروڈیں ایک ایک مجلس ہے جس میں ۳۰ سے ۶۰ تک ارکان ہوتے ہیں جن کا انتخاب ۳، ۳ سال کے لئے ہوتا ہے، اور یہ ارکان ۶، ۶ سال کے لئے آلڈرمن کا انتخاب کرتے ہیں جن کی تعداد ارکان کی تعداد کا پانچواں حصہ ہوتی ہے۔ نیز ہر مجلس ایک سال کے لئے ایک امیر بلکہ کا انتخاب کرتی ہے،

تعلیم:- علاوہ جامعی تعلیم کے تمام تعلیم مقامی ادارات کے سپرد ہے، گو اس کی نگرانی صدر مجلس تعلیم کرتا ہے جو وزارت کارکن ہوتا ہے۔

مالیات :- مقامی اخراجات کا دار و مدار حسب ذیل محاصل پر ہے :-

(۱) البواب، جو مقامی ادارات زمین اور عمارتوں کی سالانہ قیمت پر لگاتے ہیں زرعی البواب اور ریلوں، نہروں وغیرہ کے البواب آمدنی پر ۲۵ فیصد کے حساب سے لئے جاتے ہیں، باقی البواب کی تعداد ہر جگہ مختلف ہے۔

(۲) مرکزی خزانہ سے آبکاری کے مالیہ سے کچھ رقم مقامی اخراجات کے لئے دی جاتی ہے۔ نیز اسی طرح تعلیم، کوٹوالی، غربا، پاگلوں، حفظانِ صحت اور سڑکوں کے لئے بھی کچھ روپیہ ملتا ہے۔

(۳) تجارتی کاروبار مثلاً بجلی، گیس وغیرہ کی آمدنی۔

(۴) قرضہ۔ لیکن اس کے لئے مرکزی حکومت کی اجازت لازمی ہے۔

عام ملکاری وغیرہ :-

(۱) کسی حصہ ملک میں مرکزی حکومت کا ذاتی اختیار قائم مقام مثل صوبہ دار وغیرہ کے نہیں رہتا، بلکہ مقامی مجالس پر اعتماد کیا جاتا ہے جو اپنا کام نہایت تدریجی اور کاروباری طرز پر انجام دیتی ہیں۔

(۲) قانون سازی کلیتہً مرکز کے قبضے میں ہے اور جلد ادارات مرکز کے

تابع ہیں۔
فرانس

۹ صوبے۔ ہر صوبے میں ایک صوبہ دار ہوتا ہے جسے وزیر داخلہ کی سفارش پر

صدر جمہوریہ مقرر کرتا ہے۔ اس کی مدت عہدہ معین نہیں ہے۔ اداریہ مرکزی حکومت کا قائم مقام ہوتا ہے۔ یہ صوبے کے تمام معمولی عہدہ داروں کو مقرر کرتا ہے اور اسے صوبے کے پولیس اور حفظان صحت پر بہت اہتیا رات حاصل ہیں۔ نیز وہ بلدیوں پر بھی نگرانی رکھتا ہے۔

ہر صوبہ کے متعلق دو مجالس ہوتی ہیں ۱۔

(۱) مجلس صوبہ جس کے تین تنخواہ یاب ارکان ہوتے ہیں۔ لیکن انتظامی امور میں صوبہ دار اس مجلس کی رائے کا پابند نہیں ہوتا۔ یہ مجلس دراصل انتظامی عدالت زیرین بھی ہے جس کا مرافعہ مرکزی ”مجلس محکمات“ میں ہوتا ہے۔

(۲) صوبہ کی مجلس عامہ۔ اس میں ہر پرگنہ کی طرف سے ایک ایک رکن ہوتا ہے اور اس وقت ایسے کم از کم ۱۱ اور زیادہ سے زیادہ ۶۰ اراکین ہیں۔ یہ ارکان ۶ سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ اس مجلس کے سپرد علاوہ مالی امور کے (جن میں سب سے اہم معاملہ

(بقیہ خاشیہ ۱۶۷ کا) شو: ”بر غظمی یورپ میں بلدی حکومت“ A. Shaw:

Municipal Government in Continental Europe. باب ۱۔

منرد: ”یورپی شہروں کی حکومت“ Munro: Government of European Cities.

گلکرسٹ، حسب بالا، باب ۴ ص ۳

رام و شرما، حسب بالا۔

مختلف اضلاع میں محاصل کی تقسیم اور حصول قرضہ ہے) حسب ذیل امور بھی ہیں مدارس تعلیم و تعلیمات، صوبہ داری سڑکوں کی دیکھ بھال، یتیموں اور بیگس بچوں کی پرداخت، خیرات عامہ، پاگل خانے،

ضلع ۱۔ ہر ضلع میں ایک نائب صوبہ ہوتا ہے جسے صرف وہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو صوبہ دار اس کے تفویض کرتا ہے۔ نیز ایک مجلس ضلع بھی ہوتی ہے جس کے لئے ہر پرگنہ سے ایک ایک رکن منتخب ہوتا ہے۔ یہ مجلس کم از کم سال میں ایک مرتبہ نشست کرتی ہے اور اس کے سپرد یہ کام ہے کہ جو محاصل ضلع پر عائد کئے گئے ہیں انہیں پرگنوں پر تقسیم کر دے۔

پرگنہ ۱۔ یہ کئی بلدیات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسے انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوتے اور اس سے صرف انتخابات اور عدالت کی اکائی کے طور پر کام لیا جاتا ہے۔

بلدیات ۱۔ اوپر کے قسموں کے برخلاف (جو سب کی سب انقلاب فرانس کے بعد قائم کی گئی تھیں) بلدیہ فرانس کا قدیم ادارہ ہے۔ فرانس میں بلدیات کی تعداد تقریباً ۴۰ ہزار ہے۔ ان کی آبادی اور رتبے مختلف ہیں یعنی بعض کی آبادی ۵۰ سے بھی کم ہے اور بعض کی لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے بلدیہ کا رتبہ تقریباً دس ایکڑ اور بڑے سے بڑے کا ۱۰۰ مربع میل ہے۔ بلدیات خواہ دیہی ہوں یا بلدیہ دونوں کے ادارات ایک ہی طرز کے ہیں :-

مجلس بلدیہ میں ۱۰ سے ۳۶ تک ارکان ہوتے ہیں جو ہر سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور اکیس سال سے زیادہ عمر کے ہر فرانسیسی مرد کو رائے دہی کا اختیار حاصل ہے۔ انہیں اس سے زیادہ آبادی کے بلدیات انتخابات کے لئے حلقوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ بلدیہ کا سب سے بڑا عہدہ دار میئر بلدی ہوتا ہے جسے مجلس بلدیہ منتخب کرتی ہے۔ یہ ایک طرف بلدیہ کا حکمران ہوتا ہے اور دوسری جانب مرکزی حکومت کی طرف سے قوانین وغیرہ کے نفاذ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت ایک یا کئی نائب میئر بلدی ہوتے ہیں۔

بلدی مالیات :-

بلدی اخراجات کا دار و مدار زیادہ تر ”الواب“ پر ہے۔ اور یہ براہ راست محصول پر کچھ فیصد اضافہ کا نام ہے۔ براہ راست محصول اراضی، مکانات، گراہنچا، ”دروازوں اور کھڑکیوں“ اور پیشیوں اور تجارتوں کے محاصل ہیں۔ ان الواب کے علاوہ جنھیں ”معمولی الواب“ کہتے ہیں، بعض دوسرے محاصل بھی عائد کئے جاتے ہیں جنھیں غیر معمولی الواب کہتے ہیں اور جو زیادہ تر کاروبار، موٹر دل وغیرہ پر عائد کئے جاتے ہیں۔ نیز بعض ضرورت مند صوبوں کو مرکزی طرف سے بھی مدد ملتی ہے۔

بلدیات کو ایسے محاصل جیسے گھڑا گاڑی، اکھل، مودنیات، چنگی، کتوں، شہری وغیرہ پر بھی محاصل عائد کرنے کا اختیار ہے۔

تعلیم :- تعلیم کلیدی مرکز کے نگرانی میں ہے اور اس مقصد کے لئے ذرائع، ”ماہی حلقوں“ میں منقسم ہے۔ ابتدائی تعلیم کی نگرانی صوبہ دار کے ذریعے سے کی

جاتی ہے اور ہر صوبہ میں ایک تعلیمی مجلس چوتی ہے جس کے زیادہ تر اساتذہ رکن ہوتے ہیں۔ مدارس کی عمارتیں بلدیات کے سپرد ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ کے لئے مرکزی حکومت کچھ امداد دیتی ہے، نیز جملہ اساتذہ کی تنخواہیں مرکزی حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے۔

جاپان

(۱) صوبہ۔ صوبے دو قسم کے ہیں ایک "فو" یعنی بلدی صوبے (ٹوکیو، کیوتو، اوکاسا، اور بائی ۳) "کین" یعنی دیہی صوبے کہلاتے ہیں۔ دونوں کے طرز انتظام میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔

ہر صوبے میں ایک صوبہ دار ہوتا ہے جسے شہنشاہ نامزد کرتا ہے، اور مرکزی وزارت کے طرح اس کے ماتحت چند محکمے ہوتے ہیں، جیسے کاروبار، معتمدی، کاروائی، امور داخلی (تعلیم)، امور عامہ، حساب کتاب، اصلاح کی نگرانی، زراعت و حریت، کوٹوالی (حفظ امن و صحت)، امن عامہ، حفاظت عامہ، اجانب، کارخانے اور گرتیاں)۔

۱۹۱۷ء میں، حسب بالا، باب ۱۶

پیرڈ: "توکیدو کا انتظام اور سیاسیات" *Beard: Administration*

and Politics of Tokio باب ۲، ص ۴۰۔

نام و شرف، حسب بالا۔

مسعود جنگ: "جاپان اور اس کا تعلیمی نظریہ" *Masood: Japan & its*

Educational System. باب ۱۵۔

ہر صوبے میں ایک صلاح کار مجلس انتظامی ہوتی ہے جس میں سرکاری اور غیر سرکاری رکن ہوتے ہیں اور جس کی صدارت صوبہ دار کرتا ہے۔ اس میں کم سے کم ۲۰ ارکان ہوتے ہیں، جنہیں صوبے کے ایسے ۲۵ سالہ جا پانی مرد ۴ سال کے لئے منتخب کرتے ہیں جو محصول ادا کرتے ہوں۔ اس کے اجلاس کم از کم سال میں ایک مرتبہ ہوتے ہیں جس میں صوبہ کا سالانہ موازنہ پیش ہوتا ہے۔ اس مجلس کو صوبہ کے معاملات کے متعلق صوبہ دار کو صلاح دینے کا بھی اختیار ہے، مگر ہر اور میں وہ صوبہ دار کی مرضی کی تابع ہے۔ اگر مالی معاملات میں مجلس اور صوبہ دار کے خیالات کے درمیان مستقل اختلاف ہو تو معاملہ وزیر داخلہ کے سامنے پیش ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ قطعی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) دیہاتی اضلاع (گرن)۔ ان میں ہر ایک میں ایک نائب صوبہ دار رہتا ہے، ۱۹۲۱ء کے بعد یہاں کی مجالس کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

(۳) شہر (شہری)۔ جن شہروں کی آبادی تیس ہزار سے زیادہ ہے ان میں ایک ایک میئر ہوتا ہے۔ اس کے انتخاب کے لئے مجلس بلدیہ (جس کا انتخاب ۴ سال کے لئے ہوتا ہے) تین نام وزیر داخلہ کے سامنے پیش کرتی ہے اور یہ وزیران میں سے ایک کا انتخاب کر کے تقرر کے لئے شہنشاہ کے سامنے پیش کرتا ہے، میئر بلدیہ اور مجلس بلدیہ کے اختیارات کلیتہً صوبہ دار اور وزیر داخلہ کی مرضی کے تابع ہیں۔ صوبہ کی طرح یہاں بھی ایک مجلس انتظامی ہوتی ہے۔

(۴) قصبوں اور گاؤں کے انتظامات کا طریقہ بھی اسی کے مثل ہے۔ ان میں

اعلیٰ عہدہ دار رکھیا ہوتا ہے۔ جس کا انتخاب مقامی مجالس کرتی ہیں لیکن اس کے تقرر کے لئے صوبہ دار کی منظوری لازمی ہے۔

مالیات کا دار و مدار حسب ذیل مدات پر ہے :-

- (۱) ابواب۔ اس کی دو صورتیں ہیں :- سرکاری محصول کے ساتھ زائد محصول کی وصولی۔ ان دونوں کی تحصیل بغیر وزیر داخلہ اور وزیر مالیات کے نہیں کی جاسکتی، گوچھ بڑے بڑے شہروں میں اس اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔
- (۲) سرکاری خزانے کی طرف سے امداد خصوصاً پولیس اور لازمی تعمیرات متعدد امراض، شاہراہوں، آب رسانی اور زراعتی زمین کی ترقی کے لئے میں دی جاتی ہے۔

- (۳) قرضہ صرف اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب مقامی جماعت اس امر کی قرارداد منظور کرے اور وزیر داخلہ وزیر مالیات بھی منظور کر لیں۔

ممالک متحدہ امریکہ

ممالک متحدہ امریکہ کی ہر ریاست میں مقامی حکومت کے اصول مختلف ہیں

اور ان اصول کے تحت انتظامات میں بہت کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ سب سے

پہلے امریکن ٹاؤن کر لینا چاہئے کہ یہاں جو لفظ Fown یا Fownship

استعمال ہوتا ہے اس سے مراد قصبہ نہیں بلکہ دیہہ ہے، اور اس کے برعکس لفظ City

۳۵ ہیرس، حسب بالا، باب ۱۵، فنکٹر سٹ، حسب بالا، باب ۲۵، حصہ ۴، مندرجہ حسب بالا، باب ۱۵

دیکھیں: "مملکت Woodrow Wilson: The State" باب ۹۔

یا شہر میں بعض ایسے چھوٹے چھوٹے رقبے اور آبادیاں شامل ہوتی ہیں جنہیں بعض دوسرے ممالک میں گاؤں سے زیادہ وقعت نہیں دی جائے گی۔ ممتاز فرقوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مقامی حکومت کے اعتبار سے ریاستوں کو چار مجموعوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) نئے انگلستان کی ریاستیں۔ یہ سب شمال میں ہیں۔ یہاں کی مقامی حکومت کی اکائی دیمہ ہے، اور صوبہ دراصل بہت سے دیہات کا مجموعہ ہے اور اسے نسبتاً کم اختیار حاصل ہوتا ہے۔

(۲) جنوبی ریاستیں:- یہاں کے صوبوں کے مقامی اختیارات نہایت درجہ وسیع ہیں۔

(۳) شمالی وسطی ریاستیں:- یہاں دیہات کو معینہ مقامی اختیارات حاصل ہیں۔ جو صوبہ جاتی اختیارات سے ممتاز ہیں۔

(۴) جنوبی وسطی ریاستیں:- یہاں دیہات صوبوں کے بالکل ماتحت ہیں اور حقیقت میں صوبوں کے اضلاع سے بہت زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

عام اصول:- بالکل حال کے زمانے تک انتخاب کے اصول کو بہت کچھ اہمیت دی جاتی تھی، یہاں تک کہ آج بھی علی العموم نخبوہ یا ب عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ حق رائے وہی تقریباً ہر شخص کو جس کی عمر ۲۱ سال کی ہو حاصل ہے، مگر بعض ریاستوں میں محصول ادا کرنا اس حق کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے حدود بھی مقرر کئے گئے ہیں جیسے سکونت اور

میڈیا تعلیم (جس کے ذریعے سے جنوبی ریاستوں میں کالوں سے خلی سلب کر لیا جاتا ہے)

الکتر مقامی ادارات ہیں ہدایت، مزاجہ اور حق برخواست مقامی منشوروں میں نظر آتا ہے۔

(۱) دیہہ ۱۔ نئے انگلستان کے پرگنوں کا رقبہ علی الامم ۲۰ سے ۳۰ مربع میل تک ہوتا ہے۔ یہاں مقامی حکومت کی اکائی یہی ہیں۔ درآٹھ ایکڑ شمالی اور وسطی ریاستوں میں پچھن صوبوں کی تھیں ہیں اور بالکل جنوب میں پرگنوں کا ذکر بھی نہیں سننے میں آتا۔

نئے انگلستان میں پرگنہ کے حصے میں تمام رائے دہندے جمع ہوتے ہیں اور یہ اپنے عدد اور پرگنہ کے عمدہ داروں کو جنھیں ”فنجین“ کہتے ہیں، چنتے ہیں۔ یہ فنجین پرگنہ کے ملاک، شرکوں اور نالیوں کے بعض قسم کے جائزہ دار ہوتے ہیں اور چند چھوٹے چھوٹے دیہات میں حفظان صحت اور غربا کی نگرانی بھی انھیں کے سپرد ہوتی ہے۔

(۲) خصوصی اضلاع۔ حال کے زمانے میں خاص خاص مقامہ کے لئے مخصوص اضلاع بنائے گئے ہیں جیسے ریسوں کے لئے، حفظان صحت کے لئے، موریوں، شرکوں، پانی اور زراعت کے شعبے، ان اضلاع داروں کو تحصیل حاصل اور بعض مرتبہ بلدیوں کے سے کس اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

(۳) شہر، ٹاؤنک متحدہ امریکہ میں شہر بننے کے لئے کسی بڑی آبادی کی ضرورت

نہیں ہے اور بعض جگہ دس ہزار سے کم آبادی کے مقامات شہر نہیں بن سکتے، بعض ریاستوں میں ۲۵۰ سے زیادہ کے مقامات بھی شہر کہلانے کے مستحق مہر جاتے ہیں۔ بعض شہر اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان میں صوبہ کا صوبہ شامل ہوتا ہے۔ ایسے شہروں کی بہترین مثالیں نیویارک، سان فرانسسکو اور ہالٹی مور ہیں۔ شہر ماحولی دیہہ سے بالکل جدا گانہ سمجھے جاتے ہیں، اگر انھیں صوبہ کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔

بلدی انتظامات کے تین طریقے رائج ہیں :-

(الف) میر بلڈ اور مجلس بلدی کا طریقہ :- یہ طریقہ بڑے بڑے شہروں میں سے زیادہ تر میں رائج ہے۔ میر بلڈ عام طور پر دو سال کے لئے عوام انتخاب کے ذریعہ سے منتخب ہوتا ہے اور خواہ یاب ہوتا ہے۔ یہ مجلس بلدیہ کے سامنے قواعد کی سفارش کرتا ہے اور اسے مشروط اقتدار کا حق بھی حاصل ہونا ہے۔ مجلس بلدی کے اختیارات بتدریج کم ہوتے جا رہے ہیں، چنانچہ ذیلی مجالس کا تقرر بھی علی العموم صدر مجلس ہی کرنے لگا ہے۔

(ب) ماموریہ کا طریقہ :- اس طریق سے تمام مقننہ اور عاملانہ اختیارات ایک ہی مجموعے کے سپرد کر دئے جاتے ہیں۔ عام طور پر ۵ مامور ۵ یا ۱۰ سال کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور ان میں سے یہ مجلس ایک کو میر بلڈ منتخب کر لیتی ہے۔ باقی مامور ایک ایک صیفہ کا جائزہ دار ہوتا ہے۔

(ج) بلدی ناظم کا طریقہ :- یہ اس میں (ب) ہی کی ارتقائی شکل ہے۔ اس

میں مجلس یا اس کے ارکان کو عالمانہ اختیارات نہیں بلکہ صرف مباحثہ کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس مجلس میں علی العموم ۵ ارکان ہوتے ہیں، ماحورو یا چار سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ مجلس قواعد منظور کرتی ہے اور ایک ہدی ناظم کو مقرر کرتی ہے جس کے سپر انتظام ہدیہ کر دیا جاتا ہے۔

(۵) صوبہ ۱۔ ہر ریاست میں تقریباً ۱۰۰ سے ۱۲۵ تک صوبے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے انتظام کے لئے ایک "مجلس صوبہ" ہوتی ہے اس کے ارکان علی العموم ۲ سے ۴ سال تک کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور ارکان کو معاوضہ ملتا ہے۔ تقریباً ہر عالمانہ عہدہ دار کا عام انتخاب مختصر زمانے کے لئے ہوتا ہے، اور جو اختیارات میں وہ زیادہ تر عادلانہ ہیں یا بحیثیت عمل حکومت کے ہیں۔

مالیات (۱) عام محصول اٹاکس۔ یہ اٹاکس کی قیمت پر لگایا جاتا ہے۔ زیادہ تر اسی محصول پر دارو مدار ہوتا ہے۔

(۲) ذاتی محصول، پیشوں پر محصول، اجاروں پر محصول۔

(۳) ریاستی حکومت سے امداد۔ یہ نہایت کم ہوتی ہے اور جو ہوتی ہے وہ زیادہ تر تعلیم کے لئے ہوتی ہے۔

(۴) قرضہ۔ لیکن مقامی حکومتوں کو قرضہ لینے کے بہت کم اختیارات ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ علاوہ اس تحدید کے باقی امور منوعہ میں مقامی ادارات تقریباً آزاد ہیں۔

تعلیم کا انتظام براہ راست مقامی ادارات کے نگرانی میں نہیں بلکہ تقریباً ہر جگہ تعلیم کے لئے جداگانہ مجلس مقرر کی جاتی ہیں۔

ہندوستان

مقامی حکومت: (۱) شہری (۲) دیہی۔

دیہی ادارات:-

(۱) گاؤں۔ یہ ہندوستانی نظم کی قدیم ترین اکائی ہے، اور گواضلاع کے مستقروں میں حالتوں اور عہدہ داروں کے اجتماع کی وجہ سے اس کی اہمیت کم ہو گئی ہے، تاہم اس وقت بھی اسے کافی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے عہدہ دار پنچ (جو تین یا پانچ ہوتے ہیں) سر پنچ یا کھیا، پٹواری (دیہاتی ٹپل) اور چوکیدار (یا پولیس ٹپل) ہوتے ہیں جس میں سے پنچ یا سر پنچ بلا تخواہ کے ہوتے ہیں اور پٹواری اور چوکیدار کو سرکار کی طرف سے بھی کچھ تخواہ ملتی ہے اور گاؤں والے بھی بہت توفیر کچھ دیتے ہیں۔

۱۷ شاہ و بہادر جی: ”ہندوستانی بدایات کا دستور، مناصب اور الیات“

Shah and Bahadurjee: Constitution, functions and finances of India Municipalities.

مکرجی، حسب بالا، باب ۲۰۔ راج و شرا، حسب بالا، باب ۱۰۔ گلکرسٹ، حسب بالا، باب ۲۳۔

دیکھو ہندوستانی سالنامہ Indian Year Book ۳۹-۱۹۳۸ء

۳۷۱ تا ۳۷۵

حال ہی میں قدیم باضابطہ پنچایت کے طریقے کا احیاء خصوصاً پنجاب میں اور ان صوبوں میں جہاں رعیت داری طرز رائج ہے، کیا گیا ہے، اور بعض انتظامی اور چھوٹے چھوٹے عدالتی امور منتخب شدہ پنچوں کے سپرد کرنے لگے ہیں۔

(۲) گاؤں کے مجموعے - یہ زیادہ تر ہنگامہ میں نظر آتے ہیں۔ اختیارات اور طرز کار تقریباً وہی ہے جو گاؤں میں۔ خیال ہے کہ بالآخر ان مجریوں کے سپرد گاؤں کی حفاظت، سڑکیں، پانی کا انتظام، حفظانِ صحت، ابتدائی مدارس وغیرہ کر دئے جائیں گے۔

(۳) لوکل بورڈ - اس کا حلقہ عام طور پر ایک تحصیل یا تعلقہ ہوتا ہے اور اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ ڈسٹرکٹ بورڈ ہوتا ہے جو اپنی صوابدید پر لوکل بورڈ کی مالی مدد کرتا ہے۔ لوکل بورڈ خود اپنا صدر منتخب کرتا ہے۔

(۴) ڈسٹرکٹ بورڈ - اس میں منتخب شدہ اور نامزد کردہ دونوں قسم کے ارکان رہتے ہیں لیکن اب منتخب شدہ ارکان کی اکثریت ہوتی ہے اور سرکاری ارکان تقریباً انصافی سے زیادہ نہیں ہوتے۔ رکنیت کے لئے ذاتی اور مالی حیثیت کی وقعت ہے۔ پہلے صاحبِ مناع صدر ہوتا تھا لیکن اب تقریباً ہر جگہ صدر منتخب شدہ ہوتا ہے۔ بورڈ کے سپرد حسب ذیل امور

۱۔ صوبہ جات متحدہ کے پرگنے، چوتھ دفینات و قصبہ کے بورڈس ہوتے ہیں، صرف جہدائی انتظامات اور دیہی حسابات کی کیسائی کے لئے ہوتے ہیں۔

ہوتے ہیں :- حفظانِ صحت، مریاں، امور عامہ مثلاً بازار، بچک، کاشتیکہ، مختلف مقامات میں درخانوں کا قیام، تحوط ذروں کا انتظام، تعلیم خصوصاً ابتدائی تعلیم۔

مالیات کا دارد مدار حسب ذیل مدانت پر ہے :-

(۱) ابواب جس کی مقدار مالگداری پر تقریباً ۱۰ فیصدی ہے۔ (۲) سڑکوں کے محاصل۔ (۳) کانجی میس اور گھاٹوں کی آمدنی (۴) صوبہ دار حکومتوں کی طرف سے مدد۔

بلدی ادارات - برطانوی ہند میں تقریباً ۸۰۰ بلدیات ہیں جن میں سے تقریباً ۱۰۰ کی آبادی ۵۰ ہزار سے کم ہے۔

(۱) معمولی بلدیات :- مجلسِ بلدیہ کے اکثر ارکان منتخب شدہ اور کمتر نامزد کردہ ہوتے ہیں نامزدگی عام طور پر قلیتوں کی نیابت کے لئے یا ایسے لوگوں کے تقرر کے لئے عمل میں آتی ہے جو باوجود قابلیت کے منتخب نہ ہو سکے ہوں تقریباً ۷ فیصد ارکان محض اپنے عہدہ کی وجہ سے رکن ہوتے ہیں۔ قواعد و ضوابط کے ذریعہ کا تعین صوبہ داری حکومتیں کرتی ہیں۔

عام طور پر مجلسِ بلدیہ کے ارکان تین سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور وہ خود اپنے میں سے صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرتے ہیں۔ صوبہ داری حکومت کسی بلدیہ کو بد انتظامی، اختیارات کے پجا استعمال یا فرائض کی عدم پابندی کی وجہ سے معطل کر سکتی ہے۔ تمام کارروائیوں کی نقول ہمیشہ صاحبِ ضلع کے پاس روانہ کرنا ضروری ہے۔

ان کے اختیارات میں حسب ذیل شامل ہیں:- سڑکیں اور راستے، آتشزدگی سے بچاؤ، متعدی بیماریوں سے بچاؤ، ٹیکہ، حفظانِ صحت، موریائیں اور نالیاں، شفا خانے، دوا خانے، دائیوں کی تعلیم، تفریح گاہیں، دھوبی گھاٹ، روشنی کا انتظام، آمدورفت کی سہولتیں، قبرستان اور مرگھٹ، تعلیم (جس میں وسطانی اور کلیاتی تعلیم بھی شامل ہے)، کتب خانے۔

مالیات کا دار و مدار حسب ذیل ابواب پر ہے۔

چنگی، گھاٹوں، پولوں اور سڑکوں پر محصول، محصولِ اکٹہ، روشنی اور صفائی کے محاصل، گاڑیوں اور جانوروں کے اجارے، خانگی بازار۔

(۲) بلدی کارپوریشن:- مثلاً کلکتہ، بمبئی، مدراس۔ اس میں سے کلکتہ کا نمونہ بطور مثال کے پیش کیا جاسکتا ہے۔

(الف) مجلس کارپوریشن:- اس میں ۸۵ ارکان ہیں جن میں سے ۵، منتخب شدہ اور ۸۰ نامزد کردہ ہیں یہ سب مل کر ڈالڈین کا انتخاب کرتے ہیں۔ ۵، منتخب شدہ ارکان مسلم یا غیر مسلم طبقات کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور عورتوں کو بھی حق رائے دہی حاصل ہے۔ حال ہی میں قاعدہ رائج ہوا ہے کہ بجائے علیحدہ علیحدہ انتخاب کے مسلم اور غیر مسلم دونوں کا انتخاب سب رائے دہندے مل کر کریں لیکن مسلم اور غیر مسلم نشستیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ (ب) مجلسِ خفصیہ اپنے میئر بلدی، نائب میئر بلدی، علما و عہدہ دار اور نائب علما و

عہدہ دار کا انتخاب کرتی ہے۔ ان میں سے اول الذکر دو عہدہ دار ارکان میں سے اور ثانی الذکر دو عہدہ دار باہر سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ عملاً عہدہ دار کے انتخاب کے لئے صوبہ واری حکومت کی رضامندی لازمی ہوتی ہے۔

(ج) مالیات کا دار و مدار تقریباً انھیں ملات پر ہے جن پر ہدایت کے مالیات کا دار و مدار ہوتا ہے۔

بعض بڑے بڑے بلدیات اور تحصیلات (مثلاً ممبئی، کلکتہ، مدراس، حیدرآباد، کھننور وغیرہ) میں مجالس آرائش بلدیہ قائم کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ شہر کو زیادہ بہتر بنائیں اور نہ صرف امیروں کے قیام کی سہولتیں پیدا کریں بلکہ عمارتوں، صفائی، ہوا، پانی وغیرہ کے انتظامات ایسے کریں کہ غربا کی بھی حالت درست ہو جائے۔

چھاؤنیوں کی مجالس۔ ایسے مقامات کے انتظام کے لئے جہاں انگریزی انواع کی چھاؤنیاں ہیں (جیسے سکندر آباد) وہاں مقامی مجالس قائم ہیں لیکن ان کی صدارت کوئی سرکاری عہدہ دار کرتا ہے اور آخری اختیارات

محکمہ فوج کو حاصل ہوتے ہیں۔

16
University
Aligarh
11/11/2019

باب ۲۰

توالج

توالج کی وجہ وجود۔ توالج کی ماہیت۔ طرز کار۔ توالج کی مخالفت۔ نوآبادیوں۔ نوآبادیوں

کی تاریخ۔ انگلستان، ہندوستان، موجودہ طرز کار

توالج کی وجہ وجود۔ اس سے قبل جن سیاسی ادارات کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے ادارات تھے جن کے ذریعے سے کسی آزاد ملک پر حکومت کی جاتی ہے لیکن جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے حوصلہ مند اور جانناز مالک کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے کہ اپنی ملک و در و صرف اپنے ہی ملک تک محدود نہیں رکھتے بلکہ دوسرے ملک پر بھی سیاسی یا معاشی اثرات قائم کر لیتے ہیں۔ یہ اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی ملک کو بظاہر آزاد رہنے دیا جائے لیکن عہد ناموں کے ذریعے سے اسے شکنجے میں کس لیا جائے اور بعض مرتبہ اس ملک کو بالکل تابع بنادیا جاتا ہے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جب طاقتور ممالک کی آبادی میں اضافہ ہو یا اسے غام پیداوار کی ضرورت ہو یا کسی دوسرے حصہ دنیا پر سیاسی اثر قائم کرنے کی خواہش ہو تو وہ صرف دوسرے ملک پر اثر قائم کرنا یا حکومت کرنا کافی نہیں سمجھتا بلکہ دہاں اپنی فالتوا آبادی کو بھیج کر نوآبادی قائم کر لیتا ہے جو اس دوسرے ملک

میں اپنے مادری ملک کا گویا نمونہ قائم کر لیتی ہے اور اپنے وطنی اصول زندگی کا وہاں چربہ اتار لیتی ہے۔ سلطنت قائم کرنے کا یہ طریقہ ہر زمانہ میں مختلف صورتوں سے قائم رہا ہے۔ مدت دراز تک یہ ایشیائی ممالک کا دتیرہ رہا اور اب یورپی ممالک نے اسے اپنا بنا لیا ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ آباد کاری صد دن چند افراد کے ذریعے سے نہیں کی جاتی تھی بلکہ قوم کا بیشتر حصہ وطنی ملک کو چھوڑ کر نئے ملک میں چلا جاتا تھا اور اسی کو اپنا وطن بنا لیتا تھا۔ اس کی مثالیں تقریباً ہر براعظم میں ملیں گی۔ چینیوں کا ایران کے بعد منچوزں کا مشرقی ایشیا میں پھیلاؤ، یونانیوں کی سواہل ایشیا سے کوچ کر کے پرآباد کاری، عربوں کی عراق، مصر اور اندلس میں آباد کاری، ہندوستانیوں کا جزائر جاوا، سائبرا، اور جزائر شرق الہند کا استعمار، فرنگیوں کا فرانس میں جرمنوں کا ہالینڈ کے گنا سے، تاتاریوں کا جنوبی روس میں اور قزاقوں کا جنوبی یورپ میں انتشار اور حال ہی کے زمانے میں ہندو قوم کا جنوبی افریقہ میں بس جانا، یہ سب اسی قسم کی قومی آباد کاری کی مثالیں ہیں۔ ان میں بعض کی آباد کاری معاشی اسباب کی بنا پر ہوئی تھی، یعنی جب کسی قوم کو اپنے وطن میں کھانے کی تنگی ہوئی تو اکثر افراد نے اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرا وطن اختیار کر لیا۔

آباد کاری کے اسباب تو اکثر معاشی ہی ہوتے ہیں، لیکن ہر جگہ یہ ضروری نہیں کہ سامان ضرورتوں کی کمی ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جب رومنوں نے اپنی نوآبادیاں مشرق، مغرب، شمال و جنوب میں قائم تھیں تو روما

میں سامان خورد و نوش کی تنگی تھی ؟ یا اس وقت جرستنی اور اٹنی جو ملکہ انہیں وسعت پیدا کر لے کی کوشش کر رہے ہیں اور انگلستان اور فرانس اپنی اپنی سلطنت کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو کیا یہ ممالک مرزہ الحالی کے صف اول میں نہیں ہیں ؟ لیکن غور کیا جائے تو ان مثالوں اور عمومی ترک وطن کے اسباب دونوں میں ایک طرح کی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ استعماری ملکوں میں تقسیم سامان خورد و نوش کی تنگی نہیں ہے ، بلکہ ہمارے اعتبار سے پیدا فرما رہے ہیں ، لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ معیار زندگی جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں موجودہ معیار سے بھی اعلیٰ ہے اور اس کے لئے جس خام پیداوار کی ضرورت ہے وہ ملک میں ہی نہیں ہو سکتی ، چنانچہ یا تو آباد ممالک کو وہ کسی نہ کسی جھٹک اپنے تابع کی کوشش کر رہے ہیں ورنہ اپنی زائد آبادی غیر آباد ممالک میں یا ایسے ممالک میں بھیج رہے ہیں جہاں کی آبادی آسانی سے قابو میں آ سکتی ہو ۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی طاقتور ملک اپنے در افتادہ حصص سلطنت کے راستوں میں جو ممالک ہیں انھیں محض اپنی طاقت قائم رکھنے کے لئے اپنا تابع کرنا چاہے ۔ اسی اصول پر انگلستان نے جبل الطارق ، مالتا ، نہر سوئس اور عدن پر قبضہ کیا ہے ۔

انتباہ کی اہمیت ۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ تابع بنانے کے لئے صرف اثر ہی کافی نہیں بلکہ بھی تفوق ضروری ہے ۔ آج کل کے ہجیرہ تمدن میں تقریباً ہر ملک ہر دوسرے ملک کا کسی نہ کسی طرح سے زیر اثر ہے ، لیکن یہ نہیں کہ اس سے انتباہ لازم ہو جاتا ہو ۔ اگر کسی ملک کا کسی دوسرے ملک پر

محض اثر ہو تو جب کبھی وہ دوسرا ملک اس قابل ہو جائے گا کہ اس اثر سے اپنے آپ کو آزاد کر سکے تو وہ فوراً آزاد کر لے گا۔ لیکن تابع کی نوعیت دوسری ہوتی ہے۔ اتباع کے معنی یہی ہیں کہ تابع کا طرز عمل جداگانہ نہ ہو بلکہ اسے قبوع کے طرز عمل کی ہی پیروی کرنا پڑے۔ اس صورت حال کے پیدا کرنے میں جبر کا عنصر لازمی ہے ورنہ کون ایسا ملک ہوگا جو بغیر کسی نہ کسی طرح سے مجبور کئے ہوئے اپنی قسمت کی باگ دوسروں کے قبضے میں دیدے۔ انسان سے انسان جو خدمت لینا چاہتا ہے اس کے دو طریقے ہیں یا تو جبر کر کے، ورنہ جس سے خدمت لینا چاہتا ہے اسے اپنا بنا کر ایک طاقتور شخص کے لئے (اگر اس کی طاقت ناقابل مدافعت ہو تو) سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جس سے خدمت لینا چاہے اسے خدمت کے لئے مجبور کرے۔ بحسنہ یہی حالت اقوام کی ہے۔ اکثر مملکتیں دوسرے رقبہ جات پر ابتدا میں جبراً قبضہ کرتی ہیں، اور گو پرانے زمانے کا فاتح اپنی نیکی تلوار پر ہی حکمرانی کے حق کا دار و مدار رکھتا تھا لیکن آج کل جب کوئی طاقتور مملکت کسی کمزور پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو اس کے مدبر بڑے دل بھانے والے الفاظ میں اخلاق پر کچھ دیتے ہیں اور دنیا کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم جو قبضہ کر رہے ہیں اپنے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ کمزور آبادی کے مفاد کے خاطر کر رہے ہیں۔ آج کل کی فتوحات اور آباد کاری کا یہ پیرایہ بنیادیت دلچسپ ہے۔ جاپانی کہتا ہے کہ میں منچوریا اور چین کو اپنے تصرف میں صرف منچوؤں اور جینیوں کے خاطر لانا چاہتا ہوں، اٹلی، اطالیہ، جرمنی اور البانیہ پر صرف اطالیوں

جشنوں، البانیوں کے فائدہ کے لئے قبضہ کرتا ہے، بلجیم کے قول کے مطابق کوئٹو پر قبضہ کرنے کا واحد منشا یہی تھا کہ کوئٹو والوں کو مستبد بنایا جائے۔ یہ عجیب بات یہ ہے کہ بعض نہایت سنجیدہ علماء سیاسیات بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ کسی ملک کی کسی ملک پر قبضہ کرنے کی بنیاد اخلاقی ہوتی ہے بشمول عالمِ دہلیستان، ڈچی کاٹ، انجلیٹو کہنا کہ "بلاشبہ ایک قوم کی دوسری قوم پر سیادت کا انجیل ہمارے اخلاقی شعور کے خلاف جاتا ہے، لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس سیادت میں کوئی اخلاقی عنصر نہ ہوتا ہے جس کے اعتبار سے طاقتور کا فرض ہو کہ کمزور کی خدمت کرے تو پھر اس نوع کی سیادت حق بجانب ہوگی بشرطیکہ اس سیادت کا واحد مقصد ایمانداری کے ساتھ اس اصول کا اتنا ہا ہو۔ یہ پہلانی کسی غرور یا نخوت یا نفوذ پر مبنی نہ ہونی چاہئے نہ کسی ایسی خواہش پر جس کا مقصد دوسروں سے فائدہ اٹھانا ہو بلکہ اس کی بنیاد حق احساسِ فرض شناسی ہونا چاہئے۔" معلوم نہیں فاضل مولف کے پیش نظر کس ملک کی سیادت اور کس ملک کا فائدہ ہے!

۱۱۔ افزائے پروردہ ملی طاقتوں کے بتدریج قبضے کے حالات کے لئے دیکھو جون "شہنشاہیت اور سیاسیات عالم" Moon: Imperialism & World Politics. باب ۱۱، انیس اس کتاب میں اس تاریخ کو آخری باب یعنی آٹمی کو قبضہ جہشہ و البانیہ اور جرمنی کا قبضہ چنچو سڈنا کی شافی نہیں ہیں۔
۱۲۔ انجلیٹو: "استعماری فکرت علمی" No God Anywhere: Colonial Policy. بندہ امت، ایف۔ ٹی۔

لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہی وہ خیال ہے جسے عرب عام میں ”سفید فاموں کا بار“ کہا جاتا ہے اور جس کے تحت بیان کیا جاتا ہے کہ سفید فام لوگوں پر اس کا بڑا بوجھ ہے کہ وہ بھورے، کالے، زرد اور سرخ باشندوں کو قعر مذلت سے نکال کر تمدن بنائیں۔ انجیلینو خود ایک آباد کار ملک یعنی ولندستان کا باشندہ ہے اور اس مقولے کے چند ہی صفحے پور وہ ایک دوسرا اصول مثال کے طور پر پیش کرتا ہے جس کا بعض مرتبہ اعادہ کیا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ”جادو جیسے ملک سے اگر ولندیزی فوراً نکل گئے تو ہزاروں لاکھوں جادوی ایک دوسرے کو ہلاک کر دیں گے، چنانچہ سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ وہی ہے جو نوآبادی کی حکومت اختیار کر رہی ہے جس کے ذریعے سے ایک طرف تو ملک میں امن و امان کو دوسری طرف نوآبادی والوں کو خود اپنی حفاظت کرنے کا سبق دیا جاتا ہے۔“ دراصل یہ اعادہ اسی اصول کی ایک شاخ ہے کہ دوسرے ملک پر جو حکومت کی جاتی ہے وہ حاکم ملک کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ محکوم ملک کے مفاد کے غرض سے ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں اس مسئلے پر بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ آیا کوئی ملک کلیتہً تابع ملک کی خاطر اس پر حکمرانی کر سکتا ہے یا نہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق سیاسیات سے نہیں بلکہ اخلاق سے ہے۔ سیاسیات ادسط اخلاق کے انسانوں اور ادسط اخلاق والے ملکوں پر بحث کرتا ہے۔ ایسے انسانوں کا وجود ممکن ہے

جن کے اخلاق غیر معمولی طور پر ارفع و اعلیٰ ہوں اور جو اپنے عادات و اطوار میں اپنا نہیں بلکہ صرف دوسروں کا خیال رکھتے ہوں۔ اسی طرح ایسے ممالک کے وجود کا شاید امکان ہو جو محض دوسرے ملکوں کی خاطر ان ملکوں پر حکومت کرتے ہوں اور اپنے مفاد کا خیال نہ کرتے ہوں۔ لیکن عموماً ایسے اشتیاق کتنے ہوں گے، اور ایسا ملک تو کوئی نظر نہیں آتا جو اکثر انجینیئروں کے معیار پر ٹھیک اترتا ہو۔

استعماری طرز کار۔ اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ آج کل کے ممالک اپنے بحری مورچوں کی تعمیر اور زائد آبادی کے دکان اور خام پیداوار کے لئے دوسرے ممالک پر قابو حاصل کرنے کے واسطے طرح طرح کے طریقے اختیار کر رہے ہیں۔ پروڈیوسر سمجھتے ہیں کہ میری برائی کی رائے سے اتفاق کر کے اپنی مشہور آفاقی کتاب ”سیاسیات“ میں اس کی کتاب کا ایک اقتباس دیا ہے کہ ”متقدم انسان نے جو تعلقات وحشیوں سے قائم کئے ہیں ان کی تفتیش کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہمیت اور مکر و فریب صاف نظر آئے گا“ اور خود سمجھ اس پر کہتے ہیں کہ ”تاریخ حالیہ“ کا یہ باب سب سے درد آمیز ابواب میں سے ہے۔“ یہ بالکل فطری امر ہے کہ طاقتور مملکت اس علاقے کے باشندوں کے ساتھ

۱۵ جگہ: ”مبادی سیاسیات“ Sidgwick: Elements of
 Political Science. باب ۸ فصل ۸ جہاں میری برائی کی کتاب ”آبادی“
 Meirvale: Colonization کا اقتباس دیا ہے۔
 ۱۶ ایضاً۔

جنہیں وہ اپنی حکوم بنانا چاہتی ہے، یا تو سختی کا در نہ ترغیب کا برتاؤ کرے گا۔ ایسے تو بہت کم خطہ جات دنیا میں ہی رہ گئے ہیں جو غیر آباد ہوں اور کسی کے ماتحت ہوں اور میں بھی تو وہ اغنیا بے کار ہوں گے یا ان کی آباد کاری کسی نہ کسی وجہ سے دقت طلب ہوگی۔ خود امریکہ دریا نت ہما تھا تو وہاں کے کم سے کم وسطی حصے میں دو عظیم الشان سلطنتیں، یعنی میگزیکو اور پیرو کی سلطنتیں قائم تھیں جنہیں ہسپانوی مسندوں نے نہایت ظلم و ستم کے ساتھ ختم کیا۔ اگر جس ملک کو زیر کرنا ہے وہ کسی دوسری طاقتور مملکت کا مقبوضہ ہے تو اس سے یہاں بحث ہی نہیں، اس لئے کہ وہاں تو گویا براہِ برکی چوٹ ہے، اور جنگ کا جو نتیجہ ہوگا اس کے مطابق معاملہ طے پائے گا۔ سوال تو اس حصہ دنیا کا ہے کہ جہاں برابری کا سوال نہیں بلکہ جہاں کے باشندے نوجی قوت یا تمدن میں پست ہیں۔ وہ ملک آباد ہے تو ایسی حالت میں وہاں کے باشندے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لئے حتی الامکان مدافعت کریں گے، خصوصاً ایسی حالت میں جب غالب ملک وہاں اپنی نوآبادی قائم کرنا چاہے گا اور نہ صرف روپیہ بلکہ مزدوروں کو بھی وہاں آباد کرے گا۔ اگر ملک گنجان طور پر آباد ہے تو نوآبادی قائم کرنے میں اور بھی زیادہ دقت پیش آئے گی، اور رفتہ رفتہ وہاں کی اصلی آبادی کے لئے ”محفوظات“ قائم کرنے پڑیں گے اور اصلی باشندوں کو سمجھانے کے لئے ایک طرف تو نوآباد کاروں سے یہ کہا جائیگا کہ تم محفوظات میں آزادی سے آباد نہیں ہو سکتے اور دوسری طرف اصلی باشندوں کو محفوظات سے باہر زمین حاصل کرنے اور آباد ہونے کی ممانعت

کر دی جائے گی۔ بظاہر یہ طرز عمل انصاف پر مبنی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں کہیں بھی اس قسم کے محفوظات ہیں وہاں ”مخصوص“ رقبے نہایت کم ہیں اور ”غیر مخصوص“ رقبے جو آبادکاروں کے لئے بالکل کھلے ہوئے ہیں، بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے ”غیر مخصوص“ رقبوں میں اصل باشندوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا اور انھیں لیکہ ”مخصوصات“ آبادکاروں کے بھی زیر اقتدار ہوتے ہیں۔

تاریخ کی مخالفت۔ بہر حال آبادکار ملک کو شدید مخالفت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بعض مرتبہ نوآبادکار ملک مخالفت کی پرواہ نہیں کرتا اور سختی سے پست تر ملک کو کچل دیتا ہے، جیسے حال ہی میں اٹلی نے ملک حبشہ میں کسی قاعدے یا قانون انسانیت کی پرواہ نہیں کی اور ہر طرح کا ظلم و ستم کر کے مخالفت کا خاتمہ کر دیا۔ کہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ملک جو دوسرے ملک کو اپنا زیر نگین کرنا چاہتا ہے، ترکیبوں سے کام لیتا ہے، اصل باشندوں میں دو فریق رکھ کر یا فریق بندی کر کے آپس کو ایک دوسرے کا دوست بناتا ہے اور اس سے مراعات حاصل کر کے اپنا تفوق بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ملک پر تسلط ہو جاتا ہے۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک میں اصل باشندوں کی حکومت، قواعد و قوانین حسب حال

سے الگ، ”جنوبی افریقہ میں اسیوں کے بابت حکمت عملی“ Evanso Native Policy in South Africa.

چھوڑ دئے جاتے ہیں اور محض فوجی یا بحری نفوذ کو کافی سمجھا جاتا ہے نیز جیسا اور کھانگیا ہے، بعض مرتبہ رعایا کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ سیاسی تبدیلی کی وجہ یہ ہے کہ مقتدر ملک مفتوح ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتا ہے اور اسی کے مفاد کے غرض سے اس پر حکومت کرنے کا خواہاں ہے۔ ان اصول کو مد نظر رکھ کر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مختلف ممالک مختلف طریقوں سے دوسرے ممالک کو اپنا تابع بناتے ہیں۔ سب سے پہلے شاید سب سے سادہ طریقہ فتح کا ہے جس کے بعد فاتح قوم مفتوح ملک میں اپنی چھاؤنیاں بنالیتی ہے، اس کی مثالیں منجور یا کے قبضہ چین، عربوں کے قبضہ عراق و شام اور روم کے قبضہ اٹلی و دیگر اقطاع سلطنت روم سے ملتی ہے۔ ان میں سے بعض ممالک پر قبضہ امن کے ساتھ ہوا اور بعض پر بزور شمشیر کیا گیا۔ روم کی نوآبادیوں سے دونوں طریقوں کا اظہار ہوتا ہے اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کسی ملک کا ایک حصہ بزور شمشیر فتح کر لیا گیا اور اس کے بعد اندرون ملک میں نفوذ کی غرض سے نوآبادیاں قائم کر دی گئیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو ملکوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور ایک ملک نے دوسرے ملک کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ دینے پر مجبور کیا۔ کئی اوقات اسی طرح سے انگریزوں کے قبضہ میں اور ہندو گاہ آرتھر اسی طرح سے جایا ہوں کے قبضہ میں آیا۔ آج کل کے زمانے میں اکثر و بیشتر حصص دنیا پر کسی نہ کسی طاقتور ملک کا پرچم لہراتا ہے، اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ملک کسی حصہ پر بغیر لڑائی کے قبضہ کرے گا۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں تھا۔ (حاشیہ صفحہ ۴۸۹ پر)

چنانچہ حال ہی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۰ء تک یورپی مملکتوں کا، اُن حصص ازلیقہ پر جو اس وقت تک خالی تھے، بغیر جنگ ہی کے قبضہ ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ یورپی ممالک جرمنی، فرانس، انگلستان وغیرہ نے آپس میں عہد نامے کر کے تمام ایسے رقبات کو جو کسی متمدن ملک کے دست نگر نہ تھے، آپس میں تقسیم کر لیا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مملکت کسی دوسری مملکت سے حصہ خریدے، جس کی بہترین مثالیں ممالک متحدہ امریکہ کی روس سے الاسکا کی، اور ڈنمارک سے جزائر جزیرہ ڈینیڈہ کی خریداری میں ملتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خریداری کی بجائے کوئی حصہ ملک پٹہ پر لے لیا جائے جیسے ساحل چین کے بعض بندرگاہ ۱۹۰۹ء و ۱۹۱۰ء سال کے پٹہ پر فرانس، پرتگال، جاپان کے سپر دکر دے گئے ہیں۔ آخر میں ”محفوظوں کا ذکر باقی ہے۔ یہ وہ ریاستیں ہیں جو کمزور ہوتے ہوئے اس درجہ پر پہنچ گئی ہیں کہ صاحب تلفیق سلطنت اُن کے خارجی امور کھینٹ اپنی نگرانی میں کر لیتی ہے اور داخلی امور پر بھی اس کے ریڑیڈنٹ یا قائم مقام کا فانی طور پر اثر پڑتا ہے۔

نوآبادیاں۔ ظاہر ہے کہ ان سب سے زیادہ مستحکم قبضہ نوآبادیوں کے ذریعے سے ہوتا ہے اس لئے کہ حضرات ”اندرونی بغاوت یا خلفشار

سے اس کے علاوہ ایک اور ہی طریقہ ہے۔ یعنی محض دھکی کے ذریعے سے کمزور ملک کو اپنا تابع ہونے پر مجبور کرنا۔ حال میں اسکا نظائرہ جرمنی کے قبضہ چچو سلوانکیہ کی شکل میں ہوا۔

ایک غیر آبادی کے قبضہ کی وجہ سے ہوتے ہیں وہ علی العموم نوآبادی میں نہیں ہوتے، اس لئے کہ نوآبادی والے خود اپنے ہی قوم کے ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے واقعات جیسے امریکی نوآبادیوں کی بغادت اور آزادی بھی پیش آتے ہیں لیکن ایسے واقعات نسبتاً کم ہی ہوتے ہیں۔ نوآبادیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ اگر ہم نوآبادیوں کی تاریخ پر غور کریں تو سب سے پہلے تو ہم فنیقیہ کی محض تجارتی نوآبادیاں ملتی ہیں، جن سے مراد زیادہ تر یہ تھی کہ جگہ جگہ تجارتی کوٹھیاں بنادی جائیں تاکہ تجارت میں آسانی ہو۔ یونانیوں کی نوآبادیاں اپنی مادری مملکت سے بالکل آزاد ہوتی تھیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جن شہریوں کو وطن میں روٹی مشکل سے ملتی تھی وہ مشرقی یا مغربی ممالک میں جا کر دلوں زراعت کریں اور اپنی تہذیب و تمدن کی گویا چوکیاں قائم کریں۔ رومانیوں نے جو نوآبادیاں قائم کیں انھیں اپنا تابع رکھا، لیکن اکثر نوآبادیوں کو اندرونی انتظامات کے اختیارات دیدئے۔ عربوں نے اپنی نوآبادیوں کا ایک سلسلہ مشرق سے مغرب تک قائم کیا، لیکن اس کی بنیادیں پر نہ بھی بلکہ تمدن پر تھی، اور رفتہ رفتہ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی کہ عربی لوگ تہذیب و تمدن میں عربوں سے بھی آگے نکل گئے، چنانچہ تاریخ اسلام میں بہت سے ایرانی، ترک، مغول، بربر اور حبشی عربوں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ تمدن کی دڑ میں ان سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔

نوآبادیوں کی تاریخ۔ اگر یہاں دردناک کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ دول یورپ نے نسبتاً حال ہی کے زمانے میں آباد کاری شروع کی ہے۔ اسپین اور پرتگال میدان میں ان سب سے پہلے آئے۔ ان کا مقصد ابتدا میں

زیادہ تر تبلیغ عیسویت تھا، لیکن اس پر دے میں انھوں نے ایشیا، افریقہ اور امریکہ میں بڑی بڑی زیادتیاں کیں اور ایک وسیع رقبے پر اپنی دنیوی سلطنت قائم کر لی، یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں پوپ الکزیڈر ششم نے تمام نئی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مشرقی حصہ (جن میں برازیل ہے) پرتگال کو اور مغربی حصہ (جس میں تمام وسطی اور جنوبی امریکہ ہے) اسپین کے نذر کر دے۔ اسپین اور پرتگال کے بعد ولندستان میدان میں آئے اور ولندیزی شرکت شرق البند کے ذریعے سے اپنی نوآبادیاں جزائر شرق البند، جنوبی افریقہ اور ہندوستان کے ساحل پر قائم کر لیتا ہے۔ یہ شرکت ۱۶۰۰ء تک قائم رہی اور اس سنہ میں یہ سب نوآبادیاں ولندستان کی ملک ہو گئیں۔ ۱۶۰۰ء میں انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور ۱۶۰۲ء میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی بنیں اور ۱۶۰۰ء میں ورجینا کمپنی کے ذریعے سے انگریزوں نے امریکہ کی آباد کاری شروع کر دی۔ ان فرض زمانہ حال کی مملکتوں میں سے انگلستان نے تقریباً سب کے بعد آباد کاری شروع کی، لیکن تفوق اور سلطنت کی دوڑ میں سب کو ہار دیا۔

انگلستان - انگلستان کی سلطنت میں بہت کچھ مدد جزیرہ واسٹ اور ٹریس بڑے بڑے سبوروں کے بعد اب کہیں انگلستان کے استعماری طرز عمل کی معین تشکیل ہوئی ہے۔ سترہویں صدی میں نوآبادیوں پر اس طرح حکومت کی جاتی تھی گویا کہ وہ محض مادی ملک کے ذمے کے لئے قائم ہوئی ہیں، چنانچہ ۱۶۱۱ء سے ۱۶۱۲ء تک متحدہ دونوں جزائرانی منظر ہوئے جن کی رو سے صرف انگریزی جہازوں کو نوآبادی سے کسی قسم کی تجارت کرنے کی

اجازت دی گئی اور غیر ملک والوں کو ان نوآبادیوں کے ساتھ کسی قسم کا بیوپار کرنا ممنوع قرار دیا گیا۔ تیز نوآبادیوں کی صنعت و حرفت پر طرح طرح کی رکاوٹیں قائم کی گئیں اور یہ طے کر دیا گیا کہ کوئی غیر جہاز بغیر انجمنستان ہوسے کسی نوآبادی جاسے نہ وہاں سے آئے۔ اس طرز عمل کو جنگ آزادی امریکہ میں بڑا بھاری دھکا لگا۔ جنگ آزادی امریکہ میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ انجمنستان والوں کو محض اپنے نفع کی خاطر نوآبادیوں پر محصول لگانے کا اختیار ہے یا نہیں، اور اس مسئلے میں انجمنستان نے شکست فاش کھائی اور اس کی قربتاً تمام نوآبادیاں ہاتھ سے جاتی رہیں پھر بھی جو کچھ باقی رہ گیا تھا، یعنی کنڈا، اس کی باگ بھی انگریز تنگ کئے رہے، اور اس طرز حکومت کا جسے ذمہ دار حکومت کہتے ہیں اسی وقت اجرا ہوا جب فرانسیسی عنصر کی شدید بغاوت کے بعد لارڈ ڈرہم کے مامور یہ ۱۸۴۸ء میں سفارش کی کہ کنڈا کی نوآبادیوں کو ذمہ دار حکومت کے احضار رات دے جائیں۔ اس کے بعد انگریزوں کا طرز عمل یہ ہو گیا کہ ان نوآبادیوں میں، جہاں سفید نام عنصر تعداد میں زیادہ نہیں تو اہم ضروریہ، پارلیمنٹی طرز کی ذمہ دار حکومت دے دی جائے، چنانچہ ذمہ دارانہ اختیار رات ۱۸۵۲ء میں نوآبادیستان کو، ۱۸۵۳ء میں راس امیر کو اور ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۰ء تک آسٹریلیائی نوآبادیوں کو دے گئے، اور جنگ جنوبی افریقہ کے بعد ڈیوال اور سیچ کو بھی پارلیمنٹی اختیار رات عطا کر دئے گئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑیاں ہائے زمانے میں منسلک ہوئیں، یعنی ۱۸۶۰ء میں تمام آسٹریلیائی نوآبادیوں کو مارک دوت عامہ آسٹریلیا، اور ۱۹۰۱ء میں جنوبی افریقہ کی چار نوآبادیوں کو مارک دوت جنوبی افریقہ

بنایا گیا، اور ۱۹۶۱ء میں جنوبی آئرستان کے باغیوں کے ساتھ ایک صلحنامہ پر دستخط کئے گئے جس کی بوسے اس حصہ ملک میں کٹاؤ کی وضع کی حکومت نسیم کی گئی اور اسے ”آزاد ریاست آئرستان“ کا لقب دیا گیا۔

ہندوستان - ہندوستان کی نوعیت نو آبادیوں سے جدا گانہ ہے۔ گو ہندوستان میں بہت سے غیر آباد قطعات ہیں، لیکن ان سے زیادہ تر تولید ہیں جن میں، موسمی اسباب کی بنا پر کسی قسم کی یورپی آبادی کا قیام قطعاً ممکن نہیں۔ ایسے قطعات کے علاوہ باقی ماندہ ملک میں ہندوستانیوں کی آبادی نہایت گنجان ہے، اور یہ آبادی جنوبی افریقہ کے بھٹو یا آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی طرح غیر متدن نہیں بلکہ بڑی بڑی روایتوں کی حامل ہے، اور گو ہندوستانی زیادہ تر آپس کے تفرقوں کی بجائے بہت کچھ کھوٹیٹھے، لیکن اس وقت بھی ان میں غیرت و حمیت کے ٹھوڑے بہت اثرات باقی ہیں۔ ایسے لوگوں کو امریکی اندیاسیوں کی طرح ”محفوظ رقبوں“ کے اندر محدود کر کے ایک نو آبادی قائم کرنا ناممکن تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی ابتدا میں محض ایک تجارتی کمپنی تھی، لیکن خود ہندوستان کے باہمی جنگ و جدال نے اسے مولفہ ہی نہیں دیا بلکہ میسر کیا کہ وہ ہندوستان کا سب سے اہم سیاسی عنصر بن جائے۔ مہتمی سنہ ۱۷۵۷ء کی جنگی صدی عیسوی کے وسط میں اپنا مشن یہ قرار دیا کہ تمام ہندوستان پر برطانوی حکومت کرے، چنانچہ مسلسل شروع ہوا وہ یہ تھا کہ ایک گورنر جنرل و اہلکاروں جنگوں یا دوسرے ذرائع سے ایک حصہ ملک پر قبضہ کر لیت اور اس کے بعد گورنر جنرل ”عدم مداخلت“ کی حکمت برلن پر راہ کو کر لیتا، شدہ حصہ ملک پر حکومت کا مزید استحقاق کا فی جمعیتا۔

لیکن اس طرز عمل کو "عذر" ۱۸۵۷ء میں بڑا دھکا لگا۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عذر کے دو سب سے بڑے مرکز یعنی دہلی اور لکھنؤ دو ایسی شمالی سلطنتوں کے پایہ تخت رہ چکے تھے جن میں سے ایک کا الحاق صرف ایک سال پہلے ہوا تھا اور دوسرے کو بالکل بے دست و پا کر دیا گیا تھا۔ عذر کی آگ سے حیدر آباد محفوظ

رہا اور احمد لٹہریاں کے فرمانروا کی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستقل ہو گئی۔ انگریزوں جس طرح جنگ آزادی امریکہ کے بعد انگریزوں کی نوآبادی کی طرز عمل میں بھی ایک انقلابی کیفیت پیدا ہوئی، یعنی کمپنی کا خاتمہ کر دیا گیا، ملکہ وکٹوریہ اب براہ راست ملکہ ہند ہو گئیں اور ان کے مشہور فرمان ۱۸۵۷ء میں اس کا اعلان کر دیا گیا کہ تاج کے مقبوضات ہند میں وسعت نہیں کی جائے گی اور فرمانروایان ہند کے قبضے بدستور سابق رہیں گے۔ نیز اس طرز عمل سے گریز کر کے جولاوڈ پلہوڑی کے زمانے میں "بازگشت" کا قرار پایا تھا، یعنی یہ کہ اگر کسی دلی ملک کے ادلانہ ہو تو ایسی حالت میں اس کی ریاست انگریزوں کی املاک ہو جائے گی، لارڈ کیننگ

شد و کھوتھورن نے "انڈین گزیٹیر" Indian Gazetteer for 1856

۱۸۵۷ء میں اعلان کیلئے دیکھو ناٹسکلہ ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی شہنشاہی حکومت کے درمیان سیاسی

تعلقات اور ان کا ارتقاء Shyamra Shankar: The Nature

and evolution of the political relations

between the Indian States and Imperial

Government. باب ۴۔

نے جو نئے انتظام کی رو سے نائب شاہ مقرر ہوا تھا، ہر ایک ہندو والی ملک کو
 "سندھیت" اور ہر مسلمان والی ملک کو "سندھوریت" یا اصول شرع محمدی
 دے کر ذہنی غفلت کو فروغ دیا۔

موجودہ طرز کار۔ آج کل مختلف سلطنتیں اپنے مقبوضات کا طرح طرح
 سے انتظام کرتی ہیں، بعض جیسے فرانس، بظاہر مقبوضات کو خود مختار اور اختیار
 دیتی ہیں لیکن کچھ اس بیج سے کہ اسی اختیارات کے حامل اسی باغیہ سے نہیں
 ہوتے بلکہ آباد کار ہی ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی نوعیت سب آباد کار ملک
 سے جدا گانہ ہے، اس لئے کہ اس کے مقبوضات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے
 ہیں اور ان مقبوضات کی آبادی میں نہیں، مذہب اور تہذیب کے لوگ پائے جاتے
 ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی سلطنت کے یہ جزیرہ انتظام کیساں طرح پر نہیں ہو سکتا۔ ایسی
 نوآبادیال جن میں اکثریت یا اہم ترین اقلیت سفید فاموں کی ہے، انھیں مکمل سوراہی
 اختیارات دیئے گئے ہیں اور اب ان کو نام "قلمرو" قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے
 بعد وہ نوآبادیال اور مقبوضات میں جنھیں قانون سازی کے اختیارات تو خاص ہیں،
 لیکن مالا مال اختیارات کا کھینچا گورنر کے قبضے میں ہے کچھ ملک اب ایسے ہی ہیں
 جنھیں "محفوظ" کا لقب دیا جاتا ہے یعنی جن پر ایسی حکمران فرما رہا ہیں لیکن اختیارات
 کا ایک حصہ برطانوی ریڈیوٹنٹ یا قائم مقام کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ آخر میں
 "شامی" نوآبادیال کو درجہ ہے جن پر براہ راست انگریزوں کی طرف سے حکومت

مبتنی ہے۔

۱۔ ایضاً۔

حال ہی میں، یعنی جنگ عظیم کے بعد، سیادت پیدا کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا گیا ہے، جس کی رو سے انجمن اقوام نے جرمنی اور ترکی کے بعض ایشیائی اور افریقی مقبوضات کو انتظام کی غرض سے سلطنت برطانیہ، فرانس، بیجیم اور جاپان کے سپرد کر دیا۔ اس طریقہ کو ہم ”عکبر داری“ کہتے ہیں اور اس کی رو سے حکمران سلطنتیں اپنے اپنے انتظامات کی سالانہ رودادیں انجمن اقوام کے مامورِ عکبر داری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ انجمن اقوام اور عکبر داری کا بیان اس کتاب کے آخری باب میں ملے گا۔ یہاں صرف یہ امر قابل ذکر ہے کہ کم از کم ان علاقوں کے متعلق جو عکبر داری (الف) کے زمرے میں آتے ہیں، یعنی جو کسی زمانے میں دولت عثمانیہ کے علاقے تھے یہ طرز عمل ہو گیا ہے کہ انھیں ایک حد تک آزادی دے دی جائے۔ اہل میں یہ علاقے وہ ہیں جو بقول ”موافقہ انجمن اقوام“ تہدن کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ انھیں خود مختار اقوام قرار دیا جاسکتا ہے؛ گو انھیں ایک حکمران ملک سے اس وقت تک صلاح اور مدد لینی ہوگی جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ عراق اور شام میں یہ صلاح و مدد حکمران ملک یعنی انگلستان اور فرانس برابر دیتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۳۶ء میں عراق اور شام کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن یہ آزادی بہت کچھ محدود ہے، اس لئے کہ بغداد کی عدالت عالیہ و عدالت اسے ابتدائی کے میر مجلس صاحبان انگریزوں نیز وزارتِ مدافعت کی صلاح کار مجلس ایک برطانوی فوجی مامور یہ ہے اور شہر بصرہ برطانوی ہوائی قوت کا اب بھی ایک بڑا مرکز ہے۔ (حاشیہ صفحہ ۴۹ پر)

شام کی آزادی بھی تقریباً انہیں اصول پر مبنی ہے۔ باقی ماندہ حکمرانوں کی علاقے
 (یعنی افریقہ اور بحر الکاہل کی سابق جرمن نوآبادیاں) اپنی اصلی جنسیت سے
 گرتے جاتے اور رفتہ رفتہ صاحب حکمرانوں کے متحدہ علاقوں کی شکل اختیار
 کرتے جاتے ہیں۔

ضمیمہ باب ۲۰

تشیلات حکومت توابع

اٹلی - بحیم - اسپین - جاپان - ولندستان - ممالک متحدہ امریکہ - فرانس

انگلستان - ہندوستان اور ہندوستانی ریاستیں

اٹلی اور اسپین اپنے توابع پر براہ راست حکومت کرتے ہیں۔
توابع کو کتنی قسم کے اندرونی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔

جاپان اپنے مفوضہ جزائر اور ماتحت علاقوں پر براہ راست حکومت کرتا ہے۔ حال ہی میں اس نے چین سے لڑکر منچوریا اور مشرقی چین کے صوبوں کو چین سے جدا کر دیا ہے۔ منچوریا میں تو نفور چین کو سخت پریشان کر منچو کو تو (منچو مملکت) قائم کی ہے جو ایک طرح کا محفوظ ہے جس کے انتظام کی دائمی باگ جاپانی سفیر کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح اس نے شمالی اور مشرقی چین کو غیر مسلح کر کے ایک طرح سے اپنا تفوق قائم کر لیا ہے۔

ولندستان۔ ولندیزی شرقی ہندسی نوآبادیوں پر ہندوستان

۱۷ ولندستان کے توابع کی حکومت کا غفل ذکر انجیلینو کی کتاب، جلد ۲ میں ملے گا۔ مختصر

بیان کے لئے دیکھو "سالنامہ مدیرین" ۱۹۳۵ء، ص ۱۱

کی طرح (درطرز کی حکومت ہوتی ہے یعنی بالواسطہ اور براہ راست - سہارا اور جاؤا مقامی سلاطین اور راجوں سے بھرا ہوا ہے جن کی رہنمائی مختلف و لندیزی ریز پٹنٹ کرتے ہیں جس حصہ ملک پر براہ راست و لندیزی حکومت ہوتی ہے اس میں گورنر جنرل اور ایک "مجلس عمومی" کو قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے اس میں منتخب شدہ اور نامزد کردہ دونوں قسم کے اراکین تھے اور اس مجلس کو اہم ترین معاملات پر گورنر جنرل کو صلاح دینے کا اختیار تھا۔ لیکن ۱۹۲۵ء کی اصلاحات کے ذریعے سے نوآبادی کو اندرونی سول راج حاصل ہو گیا ہے، یعنی مجلس عمومی کی کنیت کو وسیع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ہی منتخب شدہ عنصر کو بھی بڑھا دیا گیا ہے۔

مالک متحدہ امریکہ

جسے نوآبادی کہنا چاہئے وہ مالک متحدہ امریکہ کی ایک بھی نہیں اس لئے کہ خورد رفتی ریاستوں میں بعض ایسی ہیں جن کا رقبہ سیکڑوں مربع میل وسیع ہے اور آبادی بہت کم ہے چنانچہ خود مالک متحدہ میں آبادی کی ہمیشہ مانگ رہی ہے۔ جو مقبوضات انہیں امریکہ سے باہر تھے بعض قبض ملکیت نے زیادہ سے اختیار دے ہوئے ہیں۔

دراگوز قوم ساوا بحری مرکز ہیں۔ ساوا میں جو حکومت ہے اس میں جدید اور قبا ئی طرزوں سے جو سٹاپ ہیں۔

۱۹۰۷ء کی کنونشن "نوآبادیوں کی حکومت" Reich Colonial
Gesetzgebung.

۲۰۔ جزائر و شہزادہ "ان کے تمام باشندوں کو امریکی شہریت کے حقوق حاصل ہیں۔ دونوں میں حکومت جدید طرز کی ہے اور امریکی اصول پر جماعت چلے چکے ہیں۔ گورنروں کا تقرر صدر ہاؤس متحدہ امریکہ کرتا ہے۔

۲۱۔ مہانگ متحدہ امریکہ کا سب سے اہم غیر لاپسی جزیرہ ایشیائی جزیرہ نئی پائن ۱۸۹۳ء کے امریکی قانون کے ذریعے سے جس کی ۱۹۰۴ء میں نئی پینز قوم نے توثیق کی، اب "دولت قائمہ نئی پائن" اندرونی امور میں بالکل خود مختار ہے۔ اس کا انتظام ایک صدر (جو چھ سال کے لیے منتخب ہوتا ہے) اور ایک ایک دو ایوانی مغلضہ پر (جو تین سال کے لیے منتخب ہوتی ہے) مشتمل ہے۔ امریکہ اپنا ایک نامور اعلیٰ صدر تمام جزائر یعنی فیلیپائن رکھتا ہے۔ دس سال تک حسب ذیل امور امریکہ کے اقتدار میں محفوظ رکھے گئے ہیں، قرضہ سکہ سازی، درآمد و برآمد، امور خارجہ و ترکس، ٹن، ترمیناس و ستوار اور حفاظت ملی۔ پہلے یہ قرار پایا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں نئی پائن بالکل آزاد ہو جائے گا لیکن بین الاقوامی حقوق حال کے مد نظر اب فیلیپین قوم کی خواہش ہے کہ امریکی حفاظت کا سلسلہ قائم رہے، چنانچہ انکی استدعا کے مطابق جزائر کی مکمل آزادی کی تاریخ ۱۹۱۰ء تک ٹھادی گئی ہے۔

فرانس

اصول: فرانسیسی نوآبادی کو ذمہ دارانہ حقوق حاصل نہیں گو بعض نوآبادیوں میں نیابتی
۱۹۴۸ء کی سیاسی حیثیت کے لئے دیکھو سالنامہ برین ۱۹۴۸ء صفحہ ۶۷۔

محسوس ہیں۔

۲۔ الجوائز کو فرانس کا ایک جزو تصور کیا جاتا ہے اور فرانس ایک محفوظ ہے جس کا تعلق وزارت خارجہ سے ہے (۳) بعض نوآبادیاں پیرس کی مجلس مینات اور دارالائینین دونوں میں سے ارکان انتخاب کر کے بھیجتی ہیں اور بعض دارالائینین ہیں اور پیرس میں ایک مجلس اعلیٰ متعلق نوآبادیات ہے جس میں نوآبادیاتی ارکان دارالائینین و مجلس مینات خاص نوآبادیاتی وفید فرانس ایوان مانے تجارت اور نوآبادیاتی انکمبول کے وفید شامل ہیں یہ مجلس جنرالی حلقوں میں تقسیم ہے انواع توالیج فرانس ۱۔

۱۔ الجوائز: اصل عرب باشندوں کو مکمل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لئے کہ نوآبادی کو فرانس کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے جو پہلی باشندوں کے لئے نقصان رساں ہے۔ الجوائز کے آباد کاروں کی طرف سے فنانس اور سیناتی پیرس جاتے ہیں لیکن ان کے لئے صرف فرالسی ہی رائے دے سکتے ہیں اور چونکہ پارلیمنٹ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے مجموعے کام کرتے ہیں اس لئے ان لوگوں کی آواز کو خاص اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے آباد کاروں کو برابر مراعات ملتی رہتی ہیں۔ الجوائز کے محکمات عدل، تعلیمات، کھیت اور خزانہ براہ راست پیرس کے ماتحت ہیں۔ اور نوآبادی کا موازنہ گورنر جنرل وزیر خزانہ کے رائے بناتے ہیں۔ گورنر جنرل کے متعلق ایک مجلس بھی ہے لیکن وہ محض صلاح کار ہے اسے کوئی خصوصی اختیارات حاصل نہیں۔

۲۔ ٹونس۔ یہ بحیرہ فرانس کے وزیر خارجہ کے متعلق ہے۔ یہاں پر اس کے نام ”ٹونس کے“ ہے۔ ”کی حکومت ہے لیکن دراصل ہر امر کا دار و مدار فرانسیسی ریزیدنٹ کے قبضے میں ہے جو ٹونس کا وزیر خارجہ باعتبار عہدہ بھی ہے دیگر اوزار میں سے، ذرا فرانسیسی اور تین تونسوی ہیں۔

۳۔ انام میں ”شہنشاہ انام“ کے ماتحت ایک دارالنائینین ہے اور ایک وزارت بھی، لیکن حکومت ریزیدنٹ کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔

۴۔ فرانسیسی ہند میں ایک منتخب شدہ مجلس ہے جو ہندوستانی علاقے کے متعلق قانون سازی کرتی ہے۔ انتخاب کے اغراض کے لئے اس کے دوسری حصے ہیں، ایک کو فرانسیسی منتخب کرتے ہیں اور دوسرے کو ہندوستانی۔ جو ارکان پیرس کی پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہوتے ہیں (یعنی ایک سیناتی اور دو نائب) انھیں صرف فرانسیسی ہی منتخب کرتے ہیں۔

۵۔ ایک نوع ایسی نوآبادیوں کی ہے جو زیادہ تر جزائر غرب اہند میں پائی جاتی ہیں اور جن میں قانون سازی کا کام منتخب شدہ مجلس کے ہاتھ میں ہے لیکن ان مجالس کو کسی قسم کے عاملانہ اختیارات حاصل نہیں۔

۶۔ فرانسیسی مراکش ایک بحیرہ ہے۔ سلطان مراکش کا وزیر خارجہ (جہاں تک فرانسیسی حصہ کا تعلق ہے) فرانسیسی ریزیدنٹ ہے، اور اصل میں تمام حصہ ملک کا انتظام اسی کے قبضے میں ہے۔ قانون سازی شہنشاہی فرامین کے ذریعے سے ہوتی ہے لیکن ان فرامین کو اصل میں ریزیدنٹ

یہ ترتیب دیتا ہے۔
انگلستان۔

(۱) شاہی نوآبادیاں - یہ نوآبادیاں میں جن پر تاج کی طرف سے براہ راست حکومت ہوتی ہے اور جہاں قانون سازی اور عادلانہ اختیارات دونوں پر شاہی گورنر کو پورا قابو حاصل ہے۔ بعض نوآبادیوں میں جماعت مقننہ نہیں ہے جیسے جبل الطارق اور سینٹ ہلینا، اور بعض میں جماعت مقننہ ہے صرف لیکن اس کا بیشتر حصہ نامزد کردہ ہر جیسے برطانوی ہونڈیوارڈ، ہونگ کانگ اور جزائر فاکستان۔

(۲) ایسی نوآبادیاں جہاں کی جماعت مقننہ قانون سازی کی حد تک ذی اختیار ہے لیکن عادلانہ اختیارات گورنر کی ذات میں مرکوز ہیں۔ انھیں بعض ترتیب "نیابتی نوآبادیوں" کا بھی لقب دیا جاتا ہے۔

نوآبادیوں میں ان کی ایک خاص نوعیت ہے۔ اس کی "مجلس مملکت" کو نہ صرف قانون سازی کے اختیارات حاصل ہیں بلکہ یہ انتظامی امور میں بھی رائے زنی کر سکتی ہے۔ وزارت دس ارکان پر مشتمل ہے جن میں سے سات مجلس مملکت کے منتخب شدہ ہوتے ہیں اور تین، یعنی متعینہ خصوصی، متعینہ قانون اور متعینہ مالیات اگر گورنر نامزد کرتا ہے۔ ساتوں منتخب شدہ وزرا کی مدد سے ہر ایک ایک مجلس شورے

یہ نشست۔ حسب بالا باب ۸ اور انگلستان، حسب بالا باب ۸، رکنیت، "فکری حکومتیں
 میں "Keith: Dominion Autonomy in
 practice.

بھی ہوتی ہے جسے مجلس مملکت مقرر کرتی ہے۔ جس مملکت میں وہ منتخب شدہ ارکان، تین نامزد کردہ ذرا اور آٹھ مزید نامزد کردہ ارکان ہوتے ہیں۔

(۳) قلمرویں۔ یہ تعداد میں پانچ ہیں، یعنی کناٹا، آسٹریلیا، نوڈریسٹان، جنوبی افریقہ اور آئرستان۔ پہلے نیونادٹ لینڈ بھی ایک قلمرو تھی لیکن جزیرہ دالول نے اپنے جملہ اختیارات برطانیہ کو ہنگامی طور پر واپس کر دئے اور اب اس کا انتظام ایک ساموریہ کے سپرد ہے جس کا صدر گورنر ہوتا ہے اور جس میں تین انگریز اور تین آباد کار ہوتے ہیں۔

قلمروں کے خصوصیات۔

قلمرو ہر داخلی معاملے میں اور ایک حد تک خارجی معاملات میں خود مختار ہے اور اسے دل خارجہ سے براہ راست تعلق رکھنے کا اختیار حاصل ہے۔ قلمرو انجمن اقوام کا رکن ہے۔ کسی قلمرو کے حدود کے اندر انگریزی فوج نہیں ہے اور سلاطہ آئرستان کے شاہ جہاں کے ۱۹۳۷ء کے دستور کے مطابق گورنر جنرل کا عہدہ

۵۵ قلمروں پر برطانوی اقتدار کے لئے دیکھو کیتھ: ”برطانوی قلمروں کا اقتدار“

Keith: Sovereignty of the British
Dominions.

۵۶ سالانہ مدبرین، حسب بالا، ص ۱۱۳

۵۷ اس سے پہلے ہی، یعنی دسمبر ۱۹۳۷ء میں صدر اعظم آئرستان ڈی ولیر نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ شاہ انگلستان کو سوائے بین الاقوامی تعلقات (بقیہ حاشیہ ص ۱۱۳) پر

تڑو دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ایک نخب شدہ صدر مقرر کیا گیا ہے (ہر جگہ ایک ایک گورنر جنرل مقرر کردہ بادشاہ ہے، لیکن انگلستان کی طرح اسے حقیقی عاملانہ اختیار حاصل نہیں ہیں، بلکہ ان اختیارات کا حال ذریعہ غم ہوتا ہے جو قلمروی پارلیمنٹ کے سامنے ذمہ دار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قلمروی حکومتوں اور حکومت انگلستان کے امین رسل درسا کی بجائے گورنر جنرل کے دو نامورین اعلیٰ کے ذریعے سے ملے ہوتے ہیں جن میں سے ایک قلمرو کی طرف سے لندن میں اور ایک حکومت لندن کی طرف سے مستقر قلمرو میں بطور سفیر کے رہتا ہے۔

۶۔ اپریل کا کنفرس ۱۹۶۶ء اور تاؤن ویلٹ کنفرس ۱۹۶۷ء نے یہ ملے کر دیا ہے کہ برطانیہ کلاں اور قلمروں کی حیثیت بالکل سادی ہے کسی کو دوسرے پر کسی معاملے میں تغلق حاصل نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ ۵۰۵) اور سفر کے خطوط اعتبار پر دستخط کرنے کے اب آریستان کے متعلق کوئی حق باقی نہیں رہا۔ چنانچہ شاہ ایڈورڈ ہشتم کے ترک سلطنت کے بعد ہی ایک قانون آریستانی پارلیمنٹ میں منظور ہوا جس کے ذریعے سے بادشاہ یا گورنر جنرل کے حق اقتدار اور پارلیمنٹ کو طلب کرنے اور برخاست کرنے کے حق کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس قانون کی رو سے بادشاہ کو علاوہ خارجی معاملات مثلاً صلح ناموں اور قلمرو سفر کے اندر دنی امور میں کوئی اختیار باقی نہیں ہے۔ ۱۹۶۷ء کے آریستانی دستور میں بادشاہ کا نام ہے نہ ذکر، دیکھو سالانہ رجسٹر *Annual Register* ۱۹۶۷ء کے لطف یہ ہے کہ یہی آریستان بیڑے اور زمین روں پر ایک پیسہ خرچ نہیں کرتا اور اس کی بیرونی حفاظت کا دار و مدار کلیئہ انگلستان پر ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ

۱۔ گورنر کے اقتناع کا اب استعمال نہیں کیا جاتا لیکن وہ مسودوں کو بادشاہ (یعنی عطا حکومت برطانیہ) کے حکم کے لئے ”محفوظ“ کر سکتا ہے۔ نیز بعض ایسے معاملات (مثلاً بعض قلمروں میں انگریزی پریوسی کونسل میں مرفوعہ کے اختیار) ہیں جن کے زمینی مسودہ جات کو اس طرح ”محفوظ“ کرنا لازمی ہے، جو مسودے اس طرح ”محفوظ“ ہوتے ہیں ان پر اگر ۲ سال تک بادشاہ کے دستخط نہ ہوں تو خود بخود غیر منظور سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۳۷ء کے دستور کے بعد ایرستان کی حیثیت بالکل ممتاز ہو گئی ہے یہاں گورنر جنرل کا عہدہ ٹرڈر یا گیا ہے اور دستور میں بادشاہ کا کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا۔ نیز اب یہ سمجھنا چاہیے کہ انگریزی پریوسی کونسل کو ایرستانی معاملات میں مداخلت کے کوئی اختیارات باقی نہیں ہیں۔

۲۔ جنگ دامن کے اختیارات برطانوی حکومت کو حاصل ہیں۔ لیکن قلمری حکومتیں روز بروز خارجی معاملات میں اپنی قوت دکھا رہی ہیں۔ مثلاً چچو سلوفاکیہ کے الحاق جرمنی کے بحران کے زمانے میں کناڈا نے صاف کہہ دیا کہ ہم صرف اس وقت لڑنے کے لئے تیار ہیں اگر خود برطانیہ یا سلطنت برطانیہ پر کوئی وار کیا جائے۔

۳۔ سلطنت برطانیہ سے علیحدگی کے مسئلے پر علمی مباحث کا دروازہ کھلا ہوا ہے

لیکن باقی تمام قلمروی دساتیر کی بنیاد تاج کا اقتدار اعلیٰ ہے۔ - یرستانی دستور
۱۹۱۹ء اپنی نوع کا انوکھا ہے اس لئے اس کی بابت برطانوی پارلیمنٹ کا
کوئی قانون منظور نہیں ہوا اور اس کے پیش لفظ کے مطابق اس کا فیصلہ خود یرستانی
قوم کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔

۴۔ سلطنتی اعزازات مقامی وزارتوں کی سندش پر برقی نمبر میں دئے جاتے ہیں۔

۵۔ قلمروں کے خارجی حفاظت کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہے اور سولہ

آسٹریلیا اور کیناڈا کے چند جہازوں کے کسی قلمرو کے پاس چلی جہاز نہیں

ہے، اور کیناڈا اور آسٹریلیا جہاز بھی تقریباً کھینچ برطانوی

بحری کے ماتحت ہیں۔

قلمرو میں ایسی باشندوں کے سیاسی حقوق۔

جنہی قلمرو میں ان سب میں سیاسی حقوق کا درجہ سفید مآبہ دہی ہے

۱۹۱۹ء میں کیناڈا کی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد کے ذریعے سے ملک معظم سے

استدعا کی کہ کیناڈا والوں کو خطا بات نہ دئے جائیں۔ یہ صورت حال ۱۹۱۹ء تک جاری

رہی۔ ۹ اگست ۱۹۱۹ء کو جنرل ہرنزوک وزیر اعظم جنوبی آفریقہ نے پارلیمنٹ میں اعلان

کیا کہ نئے گورنر جنرل کو ملک معظم نے ”سر“ کا جو خطاب دیا ہے وہ جنوبی آفریقہ کی ذمہ دار وزارت

کی رائے سے دیا ہے، اور ۱۹۱۹ء میں جو داردار انٹرمورمولی تھی کہ جنوبی آفریقہ والوں کو

بادشاہ خطاب عطا کریں اس سے یہ مراد نہیں کہ گورنر جنرل کو ان کی سابقہ خدمات کے

بجائے پر خطاب نہ دیا جائے۔

ہے خواہ وہ کتنی اقلیت میں کیوں نہ ہو، اور علی العموم قلمرو کی حقوق اس وقت تک نہیں دئے جاتے تا وقتیکہ سفید فام آبادی کی کافی تعداد نہ ہو جائے۔ اصلی باشندوں یعنی ماؤریوں کو کٹاؤ اور اسٹریپیا میں ملحق کوئی سیاسی حق حاصل نہیں۔ نوآبادیستان کے اصلی باشندوں کی تعداد کل آبادی کا نصف ہے، لیکن منجملہ اسی؛ لیکن دارالنائیں صرف چار ارکان ماؤریوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ایک وزیر بھی ماؤری ہوتا ہے۔ جنوبی افریقہ کی نوعیت اس اعتبار سے جدا گانہ ہے، اس لئے یہاں سفید فام باشندوں کی اقلیت ہے، اور جہاں ۵۵ لاکھ سیاہ فام ہیں وہاں صرف اٹھارہ لاکھ سفید فام ہیں، جن میں سے نصف سے کم انگریزی نس کے ہیں باقی بوریٹلینڈی نسل کے ہیں بلکہ جنوبی افریقہ کے سیاہ فام باشندوں جس طرح حکومت کی جاتی ہے وہ حسب ذیل امور سے معلوم ہوگی ۱۱۱۱

۱۔ الف اتحاد جنوبی افریقہ۔ اتحاد یعنی راس امیہ، مثال، اور چیچ اور فوٹو کانا میں حکومت، بالکل متوازی طور پر گورنر اور کالوں کے لئے جدا جدا اصول چلتی ہے جب ”تقدیر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے مراد صرف گورنر کی

۱۱۱۱ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔

۱۱۱۱ اس بارے میں جہد مضمون، کتاب اول، ۱۰۱۲، ”جنوبی افریقہ کی دینی حکمت علمی“

J. d. Evans: Native Policy in South Africa

سے اخذ کئے گئے ہیں۔

حکومت ہوگی، سوائے ماس امید کے جہاں نمبر ۱۶ لاکھ کالوں کے ۱۲ ہزار کو حق رائے دی جا رہی ہے۔ گورنر جنرل میٹاں، ٹرانسوال اور اورنج کے کالے قبیلوں کا سردار اعظم تسلیم کیا جاتا ہے۔ کامینہ اتحاد میں ایک وزیر کو دیسیوں کی نگرانی کے لئے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ دیسی امور کے ناموریہ کی صدارت کرتے ہیں جس میں تین سے پانچ تک تنخواہ دار رکن ہوتے ہیں۔ جو دیسی روزی کمانے کے لئے شہروں میں آ جاتے ہیں ان پر مختلف قسم کی شرطیں عائد کی جاتی ہیں۔ ان کے لئے جدا گانہ ہوسٹل ہیں اور گورنر ان کی قیام گاہوں کی نگرانی کرتے ہیں۔

دیسیوں کے لئے عدالتی تنظیم بھی گورنوں کی عدالتی تنظیم سے جدا گانہ ہے۔ ۱۹۲۷ء سے دیسی ناموروں کے عدالتیں قائم ہیں جن میں ان کے مراسم و رواج کا نفاذ ہوتا ہے اور یہاں سے مرافعہ دیسی عدالت مرافعہ میں جاتا ہے۔ ان عدالتوں کے حکام انگریز ہیں۔ لیکن اگر گورنر جنرل چاہے تو کسی دیسی حکمران کو دیسیوں کے باہمی مقدموں کے تصفیہ کے اختیارات دے سکتا ہے۔

صوبہ راس امید میں صورت حال دو حصے میں صوبوں سے ذرا جدا گانہ ہے۔ یہاں ابتدا میں یہ طرز عمل تھا کہ کالوں کو یورپا دیا جائے اور اسی لئے بعض شرائط کے تحت یہاں کے کالوں کو رائے دی کا حق دیا گیا۔ آج کل جہاں ۲۰ لاکھ گورنوں میں سے تقریباً ہر ایک مرد عورت کو حق رائے دی حاصل ہے وہاں نمبر ۱۶ لاکھ کالوں میں صرف ۱۲ ہزار کو یہ حق ہے۔ یہ حق قانون دستور جنوبی افریقہ کے بموجب اس وقت تک سب نہیں کیا جاسکتا تھا جب تک جنوبی افریقہ کے دہلوں اور ان مشترکہ نشست میں یہ اکثریت سے اس کے خلاف نہ ہو جائیں۔ یہ یہ اکثریت

بالآخر اپریل ۱۹۳۷ء کو حاصل ہو گئی اور اب صدر نہ راس امید میں بھی کسی کالے کو حق را، دہی حاصل نہیں۔ خود راس امید کی صدر بہ داری مجلس میں تین سفید نمائندے کالوں کی طرف سے منتخب ہو کر رہ گئے، اور تمام اتحاد کے لئے ایک کالی مجلس شورے مقرر کی جائے گی بلکہ

راس امید کے قطعہ "مادر اسکے کائی" میں جہاں تقریباً کلینہ کالوں کی آبادی ہے ہر ضلع میں کالوں کی مجلس قائم کی گئیں ہیں جس کا صدر دیسی معاملات کا مامور ہوتا ہے جو گورنر ہوتا ہے۔ ان مجلس میں انتخاب کا طریقہ رائج ہے۔ تمام ماوراء کائی کی ایک مجلس عامہ ہے جسے "متحدہ مادر اسکے کائی" کی مجلس عامہ یا دیسی زبان میں "بنگلا" کہتے ہیں۔ یہ سب مجلس محض مجلس شورے ہیں، گو یہ کسی ضروری مسئلے پر اپنی رائے دے سکتے ہیں۔ بنگلا کی بعض ذیلی جماعتیں بھی ہیں جو تعلیم، حسابات، قوانین، رواج، املاک وغیرہ میں گورنر جنرل کو مشورہ دیتی ہیں۔ قانون سازی ملکیت گورنر جنرل کے احکام کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

دب (۱) علاوہ علاقہ جات اتحاد کے بسوٹان، بھوٹان اور اڑیسہ کے علاقے براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت تھے جو ان پر بحیثیت حکومت انگلستان کے مامور خاص کے حکمرانی کرتا تھا۔ اب ۱۹۴۷ء سے یہ برطانوی مامور اعلیٰ کے سپرد ہو گئے ہیں۔ جس طرح اتحاد کے علاقوں میں دیسی رقبے مختص ہیں ایسے ہی ان ماموری علاقوں میں گوروں کے لئے رقبے مختص ہیں جو زیادہ تر بہتر قسم کے

ہوتے ہیں۔ ان علاقوں میں بھی کالوں کی صلاح کار مجلس ہیں، لیکن کاروبار کا دلد مار گورے حکام پر ہوتا ہے۔

ہندوستان

(الف) قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی رو سے برطانوی ہند کی حکومت پر برطانیہ کا اثر۔

(۱) یہ قانون (قلمروں کے دستوری قوانین کی طرح) انگریزی پارلیمنٹ کا قانون ہے۔

(۲) مرکزی وفاقیہ بادشاہ باجلاس مجلس خاص کے اعلان سے وجود میں آئے بشپٹیکہ انڈی ہندوستانی ریاستیں شامل ہو جائیں کہ مجلس مملکت میں ۵۶ ارکان ان کی طرف سے جائیں اور صدر ہندوستان ریاستوں کی نصف آبادی شریک ہو جائے۔

(۳) گورنر جنرل کو ملک معظم متقرر کریں گے اور وہ ان درجات پر عمل کرے گا جو وزیر ہند وقتاً فوقتاً اسے دیتا رہے۔ گورنر جنرل کو اختیار ہوگا کہ کسی مسودہ کو بادشاہ کی طرف سے منظور کرے یا منظور کر دے یا بارشہ کے ایسے کے لئے محفوظ کرے (اسی حالت میں اگر ۱۰۰ کے اندر بادشاہ نے منظور کیا تو مسودہ نافذ ہو جائے گا) یا فریہ غور کے لئے مسودہ واپس کر دے۔

گورنر جنرل کو اشد ضرورت کے وقت (بشپٹیکہ مقصد اجلاس نہ کر رہی ہو) احکام عطا کر کے کا اختیار ہوگا۔ یہ حکم صرف متعلقہ نافذ رہے گا اور

مقننہ کے دونوں ایوانوں کے سامنے رکھا جائے گا اگر مسئلہ عام طور پر خود اس کی رائے پر منحصر ہو تو پھر ایسا حکم ۶ ماہ نافذ رہے گا۔ اور تجدید کی صورت میں اس کی اطلاع وزیر ہند کو دی جائے گی جو پارلیمنٹ کے سامنے اسے رکھے گا۔

اگر کسی خاص مسئلے میں قانون سازی ضروری ہو، اور مقننہ اجلاس کر رہی ہو تو دونوں لوگوں نے جنرل ایوانوں کو پیام بھیجے گا اور اس کے ساتھ جو قانون وہ منظور کرنا چاہتا ہے اس کا مسودہ بھی ہمیشہ کرے گا۔ پھر ایک ماہ بعد غور لیتے ہیں اس مسودہ کو قانون بنا سکے گا۔ اس قانون کو گورنر جنرلی قانون کہیں گے۔ ایسے قوانین جلد از جلد پارلیمنٹ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔

اگر دستور میں کسی کام کرنے سے رک جائے تو گورنر جنرل علاوہ دفاتی عدالت کے تمام یا چند اختیارات اپنے قبضے میں لے سکتا ہے، لیکن یہ عطل صرف ۶ ماہ تک رہے گا، گو اس کے بعد پارلیمنٹ چاہے تو اسے تین سال تک جاری رکھ سکتی ہے۔

دفاتیہ کے قیام کے بعد گورنر جنرل دہرا کا انتخاب کرے گا جن کی تعداد ۱۰ ہوگی۔ ان کا کام گورنر جنرل کو ”مشورہ دینا اور اس کی امداد“ ہوگا۔ گورنر جنرل ایسے شخص کو بھی وزیر مقرر کر سکے گا جو جماعت مقننہ کا رکن نہ ہو لیکن اسے چھ ماہ کے اندر کسی نہ کسی ایوان کا رکن بننا لازم ہوگا ورنہ قلمدان وزارت اس سے لے لیا جائے گا۔

مدافعت اکیلیا اور غارچی معاملات کے متعلق گورنر جنرل تین مشیروں کا تقریر کرے گا۔

گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داریاں ایک ملک کی امن وامان، مالی توازن، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، موجودہ یا سابق خدام کی کے حقوق کا تحفظ، سلطنت متحدہ و برطانوی کے باہر کے ممالک کی قسم کے متعلق حدود کا افسار دار، ہندوستانی رہائشیوں کے حقوق، تقریباً یہی ذمہ داریاں گورنر کی ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ملک متوسط کے گورنر کی مخصوص ذمہ داری یہ ہے کہ برسرِ قیام وہابی کی کیا مناسبت سے خرچ ہو اور یہ گورنر کی ذمہ داری ہے کہ ان شرائط میں "مستشفیہ انبیا" کا حاصل کیا جائے۔ گورنر جنرل اور گورنر اپنی "مخصوص ذمہ داریاں" کے تحت صرف اپنے اختیارات و مفیدی کے

پابند ہیں۔

گورنر جنرل کو بھی اختیار ہے کہ جو ذمہ داریاں کو ہندوستان پر
ہے گورنر کے اختیار ہے۔ تقریباً یہی صورت حال ہے جس میں ان صدر دیکھیں
یہ کہ اگر صدر ۲۰ پولیس کے متعلق تو صدر تہذیبی اس پولیس سے جو
کے متعلق کا عدالت کو کسی شخص کو روکا جائے۔

گورنر کو اپنے عدویوں میں تقریباً وہی اختیارات حاصل ہیں جو گورنر جنرل
کو گورنر کی حکومت میں حاصل ہیں۔

مستشفیہ انبیا تقریباً یہی گورنر کو ملے گا۔ ان کے لئے جس کا بلکہ ان کے لئے
کی بہت گورنر کی حکومت کو روکے گا۔ اس کے بعد وہ گورنر جنرل کے لئے

- (۵) حسب ذیل مرکزی قوانین کے بابت گورنر جنرل کی رادارہمی کے
مثال صوبہ واری قوانین کی بابت گورنر کی (پیشگی اجازت لازمی ہے۔
(۱) اگر یہ پارلیمنٹ یا گورنر جنرل یا گورنر کے مخصوص قوانین کے
خلاف ہوں (۲) گورنر جنرل کے اختیارات کے خلاف ہوں۔
(۳) پولیس کے قوانین کے خلاف ہوں (۴) یورپوں کے مخصوص
تجزیری ضابطے کے خلاف ہوں (۵) ایسے تاجروں یا شرکتوں پر
خاص محصولات کے تحریک ہو جو ہندوستان سے باہر ہوں۔
(۶) پریوی کونسل کو مراعات جات اور بغیر اجازت کے 'یعنی خود بخود'
مراعات کے اختیارات اس وقت حاصل ہیں جب مسئلہ دفاتی عدالت
کے صیغہ ابتدائی میں ہو، اور اس کا تعلق کسی باجلاس مجلس شاہی یا
دست ویز شرکت یا کسی ہندوستانی ریاست میں کسی دفاتی
قانون کے لگاؤ کے متعلق ہو۔ باقی تمام امور میں 'خواہ دفاتی عدالت
کی خواہ پریوی کونسل کی' اجازت ضروری ہے۔
(۷) خدمات عالیہ یعنی سول سروس، آئی ایم ایس، پولیس سروس وغیرہ
کی اعلیٰ خدمات کا کثرت وزیر ہند کے تابع ہیں۔
(۸) وزیر ہند اور اس کی صلاح کار مجلس :- وزیر ہند کی صلاح کار مجلس
میں تین سے چھ ارکان تک ہوں گے، اور اس کا کام عام طور پر یہ
ہوگا کہ جن امور پر وزیر ہند ان کا مشورہ چاہے اسے مشورہ دیں۔ ان
کے ارکان میں سے کم سے کم نصف ایسے ہوں گے جو کم از کم دس

سال تک سرکاری ملازم رہ چکے ہوں اور تقریر سے پہلے زیادہ سے زیادہ دو سال پیشتر تک ہندوستان میں برسرکار رہے ہوں۔ وزیر ہند کو اختیار ہوگا کہ وہ ان سے انفرادی طور پر یا مجموعی طور پر صلح لے۔

(ب) ہندوستانی ریاستوں پر برطانیہ کے تعلقات زمانہ موجودہ میں: ہندوستانی ریاستیں ایک طرح کے محصور ہیں اور ان تعلقات کی بنیاد عہد نامے فریقین کے مرضی اور مذاکرے پر ہے۔ یہ نقطہ اس قدر منوٹ ہے کہ اصل عہد نامے ان سے بالکل ہی پس پردہ ہو جاتے ہیں۔ حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں:-

(۱) خارجی معاملات کلینہ حکومت ہند کے قبضے میں ہیں۔

(۲) اندرونی معاملات میں دلیان ملک بھارت آزاد میں، لیکن چند حالات کے تحت حکومت ہند مداخلت کرتی ہے بلکہ بعض مرتبہ دی ریاست کو تخت سے بھی اتار دیتی ہے۔ حال میں ایک نئی شکل پیدا ہو گئی ہے

Dr. D. K. Shyama Prasad Mukherjee: "The Political Relations of the Indian States with the British Empire"

Nature and evolution of the Political relations between the Indian States &

British Imperial Government

جب سے کانگریس نے بحیثیت ایک جماعت کے صوبہ واری حکومتوں کی ہاگ سنبھالنی شروع کی ہے اس وقت سے مختلف ریاستوں کی کانگریس کمیٹیاں ریاستوں میں عمومی حکومت کا مطالبہ کرنے لگی ہیں اور اب برطانوی حکومت نے بھی ایک حد تک اس بارے میں مداخلت شروع کر دی ہے۔ علاوہ دس ریاستوں کے (جن میں حیدرآباد کو خاص امتیاز حاصل ہے) انگریزی ڈاک خانہ تمام ہندوستانی ریاستوں پر عادی ہے اور تقریباً سب ڈھالنے کا اختیار (علاوہ ایک حیدرآباد کے) کسی ریاست کو نہیں ہے۔ باوجودیکہ قانوناً ریاستوں کے شہری اجاب سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ مجلس مقننہ میں شریک ہو سکتے اور ہر عہدہ پر کر سکتے ہیں اور آئی سی ایس وغیرہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۷ کا) ۱۹۱۷ء اس کی شاید سب سے ممتاز مثال بہار راجہ تاج کی تخت سر علیحدگی اور بہار راجہ اور کی دو سال کے لئے جلاوطنی ہے۔ بہار راجہ اور کا ۱۹۱۷ء میں اسی جلاوطنی میں انتقال ہو گیا۔

۱۹۱۷ء مارچ ۱۹۱۷ء کو وزیر ہند نے ایک تقریر میں کہا کہ ”میری رائے میں اب وقت آگیا ہے کہ بلا درست زیادہ مداخلت کرے یعنی نظم و نسق کے معیار کے بلند کرنے کے مقصد سے مشورہ دے۔“ کانگریس کی مداخلت کا سب سے ممتاز مظاہرہ مارچ اپریل ۱۹۱۷ء میں راجکوٹ کے واقعات اور گاندھی جی کے برت کی صہرت میں ہوا۔

۱۹۱۷ء یہ دس ریاستیں حیدرآباد، ٹراونکور، اور کے پور، بے پور، کوچین، کنکن گڑھ اور جھا، جونا گڑھ، شاہ پور چکھاری ہیں

(۳) کسی ریاست میں کسی غیر مملکت کے شہری بنسٹہ انگریزی رضا مندی کے ملازم نہیں رکھے جاسکتے اور نہ کسی والی ملک کو کسی غیر مملکت کا خطاب یا سلامی مل سکتی ہے۔ غیر مالک کے اغراض کے لئے ہندوستانی ریاستیں کلکتہ ہندوستان کا جزو تصور کی جاتی ہیں۔

(۴) ہندوستانی ریاستوں کے باہمی جھگڑے برطانوی ہندی حکومت طے کرتی ہے۔

(۵) صرف اندرونی حفاظت، تزک و احتشام اور ہنسنا ہی اغراض کے لئے ریاستوں کے پاس مستثنیٰ افواج ہیں جنکی تعداد محدود ہے اور جنہیں "ہندوستانی ریاستوں کی افواج" کہتے ہیں ان کے ہمسہ با نکل برطانوی وضع کے ہیں اور وقتاً فوقتاً انگریزی عہدہ داران کا معائنہ کرتے رہتے ہیں (۶) حکومت ہند کو ہندوستانی ریاستوں میں برطانوی رعایا، "جانب اور فوجی چھڑائیوں پر اقدار حاصل ہے۔

(۷) ہر ریاست کے متعلق برطانوی ہندی حکومت کا ایک قلم مقام رہتا ہے جو بری ریاستوں میں ریڈیٹ منٹ کہلاتا ہے۔ بعض مرتبہ کئی ریاستیں ایک ریڈیٹ منٹ یا ایجنٹ کے ماتحت کر دی جاتی ہیں اور سب سے چھوٹی ریاستوں میں بعض مرتبہ نزدیک کے ضلع کا گورنر یا قسمت کا کمشنر ایجنٹ کے ذرائع انجیم دیتا ہے۔

۱۱ جیسے گورنر ایجنٹ ریاست رام پور کے لئے حکومت ہند کا ایجنٹ ہے۔

(۸) زبردنٹنڈل یا ایران والیان ریاست ۱۔ یہ گورنر جنرل کے صدارت میں سالانہ نشست کرتا ہے۔ لیکن جب سے وفاقیہ کا سوال پیدا ہوا ہے اس کی اہمیت کچھ گھٹ گئی ہے۔ باوجودیکہ اس میں انفرادی عہد ناموں پر بحث نہیں ہو سکتی تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ بہت سے چھوٹے والیان ملک کو اس بات کا احساس شاید پہلی مرتبہ ہوا کہ ان میں اور سرکار انگریزی میں کسی قسم کے عہد نامے بھی تھے۔ ۱۹۱۷ء میں زبردنٹنڈل کا آخر ہوا اور اس کے اقتداری جیسے ہیں دائرہ سے بہتر درجہ لفظ "مالا پستی" استعمال کیا جو اس روز سے گویا انگریزوں اور والیان ریاست کے تعلقی کو ظاہر کرنے لگا ہے۔

(۹) ریاستوں کے وفاقیہ ہند میں شرکت کا مسئلہ ۱۔ اس کے سیاسی اور معاشی دونوں پہلو سمجھنے چاہئے۔ جہاں برطانوی ہند کو ایسے محال جیسے بحری محسن، نمک، دھاتیں، چالو سکھ، دیاسلانی کا محصول، جنگی وغیرہ پر قابو ہے، وہاں والیان ملک کو محال کے لین پر کوئی قابو نہیں، حالانکہ ان کا بڑا راست اثر ان کے ریاستوں پر پڑتا ہے۔ والیان ریاست پر وفاقیہ ہند کا داخلہ اختیاری رکھا گیا ہے۔ لیکن اغلب امر یہ ہے کہ اکثر ریاستیں وفاقیہ میں شریک ہو جائیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بھی حکومت ہند اور ریاستوں کے تعلقات ایک حد تک وفاقی اصول پر مبنی ہیں۔ اس لئے کہ علاوہ ان امور کے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے مرکزی حکومت کو خارجی معاملات، محصول درآمد، فوج، ہمسدہ گاؤں اور

(ایک بڑی حد تک) سکھ اور ڈاک خانہ پر اختیارات عطا ہیں۔
 والیان ریاست دستاویزائے شرکت کے ذریعے سے وفاقیہ میں
 داخل ہوں گے جس میں ان امور کی صراحت ہوگی جن کی بابت قانون
 سازی کے اختیارات والی ریاست کی طرف سے وفاقی جماعت مقننہ
 کو تفویض ہو جائیں گے۔ ریاستوں میں قانون حکومت ہمسہ کاغذ
 دستاویزائے شرکت کی شرائط کے تحت ہوگا۔

Constitution

باب ۲۱

دساتیر

دساتیر کی نوعیت - دستور اور چکدار - ذراست - دستور اور دساتیر کی ضرورت -

تبدیلی دستور - عملدرآمد شکست دستور پر تنبیہ - تاویلی دستور

دساتیر کی نوعیت - اس سے قبل جب اقتدار اعلیٰ پر تبصرہ کیا گیا تھا اس وقت یہ بتایا گیا تھا کہ ایک نوع قوانین کی وہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے حکومتی کس پرزوں کی تنظیم کا پتہ چلتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ قوانین سیاسی اعتبار سے سب سے اہم قوانین ہوتے ہیں اس لئے کہ انہی پر ملک کی اس دھات اور عافیت کا دارومدار ہوتا ہے اور انہی کے ذریعے سے ملک کی ہیئت حاکمہ کی تنظیم ہوتی ہے۔ حکومت میں جو عناصر شریک ہیں ان کی کیفیت، حکومت کی نوعیت کہ آیا وہ فزکی ہے یا دھاتی، عمومی ہے یا عیدی، اس میں بادشاہ ہے یا اس کا انتظام جمہوری طور پر کیا جاتا ہے، اور اگر بادشاہ ہے تو اس کے کیا اختیارات ہیں، ملک میں کوئی جماعت مشنہ بادشاہ کی ذاتی مجلس سے جدا گانہ ہے یا نہیں

اور بادشاہ اور اس مجلس کے باہمی سیاسی تعلقات کیسے ہیں، انتظام کے اغراض سے ملک کو کس قسم کے رقبہات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان رقبہات کا انتظام مرکزی ادارات میں ادارات کرتے ہیں یا مقامی امور میں مقامی ادارات کو کچھ اختیارات حاصل ہیں، ملک کا عدلی انتظام ممکن اصول پر مبنی ہے یا عادلانہ دوسرے ادارات کے، تخت میں اور میں تو کس حد تک، یہ سب امور میں جن کی نوعیت دستور کی تصویر کی جاتی ہے۔ اس سے بھی جواب میں ہونے سے مستثنیٰ حکومت پر نظر ڈالی ہے، اب یہ باقی رہ گیا ہے کہ یہ وہاں میں کہ کسی ملک میں۔ اعضاء کے حکومت کس حد تک مستقل ہونے میں اور ان کی حیثیت میں تبدیلی کرنے کے کیا طریقے رائج ہیں۔

سب سے پہلے دستگیر کی نوعیت پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوانین اور رسم کے ہونے میں ایک تحریری قوانین یعنی وہ قوانین جن کے اصول ضبط تحریر میں آئے ہیں اور دوسرے وہ قوانین جو زیادہ تر راجی ہیں، ممکن ہے کہ تحریری قوانین بھی قدیم رسم و رواج پر مبنی ہوں، لیکن جو نگہ سے لکھے ہوئے ہوتے ہیں اس سے ان کے الفاظ و مطلب کا تعین بہ سبب بعض رواجی قوانین کے زیادہ آسان ہوتا ہے اور بعض کس کا علم ہو سکتا ہے کہ ٹھیک دکھایا اصول میں جن بنیاد قانونی پائیدار ہونی کی جاسکتی ہے۔ لیکن جب اس سے قبل دیکھا جا چکا ہے، تو ان کو ایک ہی تحریر کی کہیں نہ ہو، یہ عادل کی تصویر

سے پہلے طے کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کسی خاص حالت کی کیفیت پر منطبق ہو گا۔ پھر عادلوں کے نظائر کے وجہ سے تحریری قوانین میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اور جب تک ان پر نظر ثانی کر کے نئے سانچے میں نہ ڈھالا جائے ان کی حیثیت بھی کم و بیش اسی طرح سیالیت کی طرف مائل ہوتی ہے جیسے غیر مکتوبی قوانین کی جیسے

استوار اور یکپارہ۔ تقریباً یہی کیفیت دساتیر کی بھی ہے۔ بعض دساتیر مکتوبی ہوتے ہیں یعنی سیاسی ادارات کے باہمی تعلقات اور حکومت اور اس کے اعضاء کی نوعیت اجمالاً یا صراحتاً ایک وسیعہ میں مندرج ہوتی ہے جسے دستور کہتے ہیں اور اس خطرے سے بچنے کے لئے کہ کہیں جلد جلد تبدیلی کی وجہ سے دستور غیر معین نہ ہو جائے اس میں ترمیمیں کرنے کا حق محدود ہوتا ہے یعنی اس میں ترمیمیں معمولی قوانین کی ترمیموں سے زیادہ دشواری کے ساتھ کی جاسکتی ہیں۔ اس کے برعکس دوسری قسم کے دساتیر ایسے بھی ممکن ہیں جو غیر موضوعہ قوانین

۱۔ اس اصول کا سب سے عجیب و غریب مظاہرہ "ٹنسی" جرمنی میں ہوا ہے۔ یہاں ایک وزارت قانون کے ذریعے سے "دور جوئی" ۱۹۵۱ء میں نافذ ہوا، اگر عادل سمجھ کہ ملزم کو عام تفسیری اصول یا "تندرست جذبہ عامہ" کے تحت سزا ملنی چاہئے تو اسے سزا دینے میں درجی نہ کرنا چاہئے خواہ قانوناً ملزم سزا کا مستحق نہ ہو۔ دیکھو "سالنامہ برلن" ۱۹۵۱ء صفحہ ۹۶۔

۲۔ دیکھو بالا، باب ۷۔

کی طرح لکھے ہوئے نہیں یعنی جن کی بنا محض رسم درواج اور نفاذ پر ہو، یا ایسے دلائق پر جن کی نوعیت تو دستور کی ہو لیکن جن کا رتبہ معمولی قوانین سے زیادہ نہ ہو اور جن میں ترتیم معمولی قوانین کی طرح کی جاسکتی ہو۔ ایسے دساتیر کو ہم لکھا کہ جس گے اور ان دساتیر کو جن کی تبدیلی میں معمولی قوانین کی تبدیلی سے زیادہ دقت ہوتی ہے انھیں استوار۔

یہ ضروری نہیں کہ مکتوبی دساتیر لازماً استوار ہوں اس لئے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ ان ممالک میں جہاں تحریری دساتیر رائج ہوں ان دساتیر کی ترتیم معمولی قوانین کی طرح ہو سکے۔ تحریری دساتیر میں ایک متن زد دستور ^{۱۸۴۸ء} کا اطلالی دستور ہے جس میں تبدیلی یا ترتیم کا کوئی معین طریقہ نہیں دیا ہوا تھا بس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اس کی ترتیم معمولی قوانین کی طرح ممکن ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دستور کی ترتیم اتنی مرتبہ اور اتنے مختلف اصول کے تحت ہوتی ہے کہ اس کی صورت بالکل سبج ہو گئی ہے اور جس سے کوئی انصاف پسند شخص ہو سکا ہو سمجھتا ہو کہ آج کل کی فاشی اٹلی سے کہیں دور ہے جو ^{۱۸۴۸ء} میں شاہکار ہوا تب تو نے اٹلی کو دیا تھا۔ اسی طرح فرانس کے دستور کے رد حصے جو خاص طور پر قوانین اس ^{۱۸۴۸ء} کے اجزاء میں ہیں، جیسے حکمہ عدلیہ کی ترکیب یا وہ اجزاء جو اس دستور کے خارج ہیں رہے، جیسے مجلس سنیات کی ترکیب، لکھا کہ حصے کے اجزاء ہیں، اعلان انڈرٹس

۱۸۴۸ء مجلس سنیات کی ترکیب اس ^{۱۸۴۸ء} قوانین کا جزو تھی، لیکن ^{۱۸۴۸ء} میں اسے اس ^{۱۸۴۸ء} قوانین کے زمرہ سے نکال کر "عضوی قانون" کر دیا گیا اور ترتیم وغیرہ کے (لقبہ عارضیہ ^{۱۸۴۸ء} پر)

کا دستور استوار تصور ہوتا ہے۔ انگلستان کا دستور غیر مکتوبی تصور کیا جاتا ہے، لیکن شکل سے یہ صورت حال سمجھ میں آ سکتی ہے جس کے تحت ایسے دستاویزات جیسے منشور عظیم اور عرصہ اشتقاق حقوق کو معزلی قوانین کی طرح بدل دیا جائے۔

قدامت۔ اگر غور کیا جائے تو ہم محسوس کریں گے کہ یکجا دار دساتیر ہندوستان سے زیادہ قدیم ہیں۔ یوں تو دستور کے معنی دو لفظوں میں طرز حکومت کے ہیں، اور کوئی ایسی ممکنات نہیں ہے جس کی حکومت کا ایک معین طرز نہ ہو، لیکن خاص طور پر دستور کا تخیل یعنی ایسے طرز حکومت کا تخیل جو قطعی طور پر دوسرے قوانین سے ممتاز ہو نسبتاً جدید ہے۔ آج کل جو دستور مانجے ہیں ان میں سب سے قدیم دساتیر سوئستان کے بعض کمیٹیوں اور انگلستان کے دساتیر میں جن میں سے اول لکچر کی تاریخ ۱۶۱۱ء کے کینٹونٹی اتحاد اور ثانی انڈر کی تاریخ کم دیش سلسلہ ۱۲۶۵ء تک پہنچتی ہے۔ سوئستان کے کمیٹیوں کے دستور سب کے سب استوار ہیں، یعنی ان میں تاریخی کے لئے چند خاص ضابطوں اور قواعد پر عملدرآمد لازم آتا ہے۔ قدیم دستور میں انگلستان ہی کا دستور ایسا ہے جو کم از کم جہاں تک انضاط قانون کا تعلق

(تفسیر حاشیہ ص ۵۷) : اعراض سے اس کا وہی رتبہ ہوگا جو جمہولی قوانین کا ہے۔ فرانس کے

قوانین کے لئے خاص طور پر لکھی "تمہید قانون دستوری" - Dacey: Intro-

duction & the Law of the Constitution - تتمہ (۱)۔

۵۷ اس بحث کے لئے دیکھو برٹس: "دساتیر" - Bryce: Constitu-

tions. باب ۱۔

ہے بالکل ٹھیکہ دار ہے، یعنی دستور بالکل اسی غائبے سے بدل جا سکتا ہے جس غائبے سے معمولی قوانین انیسویں اور بیسویں صدی کے قوانین اصلاح، جن کی رو سے کروڑوں شہریوں کو رائے دہی کا حق دیدیا گیا، بالکل اسی طرح بدلے گئے جیسے معمولی سے معمولی قوانین حقیقت میں یہ انگریزوں کے قدامت پسند جہت کا ہی نتیجہ ہے کہ دستور کی شکل اس قدر دیر پا ہے اور انگلستان کے دستوری اصول ان کی خصلت میں داخل ہو گئے ہیں، ورنہ بالکل ممکن تھا کہ جیسے روز بروز قوانین میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ویسے ہی دستوری تبدیلیاں بھی ہوتی رہتیں۔

اگر نظر غائبے سے دیکھ جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دستور انگلستان کی ٹھیکہ داری ہی ہے کہ جس نے اس ملک فرانسیس اور برٹنجر پوپ کے دوسرے ملک کی طرح کے انقلابوں سے بچا ہے۔ بادشاہ و دارالحکومت دارالعوام، کامیاب، محکمہ عدلیہ سب کی شکل تب ہی ہے جو گریزی انقلاب ۱۶۸۸ء کے بعد تھی، بلکہ سوائے جزوی تبدیلیوں کے وہی ہے جو سترہویں صدی کے ابتدا میں تھی، لیکن بریڈی ٹھیکے کے سوا پرے نظام کی حیثیت بدل گئی ہے، اور کونے اس کے کہ دستور کا مرکز نقش بادشاہ کی ذات ہو، اب وہ قطعی طور پر الوان نام یا مجلس کا بنیہ کو منتقل ہو گیا ہے۔ اگر انگلستان کا دستور استوار ہوتا، یعنی اس میں تبدیلی کرنے کے لئے خاص طریقے استعمال کرنے پڑتے یا اگر دستوری لفٹ ٹرک کا خیال نہ رکھ جاتا، تو ممکن ہے کہ نئے

۱۔ آئینی غائبے کے لئے سارا کچھ، انگریز کے ساری دستبر : Strongy

۲۔ Modern Political Constitutions. باب ۶۔

عمومی خیالات پیدا ہوئے پر انقلاب ہو جانا اور ملک کو اسی طرح کے مدوجز کا سامنا کرنا پڑتا جیسے فرانس کو ۱۷۹۳ء اور بعد کے سالوں میں۔ انگلستان کا جیسا لچکدار دستور اسی لئے بچا رہا ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں کے قدامت پسندانہ خصائل کی وجہ سے دستور کا ڈھانچہ قدیم اور ٹوٹی ہے، دوسری طرف دستوری دست وکشاہ کی وجہ سے اس ڈھانچے میں جو روح کا رخا ہے وہ جدید اور عمومی ہے۔

افترض یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہر ملک میں لچکدار دستور ضرور کامیاب ہوگا، بلکہ ان ملک میں جہاں قدامت روایت کی زیادہ وقعت نہیں یا جہاں کے باشندوں کے دلخیز قانونی فضا کو اور اشکال کی زیادہ پرداہ نہیں کرتے، ایسے ملک میں لچکدار دستور نہ کام ہوگا۔ لچکدار دستور اسے ملک میں اگر جدت کرنے کی خواہش ہوگی تو معنوی بہت کافی سمجھی جائے گی نہ وہ نہ ہر کسی میں۔ لیکن ان ملک میں جہاں دستور دستور کا رواج ہے وہاں نئے خیالات کے لوگ عام طور پر صرف معنوی نہ ہر پیکر پر کثافت نہیں کرتے بلکہ شکلیں بھی بدلنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی لچکدار قانون سے ملک میں اگرچہ نظم حکومت کی باگ عوام کے قبضے میں ہوتا ہے حکومت کی خصوصیات کا رد و بار ایک طرح کی ایما نیٹ کے قبضے میں ہوتا ہے اس لئے کہ لچکدار دستور کی کارفرمائی کے لئے جس ذمہ داری، تدبیر اور معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کے حامل عام طور پر عوام الناس نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس دستور دستور سے ملک میں جو دستور بنایا جاتا ہے وہ عام طور پر طبقہ اوسط یا طبقہ ادنیٰ کے اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، چنانچہ ایسے ملک میں بہت بڑی اذکار ملک کے عوام کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

(لاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۵۷۷ پر)

کا قانون ضرور لچکدار ہے، لیکن جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے اس ملک کے بعض اہم دستاویزات جبے دستورِ اعظم، عرضداشتِ حقوق و شادیِ حقوق قانونِ بندوبست اور ایسے بعض دوسری دستاویزات جن اصول پر مبنی ہیں ان کی تبدیلی تقریباً اسی طرح ناممکن ہے جیسے فرانس کے انقلابی دستور میں تبدیلی اسی طرح استوار دستور والے ملک میں بعض دستوری امور ایسے ہیں جن میں تبدیلی معمولی قوانین کی طرح ہو سکتی ہے، جیسے فرانس میں مجلسِ سینت کی ترکیب اور دارالنائمن کے انتخاب کا طریقہ۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ بعض دستوری دستاویزات میں ایسے امور کا ارجاع بھی ہوتا ہے جن کا دستور سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک ان امور کو جس قدر ضروری اور لازمی تصور کرتا ہے کہ ان کی ترمیم کے لئے وہی ضابطہ لازمی کر دیا جاتا ہے جو ترمیم دستور کے لئے ہو۔ اس کی بہن مثال ملک متحدہ امریکہ کے ان دستوری ترمیموں سے دی جا سکتی ہے جن میں سے ایک کے ذریعہ سے شہرِ سان فرانسسکو اور اس کا اسمبل منوٹ قرار دیا گیا اور دوسرے کے ذریعہ سے اسے جائز گردانا گیا۔ یا سوئسٹن کے دستور کا وہ جزو جس کے ذریعہ سے کسی جانور کا خون استعمال کرنا ناجائز قانون قرار دیا گیا تھا۔

فقہ دیموکرٹس: برطانوی روپ میں حکومتیں اور ان کا

Parties in Continental Europe. نویسنہ: کاجان۔

Shivappa: Modern

نویسہ: راجہ: اندازِ حال کے دساتیر

دستور سوئسٹن اور فرانس۔

Constitutional

عملدرآمد۔ یہ تو معین امور دستوری کا ذکر ہوا۔ علاوہ ان امور کو ہر ایک ملک میں، خواہ اس میں استوار دستور رائج ہو یا لچکدار، واقعی عملدرآمد کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ عملدرآمد ایسے رسم و رواج اصول یا ہدایات کو کہتے ہیں جن کی خلاف ورزی کی حالت میں خلاف ورزی کرنے والے پر کسی باضابطہ عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جاسکتا بلکہ غیر کمزوری دستور زیادہ تر ایسے ہی عملدرآمدوں پر مبنی ہوتا ہے۔ چنانچہ انگلستان میں ایسے اہم مسائل جیسے دارالعوام میں کسی اہم مسئلے پر نفی رائے پر کسی کا ہینہ کا استغفار کا ہینہ کی مجبوری، ذمہ داری، کسی ایسے سہلہ نامے پر دستخط نہ کرنا جو صریحاً دارالعوام کے اکثریت کے رائے کے مخالف ہو، یہ امور ایسے ہیں جن کا قانون میں کہیں تذکرہ نہیں۔ اسی طرح بادشاہ کے حق امتیاز کا استعمال، سوار سواری سے نہیں ہوا اور اب شاید کبھی نہ ہو۔ یہ کیبنٹ صرف لچکدار دساتیر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ ان ممالک میں بھی نظر آتی ہے جن کے دساتیر استوار نوعیت کے ہیں۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ استوار دستور برطانیہ متحدہ امریکہ کا ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ میں صرف میں ترمیمیں ہوئی ہیں جن میں سب سے پہلی دس ترمیمیں دہرے کے اندر لگیا رہیں اور دہرے ایک ساٹھ اور تین ایک عظیم الشان فائدہ جتنی کے بعد ہوئیں، چنانچہ اگر دیکھا جائے تو امریکہ میں ترمیم کی کل سلسلہ سے اس وقت تک صرف و مرتبہ چلی سببہ تا جہ عملدرآمد کا اثر امریکی دستور پر بھی یقیناً پڑا ہے۔ جیسا ایک نہایت

ممتاز امر دستور امر کیے نے کہا ہے "یہ امید کہ الفاظ کا کوئی مجموعہ خواہ اس کی تشکیل کیسے ہی غور و فکر کے ساتھ کیوں نہ ہوئی ہو، لوگوں کے جذبات اور خیالات کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دے گا، بالکل لاعلم امید ہے"۔
 امریکہ میں جو خاموش تبدیلی قانون کے دستور کی تاویل میں ہو رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اشتداد زمانہ اور مختلف اثرات و ماحول کی وجہ سے بعض دستوری ادارات کے وہ معنی نہیں رہے جو اس کے مؤسس چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر چند امور کا ذکر کافی ہو گا۔ مؤسسوں نے اس خیال سے کہ صدر جمہوریہ ملک کا اعلیٰ اور ممتاز ترین فرد ہونا چاہیے "انتخاب کا اختیار ایک منتخب شدہ جماعت کو دیا تھا، لیکن سیاسی فریقوں کی جگہ بنیاد اور انتہائی انضباط کی وجہ سے انتخاب کنندوں کو آزادانہ رائے دینے کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ جس کی وجہ سے جس ذریعہ کی مجلس انتخاب کنندہ میں اکثریت ہوتی ہے اسی کا نتیجہ بالآخر امر صدر دستور ہوتا ہے، چنانچہ صدر کے واقعی انتخاب سے بہت پہلے، یعنی مجلس انتخاب کے اراکین کے تقریر پر ہی دنیا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ صدر کون مقرر ہو گا اور مبارکبادوں کی بوچھاڑ ہو لیتی ہے۔ اسی طرح گو دستور میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ کوئی شخص صدر جمہوریہ کہنے کے مرتبہ منتخب ہو گا لیکن رواج یہ چل گیا ہے کہ کوئی شخص دو مرتبہ سے زیادہ اپنے آپ کو صدارت کے لئے پیش نہیں کرتا، اور شاید آئندہ بھی کبھی نہیں کرے گا۔ تیسری تبدیلی یہ

ہوئی ہے کہ گو مجلس سیناٹ کو یہ حق حاصل ہے کہ جن اعلیٰ عہدہ داروں کو صدر نامزد کرے ان کے تقرر کو یہ نامنظور کر دے، لیکن اب اس حق کو کبھی استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ اسی طرح ہر ایوان میں ہر فریق کی ایک بڑک ہے جس کے ہر چکا م کی ٹیمیں ہر رکن پر فرض ہو گئی ہیں۔ اور یہ اسی قسم کے دوسرے رواج ہیں جو ملک میں اتنے ہی مستحکم ہو گئے ہیں جتنے خود دستور میں دفعات گوان کی بنیاد کسی قانون اور آئین پر نہیں اور نہ ان کے توڑنے والے پر کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔

تسلط دستور پر تہدید۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دستوری قانون کی خلاف ورزی پر کیا چارہ جوئی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک عجیب و غریب مثال اٹھمکتان کے منشور عظم سے دی جاسکتی ہے جو اس زمانے کا ایک صرح کا مکتوبی دستور تصور کرنا چاہئے۔ منشور عظم کے دفعہ ۶۱ کی رو سے منتخب شدہ اور اکوہ باضابطہ اختیارات دیا گیا تھا کہ اگر شاہ جان منشور کے دفعات کی خلاف ورزی کرے تو وہ اس کے خلاف بغاوت کر دیں۔ یہ محض مثلاً بیان کیا ہے

ٹلہ برنس: "دولت عامہ امریکہ۔ Bryce: American Common-wealth. باب ۲۲۔"

ٹلہ اس کے لئے دیکھو "ویل لینگ میڈ" "تاریخ دستور انگلستان" Taswell Langmead: English Constitutional History. باب ۴۔

اس لئے کہ حق بغاوت اگر کوئی حق ہے تو وہ آج کل دستور سے باہر تصور کیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو قانونی دست برد سے مامون قرار دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے چودھویں صدی عیسوی میں مواخذہ کا طریقہ رائج ہوا یعنی اگر کسی شاہی ملازم سے کوئی خلاف آئین کام سرزد ہو جائے تو اس کے دربار پر دارالعوام کی طرف سے دارالاعرا میں باضابطہ مقدمہ چلایا جاتا۔ اب آج کل یہ سمجھنا چاہئے کہ مواخذہ کا طریقہ مسدود ہو چلا ہے اور اس کی بجائے محض اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ اگر ایوان عام کسی ذریعہ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر دے تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی ذریعہ مستعفی نہ ہو تو اس کا فوری اثر یہ ہوگا کہ دارالعوام اخراجات سلطنت کے لئے روپیہ کی منظوری نہیں دے گا اور نہ جو "قانون انواج" سال بسال منظور ہوتا ہے اسے منظور کرے گا جس کی وجہ سے ایک تو خرچ کے لئے ایک پیسہ بھی محصول کا لینا خلاف قانون ہوگا دوسرے ملک کی حفاظت کے لئے فوج نہیں رہے گی۔

تاویل و مستور: جہاں تک تاویل دستور کا تعلق ہے یعنی یہ کہ آیا کسی ادارے کا کوئی فعل خلاف دستور تو نہیں ہے، تو اس بارے میں دو مختلف طرز عمل رائج ہیں۔ بعض ممالک مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں اس سلسلہ پر تجویز ناظرین کا اختیار عدالت عظمیٰ کو حاصل ہے، گو بدن کسی خاص مقدمہ کے عدالت عظمیٰ کے سامنے جانے کے عدالت عظمیٰ کسی منظور شدہ قانون کو خلاف آئین نہیں کہہ سکتی۔ عدالت عظمیٰ کے جامعیت متقنہ پر اس تفوق کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وفاقیہ کا جو دستور ہوتا ہے وہ دراصل مرکزی ادارات، اور ریاستوں کے مابین ایک طرح کی

مفاہمت اور عہد نامہ ہوتا ہے اور اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی ادارہ ایسا ہو کہ دونوں ذیلیوں کے مابین نزاع کی صورت میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ فیصلہ کرے اس کے برعکس ان ممالک میں جہاں فروی طرز حکومت رائج ہے وہاں علی العموم دستوری تفریق کسی عدالت کو حاصل نہیں ہوتا بلکہ دستور کے تحت جماعت مقننہ کو حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہاں اگر جماعت مقننہ کوئی ایسا "قانون منظور کرے جس کا اسے حق نہیں یعنی جو اس کے اقتدار سے باہر ہے تو ایسی حالت میں کیا ہوگا۔ مثلاً اگر فرانس کی پارلیمنٹ ایک قانون منظور کر دے کہ آئندہ بجائے دو کے ایک ہی ایوان ہو، یا یہ کہ صدر جمہوریہ بجائے سات سال کے آٹھ سال تک صدر رہے، تو کیا ہوگا۔ جواب یہ ہے کہ اس وقت تک نہ اس قسم کی صورت پیش آئی نہ عدالت کے کسی قانون کو خلاف آئین تصور کیا بعض ممالک میں خصوصاً ان ممالک میں جہاں انتظامی رائج ہے، عدالت کو دستوری معاملات میں کسی قسم کی مداخلت کا حق دینا "تفریق اختیارات" کے اصول کے خلاف اور آزادی قانون سازی کے منافی تصور کیا جاتا ہے۔ انگلستان جیسے ملک میں جہاں پارلیمنٹ ہی تمام ادارات اور اداراتی اختیارات کا منبع و مرکز ہے، خود اس کے حدود اختیار سے تجاوز کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا، اور جو کچھ پارلیمنٹ منظور کر لیتی ہے، خواہ وہ دستوری معاملہ ہو یا غیر دستوری، وہی ملکی قانون قرار پاتا ہے۔

۱۱۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ "قانون پارلیمنٹ" (۱۹۱۱ء کے دفعہ ۱۱۱ پر)

(بقیہ ماضیہ ۵۳۵)

بموجب صدر ایوان عام کی اس سند کے خلاف کہ کوئی خاص قانون، مالی قانون ہے یا کسی خاص قانون کے منظوری میں وہ تمام مدارج طے ہو چکے ہیں جو قانون پارلیمنٹ سلاسلہ کے معین کردہ ہیں، بالکل باطل قرار دی جائے گی اور کسی عدالت میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی ممکن نہ ہوگی۔

can be used as

ضمیمہ باب ۲۱

تمثیلات دساتیر

دالف، لچکدار دساتیر - انگلستان - فریستان - آٹلی - دب، ایشوار دساتیر -
فرانس - سویستان - مالک متحدہ امریکہ - انج، جنوبی افریقہ - آسٹریلیا -
روس - ہندوستان

دالف، لچکدار دساتیر، یعنی وہ دساتیر جن میں تبدیلی بالکل اسی طرح سے
مکن ہے جیسے معمولی قوانین میں ہے۔

(۱) انگلستان، - یہاں دستوری قوانین اور معمولی قوانین کے درمیان
عام طور پر کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا - قوانین کی منظوری کے دو طریقے ہیں۔
(۱) ایوان عام اور ایوان امرا قوانین کو ضابطہ کے مطابق منظور کر لیں اور

سلہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دستوری رسم و رواج کے رائج ہونے کی وجہ سے انکی تبدیلی
شاید استوار دستوروں کی ترمیم سے بھی زیادہ مشکل ہے - مثلاً بادشاہ اور دارلارام کے
اختیارات میں قطع دبرید تو ہو سکتی ہے لیکن دارلارام کی ہیئت میں ترمیم اس وقت تک
مکن نہیں ہوئی ہے -

بادشاہ کے دستخط ہو جائیں (۲) اگر ایوانِ امرا منظور کرے تو قانون پارلیمنٹ سلاٹ کی رو سے اگر ایوانِ عام کسی قانون کو (جو مالی قانون نہ ہو) تین متواتر اجلاسوں میں منظور کرے اور ایوانِ امرا اسے ہر دفعہ نام منظور کرے تو ایسا مسودہ براہِ راست بادشاہ کے دستخطوں کے لئے پیش کر دیا جائے گا بشرطیکہ پہلے اجلاس کی دوسری خواندگی اور تیسرے اجلاس کی تیسری خواندگی کے درمیان دو سال کا وقفہ ہو۔ ایسی حالت میں صدر ایوانِ عام ایک سند سنک کرے گا کہ قانون پارلیمنٹ کے لازماًت پورے ہو گئے ہیں۔ اس سند کے خلاف کسی عدالت میں چارہ جوئی نہیں کی جاسکے گی لیکن دارالامرا کی ترکیب میں تبدیلی بغیر خود ایوانِ امرا کے منظوری کے نہیں ہو سکتی۔

(۲) نو ذیلیستمال کے قانون دستوری ہیں جو انگلستان کی پارلیمنٹ کا ایک قانون ۱۸۵۵ء کا ہے، یہ صریحاً لکھا ہے کہ یہاں کی جماعت مقننہ اس قانون کو اسی طرح سے تبدیل کر سکے گی جیسے کسی دوسرے قانون کو۔

(۳) اٹلی میں تمام دستوری تغیرات کے مسودے اردو رراثت تخت و تاج تبدیلیوں کی تحریکات ناشی مجلسِ عظمیٰ کے سامنے آنے چاہئیں جس میں ۳۵ سے ۴۰ تک ارکان ہوتے ہیں جو سب کے سب ناشی زین کے

رکن ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ اٹلی میں کوئی قانون بھی بغیر اس مجلس کی رائے کے نہیں بن سکتا اس لئے (علاوہ دستور ۱۸۴۸ء کے جو ایک لچکدار دستور سے اور جو اب بھی اٹلی میں برائے نام رائج ہے) یہاں کے ناشی دستور کو بھی لچکدار کہا جاسکتا ہے۔

(۴) جرمنی میں نائسی فریق کے برسر اقتدار آنے کے بعد تمام قوانین کا خواہ وہ دستوری ہو یا غیر دستوری، منع ہٹکری کا بند ہے، اور وہ ہمہ گیر دستوری قوانین کو تبدیل کر سکتی ہے بلکہ

(ب) استوار دساتیر

(۱) فرانس۔ استوار دساتیر میں سب سے لچکدار دستور فرانس کا موجودہ نہایت مختصر دستور ہے جو دراصل آئن تین قوانین کا مجموعہ ہے جو فردری اور جولائی ۱۸۷۵ء میں منظور ہوئے تھے۔ یہ پررے دستور پر حاوی نہیں ہیں، چنانچہ بہت سے ایسے معاملات ہیں جو حقیقت میں دستوری ہیں لیکن جنہیں معمولی قوانین کی طرح بدلا جاسکتا ہے۔ خالص دستوری قوانین کی

۱۷ اٹلی کے دستور کے لئے دیکھو پی لی نیائی: "اطالوی شخصیات کی حکومت"

Pitilignami: The Italian Corporative

State. باب ۵۔

۱۷ دیکھو "سالانہ رجسٹر" *The Annual Register.*

۱۹۳۶ء ۱۵۵

تبدیلی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ پہلے ترمیم ہر ایوان میں اکثریت سے منظور ہو اور اس کے بعد دونوں ایوان مشترکہ نشست و پرسائی میں کریں، اور ترمیم اس مجلس میں جسے قوی پہلی کہتے ہیں، اکثریت سے منظور ہو جائے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے، کہ فرانس کا دستور کبھی ایسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی نوعیت بجائے جمہوری کے ملوکیت ہو جائے۔

سویٹن۔ یہاں کا دستور ۱۸۷۹ء میں مدون ہوا۔ اس کی تبدیلی کے لئے حسب ذیل ضابطے کی ضرورت ہے: (۱) اگر دونوں ایوان کثرت رائے سے دستوری تبدیلی کے موافق ہوں تو اس کی فیصلہ طلبی کیا جائے گا اور ساتھ ہی جملہ کینیٹوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اکثریت ہوئی تو ترمیم منظورہ تصور کی جائے گی (۲) اگر ۵۰ ہزار شہری کسی ترمیم کی تحریک کرنا چاہیں تو یا تو وہ مکمل ترمیم مسودہ کی شکل میں پیش کریں گے ورنہ صرف اصول پیش کریں گے۔ ادل الذکر حالت میں جمعیت وفاقی اس ترمیم کے ساتھ اپنے مسودہ کی بھی فیصلہ طلبی کر سکتی ہے۔ اگر ان ۵۰ ہزار شہریوں نے صرف اصول ہی پیش کیا تو وفاقی اسمبلی کی اصولی منظوری کے بعد وفاقی مجلس (یعنی جماعت عامہ) اس کی تلافی

شہد کھورام و شہرہ: "سیاسی نظریہ اور حکومت اے عالیہ" Ram and Sharma: Political Theory and modern Government. - جلد ۲، باب ۹۔

نیکل میں لاکر فیصلہ طلبی کرے گی۔ اگر دفاعی اسمبلی نے ترمیم منظور نہ کی تو پہلے اس مسئلے پر فیصلہ طلبی ہوگی کہ آیا عوام کو ترمیم مجوزہ قابل قبول ہے یا نہیں۔
 بہر حال آخری فیصلہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ کینٹن میں لوگوں کی اکثریت دیکھی جاتی ہے اور اکثریت کو اس کینٹن کی ایک رائے قرار دیا جاتا ہے، اور پھر جس طرف کینٹنوں کی اکثریت ہوگی وہی ترمیم کا حشر ہوگا۔

ممالک متحدہ امریکہ، دستور کا نفاذ مارچ ۱۹۶۱ء میں ہوا۔ اس میں ترمیم حسب ذیل طریقے سے کی جاتی ہے۔ (۱) تحریک، (الف) کانگریس کے ہر دو ایوان کے اراکین کی پٹ اکثریت ترمیم کی تحریک پیش کر سکتا ہے (ب) ریاستوں میں سے پٹ کانگریس کو ترمیم کی درخواست کریں اور کہیں کہ کانگریس ترمیم کیلئے ایک مخصوص اجتماع طلب کرے۔ دونوں صورتوں میں آخری منظوری کے لئے ریاستوں کی تعداد کی پٹ اکثریت لازم ہے۔

انچا و جنوبی افریقہ۔ علاوہ مفصلہ ذیل امور کے باقی جملہ دستوری امور سموری قوانین کی طرح منظور ہو سکتے ہیں۔ استثنائی امور حسب ذیل ہیں (۱) ملک کے دیسیوں کے حقوق (۲) دیسی علاقوں، مثلاً بسوٹان، سچوانا، سوازیستان وغیرہ کے انتظامات۔ ان امور میں تبدیلی یا ترمیم کے لئے دونوں ایران کی نشست کرتے ہیں اور آخری منظوری کے لئے کم از کم پٹ اکثریت

لازمی ہے شہ

آسٹریلیا۔ (۱) اگر ترمیم پہلے ہر ایوان کی اکثریت سے منظور ہو تو اس کے بعد ہر ریاست میں جو مرکزی دارالنائین کے رائے دہندہ ہیں ان سے فیصلہ طلبی کی جاتی ہے۔ (۲) اگر صرف ایک ہی مرکزی ایوان منظور کرے دوسرا نہ کرے اور تین مہینے کے بعد پھر اسی ایوان سے منظور ہو جائے تو گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ دوسرے ایوان کی رائے کے ساتھ یا اس کی رائے کے بغیر فیصلہ طلبی کرے۔ اگر ریاستوں میں سے زیادہ تعداد میں جو رائے دہندے ہیں ان کی اکثریت سے فیصلہ طلبی منظور ہوگی تو ترمیم منظورہ تصور کی جائے گی۔

لیکن اگر ترمیم سے کسی خاص ریاست کے حدود میں تغیر ہوتا ہو یا کسی ریاست کے ارکان جماعت متفقہ کے تناسب میں کمی ہوتی ہو یا اس کے مخصوص میں کسی قسم کی ترمیم چاہی جاتی ہو تو ایسی حالت میں علاوہ فیصلہ طلبی کے خود اس ریاست کے رائے دہندوں کی اکثریت بھی ترمیم کے لئے ضروری ہوگی۔

روس کے جدید دستور کے تحت، جو ۱۹۱۷ء میں نافذ ہوا، "مجلس عالی" یعنی جماعت متفقہ کو دستوری ترمیمات کرنے کا بھی اختیار ہے بشرطیکہ ہر ایوان کا ترمیم کے موافق ہو۔

شہ شریک، حسب بالا، باب ۷۔

۷۷ ایضاً۔

ہندوستان کا موجودہ دستور۔ برطانوی پارلیمنٹ کے "قانون حکومت" ہند ۱۹۴۷ء پر مبنی ہے اور اس میں برطانوی پارلیمنٹ ہی ترمیم کر سکتی ہے۔ ہندوستانی جماعت ہائے مقننہ کو اس کے بارے میں معمولاً سفارش کا بھی اختیار نہیں۔ لیکن بعض امور میں ایسی سفارش کا اختیار ہے جس کے متعلق ایک خاص ضابطہ مقرر ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کی نوعیت صوبہ داری یا مرکزی جماعت ہائے مقننہ کی ترکیب، تعداد اراکین اور رائے دی کے متعلق ترمیمات کی ہو، بشرطیکہ ان ترمیمات کا تعلق اس مناسبت سے نہ ہو جو دونوں ایوانوں کے اراکین کی تعداد سے یا مرکزی جماعت مقننہ کے برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے اراکان کے درمیان ہے۔

- ایسی ترمیموں کے متعلق جو ضابطہ قرار پایا ہے وہ یہ ہے کہ
- (۱) صوبہ داری یا مرکزی وزیر مجلس دہرا کی طرف سے دونوں ایوانوں میں تحریک کرے اور اس تحریک کی دونوں ایوانوں میں منظوری ہو۔
 - (۲) دونوں ایوان گورنر یا گورنر جنرل کے سامنے ایک معروضہ پیش کریں اور استدعا کریں کہ یہ معروضہ ملک معظم کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ ملک معظم پارلیمنٹ کو ایوان کی خواہش سے آگاہ کر دیں۔

اللہ اس قانون کا ایک اچھا شخص ایڈیٹر کی کتاب "ہندوستان کا جدید دستور" Eddy and Lawton: India's new Constitution شہداء ہوا ہے۔

(۳) گورنر یا گورنر جنرل یہ معروضہ وزیر ہند کے پاس رد اند کریں تو اس کے ساتھ ساتھ اپنی رائے بھی بھیجیں کہ اس ترمیم کا کسی خاص اقلیت پر کیا اثر پڑیگا اور ساتھ ہی اقلیت متاثرہ کے خیالات کی بھی ترجمانی کریں۔

(۴) وزیر ہند تمام کاغذات کو پارلیمنٹ کے رد بردیش کریں گے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی ترمیم کا حق (سوائے عورتوں کی حق رائے دہی کے مسئلے کے) نفاذ دستور سے دس سال کے اندر حاصل نہیں ہوگا۔ گو پارلیمنٹ کو جب چاہے کسی قسم کی ترمیم کا حق حاصل ہے۔ نیز کسی ریاست کی نیابت جماعت مشفقہ میں کوئی ترمیم اس ریاست کے دالئی ملک کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکے گی۔

Internationalism 4/10/11

باب

بین اقوامی ہیت

ملکت کا مقصد اعلیٰ "قومی اور بین الاقوامی" نظریات۔ بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ کا ارتقا۔ انجمن اقوام کا جنم۔ اعضاء انجمن اقوام تصفیہ تنازعات بین اقوامی عدالت تسلیم مزوری۔ تفریق قلمتیں۔ تہدیب۔ انجمن اقوام کا ارتقا۔

ملکت کا مقصد اعلیٰ۔ اس سے قبل ایک باب میں 'جہاں ملکت کا سطح نظر اور مقصد عظیم کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی' وہاں یہ دکھایا گیا تھا کہ جو اصول ملکت کی کارفرمائی میں سب سے اہم ہے وہ عدل و مساوات کا اصول ہے، اور اگر اس خیال کو ترقی دی جائے گی تو نسلی، معاشری، لسانی قومی اور برعظمی تنگی سے نکل کر دنیا کی ملکیتیں ایک ارفع و اعلیٰ سطح نظر یعنی بین الاقوامی تختی پر کاربند ہو کر ایک عالمگیر بھائی چارے کی بنیاد ڈالیں گی۔ یہ ایک ایسا تختی ہے کہ بجائے اس کے کہ دنیا اس طرف آئے اس سے گریز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور شاعر کا جو مقصد اور آرزو

ہی آدمی اعضائے یک دیگر اند کہ از آفرینش نزدیک جو ہر اند
 چو عضوئے بدست آفر و روزگار در عضو ارا نہ اند سترار

سے ظاہر ہوتا ہے وہ بظاہر صد بصحرا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ تاہم اس میں
 شبہ نہیں کہ مدت دراز سے بڑے بڑے مفکروں کا خیال رہا ہے کہ انسان
 اور انسانی اجتماعات کو ایک دوسرے سے قریب تر لائیں تاکہ دنیا کے ایک
 ٹکڑے والے دوسرے ٹکڑے والوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس مقصد
 کے لئے انھوں نے طرح طرح کے اصول اور طریقے پیش کئے ہیں، چنانچہ
 بقول ایک سیاسی مفکر کے، شاید تاریخ عالم میں کوئی زمانہ ایسا نہیں آجاس میں
 امن و امان کے دیوتا کے سامنے رہائی تسلیم و رضا کی مانا نہ جی گئی ہو۔ ان
 خیالات میں سے بعض لوگ موتی طور پر کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن بالآخر نسلی
 قومی اور ملکیتی خود غرضیوں کا بول بالا رہتا ہے اور یہ جذبات، بعض کے نزدیک
 محض مصنوعی اور فی الجملہ بنی آدم کو نقصان پہنچانے والے ہیں، آخر اس پر غالب
 آجاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے اعتبار سے دنیا ہمیشہ ایک دائرے
 میں ہرگز گزرتی رہی ہے۔ جب کوئی ملک کسی جنگ یا اندرونی خلفشار کی وجہ سے
 مصیبت کی حالت میں ہو کر گزر چکتا ہے تو اس کے بعد اس میں ایک طرح کا عمل
 ہوتا ہے اور جنگ کے اصول سے نفرت کے ساتھ بین الاقوامی جذبہ بظہر میں آتا ہے۔

۵ پولارڈ: "تاریخ بین النہم اقوام"
 Pollard: The League of Nations in History.

رد عمل کے دور کے بعد وہ اپنی کھوئی ہوئی ثروت کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر واپس لانے لگتا ہے تو اس میں قومی جذبات موجزن ہوتے ہیں، خصوصاً اگر اسے شکست مل چکی ہو اور اپنی ترکیبوں سے اسے پھر پینے کا موقع مل گیا ہو۔ ایسی حالت میں ہمسایہ اقوام سے نفرت کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں اور جو بین الاقوامی جذبہ ہے وہ نسا ہو جاتا ہے۔ ابھی تک ”ہمسایہ کی محبت“ اپنے ہمسر کے ساتھ عدل“ اور ”مستقل جذبہ جس کے تحت انسان محض اپنے ماحول اور ملکی اغراض سے باہر دیکھ سکے، مفقود معلوم ہوتا ہے۔

”قومی“ اور ”بین اقوامی“ بہر حال پختل کہ بنی آدم میں خواہ کہیں بھی رہتے ہوں، کسی نسل سے پیدا ہوں، کسی رنگ روپ کے ہوں، یگانگت ہونی چاہئے، اور انسان کو انسان کے خون کا پیاسا نہ ہونا چاہئے، برابر کار فرما رہا ہے، اور برگزیدہ انسان ہمیشہ ایسے قواعد کی ٹوہ میں رہے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان میں اپنے بھائی کے خلاف ہمہیت کے جذبہ میں کچھ ٹھوڑی بہت کمی ہو جائے۔ یہی وہ قواعد ہیں جنہیں آج کل مجموعی طور پر بین اقوامی قانون کا اختیار دیا جاتا ہے اور جو اس موجودہ دور میں رد و رد اپنی اہمیت میں گر رہے ہیں اس مسئلے پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے کہ آیا ان قواعد کو ہم قانون کا لقب دے سکتے ہیں یا نہیں۔ کسی منظم معاشرے میں وہ شخص یا جماعت، جسے حکم دے اور اپنا حکم ضرورت ہو تو جبراً منوانے کا اختیار ہو، اگر ایسے احکام نافذ کرے جسے معاشرے کے عام ارکان کو ماننا پڑے، تو یہ احکام قانون کہلا سکیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا کوئی ایسا معاشرہ ہے جسے بین اقوامی قانون ساز کہا جاسکے۔ تو ان کو کسی

مملکت کے شہری اور بین الاقوامی حیثیت سے کسی مملکت کی کیفیت میں تین فرق ہے، اس لئے کہ جہاں شہری قانون کا پاس کرنے پر مجبور ہے وہاں اگر کسی مملکت کے بین الاقوامی فرائض اور اس کی قومی مفاد کے درمیان تصادم ہو تو یہ مسئلہ کم از کم زیر بحث ضرور ہو جاتا ہے کہ مملکت کے لئے کون سا طرز عمل مناسب ہے، اور بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو حب وطن کو بین الاقوامی نہیں کی قربانگاہ پر چڑھانے کے لئے تیار ہوں۔ پھر جہاں مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہوتا ہے جو خلافت قانون کارروائی کا جبراً اسناد کرتا ہے وہاں اس قسم کا بین الاقوامی ادارہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا جو عملاً کسی غلط کار مملکت کو جبراً صحیح راستے پر لگا سکے خصوصاً ایسی مملکت کو جو قوت و مطرت میں کسی سے ہٹی نہ ہو یا جس کی بین الاقوامی حیثیت ایسی ہو کہ وہ مختلف مملکتوں کے درمیان حاجب کی ظہیر ہو۔ کسی نے خوب مثال دی ہے کہ جس طرح ایک نوجوان شخص پسند نہ کرے گا کہ اس کا کوئی ہمسر اس کے خاکی معاملات میں مداخلت کرے اسی طرح سے کوئی مملکت جو مستحکم ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اگر جس میں اس دعوے کی تائید کے لئے قوت بھی ہے، وہ اندرونی معاملات میں کسی قسم کی بیرونی جبری مداخلت کی تاب نہ لائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی قوت دالی مملکت کسی مکرار مملکت کے معاملات میں

شہرہ: "اصول سیاسیات" Sidgwick: Elements of
Politics. باب ۱۸ دفعہ ۱.

مداخلت کیے یا اس پر جبر کرے یا اسے فنا کر دے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بین الاقوامی معاملات زیادہ تر کسی قسم کی مشترک اجتماعی توت پر نہیں بلکہ چند طاقتور مملکتوں کی توت پر مبنی ہوتے ہیں۔ مملکت کے اندر باشندوں کی تعداد اس قدر کثیر ہوتی ہے کہ ان میں مشکل سے کوئی ایک دو اشخاص ایسے ہوتے ہوں گے جن کا اقتدار قطعی طور پر بلا شرکت غیرے دوسرے تمام اشخاص سے بڑھا ہوا ہو لیکن بین الاقوامی تعلقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ مملکتوں کی تعداد نہایت تنہل ہے۔ تمام دنیا کی مملکتوں کو دیا جائے تو ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں اور ان میں اکثر مملکتیں ایسی ہیں جو چند مخصوص مملکتوں، مثلاً انگلستان، فرانس، جرمنی، امریکہ، جاپان، روس، اٹلی وغیرہ سے کہیں کمزور ہیں، جس کی وجہ سے ہوتا رہی ہے جو یہ چند طاقتور مملکتیں چاہتی ہیں اور باقی مملکتیں ایک طاقتور مملکت یا دوسری طاقتور مملکت کا منہ دکھا کرتی ہیں۔

دو درجہ ہیں جن سے کسی مملکت کے اندر شہری کی حیثیت اور بین الاقوامی

یہ تہذیب جنگ جہشہ کے موقع پر انگلستان اور فرانس نے چند تہدیدیں اٹھائی پر فائدہ کرنا چاہیں تو ۲۰ھ مملکتوں نے جو انجمن اقوام میں شامل تھیں یعنی علاوہ البانیہ، آسٹریا اور ہنگری کے باقی سب رکن مملکتوں نے، تہدیدوں کو تسلیم کر لیا۔ لیکن عدیس رابا کی فتح کے بعد جب انجمن اقوام میں انگلستان اور فرانس نے تہدیدوں کو واپس لینے کا ارادہ کیا تو جملہ ارکان کو بھی آتنا صدقہا کہنا پڑا۔ انجمن اقوام پر جنگ جہشہ کے اثرات کے لئے دیکھو "سالانہ رجسٹر" Annual Register ۱۹۳۶ء حصہ ۱، صفحہ ۱۵۹۔

تعلقات میں مملکت کی حیثیت میں گو نہ فرق پایا جاتا ہے، خانگی معاملات میں اگر کوئی فرد کسی دوسرے فرد سے جبراً کسی دستاویز پر دستخط کرے یا معاہدہ پر رضا مندی لے لے تو قانوناً یہ دستاویز یا معاہدہ کا عدم سمجھا جائے گا، لیکن بین الاقوامی معاملات میں اس اصول کا نفاذ دشوار ہے، اس لئے کہ یہاں تو بیشتر معاہدات پر ہر ایک فریق دوسرے فریق سے دب کر ہی دستخط کرتا ہے، اور ایسے معاہدات قطعاً جائز قرار دئے جاتے ہیں۔ پھر خانگی معاملات میں حفاظت خود اختیاری کے اصول کو صرف اس وقت کام میں لایا جاسکتا ہے جب کوئی شخص حملہ کرے، لیکن بین الاقوامی معاملات میں اس حفاظت خود اختیاری کے اصول میں بڑی بستی و کشادگی گنجائش ہے، اور محض اس واسطے کی بنا پر کہ ایک ہمسایہ مملکت شاید کبھی حملہ کر بیٹھے، نہایت آسانی سے ادل تو اسلحہ جات میں بے انداز اضافہ کیا جاسکتا ہے اور بعض مرتبہ بغیر دوسرے کے حملے کی انتظار کے عین جس وقت پوری طور سے اسلحہ اور سامان جنگ کی طرف سے اطمینان ہوا دوسرے ملک پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔

انہی اسباب سے بعض مفکر تانوں اقوام کا تعلق بجائے قانون کے محض اخلاق سے زیادہ تصور کرتے ہیں۔ ان کا یہ قول ہے کہ بجائے اس کے کہ پہلے اصول قائم کئے جائیں اور ان اصول کا واقعات پر انطباق ہو جیسا کہ قانون کے دائرہ میں ہوتا ہے، قانون بین الاقوام میں پہلے رواج پر غور کیا جاتا ہے اور

جو رواج عالمگیر ہوں یا زیادہ تر ملکوں کے باہمی تعلقات میں پائے جائیں ان سے اصول اخذ کئے جاتے ہیں، چنانچہ قانون بین الاقوام کا دار و مدار زیادہ تر عہد ناموں، صلح ناموں اور بین الاقوامی رسم و رواج پر ہوتا ہے۔

نیز جیسے اخلاقی تہدیں غیر معین ہوتی ہیں اسی طرح بین الاقوامی تہدیں خواد کا غنہ پر کیسی ہی معین نظر آئیں دراصل غیر معین ہی ہوتی ہیں، اس لئے کہ عمل کے وقت ان کا دار و مدار وقتی بین الاقوامی معاملات پر ہوتا ہے۔ باوجود اس کے بعض مفکرین قانون بین الاقوام کو قطعی طور پر قانون کہنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اور ان کا یہ قول ہے کہ جس طرح زیادہ تر قوانین کا دار و مدار رسم و رواج پر ہوتا ہے جن میں اعتماد و مانہ سے قطعیت پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح قانون بین الاقوام بھی رسم و رواج پر مبنی ہے اور یہ بھی رشتہ رشتہ قانون کی طرح معین ہوتا جاتا ہے۔^۱ نظر پات۔ یہ سب نظریے اور خیالات حال ہی کے ہیں جب مفکرین نے قانون بین الاقوام کی ہیئت پر نظر ڈالنی شروع کر دی ہے۔ لیکن سب سے پہلے جس شخص نے قانون بین الاقوام کو ایک جداگانہ فن کا رتبہ زیادہ ڈیلفٹ (Delft) کا باشندہ گروٹیوس تھا۔ لیکن بین الاقوامی قانون کو اپنے صحیح رتبے پر لانے کا

۱۔ اوپنہائم: International Law: اپنی نام "قانون بین الاقوام" Openheim: International Law

جلد ۱ باب ۱۔ یہ خیال روز بروز آج کل کس قدر غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ گروٹیوس ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۵ء میں مرا۔ اس کے خیالات کے لئے دیکھو ڈونگ: "سیکس"

نظریات (Theories) of International Law: ڈونگ Dunning: Political Theories of International Law

from Luther to Montesquieu۔ ۵۔ فصل ۴۔

سہرا گروتیوس ہی کے سر ہے۔ گروتیوس کا زمانہ یرپ میں مذہب کے نام سے
 بڑی بڑی خوریزیوں کا زمانہ تھا۔ عالمگیر عیسوی مملکت کا الوان گرچکا تھا، اس کی
 جگہ نئی نئی مملکتوں جیسے فرانس، اسپین اور انگلستان نے لی تھی اور پرورش
 اور دس بھی ترقی کے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ گروتیوس برجگلوں اور خوریزیوں
 کا بہت اثر ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ گرجنگ کا خاتمہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کی
 قدرت کو کم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ اس مقصد سے اس نے اپنی مشہور تالیف کتاب
 ”قانون جنگ و امن“ ۱۶۲۵ء میں لکھی۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے قانون
 فطری کے تعلیم کو کام میں لایا ہے اور کہتا ہے کہ بین الاقوامی تواعد و مشقوں میں تقسیم
 کئے جاسکتے ہیں، ایک وہ تواعد جو اس قانون فطری سے ماخوذ ہیں اور دوسرے
 وہ جو مختلف مملکتوں کے مشترک قوانین فطری سے ماخوذ ہیں۔ لیکن وہ فطری قانون پر
 بہ نسبت اس دوسری مشق کے زیادہ زور دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قانون فطری ہی ایسا
 اصل اور ازلی نظام ہے کہ اسی پر بین الاقوامی تواعد کی صحیح بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ اگر ہم
 غور کریں تو یہ محسوس کریں گے کہ بالآخر اس قانون فطری کا معیار سولے زعم و رواج
 کے کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن گروتیوس نے ایک ایسا تخیل قائم کیا جو کئی صدیوں تک
 برابر زندہ رہا۔ اور گروتیوس کے مفروضوں کو اس کی عنصر مملکتوں نے تمام دیکھا منظور
 نہیں کیا تاہم جب بھی کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہوتا تھا تو اس کی کتاب کا حوالہ
 دیا جاتا تھا۔ آج گروتیوس بین الاقوامی قانون کے ان کے میں شمار کیا جاتا ہے۔

بین الاقوامی نظریے میں روسو کے خیالات میں گروتیس کے خلاف رد عمل نظر آتا ہے۔ روسو روایات سے سخت متنفر ہے اور کہتا ہے کہ "اگر ہزاروں ظالم اقوام نے اپنے قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا ہے..... تو بھی انسان کے ان جرائم سے متنبہ کرنا ان کی ہیمنیت کو اخلاق سے کیا تعلق ہے؟ یہ نہ پوچھ کہ انسان نے کیا کیا ہے۔ یہ سوچ کہ انسان کو کیا کرنا چاہئے۔ ان لغو اور نقصان رساں "استاد" سے بچ جنھوں نے انسانوں میں غلامانہ ذہنیت پیدا کرنے اور انھیں خوشنوار اور مبذول بنانے میں مدد دی ہے۔" روسو کا خیال تھا کہ بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ ملکوں کے درمیان ایک طرح کی عہدیت قائم ہو جائے جو اتحاد سے زیادہ مستحکم ہو لیکن دفاعیت کے حد کو نہ پہنچے تاکہ اس صورت حال کا فائدہ ہو جائے جس کے تحت یورپ میں امن کی بجائے محض التوائے جنگ ہو رہی رہتی ہے اس لئے کہ کسی فریق کے دفاعی کبھی دوسرا فریق دل کھول کر تسلیم نہیں کرتا۔ روسو کا خیال تھا کہ جنگ افراد کے درمیان نہیں بلکہ محض ملکوں کے درمیان ایک تنازعہ کی کیفیت کا نام ہے، چنانچہ متحارب ملکوں کے افراد کو بحیثیت افراد کے ایک دوسرے پر سختی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

حکمیاتی کشمکشوں نے بھی بین الاقوامی جذبہ کو ترقی دی اور ایسے حکمیاتی کشف جیسے گالی لید، کورنیلوس، ٹیخو براسے، دیکارٹ، نیوٹن وغیرہ کا احسان

۱۵ روسو کے بین الاقوامی خیالات کے لئے دیکھئے ویل: "بین الاقوامی خیالات کا ارتقاء"
 Stawell: Growth of International Thought. باب۔

کسی ایک ملک دے پر نہیں بلکہ تمام عالم پر ہے۔ نیز علم انبیاء کے اکتشافات سے یہ محسوس ہونے لگا کہ نبی نوع انسان میں ایک ایسا رابطہ ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر جرمن فلسفی کانٹ ایک تجویز پیش کرتا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ہر دولت عائدہ اپنے ہمسایہ کے ساتھ "ایک غیر ذمہ دارانہ آزادی" کا برتاؤ کرتی ہے اور ہر دولت عامہ کو چاہئے کہ اس کے برعکس ایک ایسی لیگ میں شامل ہو جہاں چھوٹی سے چھوٹی مملکت محفوظ ہو اور امن و امان قائم رہے اور بڑی سے بڑی مملکت کو بھی کسی دوسری مملکت پر جبر کرنے کا ہمت پیار نہ ہو۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں قانون فطری کا نظریہ نفا ہوتا ہے اور فکروں کا زیادہ تر رجحان انسانی قانون بین الاقوام کی طرف ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف مملکتوں کے درمیان ایک لا قتنا ہی سلسلہ باہمی عہد ناموں اور رضی ناموں کا شروع ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے بین الاقوامی قواعد میں ایک قسم کی قطعیت پیدا ہوتی ہے اور یہ رجائی صورت حال موجودہ زمانہ تک جاری رہتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ویسٹ لیک، کوریمر^۱ اور اپن آئم جیسے مفکر قانون بین الاقوام کو مدوں

۱۔ ایضاً باب ۹

۲۔ اپن آئم باب ۲ دہنہ ۴۔

۳۔ کوریمر: "اصول قانون بین الاقوام" *Lorimer: Institutes of the*

Law of the Nations, لیٹ لیک، "قانون بین الاقوام" *Westlake:*

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵۵ پر)

کرتے اور اسے ایک قطعی حالت میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس ماحول کے پیدا ہونے میں مدد ہوتے ہیں جس کے تحت انہیں اقوامِ ظہریں آئی - یہ مفکر قانون بین الاقوام کو ایک معین قانونی جامہ پہناتے ہیں، چنانچہ اوہن آئم نے قانون بین الاقوام کی تعریف جو کہ ہے وہ یہ ہے کہ "قانون بین الاقوام ایسے رواجی اور مضرعہ قواعد کا نام ہے جس کی مشن مکملتیں آپس کے معاملات کی حد تک قانوناً باندھ بھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا مؤرخ ذرا طبعہ امیر الفاظ میں کہتا ہے کہ "قانون بین الاقوام صرف ادبیات اور اخلاقیات کے مجموعے کا دوسرا نام ہے۔"

بین الاقوامی تعلقات کا ارتقا۔ یہ مؤلفین کے خیالات ہوئے۔

اب بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ پر زرا نظر ڈالئے۔ یہودی قوم اپنے دشمنوں کے ساتھ انتہائی بے رحمی سے پیش آئی تھی، چنانچہ سمویل مکس کے صحیفے میں مذکور ہے کہ انھوں نے طاقت کو ہدایت کی کہ وہ جا کر دشمنوں کو مارے اور "ان پر رحم مت کر۔ بلکہ مرد اور عورت، ننھے بچے اور شیرخوار، بیل، بھیر، اور اونٹ اور گدھے تک، سب کو مار ڈال" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانے میں یہودی

دقیقہ جانشین ۵۵۵

International Law اور آئم "قانون بین الاقوام" Oppenheim

International Law

آئم اور آئم جلد انص

آئم پر لارڈ

آئم پرانا عہد نامہ سمویل کا صحیفہ ۱۵۱

اپنے دشمن کے ساتھ کسی قسم کی روداداری کے لئے تیار نہ تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہے کہ غیر اقوام کے جو لوگ یہودیہ میں آباد تھے ان کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا تھا۔ یونانی شہری ملکوں کے باہمی تعلقات قائم تھے اور علی العموم ایک مملکت دوسری مملکت کے کسی شہری کو اپنی طرف سے ایک ”پردے کے کوس“ یا سفیر کے طور پر مقرر کرتی تھی جو اس کے مفاد کی نگہبانی کرتا رہتا تھا۔ یونانیوں کا قاعدہ تھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے باضابطہ اعلان جنگ دیتے تھے اور بعض اشخاص وادارات (جیسے ندما اور بیت خانے) مامون سمجھے جاتے تھے۔

رومن سلطنت کی توسیع کے ساتھ بین القریٰ ضرورت حال میں تبدیلی ہو گئی اور جہاں تقریباً ہر یونانی شہر کا رتبہ ایک مملکت کا تھا، وہاں ایک بلدیہ یعنی روم نے اپنی حکومت بھیتوروم کے سر جہاں طرف شمال میں برطانیہ اور دکنستان تک، جنوب میں مصر، مشرق میں ایران تک وسیع کر لی۔ ظاہر ہے کہ ایسی مملکت کے وجود سے بین القریٰ تعلقات صرف کے برابر ہوں گے، اس لئے کہ روم کسی دوسری مملکت کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا۔ تاہم رومن تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی جنگ کی ابتدا خاص خاص ضابطوں کے تحت ہوتی تھی اور روم میں پجاریوں کا ایک خاص گروہ ایسا تھا جس کے سپرد خارجی معاملات کی دیکھ بھال تھی اور اگر کسی قوم سے جنگ چھڑتی تو اسی گروہ کے سپرد اعلان جنگ کا دینا ہوتا تھا۔ روم میں غیر مالک کے سفیروں کی ذات محفوظ سمجھی جاتی تھی اور اگر کوئی شخص کسی سفیر کو گزند پہنچاتا تو اس شخص کو سفیر کے مملکت کے حوالہ کر دیا جاتا۔ رومن سلطنت میں تقریباً تمام دنیا کے معلومہ کے باشندے آتے جاتے تھے

اور بعض روماء اور اس کے توابع میں رہ بھی پڑے تھے۔ چونکہ خاص قانون روماء کا اطلاق صرف رومن شہریوں پر ہوتا تھا، اس لئے اس کی ضرورت پیش آئی کہ غیر رومنیوں کے لئے بھی کسی قسم کے قانون کا نفاذ کیا جائے۔ اسی ضرورت کے تحت اس قانون کا رواج ہوا جسے ”قانون اجانب“ کہتے ہیں، جو دراصل مختلف اقوام کے قوانین کا گر یا پچھڑ تھا۔ رومن لوگ تو انہیں کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے جنگ جیسے ادارے کو بھی قانونی جامہ پہنا دیا اور یہ اصول قرار دیا کہ جنگ ایسی حالت میں قانوناً جائز ہوگی اگر کوئی قوم رومن سرحدوں یا سفیروں پر حملہ کرے یا عہد ناموں کو توڑے یا رومنوں کے دشمنوں سے جا ملے۔

رومن قانون کے بعد سنوی اہتبار سے قانون اسلام کا زمانہ آتا ہے۔ اور جیسے اسلام نے ہر دوسرے انسانی ادارے میں عظیم الشان انقلاب برپا کیا، اسی طرح بین انوائی طرز عمل میں بھی بدیہی تبدیلیاں کیں۔ جس زمانے میں اسلامی اصول دنیا کے سامنے پیش کئے گئے ہیں وہ ایسا زمانہ تھا کہ نہ صرف عرب بلکہ تمام دنیا مستحارب قوموں، فرقوں اور طبقات میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے اس تقسیم کو محض اس درجہ سے حق بجانب ٹھہرا کر اس سے شخصی قابلیتوں کی آزمائش کا پورا موقع مل سکے، لیکن ساتھ ہی وہ باہمی جھگڑوں، جنگوں اور تنازعات کی وجہ یہ قرار دیتا ہے کہ یہ دراصل قانون المیہ سے انحراف یا شجاعت کرنے کی سزا ہے۔ مسلمانوں کے لئے جنگ کی اجازت اس حالت میں دی گئی ہے کہ مخالفین ان پر زیادتی کریں اور جنگ صرف ان لوگوں کے خلاف کی جائے جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم کیا ہے، اور فتنہ کے ختم ہونے ہی تو ان کو پیام میں ڈال دیا جائے، چنانچہ اگر دشمن صلح کی درخواست

کریں تو اس درخواست کو رد نہ کیا جائے۔ اس ضمن میں یہ امر قابل صراحت ہے کہ غیر مسلموں کی جماعت کی توقعیں کی گئیں ہیں، ایک وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے حلیف ہوں، اور اس صورت میں مسلمانوں پر لازم ہے کہ کسی حالت میں عہد شکنی کا ارتکاب اپنی طرف سے نہ کیا جائے، اور دوسری وہ جماعت ہے جو اس قسم کے عہد کو توڑے اور خود اپنے آپ مسلمانوں سے دشمنی مول ہے۔

اسلام نے جو اصلاح اسیران جنگ کی حالت میں کی وہ دنیا پر اس کا بڑا بھاری احسان ہے۔ جنگ بدر پہلی جنگ ہے جس میں اس قاعدے کی ابتدا ہوئی کہ قیدیوں کو آرام و آسائش سے رکھا جائے اور ایک قلیل فدیہ یا چھوٹی سی قیمت کے عوض (جیسے بچوں کو پڑھنا سکھانا) انھیں بالکل آزاد کر دیا جائے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے اپنی ذاتی مثال سے ایک ایسا سبق اپنے ہم قوموں کو سکھایا جس کی نظیر آج بھی مشکل سے مل سکتی ہے، اور وہی عرب جن کے مرد و قوم دہشتیں تک زخمیوں اور مقتولوں کی لاشوں پر ترس نہ کھاتی تھیں ایسے شریف بنائے گئے کہ جب پیغمبر اسلامؐ اپنے دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو آنحضرتؐ صلعم کے صریح احکام کی اطاعت میں انھوں نے ان ظالموں سے کسی کو ہاتھ تک نہیں لگایا جنھوں نے آٹھ سال پیشتر خود حضرت محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کو نہایت درجہ ظلم و ستم کے ساتھ اپنے جہنم بھوم سے نکال دیا تھا۔

مثلاً اس بحث کے لئے دیکھو میرا کتابچہ "اسلامی دولتِ عامہ کی ابتدا" : Sherwani :
Origin of the Islamic Polity حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء، جس کا
 (تقریباً ششہ ماہ پر)

یورپ میں روسیوں کا ڈھانچا باوجود اندرونی اور سیاسی تبدیلیوں کی پندرہویں صدی عیسوی تک قائم رہا، لیکن اس صدی کے وسط میں نئی ملکوں کے قیام کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات کے تعین کی ضرورت پیش آئی، یہاں تک کہ ۱۶۴۸ء میں جنگ سی سالہ کے اختتام پر ان یورپی ملکوں کے آزادانہ وجود کو "مقدس سلطنت" رونے بھی جو قدیم روسی روایات کی حال تھی، تسلیم کر لیا، اور اس طرح عالمگیر سلطنت اور عالمگیر پابندیت کا نظریہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، نیپولین کے عہد میں تقریباً وہی صورت حال پیدا ہوئی جو روسی سلطنت کے زمانے میں نظر آتی ہے اس لئے کہ نیپولین کی طاقت اور قوت یورپ پر اس قدر بھائی ہوئی تھی کہ اس کا حکم ہمنہ لہ قانون کے تھا خواہ وہ حکم اندرون ملک کے معاملات کے متعلق ہو یا بین الاقوامی معاملات کے متعلق۔ نیپولین کے بعد سے لے کر ۱۸۷۱ء تک کے دور کی ایک نہایت ممتاز کیفیت دول یورپ میں مخالفوں کی بہتات تھی۔ پہلا مخالف، جو مخالفہ مقدس، کے نام سے مشہور ہے، دار روس کا اختراع تھا، اور اس کے ذریعہ سے یہ کوشش کی گئی تھی کہ عیسوی یورپ کو انقلاب کی زد سے بچایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وقتاً فوقتاً کل یورپی کانفرنسیں اور کانگریسیں منعقد کر کے اختلاف یورپ کو ایک زندہ ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس اختلاف کو پہلا دھکا ۱۸۶۲ء میں راجا بنگلہستان

(بقیہ ہمشیمہ ۵۵۵) ترجمہ رسالہ "ترجمان القرآن" حیدرآباد دکن کی اشاعت ربيع الاول و ربيع الثاني ۱۳۵۵ھ میں طبع ہوا ہے۔

نے ہسپانوی امریکی نوآبادیوں کو جو اسپین سے باغی ہو گئیں تھیں، زیر کرنے کی تجویز سے اختلاف کیا، اور اُدھر مالک متحدہ امریکہ کے طرف سے صدر جمہوریہ منرو کی آواز آئی کہ امریکی معاملات میں یورپ مداخلت نہ کرے، چنانچہ آخر کار اس طریق کار کا جس کی ۱۸۲۳ء میں دائیہ کی کانگریس میں ابتدا ہوئی تھی، ۱۸۲۳ء میں خاتمہ ہو گیا۔

اس وقت تک یورپ میں مبنی کوششیں بین الاقوامی معاملات میں یکسوئی پیدا کرنے کی ہوئی تھیں وہ سب عیسائی دول یورپ تک محدود تھیں۔ جنگ کریمہ کے بعد ۱۸۵۶ء میں پہلی مرتبہ ایک ایسی مملکت کو جسے غیر یورپی تصور کیا جاتا تھا اور جو نہ عیسائی نہ تھی، اختلاف یورپ میں شامل کر لیا گیا۔ یہ مملکت ترکی تھی۔ حقیقت میں یہاں بجائے محض یورپی تھیں کے بین الاقوامی سیاسیات میں ایک سنساری تھیں کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب ۱۸۶۷ء کے بعد جاپان پر وہ اٹھا کر میدان سیاسیات میں نمودار ہوتا ہے اور اپنی قوت کا سکھار اپنے ملک میں غیر ملک اختیارات کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور پہلے چین کو بعد روس کو شکست دیتا ہے، تو یورپی دول اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اسے اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اختتام سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ بین الاقوامی تخیل میں ترقی کا زمانہ تھا۔ زار روس نے ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں جرمن الاقوامی کانفرنسیں ولندستان کے پایہ تخت ہیگ میں مجتمع کی اس کے ارکان نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے جس کی رو سے قرار پایا کہ ایک مستقل عدالت نمائشی قائم ہو

جس میں ہر مخط کنندہ ملک کے چار ممتاز مقنن مقرر کرے، اور اگر دو ملکوں کے درمیان تنازعہ ہو تو ان مقننوں سے ہر فریق دو دو نمائندوں کا انتخاب کرے جو ایک سرچ کا خود انتخاب کریں۔ یہ بھی قرار پایا کہ ثالثی قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار فریقین کو حاصل ہوگا۔

جنگ روس و جاپان کے اختتام پر زار روس ہی کے ایسا مسئلہ میں دوسری کانفرنس ہیگ میں جمع ہوئی اور اس میں علاوہ اصول ثالثی کی توسیع کے قانون جنگ پر بحث ہوئی۔ یہ بحث ختم نہ تھی اس لئے انگلستان کی دعوت پر ۱۹۰۷ء میں ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس نے بحری جنگ کے بعض قواعد پر طول طویل غور کر کے ایک "اعلان لندن" منظور کیا، لیکن اس اعلان کی اس وقت تک خود برطانوی پارلیمنٹ نے توثیق نہیں کی ہے اور اب اسے کالعدم تصور کرنا چاہئے۔

اس دوران میں بہت سے بین الاقوامی ادارے عدم سے وجود میں آئے، جیسے سنساری اتحاد تار برقی، سنساری اتحاد ڈاک، ادبیات اور فنون لطیفہ کے شاہکاروں کی حفاظت کا ادارہ، سکے، اوزان اور پیمانوں کی کیسانی کے لئے محالفے اور اتحاد وغیرہ۔ نیز حکمیاتی انکشافات کے متعلق بھی بعض بین الاقوامی محالفے اور اتحادات قائم ہوئے ان ادارات میں شاید سب سے اہم صلیب احمر ہے جس کا اسلامی ممالک میں انجمن ہلال احمر نام سے کیا اور جس کا مقصد جنگ کے زخمیوں کی نگہداشت اور مرہم پٹی کرنا تھا۔ لیکن جنگ عظیم نے ان تمام کیفیات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء

کا زمانہ دراصل بین الاقوامی ہمسیت، رواداری، حق پرستی اور انصاف کے خلاف رد عمل کا زمانہ تصور کرنا چاہیئے۔

بین الاقوامی تنظیم - پندرہویں صدی عیسوی سے برابر یورپ کے مختلف ملکوں، مثلاً فرانس، ہولینڈ، اٹلی میں بڑے بڑے مفکر اور دوزار کسی نہ کسی قسم کے بین الاقوامی ادارے کی تجویز پیش کرتے رہے تھے جو مختلف مملکتوں کے باہمی تنازعات کو حل کرنے میں مدد دیا جو اپنا حکم ان سے جبراً منوا سکے۔ لیکن یہ سب اتحادیں ناقابل عمل ثابت ہوئیں اس لئے کہ یورپ میں اس قدر باہمی نفیض رہا تھے کہ کسی قسم کی مفاسدت ممکن ہی نہ تھی۔ بین الاقوامی اصول کو سب سے پہلی علیٰ فتح امریکی اتحاد سے اور اس سے بھی زیادہ تقویت جرمن اتحاد کے وقت یعنی ۱۸۷۱ء میں حاصل ہوئی۔ امریکی اتحاد تو پھر بھی ایسی ریاستوں کے مابین تھا جو رقبہ، آبادی اور حیثیت میں تقریباً مساوی تھیں، لیکن جرمن وفاقہ غیر مساوی اور متنازع، ریاستوں کے مابین تھا۔ جرمن وفاقہ میں پرورشیا جیسی عظیم الشان بادشاہی، اور اولڈن برگ جیسی ناچیز امارت شامل ہو گئی تھیں۔ علاوہ پرورشیا کے اس میں تین دوسری ملکیتیں متعدد گرینڈ ڈچیاں اور ڈچیاں، استغنی علاقے اور ”آزاد شہر“ (جن کی حکومت ایک طرح کی جمہوری اصول پر مبنی تھی) سب کے سب شامل تھے، اور یہ ترکیب ایک قسم کا اشارہ تھا کہ اگر کوئی

۱۸۷۱ء قطع ہو کر آج کے پورٹشیا کا رقبہ ایک لاکھ تیرہ ہزار مربع میل سے زیادہ اور شاہی مہرگاہ کا رقبہ صرف سو سو میل ہے۔

کی جائے تو بین الاقوامی وفاقیہ بھی اسی طرح سے ترکیب دیا جاسکتا ہے۔
 انجمن اقوام۔ الغرض یہ وہ نظریے اور کیفیات تھیں جن کا انجمن اقوام
 کے قیام کے مسئلے پر اثر پڑا۔ جنگ عظیم کے دوران میں (جولائی ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء
 تک جاری رہی) بین الاقوامی ادارات کو بڑا زبردست دھکا لگا، اور جب
 نومبر ۱۹۱۸ء میں یہ جنگ ختم ہوئی تو حسب سابق بین الاقوامیت کی طرف ایک
 رد عمل پیدا ہوا، چنانچہ صدر جمہوریہ، وڈر ولسن نے جو وہ نقاط جرمنی کے سامنے
 پیش کئے ان میں سے یہ بھی تھا کہ ایک انجمن اقوام قائم کی جائے جس کے ذریعے
 سے بڑی چھوٹی مملکتوں کی سیاسی آزادی اور علاقہ جاتی تفریق کی ضمانت کی
 جاسکے۔ ولسن بین الاقوامیت کے معاملے میں بڑا مطمحہ تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ اس
 انجمن کے علاوہ کسی قسم کی مجلس یا محافلے نہیں ہونی چاہئیں۔ بہر حال انجمن اقوام
 کے قواعد و ضوابط ایک ”موافقہ“ میں تدوین ہوئے، جو بالآخر، جنوری ۱۹۱۹ء
 کو عہد نامہ ویرسائی کا جزو بنا دیا گیا اور اسی حیثیت سے جرمنی کو اسے تسلیم کرنا پڑا۔
 انجمن اقوام کے ۱۶ چار اعضاء ہیں، یعنی اسمبلی، مجلس، منبذی، ان کے علاوہ
 بین الاقوامی عدالت کا ادارہ بھی ہے اور گویہ انجمن کے ڈھانچے سے باہر تصور کیا
 جاتا ہے لیکن اس کا انجمن کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اسمبلی میں ہر مملکت کے قائم
 مقاموں کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے، گو مملکتوں کو متبادل قائم مقاموں

حلقہ اس کتاب کی پہلی اشاعت میں انجمن اقوام کا مفصل ذکر تھا۔ اس وقت تک انجمن مردہ
 نہیں ہوئی تھی۔ موجودہ اشاعت میں صرف اشارے کافی سمجھے گئے ہیں۔

باب ۲۲ احمد علی شاہ ۵۶۸۰ بین اقوامی ہیئت

۱۹۱۰ء - ۱۹۱۱ء
کے بھیجنے کا حق حاصل ہے، اس کا جلسہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ ماہ ستمبر میں ہوتا ہے اور اس کا صدر عموماً چھوٹی ملکوں سے چنا جاتا ہے۔
انجمن کا دوسرا اسم ادارہ مجلس ہے مجلس میں ابتدا میں صرف چار مستقل اور چار غیر مستقل ارکان ہیں جن میں سے ہر تین کا انتخاب تین تین سال کے لئے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی اگر کسی ایسی ملک کا معاملہ مجلس کے سامنے پیش ہو جو اس کی رکن نہیں، تو اسی ملک کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنی طرف سے ایک قائم مقام مجلس میں موٹی طور پر نشست کر لے کے لئے بھیج دے۔
مجلس کے معاملات محض اکثریت کے ذریعے سے طے نہیں کئے جاتے بلکہ ان میں سے اہم ترین کے لئے اتفاق رائے ضروری ہے۔ موافقہ انجمن اقوام کے ذریعے سے مجلس کے سپر بعض خاص معاملات گردے گئے ہیں جیسے تحدید اسلحہ، تفویضی علاقوں کا انتظام، کسی ملک کی سرحد پر حملہ ہونے کی صورت میں طرز کار کا تعین وغیرہ نیز اسی کے سپر علاقہ جات ساکرو ڈائٹریکٹ کا انتظام اور اقلیتوں کی حفاظت بھی کی گئی تھی۔
قیصر ادارہ متعدی ہے۔ انجمن اقوام کا ایک معتد اعنی ایک نائب معتد اور

۱۹۱۹ء یہ ملازمہ سا ایک شاہد علی کے ذریعے سے جرمنی کو واپس لے گیا ہے اور انجمن اقوام کا اس پر کوئی دخل نہیں رہا۔ ڈائٹریکٹ کی مجلس متفقہ میں جرمن ناکسی گروہ کی اکثریت ہے اور اس کا جرمن سے الحاق ناگزیر ہے۔ دوسرے اختیاری دائروں کے تنگ ہو جانے کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کے مسئلے پر بھی مجلس کا تاثر نہیں رہا۔

تین درجہ کا معتمد ہیں۔ معتمد باعث ہمارے اپنے عہدے کے جمعیت اور مجلس داروں کا معتمد ہوتا ہے۔ یہی مجلس کے منظوری سے معتمدی کے جملہ عہدہ داروں کا (جن کی تعداد تقریباً ۷۷ ہے) تقرر کرتا ہے اور یہ عہدہ دار براہ راست اس کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ معتمدی کا کام ۴ شعبوں کے ذریعے سے طے پاتا ہے ان شعبوں کے علاوہ ایسے امدادی اعضا بھی ہیں جیسے ماموریہ حکمہ داری، ماموریہ انیورن، ماموریہ حفظان صحت وغیرہ۔ انجمن کا موازنہ تقریباً ۱۶ کروڑ طلائی فرانک کا ہوتا ہے جو تقریباً ۲۵ ہزار طلائی فرانک کی تقریباً ایک ہزار اکائیوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر مملکت کو ان اکائیوں کا ایک خاص مجموعہ دینا پڑتا ہے۔ مثلاً برطانیہ کلاں کے متعلق ۱۰۸ اکائیاں ہیں، فرانس کے متعلق ۸۰، ہندوستان ۵۶، کناڈا ۳۵، اور بعض غیر اہم مملکتیں مثلاً لائیبریہ، اور بعض وسطی امریکی مملکتیں ایک ایک اکائی یا دس سے بھی کم ادا کرتی ہیں مثلاً

بین الاقوامی عدالت۔ جنگ عظیم کے بعد موافقہ انجمن اقوام کے چودھویں دفعہ کا اتفاق ہوا تھا کہ مجلس انجمن ایک مستقل بین الاقوامی عدالت کے متعلق تجاویز پیش کرے۔ لیکن اس عدالت کا قیام ۱۹۲۲ء تک عمل میں نہیں آیا۔ چونکہ اس عدالت کی موسس دستخط کنندہ مملکتیں تھیں نہ کہ انجمن اقوام بحیثیت انجمن کے، اس لئے عدالت پر (سوائے عادلوں کے انتخاب کے مسئلے کے) انجمن کو کوئی

تفوق حاصل نہیں، چنانچہ انجمن عادلوں کو برطرف نہیں کر سکتی، نہ اپنی قراردادوں کا انجمن کے ذریعے سے نفاذ کر سکتی ہے اور نہ عدالت کے قواعد میں کسی قسم کی ترمیم کر سکتی ہے۔ اس وقت بین الاقوامی عدالت میں پندرہ عادل ہیں۔ ان کا تقرر اس طرح ہوتا ہے کہ ہینگ کے مستقل محکمہ مفاہات میں جو مختلف ممالک کے طرف سے ارکان ہیں وہ امیدواروں کو نامزد کرتے ہیں اور انجمن اقوام کی جمعیت اور مجلس ان کا جدا جدا انتخاب کرتی ہیں اور ان امیدواروں کے حق میں دونوں مجالس زیادہ سے زیادہ رائے دیں وہ نو سال کے لئے منتخب ہو جاتے ہیں۔ باوجودیکہ عدالت میں ”نندن کے رسم اشکال اور دنیا کے خاص خاص قانونی نظاموں کی قائم مقامی ہونی چاہیے“ لیکن اس وقت تک اس کارکن نہ کوئی مسلمان ہوا ہے نہ ہندو۔ عدالت خود اپنا صدر اور نائب صدر کا انتخاب کرتی ہے اور اگر کسی مملکت کا کوئی معاملہ عدالت کے سامنے پیش ہو تو اسے موافق طور پر اپنا ایک عادل مقرر کرنے کا بھی اختیار ہے۔ عدالت کا ہر اختیار دو طرح کا ہے۔ اگر دو متنازع مملکتیں اپنی خوشی سے کوئی معاملہ عدالت کے سامنے پیش کریں تو ایسی حالت میں عدالت اس معاملے کو طے کرے گی اور پھر اس کی تجاویز پر فریقین کو عمل کرنا لازم ہوگا۔

۱۱۵ قانون عدالت، دفعہ ۲۔

۱۱۶ نام دستبرداشت ہندوستان اور انجمن اقوام: Ram and Sherna
India and League of Nations باب ۲۔

ساتھی، عدالت اپنی رائے ایسے معاملات کے متعلق مجلسِ اوجہیت کے سامنے پیش کر سکتی ہے جس کی بابت ان کی رائے طلب کی جائے۔ نیز اگر کوئی ملکیت "اختیاری دفعہ" پر دستخط کرے تو ایسی حالت میں عدالت کو جملہ امور متعلقہ پر خود بخود اختیار حاصل ہو جائے گا۔ وہ امور حسب ذیل ہیں: (۱) کسی عہد نامہ کی تعبیر (۲) قانونِ اقوام کے بابت کوئی مسئلہ (۳) کسی ایسے واقعہ کا وجود جس کی وجہ سے بین الاقوامی پیمانہ کی خلاف ورزی ہوئی ہو (۴) ایسی خلاف ورزی کی صورت میں ہرجہ کا تعین۔ ابتدا میں مختلف مملکتیں اس نوع کے دستخط کرنے سے ذرا ہچکچاتی تھیں لیکن اب بعض شرائط کے تحت ان مملکتوں نے اس فقرے پر دستخط کر دئے ہیں۔^{۱۱} بین الاقوامی عدالت کے لئے کوئی خاص قانونِ شخص نہیں ہے بلکہ قانونِ عدالت میں حسب ذیل مآخذ قانونی شمار کرنے گئے ہیں: (۱) بین الاقوامی مفاسم جن کے متعلق قواعدِ فریٹین تسلیم کر لیں (۲) شرائط مختلف النوع ہیں۔ برطانیہ نے جو دستخط کیے ہیں تو صرف ۱۰ سال کے لئے یا اسے مزید زمانے کے لئے جس کی برطانیہ اس کی ضرورت سمجھے۔ نیز اس کی رضامندی اس پر مشروط ہے کہ اس دفعہ کا اثر ان معاملات پر نہیں پڑے گا (۱) اگر زمین کوئی دوسرا طریقہ تسویہ معاملات کا نکال لیں (۲) اگر تنازعہ کسی ایسے رکنِ انجمنِ اقوام سے ہو جو برطانوی دولت عامہ اقوام کا رکن ہو (۳) اگر تنازعہ ایسے معاملات سے ہو جو بالکل سلطنت متحدہ کے متعلق ہیں۔

۱۱ "قانونِ عدالت"، باب ۳۸، حصہ پورک سچر کی کتاب "بین الاقوامی تنظیم"
 Yorks - Hedges: International Organization.

سے لیا گیا ہے۔ نیز ملاحظہ کر دے، باب ۷، بالا، حاشیہ ۱۹۔

(۲) بین الاقوامی رواج (۳) متمدن اقوام کے مسئلہ اصول قانونی (۴) بین الاقوامی نظائر (۵) مستند ترین متمدنوں کی تحریریں۔

مزدبی تنظیم۔ آخری بین الاقوامی ادارہ جس کا ایک طرح کا تعلق انجمن اقوام سے ہے بین الاقوامی تنظیم مزدبی ہے۔ اس کے متعلق دو ادارات ہیں، ایک تو بین الاقوامی مزدی کانفرنس اور دوسرے بین الاقوامی مزدی فیسٹر بین الاقوامی مزدی کانفرنس سال میں کم از کم ایک مرتبہ نشست کرتی ہے اور اس میں ہر کمن مملکت کے طرف سے چار وفد جاتے ہیں، دو حکومت کی طرف سے ایک آجروں اور ایک مزدوروں کے ناظم مقام کی حیثیت سے، موخر الذکر دو وفدوں کو بھی حکومت ہی مقرر کرتی ہے گواہیے ہی لوگ مقرر ہوتے ہیں جو آجروں اور مزدوروں کی انجمنوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ اس کی قراردادیں زیادہ تر سفارشات کی شکل میں ہوتی ہیں جن کی منظوری کے لئے کم از کم پانچ ارکان کی اکثریت ضروری ہے۔ اور اس کے بعد یہ مختلف ممالک کے حکومتوں کے سامنے بغرض توثیق پیش کی جاتی ہیں۔ مزدبی تنظیم کا ایک اہم عنصر حکومتی ادارہ ہے جس کے سپر مزدبی تنظیم کی عام نگرانی ہوتی ہے اور جو کانفرنس کے لئے پیش نامہ تیار کرتا ہے۔ آج کل اس ادارے کے ۳۲ ارکان ہیں جو ایسی مملکتوں سے لئے جاتے ہیں جن کی ”صنعتی اہمیت“ دوسری مملکتوں سے زیادہ ہے۔ بین الاقوامی مزدی دفتر بین الاقوامی مزدبی تنظیم کی گویا متمدنی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اس کے ناظم کو ”حکومتی ادارہ“ مقرر کرتا ہے اور اسے علمہ کے تقرر کے وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

بین الاقوامی مزدی تنظیم کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ ایک بین الاقوامی مزدی اخلاقی معیار قائم کیا جائے اور اس قسم کے قواعد بنائے جائیں جن کی وجہ سے آجروں اور مزدوروں کے معاملات میں انجمنی پیدا نہ ہو۔ مفہمہ انجمن اقوام میں ایسے معاملات کی ایک مختصر فہرست بھی دی ہوئی ہے جیسے کارکردگی کے گھنٹوں کا تعین، بے روزگاری کا انسداد، مزدور بچوں اور عورتوں کی حیثیت، بے روزگاری اور مرض کا بیمہ وغیرہ۔ لیکن جیسا زمانہ گزرتا جاتا ہے مختلف ملک اپنے اپنے نظریے قائم کرتے جاتے ہیں۔ دسبے ہی اس قسم کے بین الاقوامی ادارے کا اثر بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں تنظیم زیادہ تر مزدوروں کی غالیبت کو روکنے کی غرض سے قائم ہوئی تھی، لیکن ایک طرف تو آئی اور جرمنی نے اس غالیبت کو روکنے کے لئے اپنے اپنے لئے جدید طریقے رائج کئے اور دوسری طرف روس جیسے ملک کے مزدی معاملات پر ایسے بین الاقوامی ادارے کا اتہاد ہی سے اثر کم ہوتا گیا۔ نیز جو کچھ بھی اس بین الاقوامی تنظیم کی کارگزاری ہو سکتی ہے وہ محض سفارش کی خدمت ہو سکتی ہے اور ان سفارشوں کو بروئے کار لانا نہ لانا مختلف ملکوں کا اپنا کام ہے جس پر سوائے اخلاقی اثر کے کسی دوسرے طریقہ کا اثر موجودہ حالات کے تحت ممکن نہیں۔

حکمرانی اور رائیسی۔ جنگ عظیم سے پہلے جو نہیں ہوئی تھیں اس میں غالب فریق اپنے دشمن کو زیر کرنے کے بعد اسے اپنا ماتحت بنا لیا کرتا تھا۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران میں کچھ ایسا ماحول پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے اس طریقے کو تبدیل کرنا پڑا۔ جب روس نے ۱۹۱۷ء میں زار کو تخت سے اتار کر ایک جمہوریہ قائم کیا تو

اس نے اعلان کیا کہ ہم جو صلح کریں گے اس میں نہ تو کسی ملک کا الحاق کریں گے اور نہ خیرہ جنگ وصول کریں گے، تو اتحادیوں میں بھی یہ سوال پیدا ہو گیا کہ جنگ حق کے بول بالے کے لئے لڑی گئی ہے اور یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ مغلوب کو بالکل کھل ڈالا جائے، ورنہ اس سے ہماری خود غرضی ظاہر ہوگی۔ جنگ کے بعد آسٹریا کے تو حصے بخرے کر دئے گئے اور وسطی یورپ میں بجائے تیرہ تائی تقون کے اسلامی اقوام کو تیرہ تائیوں پر فوقیت دیدی گئی۔ لیکن جب جرمنی اور ترکی علاقوں کا سوال پیدا ہوا تو دولت محسوس ہوئی۔ اس لئے کہ اول تو الحاق کے مسئلہ لے ایک نئی شکل پیدا کرتی تھی اور پھر دول اتحاد کے باہمی معاملات میں جو الجھاؤ زار روس کے خاتمہ پر پیدا ہوا تھا اس کے اور بھی زیادہ بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ انرض بہت غور فکر کے بعد جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم جنرل سمٹس نے اس طرز کار کی تحریک کی جو نظام حکمرانی نام سے موسوم ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو انتطاع یا ممالک اتحادیوں نے اپنے دشمنوں سے ایسیا اور افریقہ میں فتح کئے ہیں وہ ان سلطنتوں میں تقسیم نہ کئے جائیں بلکہ کسی نہ کسی زیادہ ترقی یافتہ قوم کے زیر ہدایت (یا زیر حکمرانی) کر دئے جائیں۔

اسی اصول کو مد نظر رکھ کر موافقہ انجمن اقوام کی دفعہ ۲۲ کی رو سے یہ قرار پایا کہ ایسے علاقوں کو جو جنگ عظیم کی وجہ سے اپنے قدیم سلطنتوں کے ماتحت نہیں رہے اور جو فی الحال اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہو سکتے، انھیں ایسے "ترقی یافتہ ممالک کے تو لیت میں رکھا جائے جو اپنے وسائل، اپنے تجربہ، یا اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لے سکتے ہوں

اور جو اس ذمہ داری کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں، اور یہ ملک فریض تولیت کو انجمن اقوام کی جانب سے ادا کریں۔ تفویض تین نوع کی قرار دی گئی۔ ان علاقوں میں سب سے ترقی یافتہ وہ علاقے تھے جو سلطنت عثمانیہ کے جزو رہ چکے تھے اور اس بدنام سلطنت نے ان کی ترقی میں کوئی دقیقہ فرو گذا نہیں کیا تھا، چنانچہ ایسے علاقوں کو تفویض الف قرار دیا ہے اور یہ طے پایا کہ انھیں موثری طور پر خود مختار تصور کیا جائے گا اور صرف یہ شرط لگائی جائے گی کہ صاحب تفویض ملک اپنی صلاح اور مدد ملک مفوضہ کو دیا کرے گا۔ ان شرائط کے تحت فلسطین اور عراق برطانیہ کلاں کو اور ملک شام فرانس کو تفویض کیا گیا۔ تفویض ب میں وسطی افریقہ کے وہ علاقے شامل کئے گئے جنھیں اہل تفویض ملک کو یہاں کی حکومت کا ذمہ دار قرار دیا گیا بشرطیکہ یہ متولی ملک ”ضمیر اور مذہب کی آزادی کی حفاظت کرے، ایسے افعال شنیعہ جیسے غلامی، تجارت اسلحہ اور تجارت مسکرات کا انسداد کرے کسی قسم کے قلعہ بندی یا دسیوں کو فوجی قواعد سکھانے سے احتراز کرے، ساتھ ہی دوسرے ملک کے آزاد تجارت میں خلل نہ ہو۔“ ان شرائط کے تحت ”لنگن ریک“ برطانیہ کلاں کو، ”رواندا اردن“ بلجیم اور کامے رون و لوگستان برطانیہ کلاں اور فرانس کو تفویض کئے گئے۔ تیسرے وہ علاقے تھے جو جنوب و مغربی افریقہ اور بحر الکاہل میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کے ”قلیل رقبہ اور قلیل آبادی مراکز تمدن سے بچد یا متولی ملک کے قرب کی وجہ سے“ یہی

مناسب سمجھا گیا کہ انھیں اہل تفویض ملک کا جزو تصور کر کے اسی کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت کر دیا جائے بشرطیکہ ایسی آبادیوں کے متعلق ان شرائط پر عمل کرے جو تفویض ب کے تحت مذکور ہیں۔ اس تفویض کو تفویض ج قرار دے کہ جنوبی مغربی افریقہ کو اتحاد جنوبی افریقہ کے متعلق، مغربی سامرا کو نوڈیستان کے متعلق، نیوگنی کو آسٹریلیا کے متعلق، جزیرہ ناؤرو کو برطانیہ کلال کے متعلق اور بحر الکاہل کے باقی ماندہ جزائر کو جاپان کے متعلق قرار دیا گیا۔

حکمرانوں کے متعلق یہ اصول قرار پایا کہ سر حکمران مجلس انجمن کے سامنے ہر سال ایک رپورٹ کارکردگی پیش کرے گا اور مجلس ایک مشعل، ماموریت نام کرے گی جس کا کام یہ ہوگا کہ ان رپورٹوں پر غور کرے اور مجلس کے سامنے اپنی سفارش پیش کرے۔ یہ امر قابل لحاظ اور نہایت اہم ہے کہ فلسطین کے ناظرین حکمرانی میں اس حکمت عملی کے الفاظ شامل کر رکھے گئے ہیں جس کا سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں لارڈ بالفور نے اعلان کیا تھا اور جس کی رو سے فلسطین کو یہودیوں کا "قومی وطن" بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے لئے ایک یہودی ایجنسی کو اس کا مختار گردانا گیا ہے کہ وہ حکومت فلسطین کے ساتھ تعامل کرے اور یہودی قومی وطن کے قیام کے لئے آسانیاں بہم پہنچائے۔ اس طرح اس کے تحت فلسطین میں یہودیوں کی آبادی جہاں ۱۹۱۷ء میں ۵۱ ہزار تھی، ۱۹۳۶ء کے مردم شماری کی رو سے ایک لاکھ کے قریب ہو گئی تھی۔ لاکھ اور اب تین لاکھ فلسطین کی تفویض کے احکام اور کب بھیجیں تھے کے طور پر دئے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء سالانہ ممبرین ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء، ۱۹۵۰ء (بقیہ خانیہ صفحہ ۵۷۳ پر)

سے زیادہ ہے جو ایہ کہ تمام یورپی ملکوں میں متحمل یہودیوں کی ایک بڑی تعداد
 تھی جو اپنے ان ہم مذہبوں کو جن کی کسی وجہ سے ان کے ممالک میں کھپت
 نہیں ہو سکتی تھی، فلسطین جانے اور وہاں آباد ہونے کے لئے رقم مہیا کرتے تھے
 الغرض بہت جلد یورپ کے تمام ممالک کے یہودی جن کے لئے کہیں ٹھکانا
 نہ تھا، فلسطین آنے شروع ہو گئے اور اپنے روپیہ کے زور سے یہاں
 مسلمانوں اور عیسائی عربوں کو آراضیات سے بے دخل کرنا شروع کیا جس کا
 نتیجہ وہ بے چینی اور بد امنی ہے جس کی ابتداء ۱۹۳۶ء کی طرماں سے ہوئی
 اور جس کے باعث اس وقت تک فلسطین بڑے مار، قتل و غارت کا شکار ہو رہا ہے
 کئی مائورے اور کانفرنسیں ایسے حد سخت گہریاں، پھانسیاں، کورٹ مارشل
 خدایاں اور روپیہ ان میں سے کوئی بھی فلسطینی عربوں کو اپنا ملک یہودیوں کے
 حوالہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکے۔

دقیقہ حاشیہ ۵۷۳، حسب ذیل جدول سے موجودہ صورت حال معلوم ہو جائے گی۔

| ۱۹۰۹ء | ۱۹۳۱ء | جون ۱۹۳۷ء |
|-----------------|---------|-----------|
| کل آبادی فلسطین | ۶۷۵۰۰۰ | ۱۰۳۰،۵۳۸ |
| یہودی | ۱۵۰،۰۰۰ | ۲۸۶،۰۸۴ |

اس طرح ۱۸ برس میں یہودیوں کی آبادی بیس گنی سے زیادہ ہو گئی ہے اور جہاں
 ۱۹۰۹ء میں یہودی اور جملہ آباری کا تناسب اور ۲۰ تھا اب وہ آبادی کا تقریباً چوتھا
 حصہ بن گئے ہیں۔

بہر حال اصول حکمرانی کا دار و مدار انجمن اقوام پر ہے، لیکن انجمن اقوام کے اثر کے زوال کے ساتھ ساتھ یہ علاقہ جات، خصوصاً انٹلیٹس، کئے بوج، براہ راست مقبوضات کی نوعیت اختیار کرتے جاتے ہیں، چنانچہ جاپان، جواب انجمن اقوام کا رکن نہیں رہا، پہلے کی طرح جزائر مغوضہ پر قابض ہے اور انھیں چھڑانے کا نام نہیں لیتا۔

انٹلیٹوں کے تمدنی تحفظ کا مسئلہ چند سال پیشتر اہم تھا۔ لیکن اب جب آسٹریا اور جنو سلوفاکیہ کا جرمنی میں الحاق ہو گیا ہے اور دوسرے ملکوں کی وہ جرمن اقلیتیں جن کے مفاد کو انجمن اقوام نے اقلیتی عہدناموں کے ذریعے سے محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی، اغلباً جرمنی کے ماتحت آجائیں گی یا کم از کم ان کا جرمنی ضامن ہو جائے گا، لہذا اس مسئلہ کی شکل اب بدل گئی ہے۔ انجمن اقوام کے عروج کے زمانے میں بھی باوجودیکہ مجلس انجمن کے سامنے خلاف درندہ عہد نامہ جات کے متعلق متعدد درخواستیں گزریں لیکن چونکہ ارکان محض کسی اقلیت کے خاطر کسی آزاد مملکت سے دشمنی مول لینا نہ چاہتے تھے اس لئے کبھی ان شکایتوں کے ازالے کے لئے انجمن نے فریق ثانی پر کبھی اثر نہیں ڈالا۔

۵۷۴ وسط وسطیٰ میں یورپی اقلیتوں کی ایک کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی جس میں بچیم، ڈھارک، اسٹونہ، لیٹویہ، لیتوانیہ، پولستان، رومانیہ، چیکو سلوفاکیہ، یوگوسلاویہ، اٹلی اور ہنگری کے جرمن، رومانیہ اور چیکو سلوفاکیہ کے ہجرا، اٹلی اور آسٹریا کے اسلانی (لقبہ حاشیہ ۵۷۴ پر)

تہدیدیں۔ اب صرف تہدیدوں کا ذکر باقی ہے جو اپنی جنگ جہنم کے زمانے میں خاص طور پر نمایاں ہو گئی تھیں۔ تہدیدیں دراصل موافقہ انجمن اقوام کے دفعہ ۱۶ کے تحت آتی ہیں، لیکن اس سلسلہ میں دفعات ۱۲ تا ۱۵ اور دفعہ ۱۷ کا ذکر بھی مناسب ہے۔ چونکہ انجمن اقوام کے پاس کوئی ایسی مرکزی ہیئت نہیں تھی جو کسی خطا کا مملکت کو سزا دے سکے اس لئے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس قسم کی کل اختراعات کی جائے جس سے جملہ ارکان انجمن خطا کا مملکت کو مجبور کر سکیں کہ وہ موافقہ انجمن اقوام کی خلاف ورزی نہ کرے۔ دفعہ ۱۲ کا منشاء یہ ہے کہ اگر دو ارکان کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ چھڑ جائے جس سے نقص امن کا اندیشہ ہو تو ان پر لازم ہو گا کہ وہ یہ تنازعہ ثالثوں یا بن اتوامی عادلوں کے سپرد کریں گے اور تجویز کئے تین ماہ بعد تک آپس میں جنگ نہ کریں گے۔ دفعہ ۱۳ میں ایسے جھگڑوں کا ذکر ہے جو معمولی تدبیر کے ذریعے سے طے نہ پاسکیں لیکن جنہیں فریقین اس قابل سمجھتے ہوں کہ وہ ثالثی یا عدالت کے ذریعے سے طے ہو سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ ثالثی یا عدالت کے سامنے پیش کر دئے جائیں گے۔ ارکان انجمن نے اس کا وعدہ کیا کہ جو فریق تجویز ثالثی یا تجویز عدالت کے موافق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۴۵) باختر سے شریک ہوئے تھے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ عہد نامہ دہائی کے بموجب وسطی یورپ کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی ان اقلیتوں پر مشتمل تھی۔ لطف یہ ہے کہ ان میں خود جرمنی کے یہودیوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا حالانکہ یہ اقلیت آج کل دنیا کی سب سے مظلوم اقلیتوں میں سے ہے۔

عمل کرے گا اس کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔ دفعہ ۱۵ کے مطابق کسی ایسے تنازعے کی صورت میں جس میں نقص امن کا اندیشہ ہو، کوئی رکن اس مسئلے کو مشعد اعلیٰ کے ذریعے سے مجلس کے سامنے پیش کر سکتا ہے جس پر مجلس فریقین کے درمیان سمجھوتے کے لئے کوشش کرے گی، اور اگر سمجھوتہ نہ ہو سکے تو تمام واقعات اور انہی تجاویز کو شائع کر دیگی۔

اگر کوئی مملکت دفعات ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵ کے اصول سے رد گردانی کرے تو یہ خیال کیا جائے گا کہ اس نے انجمن کے باقی ماندہ جملہ اراکان کے خلاف جنگ کی ہے چنانچہ باقی ماندہ جملہ اراکین انجمن نے اس کا اقرار کیا کہ وہ اس خاطی مملکت سے اپنے تمام تجارتی یا مالی تعلقات منقطع کر دیں گے، اپنے شہریوں اور خاطی مملکت کے شہریوں کے درمیان ہر قسم کے راہ در سہم کو ممنوع قرار دیں گے اور ہر طرح کے مالی، تجارتی یا ذاتی رسل و رسائل کو مسدود قرار دیں گے خواہ خاطی مملکت رکن انجمن ہو یا نہ ہو، نیز مجلس کا فرض تھا کہ ہر حکومت متعلقہ کو سفارش کرے کہ وہ فوجی، بحری یا ہوائی فوج اس خاطی مملکت کی سرکوبی کے لئے مہیا کرے۔ موافقہ اس سے بھی آگے بڑھنا ہے، اور دفعہ ۱۵ میں اس کا اعلان کرتا ہے کہ اگر تنازعہ کے ایک یا دونوں فریقوں میں سے کوئی فریق رکن انجمن نہ ہو تو ایسی صورت میں ان شرائط کو تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے گی، اور اگر دعوت قبول کر لی جائے تو ایسی حالت میں دفعات ۱۲ یا ۱۶ تک کا نفاذ ان ملکوں پر بھی ہو جائے گا۔ اگر کوئی مملکت جو رکن نہ ہو کسی رکن مملکت کے خلاف فوج کشی کرے تو اراکان انجمن دفعہ ۱۶ کا نفاذ اس پر کر دیں گے یعنی جملہ

تعلقات منقطع کر دیں گے۔

انجمن اقوام کا ارتقا۔ یہ انجمن اقوام کا ڈھانچا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کے ہولناک واقعات کے بعد یہ ایک فطری امر تھا کہ جنگ کے اصول سے دنیا اپنی کامل بیزاری کا اعلان کرے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کرے کہ آئندہ کے لئے جنگ کے خلاف وعدہ وعید کئے جائیں بلکہ چند ملکوں کی اصول مساوات اقلیتوں کے تمدنی تحفظ انجمن اقوام کی زندہ نگرانی میں تفویضوں کے عمل، قومیت کے اصول کو مد نظر رکھنے، اور سب سے زیادہ یہ کہ جس طرح کسی مملکت میں قانون کی تہدیدیں ہوتی ہیں ایسی نوع کی بین الاقوامی نگرانی میں تہدیدوں کے سلسلے کو قائم کرنے سے مدد بریں بعد از جنگ نے یہ تصور کر لیا کہ اب دنیا عمومیت کے لئے محفوظ ہے اور جنگ کا ہمیشہ کے لئے انسداد ہو گیا ہے۔ گو حالات اور واقعات نے مساعدت نہیں کی کہ کسی قسم کا بین الاقوامی لشکر بنایا جاتا، لیکن تہدیدوں کے سلسلے میں اس صورت حال کو ممکن تصور کیا گیا کہ خطا کار مملکت کے خلاف جملہ ارکان انجمن مکمل مقاطعہ کریں جس میں انفرادی مقاطعہ بھی شامل ہے، ہر قسم کے رسل و رسائل منقطع کر دیں اور ضرورت پڑے تو اپنے اپنے حصہ رسدی لشکر بھیجا کر کے غلطی مملکت کو سر جھکانے پر مجبور کر لیا۔

ابتداء میں یعنی تقریباً اس وقت تک جب تک لوگوں کو جنگ کے مہیب نتائج یاد تھے، انجمن اقوام کی کل خوب چلتی رہی۔ انجمن محض اتحادی فاشیوں کی انجمن تھی، جس میں غیر جانبدار مملکتیں دعوت دے کر شریک کی گئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ

استدوانانہ سے جب دشمنی کا احساس کم ہوا اور یورپ نے اپنی صحیح حالت کا اندازہ لگایا تو آسٹریا کو ۱۹۲۰ء میں، مجارستان کو ۱۹۲۱ء میں، بلغاریہ کو ۱۹۲۲ء میں، جرمنی کو ۱۹۲۳ء میں اور ترکی کو ۱۹۲۴ء میں انجمن اقوام میں شریک کر لیا گیا۔ روس ۱۹۳۶ء تک شامل نہیں ہوا، اگر اس سے پہلے بھی مختلف کانفرنسوں، مثلاً سنساری معاشری کانفرنس اور بے اسٹوکی کانفرنس میں وہ اور ملک متحدہ امریکہ جو اس وقت تک انجمن اقوام کا رکن نہیں بنا، اپنے اپنے قائم مقام درانہ کرتے تھے۔ جب تک جنگ کے خلاف جوش رہا انجمن اقوام نے واقعی متحدہ جھگڑے طے کئے جن میں سے روس اور سوئیڈن کے درمیان جزائر آ لینڈ کا معاملہ ۱۹۲۱ء میں، تونس اور مراکش کی توسیع کا مسئلہ فرانس اور انگلستان کے درمیان ۱۹۲۳ء میں، موصول کے مسئلہ کا تصفیہ ترکی اور انگلستان کے درمیان ۱۹۲۳ء میں اور یونان و بلغاریہ کے درمیان جنگ کے خطرے کا انداد ۱۹۲۳ء میں، سب سے نمایاں واقعات ہیں۔ نیز وہ مشہور عہد نامے جن میں لوکارنو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، یہ بھی ۱۹۲۵ء ہی کا کارنامہ ہے، ان عہد ناموں پر جرمنی، ہجیم فرانس، اٹلی، پولستان اور چیکو سلوفاکیہ کے دستخط تھے اور ان کا مقصد یہ تھا کہ اس سال میں جو بھی سرحدیں مختلف ممالک کی مقرر ہیں، خواہ وہ کسی طرح سے بھی چال ہوئی ہوں، ان کی ضمانت و تحفظ کنندہ مملکتیں کرتی ہیں۔

تقریباً دس سال تک یعنی کم و بیش ۱۹۲۵ء تک تو جوش خروش کا یہی عالم رہا۔ لیکن اس کے بعد انجمن اقوام اور بین الاقوامیت کا ستارہ گردش میں آجاتا ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں رد عمل کی ابتدا ہوئی ہے اور ایک طرف تو روس میں

بوشیوی طرز حکومت مستحکم ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اٹلی اور جرمنی میں بجائے
 بین الاقوامی سیاست کے خالی توڑ پرستی پیدا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ مسکونی اور چند سال
 بعد شہر کی شخصیتیں نمایاں ہو جاتی ہیں جن کا سب سے اہم پیش نامہ یہ ہے
 کہ اٹلی اور جرمنی طاقتور بنایا جائے اور کسی دوسرے ملک کے مفاد کی یا کسی
 عہد نامے کی، اگر یہ مفاد یا عہد نامہ قومی ترقی کی راہ میں حائل ہو، پرواہ نہ کی جائے۔
 انجمن اقوام کی بے بسی کا سب سے پہلا مظاہرہ مشرق اقصیٰ میں ہوا جب
 بغیر کسی غائبی بہانے کے جاپان نے ایک دوہرے رکن انجمن اقوام یعنی چین
 کے پیچورچی صوبوں پر بڑا شمشیر قبضہ کر لیا اور جب انجمن اقوام نے چین کی استدعا
 پر ایک مامور کو تفتیش واقعات کے لئے پیچوریا روانہ کیا اور اس نے جاپان کے
 خلاف فیصلہ صادر کیا، تو بجائے اس کے جاپان اس تصفیہ کے مطابق عمل کرے
 اس نے انجمن سے علیحدگی کے لئے دو سال کا نوٹس دے دیا اور علیحدہ ہو گیا۔
 جاپان نے یہ بھی کہا کہ گوچین انجمن اقوام کا رکن ہے لیکن وہ تمدن کے اس مبدیہ
 کو نہیں پہنچا جو تمدن اقوام کے خاندان کا ایک ذرہ بننے کے لئے ضروری ہے
 چنانچہ اس کی حد تک انجمن اقوام کا موافقہ کارآمد نہیں۔ یہ صورت حال پیچوریا پر
 قبضہ کر کے کے وقت تھی ۱۹۳۷ء میں بغیر کسی مزید بہانے یا ضابطہ پرستی کے
 جاپان نے دوبارہ چین پر حملہ کر دیا، لیکن اس مرتبہ چین نے کسی ہمدردی کی شکست
 یا انجمن اقوام سے اپیل نہیں کی اور خود وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں
 مبتلا ہے۔ جس کو ”رہنما“ ہٹلر نے اس تمام اسس ہی کو اکٹھا کر پھینک دیا
 جن پر انجمن اقوام مبنی تھی، یعنی عہد نامہ ویرسائی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے آپ کو

جرمن فوج، پڑے اور فضائیہ کا کلیہ مختار کر لیا اور یہ کہہ کر کہ عہد نامہ ویرسائی کے مطابق صرف جرمنی ہی کو نہیں بلکہ تمام دل کو اسلو میں کمی کرنی چاہئے، انجمن اقوام سے علیحدہ ہو گیا۔ انجمن اقوام کی بے بسی یا دہلی کا حقیقی مظاہرہ جنگ جہشتہ کے دوران میں ہوا۔ یہ شخص جانتا تھا کہ آئی جہشتہ پر یلغار کرنے کے لئے جہاز پر جہاز، جو اسباب خورد و نوش آلات جنگ اور طیاروں سے لہے ہوئے تھے، مہینوں سے نہر سوئیس میں ہو کر لئے جا رہے ہیں، لیکن کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اسے اس سے روکے، اور جب جہشتہ نے (جو خورا انجمن اقوام کا رکن تھا) تہذیبیں عائد کرنے کے لئے الحاح و التجا کی تو انجمن اقوام کے مجلس اور اسمبلی نے کمیٹیوں پر کمیٹیاں بٹھانے پر اکتفا کیا۔ ادھر تو کمیٹیاں مباحثہ کر رہی تھیں اور دھر جہشتہ کا خون جو سا جا رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ ایسی تہذیبیں عائد کی جائیں جن کا بن اثر پڑے، زیادہ تر زبانی جمع خرچ کو کافی تصور کیا گیا۔ اور جب یہ خواہش کی گئی کہ تیل اور پٹرول کو رد کیا جائے گا تو مسکو نے صاف کہہ دیا کہ جو ہمارے تیل پٹرول کو روکے گا اسے ہم اپنا دشمن تصور کریں گے۔ جہشتہ فتح کر لیا گیا اور انجمن

جہشتہ جو تہذیبیں جنگ جہشتہ کے دوران میں عائد کی گئیں وہ اسلحہ اور دوسرے کے درآمد و برآمد کے متعلق تھیں۔ لیکن تہذیبوں سے مہینوں پہلے ہی آئی نے جس قدر سالانہ جنگ فراہم کرنا تھا اس میں سے اکثر فراہم کر لیا تھا۔ پھر ایک طرف مالک متحدہ امریکہ، جاپان اور جرمنی تو انجمن میں شریک ہی نہ تھے، البانیہ، آسٹریا اور ہنگری نے، جو لیگ میں شریک تھے، ان کی کے مخالفت کر کے سے انکار کر دیا۔ الغرض اول تو تہذیبیں ویسے ہی معتدل تھیں (بقیہ فیصلہ)

اقوامِ متحدہ کی بیٹھی رہ گئی۔ اس کے بعد انجمنِ اقوامِ بالکل بے بس ہو جاتی ہے۔ اسپین میں غارتگری ہوئی ہے اور جرمن و اطالوی ایک طرف تو روس زینِ مخالف کی طرف علی الاعلان مدد کرتا ہے۔ جرمنی پہلے آسٹریا پھر سوڈن کی علاقہ اس کے بعد پورا چیخوسلوواکیہ اور میل، اور آٹمی البانیہ پر قبضہ کر لیتا ہے، لیکن انجمنِ اقوام جس میں آسٹریا، چیخوسلوواکیہ، یوگوسلاویہ اور البانیہ سب ہی شریک تھیں، بیٹھی کی بیٹھی رہ جاتی ہے اور چھٹکی نہیں اٹھا سکتی تیسرے

حقیقت یہ ہے کہ جیسا ایک ممتاز مورخ کہتا ہے جب ایک لیگ اس پرستی ہوئی ہو کہ خواہ کچھ بھی ہو، جنگ آزمانی کی جائے تو پھر کوئی دوسری لیگ یا انجمن جنگ کو روک نہیں سکتی تیسرے انجمنِ اقوام کی تنظیم کو ۸ برس ہو گئے اور ایک ایسی نسل اب جوان ہو گئی ہے جو جنگ کی ہولناکیوں سے مطمئن واقف نہیں۔ دسویں یورپ، خصوصاً جرمنی یہ تصور کئے ہوئے ہے کہ اس پر شدید مظالم ڈھائے گئے

(لقبہ عاشر صفحہ ۱۱۳) اور پھر ان باتوں کی وجہ سے وہ بالکل ہی بے نتیجہ ہو گئیں۔ اس بحث کے لئے دیکھو Foreign Affairs، جنوری ۱۹۳۲ء، صفحہ ۳۵۲ مضمون بورن "تہدیدیں کیسے ناکام ہوئیں" Born: How Sanctions failed. ۱۹۳۲ء کے لئے انجمنِ اقوام کا موازنہ تقریباً ۱۵ لاکھ پونڈ یعنی دو کروڑ روپہ کا ہے جس میں سے ہندوستان کو تقریباً ۵ لاکھ روپہ دینا پڑے گا۔

۱۹۳۲ء پیمارڈ، صفحہ ۱۱۳۔

گئے ہیں۔ مطلق العنان اسٹی جا رہا ہے کہ جیسے سلطنت روما کے زمانہ میں بحیرہ
 روم اور بحیرہ احمر میں رہیں بھیلین بن گئے تھے ویسے ہی اب وہ اطالوی بھیلین
 بن جائیں۔ یہ محض اپنی قوت اور دھمکیوں اور معاہدہ ٹسکینوں کے بل بوتے پر
 انجمن اتوام کے علی الرغم اپنا حلقہ اثر وسیع کر رہے ہیں۔ تاآنکہ جرمنی تمام وسطی
 یورپ پر چھا گیا ہے اور اس کی بھی روز بروز زیادہ قوی ہوتا جاتا ہے۔ ان دونوں
 اور جاپان نے طعنے دیکر مخالفت کر کے اور کامیابی کے ساتھ دنیا سے اپنا کہنا
 منہ کر لیکن اتوام کو مغلوب کر دیا ہے اب تو سب سے بڑے پشت پناہ یعنی
 برطانیہ اور فرانس بھی ایک طرح سے صبر کر کے بیٹھ رہے ہیں۔

Law of International

ضمیمہ باب ۲

بین الاقوامی قانون کے چند نکات

(الف) بڑا نامہ امن - قائم مقام - حق مداخلت - سمندر پر حقوق - (ب) بڑا نامہ جنگ
(۱) فریقین جنگ - اعلان جنگ - جنگ آزمائوں کی تعریف جنگی تشدد کے حقوق -
محاصرے اور بیماری - جنگی تیدی - جاسوس - زخمی اور بیمار - دشمن کی املاک -
خاتمہ جنگ - (۲) غیر ضمیمہ دار - جنگی ممنوعات - ناکہ بندی - غیر ضمیمہ داری -
غنیمت - خاتمہ

(الف) بڑا نامہ امن

قائم مقام - امن کے زمانے میں عام طور پر ہر مملکت دوسری مملکتوں
میں جن سے اس کے تعلقات ہوں، اپنے قائم مقام رکھتی ہے۔ اگر کسی مملکت

۱۵ اس ضمیمہ کا بیشتر حصہ لارڈ برکن ہیڈ کی کتاب "بین الاقوامی قانون" Lord
Birkenhead, International Law. افواج ششم ۱۹۲۶ء

سے مختص ہے۔

حال میں جو بین الاقوامی حالات رونما ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۳ پر)

کا قائم مقام کوئی شخص مقرر ہو جو اس دوسرے ملک میں پسند نہ کیا جاتا ہو، تو ایسی صورت میں یہ دوسرا ملک اس قائم مقام کو واپس کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو مقرر کیا جائے۔ غیر سلطنتوں کے قائم مقاموں کی ذمہ داری کی جاتی ہیں یعنی (۱) تدبیری قائم مقام اور (۲) تفصل۔ تدبیری قائم مقام تین طرح کے ہوتے ہیں، (۱) سفرا، جو اپنی حکومتوں اور ان کے معاملات کی نمائندگی کرتے ہیں (۲) ایلچی اور دہلائے اختیار جو غیر حکومتوں کے پاس بھیجے جاتے ہیں (۳) دہلائے مصالح جو سلطنتوں کے وزرائے خارجہ کے پاس روانہ کئے جاتے ہیں۔

یہ سب قائم مقام اپنی واپسی تک قطعاً محفوظ سمجھے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر دونوں ملکوں کے درمیان جنگ بھی چھڑ جائے تو بھی یہ اپنے ملک تک پوری حفاظت سے بھیجے جائیں گے۔ عام طور پر ان کے غلاف کوئی مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا، گودیوانی معاملات میں علی العموم سفیر کی ذاتی جابدا بھی ماموں تصور کی جاتی ہے۔ نیز ان پر کسی قسم کا محصول عائد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انھیں ملک کے اندرونی معاملات میں کسی طرح کی مداخلت کی قطعی ممانعت ہے۔

(تقریباً حاشیہ ۵) ان کی وجہ سے بین الاقوامی قانون کی وقعت بالکل نہیں رہی۔ یہ حصہ ۱۹۳۷ء کا لکھا ہوا ہے لیکن باوجود حالات کے بدل جانے کے دلچسپی اور سبق آموزی کی خاطر اسے تقریباً حسب سابق رہنے دیا گیا ہے۔

۵۸ لیکن اس قاعدے کی پابندی صرف اسی وقت کی جاتی ہے (تقریباً حاشیہ ۵۸ پر)

فصل محض تجارتی عمل میں اور ساتھ ہی اپنے ہم ملک باشندوں کو مختلف معاملات میں صلاح دیتے ہیں۔ نیز ان کے سپرد غیر ملک میں اپنے ہم ملکوں کی فوجی پیدائش کے رجسٹر بھی ہوتے ہیں۔ چند سال پیشتر تک یورپی تفصیلات کو بعض مشرقی ممالک میں پر مکی "اختیارات حاصل تھے، لیکن ان اختیارات کا ۱۸۹۹ء میں جاپان میں، ۱۹۲۳ء میں ترکی میں اور ۱۹۳۹ء میں ایران میں خاتمہ ہو گیا، اور اب یہ صرف چین اور سیام میں تھوڑے بہت موجود ہیں۔ تفصیل نہ بری قائم مقام کے برابر مامون نہیں سمجھے جاتے، چنانچہ ان پر دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مفادے چلائے جاسکتے ہیں لیکن ان پر محصول عائد نہیں کیا جاتا اور نہ انھیں گزیدہ پنہنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ کوئی دوسرا پیشہ نہ کرتے ہوں۔

حق مداخلت۔ یہ حق اس اصول پر مبنی ہے کہ اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کی آزادی میں مغل ہونا جائز ہے۔ اسی اصول کے بموجب پچھلی جنگ عظیم میں جرمنی نے بحییم اور انگریزوں اور علیقوں نے یونان میں مداخلت کی بعض ملکوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ ہم دوسرے ممالک کے معاملات میں "نبی نوع انسان کے مفاد" کی خاطر مداخلت کرتے ہیں، لیکن اس طرز عمل کا اصل اصول اکثر خود انہی ہی بھلائی ہو تا ہے نہ کہ نبی نوع انسان کا مفاد۔ بعض مرتبہ جب

(نقیہ حاشیہ ۵۸۵) جب ایک مملکت کا دوسری مملکت پر کسی قسم کا دباؤ نہ ہو۔ حال میں جاپان نے اپنی معاملات میں مسلسل غلطیوں کی ہیں اور ان کے زمانے میں بنیادی معقول سبب کے محض دباؤ ڈال

عہدہ داروں تک کو بدلوادیا ہے۔

۵۸۵ نمبر دوسرے دعووں کے جو اٹنی نے حبشہ کے خلاف کئے، ایک یہ بھی تھا کہ حبشہ متحدہ (نقیہ حاشیہ ۵۸۵) پر

کسی ملک میں خاندانی جگہ ہوتی ہے تو طاقتور اقوام یا وہ قومیں جو اپنا اقتدار بڑھانا چاہتی ہیں، اس ملک میں مداخلت کرنے لگتی ہیں۔ اس کی بابت یہ تصور کرنا چاہئے کہ اگر یہ مداخلت صرف ایک فریق کے دعوت کی وجہ سے ہے تو یہ قابل اعتراض ہے، اس لئے کہ اس سے گریہ ملک کی اندرونی حکمت عملی میں مداخلت کی گئی، لیکن اگر فریقین کسی ملک کی مداخلت کی..... دعوت دیں تو مداخلت نامناسب نہ ہوگی بلکہ

سمندر پر حقوق۔ اب یہ مسئلہ ہے کہ سمندر تمام اقوام کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ساحل پر اب تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ساحل سے تین میل تک کا سمندر ساحلی ملک کا ایک حصہ ہے اور ساحلی ملک اس میں دوسروں کے جہازوں کے آنے جانے کا جو انتظام چاہے کر سکتا ہے۔ ایسے دریاؤں، بھیلوں اور خلیجوں کے لئے جو دوسرا ملک کے درمیان حامل ہوں، عام طور پر جدا گانہ عہد نامے ہوئے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۵) نہیں اور اس کا فرض ہے کہ اسے متحد بنائے۔ حقیقت میں اسی ادعا کی ایک شکل ”سفید فاموں کے بوجھ“ کا نظریہ ہے۔

۵۸۵ نامناسب ہونے کا مسئلہ تو اب گویا حل ہو گیا ہے۔ اسپین میں جرمن دورانی کی جانبدارانہ خدمت، چیچنکسونا کیلک کے سوڈانی علاقے میں جرمنی کی مداخلت اور حال ہی میں البانیہ میں آئی کی مداخلت اور قبضے نے اس اصول کا خاتمہ کر دیا ہے۔

۵۸۶ مثلاً درہ وانیال کے متعلق ۱۹۳۳ء میں بحرہ اسود، اور بحیرہ کے دول اور برطانیہ، فرانس، آسٹریا اور جاپان کے درمیان ایک ”آبنائے منامہ“ کی در سے ڈرا یا تھا کہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۸۵)

فضائی حقوق۔ مفہمہ پیرس **سلاسلہ** کے بموجب علاقہ مملکت اور علاقہ سمندر کے ارد پر کی فضا مملکت کی ملک ہے اور ہر ملک کو اس کی طیارہ رانی کے متعلق قواعد بنانے کا اختیار ہے۔

(ب) بڑا مانہ جنگ

۱۔ **فریقین جنگ**۔ ایسے افعال جو جنگی افعال تصور نہیں کئے جاتے "بدلہ" اور پھر ان ناکہ بندی ہیں۔ "بدلہ" اس فعل کو کہتے ہیں جو معاندانہ افعال کے جواب

(تیسرے ضمیمہ صفحہ ۵۵) (۱) ان کے دس لیں ہر ملک کے تجارتی جہاز اور جنگی جہاز جو بحیرہ اسود کے ساحل دول میں سے قوی تر میں کے جنگی جہازوں سے زیادہ نہ ہوں گے دروہ دانیال میں ہو کر گزر سکتے ہیں (۲) جنگ کے زمانے میں غیر ضمیمہ دار جہازوں کی اس وقت تک مداخلت نہ کی جائے گی جب تک اس میں منوعات جنگی نہ ہیں (۳) بعض جہاز اور دروہ دانیال کے ساحلی علاقے غیر مسلح کر کے گئے (۴) ایک مامور یہ آہندے ان امور کے نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا۔ جو **سلاسلہ** میں ترکی کی تحریک پر ایک کانفرنس کی گئی جس میں قرار پایا کہ تبدیلی حالات کی وجہ سے ترکی دروہ دانیال کو مسلح کر سکتا ہے اور اس پر سے وہ تمام قیود ہٹائی گئیں جو اس کے اندر اٹلی کو محدود کرتے تھے۔ دیکھو سالانہ رجسٹر **سلاسلہ** حصہ اول **سلاسلہ**۔

نہر پیرس کا انتظام مہندہ **سلاسلہ** پر مبنی ہے۔ اس کے بموجب (۱) نہر میں اور جنگ دول میں ہر مملکت کے جہازوں کے لئے کھلی ہے گی (۲) نہر یا اس کے دولوں میں تین تین میں کسی قسم کا جنگی فعل ہو نہ ہو گا (۳) نہر کے دروازے کی ناکہ بندی نہیں کی جائے گی (۴) نہر پر مستقل قلعہ بندی ناجائز ہوگی۔ کوئی جنگی جہاز یا بحری غنیمت کا جہاز اس میں ۴۴ گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھہرے گا جنگ عظیم کے دوران میں نہر پر جہتی اور اس کے حلیفوں کے لئے بند کر دی گئی، لیکن جنگ جیسے میں یہ آئی کے لئے برا کھلی رہی۔

میں کہا جائے، جیسے محصول درآمد و برآمد کی زیادتی۔ ”ضبطی“ اس فعل کو کہتے ہیں جس کے بموجب ایک مملکت کسی مخالفت کے فعل کے بدلے میں دوسری مملکت کی املاک پر قبضہ کرے۔ ”پرہیز ناکہ بندی“ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مملکت جہازوں کی معاند مملکت کے کسی خاص بندرگاہ جانے سے عملدرودک لے۔ ظاہر ہے کہ اگر فریق ثانی چاہے تو ان تینوں افعال کو جنگ کا بہانہ بنا سکتا ہے۔

اعلان جنگ۔ ۱۹۰۷ء کے بموجب جنگ سے پہلے باضابطہ اعلان جنگ ضروری ہے۔ اعلان کے ساتھ ہی ساتھ فریقین کے شہرلوں کے درمیان حملہ معادات کا اندم ہو جاتے ہیں اور قرضہ جات امن تک ملتوی ہو جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی خاص شخص کو دشمن کے ملک میں ہو کر گزرنے کا اجازت دینے کا بھی طریقہ رائج ہے۔ اعلان کے ساتھ ہی دشمن ملک کے ہر باشندہ کے لئے ایک

ملاح حال۔ کہ زمانے میں پہلے جاپان نے اور پھر آٹلی نے ایک نیا نظریہ قائم کیا ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی مملکت کسی دوسری مملکت کو کالونی متحمل تصور نہ کرے تو ایسی حالت میں بغیر اعلان کے جنگ شروع کی جاسکتی ہے، چنانچہ جاپان نے چین کے خلاف اعلان جنگ کئے بغیر بالچر بمبوریا پر قبضہ کر لیا اور اس وقت تمام مشرقی چین میں براہ جنگ ہو رہی ہے، لیکن اعلان کا نام نہیں اسی طرح آٹلی نے لیبرکری اعلان جنگ کے حبت سے جنگ ٹھیکرادی اور حال ہی میں البانیہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا لیکن اعلان جنگ نہ ہوا۔

۱۹۱۵ء میں فون ہاپن کو جرمن شنگھائی کے جرمن سفارت خانہ کا مقیم تھا، انگریزوں نے ایسا ہی اجازہ دیا۔

دقت مقرر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے اندر وہ اپنے وطن چلا جائے، گو یہ بھی ممکن ہے کہ دشمن ملک کے شہریوں کو چند شرائط کے تحت ملک میں رہنے کی اجازت دیدی جائے اور انہیں خواہ نظر بند کر دیا جائے ورنہ آزاد رہنے دیا جائے۔

اگر کسی ملک میں خانہ جنگی ہو رہی ہو تو باغیوں کو باضابطہ جنگ کا ذریعہ سمجھنا غیر اقوام کی صوابدید پر مبنی ہے۔ اگر جنگ کو باضابطہ تصور نہ کیا جائے تو پھر نہ کہ بندی منوعات جنگی وغیرہ کا اعلان ناجائز تصور کیا جائے گا۔

جنگ آزماؤں کی تعریف۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ خیال جتنا جاتا تھا کہ دوران جنگ میں عام شہریوں کی جان اور آبرو محفوظ رہے گی اور جنگ صرف سپاہیوں کے درمیان ہوگی۔ چنانچہ جنگ سے پہلے فریقین اس قسم کا اعلان کر دیا کرتے تھے۔ لیکن اس جنگ میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور اب تو چین، جتہ اسپین وغیرہ کے واقعات سے تو ایسے تو اعداد اب ناممکن سے ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تو اعداد کا عدم تعین اسباب ذیل کی وجہ سے ہے۔

(۱) اب عورتیں جنگ میں باضابطہ حصہ لینے لگی ہیں۔ (۲) طیاروں نے جنگ کے طریقے میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور خطوط ریل و رسائل پر بمباری کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ (۳) جنگی ضروریات کے لئے صنعت و حرفت کا خانہ لاڑی تصور کیا جانے لگا ہے (۴) یہ واقعہ ہے کہ بغیر شہریوں کی عام رضامندی اور تائید کے آج کل کوئی لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔

فوجوں کے ساتھ جو غیر جنگجو لوگ ہوتے ہیں، جیسے مذہبی رہنما، اطباء وغیرہ ان کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ اگر وہ مسلح بھی ہوں اور انھوں نے بیماروں اور مجروحین

کے بچاؤ کے لئے اسلحہ اٹھائے بھی ہوں، تو بھی انھیں قید نہیں کیا جاسکتا۔ گو
نارباہو یا سرشتہ بہم رسانی کے عہدہ داروں کو قید کیا جاسکتا ہے۔ فوجیوں کی
دردی کی خاص علامت لازمی ہے۔ اگر یہ علامتیں نہ ہوں یا ایسی ہوں کہ
آسانی سے انھیں علیحدہ کر کے فوجی معمولی شہری کی حیثیت اختیار کر سکیں،
جیسے بے قاعدہ سپاہی، تو انھیں گرفتار کر کے گولی سے مارا جاسکتا ہے۔
اگر ملک کا ملک خارجی حملے کے خلاف اٹھ کھڑے ہو تو قواعد ہنگ
کے بموجب شہریوں کی حیثیت جنگجوؤں کی سی ہوگی، بشرطیکہ وہ توڑیں جنگ
پر عمل کریں۔

جنگی تشدد کے حدود۔ ”جنگ میں صرف اتنے تشدد کی اجازت
ہے جو حصول مقصد کے تناسب ہو“۔ مسئلہ کے قواعد ہنگ نے حسب
ذیل کو ناجائز قرار دیا ہے: (۱) زہریلے ہتھیاروں کا استعمال (۲) دغا
کر کے قتل کرنا۔ (۳) جنھوں نے ہتھیار ڈال دے ہوں ان کا قتل۔ (۴) یہ
اعلان کہ کسی کی جان نہیں بچائی جائے گی۔ (۵) بے ضرورت تکلیف دہی۔
(۶) علم توقف جنگ کا بیجا استعمال۔ (۷) املاک کی بے ضرورت بربادی۔
(۸) کسی ملک کے باشندوں کو اسی ملک کے خلاف لڑنے پر مجبور کرنا۔ اسی
طرح پشینے والی گولیوں کا استعمال، کنوڑوں میں زہر ڈالنا اور شہری امراض پھیلانا
بھی عام اتفاقِ ذیل سے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ مسئلہ کے ششکٹن والی
کانفرنس میں برطانیہ، کلاں، فرانس، اٹلی، جاپان اور مانک متحدہ امریکہ نے بالاتفاق
ماستے یہ قراردادیں کہ آئندہ جنگوں میں یہ مہلک کسی طرح کی گیس استعمال نہیں کریں گے

لیکن اس اعلان کی اس وقت تک توثیق نہیں ہوئی اور نہ کسی جنگ میں جو اس کانفرنس کے بعد ہوئی، اس پر مطلق عمل کیا گیا۔ محاصرے اور بمباری تباہ فیکہ کوئی شہر یا مکان قلعہ بند نہ ہو اس پر بمباری کرنا ناجائز ہے۔ بمباری سے پہلے شہریوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ بمباری ہونے والی ہے۔ ایسے مذہبی مقامات یا ایسے اہلانات جن کا تعلق طبی امداد، علوم و فنون وغیرہ سے ہو، دشمن طعنے وہ فوجی اغراض کے لئے استعمال نہ کئے جاتے ہوں، انھیں ہالو نہیں کرنا چاہئے۔ ۱۹۰۷ء کے ایک بین الاقوامی فضائی مامور نے قرار دیا کہ فضائی بمباری صرف فوجی عمارات پر کی جاسکتی ہے اور اگر وہ آبادی کے وسط میں واقع ہوں تو ان پر بھی بمباری نہیں کرنی چاہئے۔

۱۹۰۷ء کے موافقہ ہیگ سے قرار پایا کہ غیر قلعہ بند ساحلی مقامات کی بحری بمباری ناجائز ہے۔ آبدوز سرنگوں کی بابت مفاہم ۱۹۰۷ء میں تیار پایا

شہ جنگ عظیم میں زلفین نے زہریلی گیس کا دل کھول کر استعمال کیا، اور اب تو ہر ملک تقریباً یہ فیصلہ کئے ہوئے معلوم ہوئی ہے کہ آئندہ کسی جنگ میں وہ ان گیسوں کو استعمال بھی کرے گی اور ان سے اپنے بکاؤ کا بھی انتظام کرے گی۔ آئینی نے جتنے کو فحش گیسوں کے ذریعے مرنے کیا۔ شہ حالت جنگ میں جنگجو زنی ایسی ہارکیوں کی پروا نہیں کرتے، چنانچہ جنگ عظیم میں جرمنی نے رادرس دجیم اسکے جاموں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور گورنمنٹوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے دشمنوں نے گرجاؤں سے فوجی کام لئے۔ مگر شہائی فرانس کے کہنے ہی ایسے گرجا میں جو توپوں کے گولوں سے ڈھائے گئے۔ آئینی نے جنگ جتنے میں متعدد مرتبہ (لغیہ ماشیہ ۵۹)

کہ آزاد خود بخود چلنے والی سرنگیں نا جائز ہیں۔ لیکن اگر آزاد ہونے کے ایک گھنٹہ بعد ہیکار ہو جائیں تو جائز ہیں۔ جنگ عظیم کے دوران میں فریقین نے نہایت وسیع اختیارات میں آبدوز سرنگوں کا استعمال کیا اور ان کی زد سے غیر جنبہ دار و دل کے جہاز بھی نہیں بچ سکے۔

جنگی قیدی۔ موافقہ ۱۹۰۷ء کے بموجب قیدی مختلف پٹنوں اور رسالوں کے قیدی نہیں بلکہ حکومت کے قیدی ہوتے ہیں، لہذا معمولی شہری قیدیوں کی الماک محفوظ رہتی چاہئے۔ ان سے کام لیا جاسکتا ہے، لیکن یہ کام فوجی نہیں ہونا چاہئے اور انھیں کام کا مناسب معاوضہ ملنا چاہئے جو ان کی حیثیت کی دستی میں صرف ہو سکے۔ اگر وہ فرار ہو جائیں اور پھر گرفتار ہو جائیں تو ان کے فرار ہونے کی انھیں سزا نہیں ملنی چاہئے۔

جاسوس۔ جاسوسوں میں وہ لوگ شمار نہیں ہوں گے جو علی الاعلان واسطے لئے جا رہے ہوں، اور اگر واقعی کوئی جاسوس اپنی فوج تک پہنچ جائے اور پکڑا جائے تو وہ بھی جاسوس نہیں سمجھا جائے گا۔

زخمی اور بیمار۔ ۱۹۰۶ء کے موافقہ جنیوا سے انجمن صلیب احمر کے مقررہ یہ امر مسلمہ ہے کہ زخمی اور بیماروں کے علاج معالجے میں خواہ اسپتالوں میں یا کیمپوں کے کسی قسم کا فرق نہیں ہونا چاہئے۔ اطباء اور جراح اگر پکڑے جائیں تو وہ آزاد

(فقہ حاشیہ ص ۵۹۱) صلیب احمر کے کیمپوں، اگر جائز اور اسپتالوں پر بیماری کی اور ۱۹۰۶ء میں البانیہ کے تمام ہندو گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بنو کسی قسم کے اعلان کے بجادی۔

تصور کئے جائیں گے گواہیں کماندار کا حکم ماننا پڑے گا۔ اسپتالی جہازوں کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ ان سے فوجی کام نہ لیا جاتا ہو۔
 دشمن کی املاک - بری املاک کے متعلق قاعدہ ہے کہ خانگی ملک۔
 نیز ایسی املاک جو مذہب، حکمیت، فنون لطیفہ، خیرات و مبرات اور تعلیم کے لئے جو ضبط نہیں ہو سکتی، اور صرف ایسی املاک ضبط ہونی چاہئے جو املاک عامہ ہوں اور جو فوجی کاموں میں لائی گئی ہو، یہ بھی قاعدہ ہے کہ افراد کی حرکات کی پاداش میں پوری آمادہ پر عام تعزیر کا بار نہیں ڈالا جاسکتا اور سامان رسد صرف اس قدر ضبط کرنے کا حکم دیا جاسکتا ہے جو فوجی ضروریات کے لئے کافی ہو اور جو ملک کی پیداوار کے قتل سب ہو۔ علاوہ فوجی ضروری اغراض کے کسی حصے کو برباد نہیں کرنا چاہئے۔

”اعلان لندن“ ۱۹۰۹ء میں یہ طے ہوا تھا کہ کسی مملکت نے اپنا کوئی جہاز جنگ سے پہلے کسی جنبہ دار مملکت کو منتقل کر دیا تو ایسی صورت میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ منتقلی صرف آنے والی جنگ کے خطرے سے بچنے کے لئے تھی تو یہ ناجائز ہوگی اور جہاز ضبط کیا جاسکے گا۔ جیسا اوپر بتایا گیا ہے اس اعلان کی کبھی توثیق نہیں ہوئی۔

خاتمہ جنگ - جنگ کا خاتمہ تین طریقوں میں سے ایک کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ (۱) التوائے جنگ (۲) ایک فریق کے دوسرے فریق کو

۱۹۱۴ء جنگ عظیم میں متعدد مرتبہ اس قاعدی کی خلاف ورزی کی گئی۔

منسوب کرنا یا ملک فتح ہو جانا (۳) در فرتی معاہدہ - صلح کے بعد تمام ایسے خانگی حقوق کا احیا ہو جاتا ہے جو جنگ کے زمانے میں فنانہ ہو گئے ہوں۔

علی العموم صلح نامہ کے حسب ذیل حصے ہوتے ہیں :-

۱۔ عام جس میں خصوصیت کا خاتمہ جنگی قیدیوں کی دلچسپی، ناجائز نقصانات کے متعلق باز پرس سے دست برداری - اور عہد نامہ ما قبل کی موثر فی یا احیاء کا ذکر ہوتا ہے۔

۲۔ خصوصی - جس میں ہر جہ جنگ اور الحاق کا اعلان ہوتا ہے۔

۳۔ متفرق - جس میں بر فاشگی افواج، قلعہ جات کی مسماری، انہی ملکوں کا جنم اور اس قسم کی دوسری دفعات ہوتی ہیں۔

علاوہ ازیں بعض صلح ناموں میں خفیہ دفعات بھی ہوتی ہیں جو اس لئے خفیہ رکھی جاتی ہیں کہ ان کا اثر بعض دوسری ملکوں پر پڑتا ہے اور آشکارا کرنے سے مقاصد کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۲۔ غیر جنبہ دار

تیسرے ہے کہ فریقین جنگ قواعد و قوانین کے اس قدر پابند نہیں ہوں گے

جنہی غیر جنبہ دار ملک ہیں - چنانچہ قانون بین الاقوام میں غیر جنبہ دار ملکوں کے متعلق جو قواعد

ہیں وہ زیادہ معین ہیں - فی الجملہ غیر جنبہ دار ملکوں کو فریقین جنگ سے تعلقات رکھنے

کا حق حاصل ہے۔ گو اس بارے میں کوئی قطعی قاعدہ نہیں، لیکن اگر ایک جنگجو فریق

اور ایک غیر جنبہ دار کے درمیان پہلے سے سامان جنگ مبادا کرنے کے متعلق کوئی

معاہدہ ہے تو اغلب ہے کہ معاہدے کی تکمیل کو دوسرا جنگجو فریق غائب ناپسندیدگی

سے دیکھے، اور ممکن ہے کہ اس بہانے سے غیر جنبہ دار فریق سے جنگ چھیڑے۔ اس اصول کے، نظر موافقہ ہیگ میں یہ طے ہوا کہ جنگجو ملکوں کو فائگی ترخصے دئے جاسکتے ہیں۔ لیکن برطانیہ، فرانس، روس اور جاپان نے اس اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اب اس کا کچھ اثر نہیں معلوم ہوتا۔

غیر جنبہ دار ملکوں کے شہر لوں کو رضا کار بننا جائز ہے اور انہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ فریقین کو اسلحہ مہیا کریں، چنانچہ جنگ عظیم کے ابتدا میں ممالک متحدہ کے مستند حکومت نے مجلس سینات کے روبرو اس حق کا اعلان کیا تھا۔

فریقین کو غیر جنبہ دار ملک یا سمندر کے فوجی استعمال کا کوئی حق نہیں، لیکن ہیگ قواعد کے مطابق اس میں مضائقہ نہیں کہ کوئی جنگجو فریق غیر جنبہ دار ملک میں ہو کہ جہاز گزارے، گو ان جہازوں کو غیر جنبہ دار سمندر میں عام طور پر ۲۴ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہئے۔ اگر کسی فریق کا کوئی جنگی قیدی غیر جنبہ دار ملک میں پہنچ جائے تو وہ خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ غیر جنبہ دار علاقے میں ہو کر فوج گزارنے کے متعلق کوئی خاص قاعدہ نہیں، لیکن جنگجو فریق کو ضرورت کے وقت یہ حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار ملک کو معاوضہ دے کر اس کی املاک اپنے قبضے میں کرے یا اسے جنگی ضرورت پر بر باد بھی کر دے۔

جنگی ممنوعات۔ نظر موافقہ غیر جنبہ دار کو فریقین جنگ سے تجارت کرنے کا اختیار ہے، لیکن جنگجو فریق کو یہ حق حاصل ہے کہ ممنوعات جنگی پر قبضہ کر کے انہیں بر باد کر دے۔ جنگی ممنوعات اس اسباب کو کہتے ہیں جس کی تجارت کو کوئی فریق غیر جنبہ داروں کے لئے بھی ممنوع قرار دیدے۔ یہ کسی غیر جنبہ دار ملک کا وہ سامان

ہوتا ہے جسے جنگی مدد کے لئے کام میں لایا جاسکتا ہو اور بغیر حیدرآلہ کے ضبط کیا جاسکتا ہے۔ ممنوعات دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک قطعی دوسرے مشروط۔ مشروط ممنوعات سے وہ اسباب مراد ہے جس سے کسی فریق کی جنگی مدد ہو سکتی ہو، لیکن اس کی ضبطی صرف اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا مقصد خاص طور پر فریق ثانی کو مدد دینا ہے۔ اس کے برعکس قطعی ممنوعات میں وہ اسباب شامل ہیں جس کا محض فریق ثانی کی طرف سے لایا جانا اس کی ضبطی کے لئے کافی ہے۔ قطعی ممنوعات جنگی میں اسلحہ ہمیشہ شامل ہوتے ہیں، اور یہی حال اکثر مواقع پر گھوڑوں کا ہوتا ہے۔ روسیہ بھی کبھی کبھی قطعی ممنوعات میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ امر کہ آیا کوئی سامان قطعی ممنوعات میں شامل ہے یا نہیں، موقع محل پر ہی ہوتا ہے۔ مشروط ممنوعات میں سامان خورد و نوش، جنگی پوشش، سونا چاندی، ریل گاڑی، سامان اشیا متعلق تار برقی اور ایسی ہی دوسری چیزیں شامل ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے دوران کی انگریزی نظریں اس قسم کی موجود چیزیں جن کی مدد سے کوئی چیز جس سے بالواسطہ بھی فریق ثانی کو فوجی مدد ملے، ضبط کی جاسکتی ہے، چنانچہ اس اعتبار پر تقریباً ہر چیز ہی آجاتی ہے۔

۱۹۱۷ء میں ممنوعات کے مسئلہ پر مختلف درل کے مابین لندن میں مفصل بحث ہوئی اور اس کے نتائج کو مشہور "اعلان لندن ۱۹۱۷ء" میں مدون کیا گیا، لیکن اس کی سرے سے توثیق ہی نہیں ہوئی، اور جو کچھ اس کا رہا سہا اثر تھا اس کا بھی ۱۹۱۷ء میں خاتمہ ہو گیا۔

جس غیر جنبہ دار جہاز پر ممنوعات ہوں، اسے بھی ضبط کیا جاسکتا ہے، اور اگر بالآخر اسے چھوڑ دیا جائے تو جو خرچہ اس کی گرفتاری میں ہوا اسے غیر جنبہ دار ملک کو پورا کرنا ہوگا۔ نیز اگر کسی جہاز پر ممنوعات ہوں تو اس کا اثر غیر ممنوع اسٹیوار پر بھی پڑے گا، اور وہ بھی ضبط کر لی جائے گی۔

ناکہ بندی۔ ناکہ بندی سے مراد یہ ہے کہ کوئی فریق جنگ غیر جنبہ دار ممالک کے ساتھ دشمن کے کسی خاص بندرگاہ کی تجارت کو اس کے دبانے پر اپنے جہاز کھڑے کر کے یا اپنے گولیں کے ذریعہ لاکر مسدود کر دے۔ ناکہ بندی کے نتائج اسی وقت جائز تصور کئے جائیں گے جب ناکہ بندی کا عمل ہو اور وہ ہر غیر جنبہ دار کے لئے ہو، یعنی اگر غیر جنبہ دار جنگی جہاز، ایسا جہاز جسے طوفان یا دوسری ناگزیر وجہ سے بندرگاہ میں جانا پڑا، تو ناکہ بندی پر اثر نہ پڑے گا۔

عام طور پر ناکہ بندی کے بعد غیر جنبہ دار ممالک کو پندرہ روز کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اس کے بعد جو غیر جنبہ دار جہاز بندرگاہ میں جانا چاہے اسے ضبط کیا جاسکتا ہے

۱۸۷۱ء جنگ عظیم کے دوران میں صرف ایک ایک بندرگاہ ہی کی ناکہ بندی پر اتفاق نہیں کیا گیا تھا بلکہ انگریزوں نے تمام جرمن ساحل کی ناکہ بندی کر دی، گو اس پر جنگ کے ابتدائی سالوں میں ممالک متحدہ امریکہ نے احتجاج کیا تھا۔ جرمنی نے بھی برطانیہ کے جہازوں کی طرف اور بعد ازاں اس اٹلی کے بھی جہازوں کی طرف آبدوزیں بھیج کر بحیرہ شمالی، برطانیہ کے مغربی ساحل اور بحیرہ روم تک کی گویا ناکہ بندی کر دی تھی۔ لیکن دونوں صورتوں میں برطانیہ کے جہازوں اور جرمنی وغیرہ کی طرف سے جو اعلانات ہوئے ان میں ناکہ بندی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

ناکہ ہندی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ناکہ بندی کرنے والا جہاز یا تو پس اختیار یا اضطراباً ہٹائی جائیں یا ناکہ بندی کرنے والی ملکیت بندرگاہ پر قبضہ کرے۔
 اگر غیر جنبہ دار جہازوں میں محض غائی سامان ہو جو جنگی ممنوعات میں شامل نہ ہو تو اسے ضبط نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اگر دشمن کے جہاز میں غیر جنبہ دار مالک کے شہریوں کا سامان ہو اور یہ سامان جنگی ضروریات کا نہ ہو تو اسے بھی چھوڑ دینا ہو گا۔
 کھلے سمندر میں جنگجو فریق کو حق حاصل ہے کہ غیر جنبہ دار تجارتی جہازوں کا معائنہ کرے اور اگر یہ جہاز تہمدی کریں تو انھیں ضبط کرے۔ اگر تجارتی جہاز کے ساتھ غیر جنبہ دار جنگی بردہ بھی ہے تو برطانوی رائے یہ ہے کہ پھر بھی جنگجو فریق تلاش ہی لے سکتا ہے، لیکن بڑی غلطی رائے اس کے مخالف ہے، یعنی اسی حالت میں محض جنگی جہاز کے کماندار کا یہ کہنا کہ کوئی قابل اعتراض شے لہجہ ذاتی جہاز میں نہیں ہے کافی سمجھا جائے۔

غیر جنبہ دار بحری غنیمت۔ اس طرح جو غیر جنبہ دار جہاز گرفتار ہوں گے انھیں یا تو فوراً چھوڑ دینا چاہئے ورنہ اس کا معاملہ آخری حکم کے لئے باضابطہ عدالت غنیمت میں پیش کرنا ہو گا۔ اگر کوئی غیر جنبہ دار جہاز مجاذجی میں محسوس آئے یا ایسا رویہ اختیار کرے جس سے ایک ہی فریق کی جنگی مدد ظاہر ہو تو اس جہاز پر حملہ کرنا جائز تصور کیا جائیگا۔ اعلان لندن ۱۹۰۷ء کی رو سے جس کی توثیق نہیں ہوئی، غیر جنبہ دار جہاز کو اس صورت میں نابود کیا جاسکتا تھا اگر اسے گرفتار کر کے بندرگاہ میں لے جانے سے جنگ میں گرفتار کنندہ فریق جنگ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔

خاتمہ۔ یہ سب بیان قانون انوار کا ہے۔ حال میں جاپانی اٹالوی اور جرمنی

کی وجہ سے قانون بین الاقوام کی وقعت کاغذ کی ٹائٹل کے برابر رہ گئی ہے۔ نیز اسپین کی خاد جنگی میں غیر جنبہ داروں کی جانبداریوں اور فریقین کی سخت ترین خونریزیوں کی وجہ سے اور ساتھ ہی اس عظیم المثال صورت حال کے باعث کہ یورپ کی بعض مملکتیں، جیسے جرمنی اور روس، باوجودیکہ بظاہر ان کے ایک دوسرے کے ساتھ امن و امان کے تعلقات میں، علی الاعلان ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کے سفیر دوسرے کے ملک میں موجود بھی ہیں، اور تجارتی تعلقات بھی قائم ہیں۔ ان سب باتوں سے قانون اقوام کا راسخا اثر بھی غائب ہوتا نظر آتا ہے اور بین الاقوامی نزاع کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔

حقیقت میں، جیسا قانون اقوام کے ایک بڑے عالم نے کہا ہے، یہ قانون صرف اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب مملکتوں کے درمیان توازن کی کیفیت ہو اور کسی ایک مملکت کو دوسری مملکت پر غیر معمولی تفوق حاصل نہ ہو۔^{۵۱۲} اس کے نزدیک بین الاقوامیت کا احساس اسی وقت ممکن ہے جب عمومیت کا راج ہو۔ اول تو ”بین الاقوامی معاشرے“ ہی میں عمومیت کا خیال نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے مطلق العنانی ایک غیر ذمہ دار ادارہ ہے جس کے ساتھ بین الاقوامی

تعلقہ ممبر کے برابر اتنا ہونا چاہئے کہ بد سے جرمی کا طرز عمل یہ ہو گیا ہے کہ جہاں موقع دیکھا بین الاقوامی کیفیت کی ہنسی اڑائی اور دوزخ کی معابدوں کے دفعت کا از خود خاتمہ کر دیا۔

تعلقہ ادین ہائم، جلد ۱، باب ۲، دفعہ ۴۔

ذمہ داری کا احساس باقی نہیں رہ سکتا، تیسرے، جنگ کے خطرے کا اندازہ
ایک محض اخلاقی مطمح نظر ہے، اور یہ اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب
تک ہر قومی سے قومی مملکت پروری طرح سے اس کی قدر نہ کرتی ہو اور مختلف
مملکتیں ایک ہی اخلاقی معیار پر نہ پہنچ جائیں۔ بظاہر دنیا پھر اسی قدر کی طرف
واپس جا رہی ہے جس سے ایک امی عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے
ساتھ سے تیس سو برس پہلے بچا یا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی انسان کو حضرت
علیؑ کا سبق یاد کرنے میں دیر لگے گی کہ

الناس من جهة التمثال الكفاء

ابوہریرہؓ آدمؑ و ہامؑ و حواءؑ

تسام شد

ضمیمہ کتاب ”مبادی سیاست“

لمحض

اصلاحات دستوری قلم و سرکار نظام خلد الشہدک
(مافذ شدہ ۱۹ جولائی ۱۹۳۲ء)

- ۱۔ حق اجتماع عامہ :- عام جلسوں کے لئے کسی قسم کی بیگی اجازت کی ضرورت نہ ہوگی، صرف قبل از قبل اطلاع دینا کافی ہوگا۔ مقامی حکام کو صرف اس وقت ممانعت کا اختیار ہوگا جب کسی جلسے میں اس عام میں نقص، باغیانہ جذبات یا فرقہ واری منافرت پیدا ہونے کا امکان ہو۔
- ۲۔ عالمہ و ملازمت سرکاری :-

۱) ”مملکت کا صدر اپنی ذات میں عوام کی بلا واسطہ نیابت کرتا ہے اور اس کا تعلق عوام کے ساتھ نہایت جماعتوں کے اراکین کے تعلق کی بہ نسبت زیادہ فطری، گہرا اور مستقل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مملکت کا صدر بھی ہوتا ہے اور عوام کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے نظام سیاسی میں صدر مملکت ایک طرف تو دادرمان سازی کے دائرے میں توہین اور امتناع کے اختیار

کا حال ہوتا ہے اور دوسری طرف عالمانہ حکومت کے دائرے میں کا بینہ کی تخلیق اور شکست کا مخصوص اختیار بھی اس کو حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ اس وقت تک معمولاً ارکان حکومت امرا اور عہدہ داروں میں سے مقرر کئے جاتے ہیں۔ آئندہ وہ مقننہ کے ایسے ارکان میں سے بھی چنے جائیں گے جنہوں نے ”اپنے اعلیٰ ضمیر“ اپنی دنا داری اور ہینک امور کی نسبت اپنی اصابت را سے ”اعلحضرت خسر و دکن و برار کا اعتماد حاصل کیا ہو اور اس کا ثبوت دیا ہو کہ ان میں وزارت کی گراں قدر ذمہ داریوں کو انجام دینے کی قابلیت ہے۔

۳۔ سرکاری ملازمت کے متعلق ہر سرشتہ میں ایک تقراتی مجلس ہوگی جو وزیر، مستند اور افسر متعلقہ پر مشتمل ہوگی۔ حیدرآباد سول سروس کمیشن باب حکومت سی کی ایک ذیلی مجلس ہوگی جس کی صدارت صدر اعظم کریں گے اور جس کے اراکین میں کم سے کم ایک ہندو اور ایک مسلمان وزیر ضرور ہوں گے۔

۴۔ مجلس مقننہ: (۱) خصوصیات

۱۔ مفادات کی نمایندگی۔

۲۔ منتخب شدہ ارکان کی اکثریت نامزد کردہ پر۔

۳۔ مشترک حلقہ جات را دہی۔

۴۔ ہندو مسلمانوں کے لئے پچاس پچاس فیصد نشستیں محفوظ ہوگی

لیکن ہندو امیدوار کو اپنے ہم مذہب را دہندوں کی اور

مسلمان امیدوار کو اپنے ہم مذہب زار دہندوں کی ہم فیسدا راضی
حاصل کرنی ہوں گی۔

۲۔ ترکیب مہنتہ۔

(الف) برہنہ عہدہ :- وزرا ————— ۴
(ب) منتخب شدہ :-

پٹ دار کاشکار، آٹھ آٹھ نمائندے ————— ۱۶
والیان ریاست، اے ماتحت و جاگیردار ————— ۴
معاشرہ، مزدوری پیشہ، صنعت و حرفت، تجارت،
بنک کاری، وکلاء، طبیب، طبیانی (ریگریسٹ)
مجلس اصلاخ، ہدیات و قصات، ہدیہ حیدر آباد
نی اکائی ردود ————— ۲۲

جدید منتخب شدہ ————— ۴۲

(ج) نامزد کردہ :-

سرکاری، منجانب حکومت ————— ۱۴
صرف خاص مبارک منجانب ہر اگر الڈائنس خیر و کون — ۳
منجانب ہر سہ پانچ گاہ (اصلی عظام) ————— ۳
منجانب علاقہ پیش کاری (مہاراجہ کرشن پرنس دہلادہ) — ۱
منجانب علاقہ سالار جنگ بہادر ————— ۱
غیر سرکاری منجانب حکومت (ہر کین ۵، عیسائی ۲، خواتین ۱)

جامعہ، لنگاہیت، پارسی، ٹھیکہ دار، صحت (۱)۔ ۱۲

جلد نامزد کرده ————— ۳۶

جلد ارکان نقشه — ۸۵

(۴) اختیارات مقننہ۔

۱۔ سوالات کرنے کا حق، سوائے ان امور کے جو مقننہ کے حدود اختیار سے باہر ہوں۔

۲۔ مسودہ قانونیچہ بابت اختیارات مفتقد۔

(۱) حسب ذیل امور کی بابت مقننہ میں کوئی مسودہ یا تحریک یا قرارداد یا سوال یا کارروائی نہ پیش کی جائے گی نہ پیش کئے جانے کی تحریک ہو سکیگی۔
جملہ اموت ملین غلاموہ اصفی و خاندان شاہی و اختیارات شاہی تاج برطانیہ اور دیگر حکومتوں ریاستوں کے ساتھ تعلقات، امور ملین برار باب حکومت، فروج، قلمرو کی سرکاری زبان وغیرہ (۱۰ دفعات)
(۲) حسب ذیل امور کی بابت صرف حکومت کے کسی رکن کی طرف سے ہی مسودات پیش ہوں گے۔ ریل یا ہوا کے ذریعے سے حمل نقل، اسلحہ یا آتشگیر مادوں کو قبضہ یا نقل و حمل، اس عامہ احتساب اور راز، قلمرو آصفیہ میں داخلہ یا اس سے ترک وطن، حقوق وطنیت، عدالتیں، کانیں، سرکاری بیمہ اور سرکاری بینک کی سرکاری ملازمت، مقامی حکومت، سکس سازی، محصول ہندی

ردم شہاری وغیرہ (۴۴ دفعات)

(۴) کوئی ایسا مسودہ قانون پیش نہ ہو سکے گا جو قلمرو آصفیہ میں رہنے والے کسی ملت یا فرقے کے مذہبی عقائد یا رسوم کو کسی طرح متاثر کرتا ہو سوائے اس صورت کے کہ محرک نے قبل از قبل حکومت سے تحریری اجازت لے لی ہو۔

(۵) حسب ذیل امور میں تحریکیں وغیرہ کرنے کا ہر رکن کو اختیار ہوگا:-
زرراعت، ماہی گیری، تجارت دیہی پار، صنعت، کارخانے، مزدوروں کی بہبودی، غربا اور بے روزگاری، گداگری، ذرائع آمدورفت علاوہ ریلوں کے، پانی، تعلیم علاوہ اعلیٰ تعلیم کے ذریعے اور عام تعلیم کے انتظام دیکھائی کے، کتب خانے، ملکی پمپس، لصلہ گاہ، شخصے، بینک کاری، بیمہ، صحت عامہ

شفا خانے و اندام مرض، وغیرہ (۵۳ دفعات)

۱- آئینی مشاوری کمیٹیاں حسب ذیل شعبوں کے لئے قائم کی جائیں گی:-

- ۱- زرعی ترقی - ۲- تعلیم - ۳- مالیات - ۴- صنعتی ترقی - ۵- صحت عامہ - ۶- ہندو مذہبی اوقاف - ۷- مسلم مذہبی اوقاف - ۸- امور مذہبی (متعلق عبادات و رسوم مذہبی) ان مجلس کے صدر ذریعہ شیعہ متعلقہ ہوں گے اور چونکہ یہ مشاوری کمیٹی اس لئے صدر کو ملے دینے کا حق نہ ہوگا۔ ان کے ارکان کی تعدادیں سرکاری اور غیر سرکاری ارکان کی مساوات ہوگی اور انھیں عام حکمت عملی کے مسائل پر جو حکومت

ان کے مشورے کے لئے روانہ کرے، بحث اور اظہار رائے پر حق حاصل ہوگا۔ ان کی روادیں راز میں رکھی جائیں گی۔

۵۔ مقامی حکومت (ہر مقامی ادارے میں نمائندگی مفاد راری ہوگی اور مقام کے مائٹل انتخابات مشترکہ اور ہندو مسلمان ارکان کی تعداد مساوی ہوگی)۔
(۱) مجلس اضلاع، ضلع میں ایک ضلعواری مجلس ہوگی جس میں حسب ذیل مفادات کی نمائندگی کی جائے گی اس میں معمولاً ۲۵ ارکان ہوں گے جن میں سے پچھتر نامزد ہوں گے، والیائی مسلمان (تحت ریاستیں) جاگیردار، معاشدار، دیہی انجمن، ٹکسے (مداد باہمی، مزدور، صنعت و حرفت، بینک کاری، وکالت و طبابت اناث وغیرہ۔ تقسیم کے مائل اس میں بھی مسلم اور ہندو ارکان کی تعداد مساوی ہوگی۔ اس کے اختیارات، ذرائع آمد و رفت، تعمیرات، صحت عامہ وغیرہ شامل ہوں گے۔
کے فرائض صاحب ضلع انجام دے گا۔ مالی وسائل میں پیشہ دار، محصول، محصول زیارات، محصول تنفیحات، حکومت کے عطایا، منفعت بخش کاروبار اور اجازتوں کی آمدنی۔

(۲) بلدیات اضلاع اور قصبائی کمیٹیاں، ایسے قصبات میں جو تحصیل کے مستقر ہوں یا جن کی آبادی ۵ ہزار سے زیادہ اور ۱۵ ہزار سے کم ہو قصبائی کمیٹیاں، اور ایسے قصبات میں جو اضلاع کے مستقر ہوں جن کی آبادی ۵ ہزار سے زیادہ ہو بلدی کمیٹیاں تاکہ کم کی جائیں۔
اول الذکر کے ارکان کی تعداد ۱۰ سے کم اور ثانی الذکر کے ارکان کی

۴۴ سے کم نہ ہوگی۔ نہائندگی وغیرہ کے لئے وہی اصول برتے جائیں گے جو مجلس اضلاع میں مد نظر ہیں۔

(۳) پنچائیتیں :- ان موضوعات میں جن کی آبادی ۲۵ ہزار سے ۵۰ ہزار تک ہے، پنچائیتیں قائم کی جائیں گی۔ ہر پنچائیت کے ارکان کی تعداد ۵ سے ۱۱ تک ہوگی۔ مکانداروں کے کھلے جلسے میں تحصیلدار ایک فہرست مرتب کرے گا جس میں مطلوبہ تعداد سے دگنے نام ہوں گے اور اس فہرست میں سے صاحب ضلع مطلوبہ تعداد کو چن لے گا۔ پنچائیتوں کے سپردگاہوں کی آب رسانی، پل اور سڑکوں کی نگرانی، صفائی اور صحت عامہ برادری کی نگرانی، گاڑیوں کے اڈے، قبرستان مرگھٹ وغیرہ۔

۱۔ بلدیہ چیدرا آباد :- اس میں حسب ذیل ارکان ہوں گے :-

نامزد شدہ _____ ۱۳
منتخب شدہ ۱۔

علاقہ جات بلدیہ فی علاقہ ۱ _____ ۴
آزاد پشیم اور مالکان اراضی داکٹہ چار چار _____ ۸
پست طبقات، اثاثہ تجارت، جاگیر دار و دودو _____ ۸
منظم مزدور، بنک کاری، صنعت، طبائی دیگر پریسٹ _____ ۴
ایک ایک _____ ۴

جملہ منتخب شدہ ارکان _____ ۲۶

جملہ ارکان بلدیہ _____ ۴۰

تعداد

۵۵، ضلع کانفرنس۔ ہر ضلع میں ایک سالانہ کانفرنس زیرِ عہدِ اہل
صاحب ضلع منعقد ہوگی تاکہ اس میں ضلع دار اپنی ضروریات کا اظہار
کر سکیں۔

BILAL
Husain Ra
Xagun

چندین کتابیں ہو جائیں

۳۲.۵۱

CALL No. { ۵۱۱۸ ACC. No. ۱۳۵۵

AUTHOR _____

TITLE _____

۳۲.۵۱

۵۱۱۸ ۱۳۵۵

کتابخانه شیروانی

مبارکی سید

| Date | No. | Date | No. | TIME |
|------|-----|------|-----|------|
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |
| | | | | |

THE B...



MAULANA AZAD LIBRARY

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of **Re. 1-00** per volume per day shall be charged for text-books and **10 Paise** per volume per day for general books kept over - due.

